نقوش

شمارہ ۱۰۴

جنوری ۱۹۶۶ء

مدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

قیمت فی پرچہ

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۲۵ روپے

ترتیب

مقالے

نظمیں ، غزلیں

افسانے

حالات حاضر

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو، ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا



"میرا بینک"

"میرا بینک"

"میرا بھی تو ہے!"

بینک لمیٹڈ



پی آئی اے کے آرام دہ
بوئنگ ۷۲۰ بی
ہوائی جہاز ہفتہ میں چھ دن
کراچی سے لندن پرواز کرتے ہیں

تہران۔ داہران۔ قاہرہ۔ بیروت۔ روم۔ جینوا۔ ماسکو اور فرینکفرٹ بھی پی آئی اے کی باقاعدہ سروسوں کے ذریعہ کراچی سے منسلک ہیں۔ مشرق میں پی آئی اے کی ہفتہ وار سروس براستہ کولمبو اور ڈھاکہ، چین جاتی ہے۔



پاکستان
انٹرنیشنل
ایرلائنز

باکمال لوگ
لاجواب پرواز

[illegible]

لاہور
کا
چیلسی

حکیم احمد شجاع

[illegible]

[illegible] ہے ۔ انکی ادبی زندگی کا آغاز [illegible] ہے جب ان کے بزرگ حکیم شہباز دین کے [illegible] شہزادہ ارشد گورگانی اور ناظر حسین ناظم [illegible] حکیم احمد شجاع کی تربیت کی تھی ۔ اس [illegible] دلی اور میرٹھ کے قیام اور لاہور کی تربیت نے انکے لئے شاعری [illegible] نگاری کے پیرائے میں ادبی کارنامے انجام دینے کا سامان کیا ۔ [illegible] مذہب اور انسان کا رشتہ قریب کا تھا ۔ زندگی [illegible] تسلیم کرتی تھی ۔ مذہبی نقطۂ نظر کو زندگی کے [illegible] جاتا تھا ۔ انسانی سیرت معاشرتی علوم سے بہرہ مند تھی ۔ [illegible] میں ایک خاص رشتہ تھا ۔ اسلام کی تعلیمات اور قرآن پاک کے احکام نے حکیم احمد شجاع کے ذہن کی تشکیل کی ۔ ان کی اصلاح پسندی اسی نظام حیات سے کسب فیض کرتی ہے ۔ [illegible] مظلوموں کی حمایت جیسی بنیادی انسانی اقدار اسلام اور [illegible] ہیں ۔ اور یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں ۔ جس ماحول میں حکیم احمد شجاع [illegible] یہ انکا لازمی نتیجہ ہے ۔ ادیب اپنے ماحول سے اثر لیتا ہے ۔ حکیم احمد شجاع نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے اس میں ان اقدار کو اسی سیاق و سباق ہی سے دیکھا جاتا تھا لیکن یہ کسی تقلید محض یا ذہنی بے دست و پائی کا نتیجہ نہیں ۔ وہ اپنے ماحول کے نقاد بھی ہیں اور مصلح بھی ۔ مذہب کو انہوں نے رسمی لباس کے طور پر قبول نہیں کیا ۔ اسکی روح تک رسائی حاصل کی ہے ۔ اس لئے انکے اظہار میں خلوص اور بیان میں وہ ناقدانہ بصیرت پائی جاتی ہے جو ہر اچھے صاحب فن کے لئے ضروری ہے ۔

حکیم صاحب کے ادبی سرمائے کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ افسانہ نگاری' ڈراما نویسی اور شاعری ۔ ''حسن کی قیمت'' حکیم صاحب کے پانچ افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ انہوں نے ''اندھا دیوتا'' ۱۹۱۳ء میں لکھا ۔ ''[illegible] کی رات'' ۱۹۱۵ء میں ۔ ''آرام شاہ کی بیٹی'' ۱۹۱۵ء میں اور حسن کی قیمت ۱۹۱۷ء میں ۔ افسانوں کا یہ مجموعہ ۱۹۲۲ء میں منظر عام پر آیا ۔

حکیم احمد شجاع اردو نثر نگاری کے ایسے دور سے متعلق ہیں جب نثر کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اسکی نوک پلک سنوار کر اسے دلکش اور جاذب بنانا بھی ضروری تھا ۔ نثر نگاری میں یہ ریاض انکی تحریر کو نکھار گیا ۔ اپنے دور کے رومانی طرز کے زیر اثر حکیم صاحب نثر میں شاعری اور مصوری کو ضروری خیال کرتے ہیں ۔ اور بعض جگہ تو انہوں نے نثر کو بالکل شعر کی سرحدوں سے ملا دیا ہے ۔ زبان و بیان کا یہ چٹخارہ انکے افسانوں کے علاوہ ڈراموں اور عام نثری تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے ۔

حکیم احمد شجاع کی ڈراما نگاری کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے معاشرتی مسائل پر سب سے پہلے قلم اٹھایا ۔

حکیم احمد شجاع کے ادبی کارناموں کا تیسرا حصہ انکے شعری مجموعوں پر مشتمل ہے ۔ ''خون بہا'' انکی آپ بیتی کے علاوہ کلام کا مجموعہ بھی ہے ۔ دوسرا مجموعہ ''گرد کارواں'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے ۔ اس شاعری میں بھی اصلاح (خاص کر اخلاقی اصلاح) کا پہلو نمایاں ہے ۔ وہ اخلاقی اقدار کے علمبردار ہیں ۔ انکی [illegible] انسانی معاشرے کی بنیادی قدر اخلاق ہے ۔ یہی نقطۂ نظر انکے افسانوں اور ڈراموں میں جاری و ساری ہے ۔ اور اسی کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ۔ اس دور میں جبکہ ہمارے معاشرے میں اخلاق کی کمی ہے اور اس تنزل کی سب سے زیادہ زد اخلاقی اقدار پر پڑی ہے حکیم صاحب کے کلام ان کے افسانوں اور ڈراموں سے ہمارے نوجوان بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔

حکیم احمد شجاع کا نام تاریخ ادب اردو میں ایک افسانہ نگار اور ڈراما نویس کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا ۔

(ڈاکٹر وحید قریشی)



حکیم احمد شجاع



حکیم احمد شجاع

یکم جون ۱۹۶۳ء کو بی بی سی لندن سے میرے ایک بہت ہی عزیز دوست ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے ادیبوں، شاعروں اور لندن کے اس مشہور محلے کے متعلق جو "چیلسی" سے موسوم ہے اور لندن کے مضافات میں واقع ہے ایک نہایت بصیرت افروز اور معلومات افزا نشریہ کیا جس کے یہ چند اقتباسات اس مضمون کو قلمبند کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔

"چیلسی کی فضا لندن کے دوسرے محلوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں قدم قدم پر یوں محسوس ہوتا ہے گویا ماضی دوبارہ زندہ ہو کر نئی صورت میں سامنے آگیا ہے۔ ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور فن کاروں کے مکان اس کثرت سے یہاں ہیں کہ یہ شرف غالباً لندن کے کسی اور محلے کو حاصل نہ ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ اب قدیم روایات کی پابندی اس شدت سے نہیں کی جاتی اور ادباء شعراء کا شیرازہ ایسا بکھر گیا ہے کہ یہ لوگ لندن کی گنجان آبادی کو چھوڑ کر یہاں سے تیس تیس، چالیس چالیس میل دور جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی چیلسی کی شان کسی حد تک قائم ہے۔ آج بھی لارڈ برٹرینڈ رسل جیسے شہرۂ آفاق مصنف، سر مائیکل ریڈگریو جیسے نامور ایکٹر، آگسٹس جان جیسے بلند پایہ مصور اور جان آئرلینڈ جیسے مشہور عالم مغنی چیلسی میں رہتے ہیں۔

چیلسی میں اگرچہ اب نئی وضع قطع کے مکان بھی بنتے جا رہے ہیں لیکن بیشتر گلی کوچوں میں مکانوں کی طرز تعمیر ویسی ہی پرانی ہے جو آج سے سو دو سو سال پہلے تھی۔ اس لیے تاریخی تسلسل ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے قائم ہے۔ قہوہ خانوں کے اندر جھانک کر دیکھیے تو ماحول کچھ الگ سا نظر آتا ہے۔ روشنی عمداً اس قدر مدھم کی گئی ہے کہ در و دیوار پر تاریکی کا سایہ پڑتا ہے۔ چھت کے شہتیر اور کڑیاں نمایاں کر کے دکھائی گئی ہیں۔ ساز و سامان سے بھی دورِ حاضر کا تعلق نہیں بلکہ ماضی کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔

آج سے چار سو سال پہلے چیلسی ـــــــ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو لندن شہر کے مضافات میں آباد تھا۔ جب سولھویں صدی کے وسط میں سر ٹامس مور نے یہاں اپنا مکان بنوایا تو چیلسی کو پہلی مرتبہ شہرت حاصل ہوئی۔ پھر مشہور مصنف بین جانسن یہاں آکر مقیم ہوا۔ اٹھارہویں

...ں کے اوائل میں گلیورز ٹریولز کا مصنف سوفٹ یہاں رہتا تھا۔

چیلسی کی حقیقی شہرت کا دور اس وقت شروع ہوا جب ٹامس کارلائل اپنا وطن چھوڑ کر لندن آیا۔ اور چیلسی کے محلے میں رہنے لگا۔ یہ واقعہ ۱۸۳۴ء کا ہے۔ کارلائل پورے سینتالیس سال ایک ہی مکان میں رہا اور یہیں ۱۸۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنی تمام کتابیں ایک ایک کرکے اسی مکان میں لکھیں تھیں۔ خوش قسمتی سے یہ مکان ایک عجائب گھر کی طرح محفوظ کر دیا گیا ہے جس میں کارلائل کا گھریلو سامان کم و بیش اسی ترتیب سے رکھا ہے جیسا اس کی زندگی میں تھا۔ دُور دُور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔

ہانس سلون ایک اور عظیم الشان شخص تھا جس نے چیلسی میں رہائش اختیار کی۔ سلون اسکوائر اور سلون سٹریٹ اسی کے نام سے منسوب ہیں۔ سلون پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا لیکن اس نے اپنی زندگی میں کتابوں کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک کے نوادر بھی اکٹھے کیے تھے۔ مرتے وقت یہ تمام چیزیں وہ قوم کو دے گیا۔ چنانچہ اسی ذخیرے سے برٹش میوزیم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

انیسویں صدی میں جو ادیب اور شاعر چیلسی میں آکر آباد ہوئے ان میں جارج ایلیٹ، لی ہنٹ، ڈی جی روزیٹی، رسکن، سون برن، اور آسکر وائلڈ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے میدان میں یکتائے زمانہ تھے۔ جن مارے اور ہنری جیمز جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے مصنفوں کے مکان بھی اسی محلے میں تھے۔ تھیٹر کی مشہور ایکٹریس ایلن ٹیری بھی یہیں رہتی تھی۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد ——— "جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔"

چیلسی کا ایک حصہ تو شہری آبادی سے ملحق ہے اور دُوسرا حصہ دریائے ٹیمز کے کنارے تک پھیل گیا ہے۔ یہ حصہ بے حد خوبصورت ہے۔ فراخ اور کشادہ سڑک کے ساتھ ساتھ عین لبِ دریا ایک پختہ بند باندھ کر سیرگاہ بنائی گئی ہے جو وُسعت میں کئی میل لمبی ہے۔ دریا کے اس طرف ایک بڑا وسیع پارک ہے جہاں گرمیوں کے موسم میں میلہ لگتا ہے۔ جو پورے چھ مہینے جاری رہتا ہے۔

گزشتہ ماہ جون میں جب ڈاکٹر عاشق حسین لاہور آئے تو مجھ سے ملے۔ نو دس برس کے بعد انہیں دیکھ کر جو مسرت مجھے حاصل ہوئی، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ان ملاقاتوں کے دوران اُنھوں نے اور کئی علمی اور فنی مباحث کے علاوہ اس مضمون کا بھی ذکر کیا جو انھوں نے لندن کے چیلسی کے بارے میں بی بی سی لندن سے نشر کیا تھا۔ اور پھر یہ قصہ سنایا کہ ا۔

"میرے ایک انگریز دوست نے جو اپنی ملازمت کے سلسلے میں چند سال لاہور میں بھی بسر کر

پہلے ہی باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا کہ لاہور کے کس محلے کو آپ لاہور کا چیلسی کہنا پسند کریں گے؟ ان کے اس عجیب و غریب اور دلچسپ سوال نے لاہور کا پورا نقشہ میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور میں نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا کہ بھاٹی دروازہ ایک لحاظ سے لاہور کا چیلسی کہلانے کا مستحق ہے۔

انہوں نے پوچھا کہ اس کی وجہ؟

میں نے عرض کیا کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھاٹی دروازہ لاہور کے اُدبا و شعرا کا سب سے بڑا مسکن تھا۔ علامہ اقبال وہاں رہتے تھے۔ سر عبدالقادر نے وہیں سے اپنا مشہور رسالہ "مخزن" جاری کیا تھا۔ آغا حشر کا قیام بھی وہیں تھا۔ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی جب لاہور تشریف لائے تھے تو انہوں نے بھاٹی دروازے ہی میں قیام فرمایا تھا۔ چوہدری سر شہاب الدین جو پنجاب اسمبلی کے سپیکر ہونے کے علاوہ پنجابی زبان کے بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے۔ فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید نور الدین جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ مشہور مرثیہ گو شاعر سید ناظر حسین ناظم لکھنوی کا مکان بھی بھاٹی دروازے ہی میں تھا۔ غرضیکہ لاہور کی تاریخ میں ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ بھاٹی دروازہ نہ صرف ادیبوں اور شاعروں کا سب سے بڑا مسکن تھا بلکہ اکثر علمی اور ادبی محفلیں بھی وہیں گرم ہوتی تھیں۔

میرے انگریز دوست یہ جواب سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن مجھے خیال ہوا کہ اس ملک کے باشندوں نے تو چیلسی اور چیلسی کی قدیم روایات پر بیسیوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور ہمارے وہاں کوتاہ قلمی کا یہ عالم ہے کہ کسی کو "لاہور کے چیلسی" یعنی بھاٹی دروازے پر ایک مضمون لکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

اس تذکرے کے بعد ڈاکٹر عاشق حسین نے مجھ سے کہا کہ کیا اچھا ہو کہ اگر آپ یہ کمی پوری کر دیں۔ آپ کا خاندان صدیوں سے بھاٹی دروازے کے اندر آباد ہے اور آپ اس کی پرانی روایات سے خوب واقف ہیں۔ اگر ان تمام ادیبوں، شاعروں اور دوسرے نامور لوگوں کے حالات کسی نہ کسی طرح محفوظ ہو جائیں، جو کبھی لاہور کے بھاٹی دروازے اور ٹکسالی دروازے کی حدود کے اندر رہتے تھے، تو یہ تحریر نہ صرف لاہور کے اس مشہور مقام کی تاریخی حیثیت کو منظر عام پر لے آئے گی بلکہ اس سے دنیائے علم و ادب کے ذہن میں ان لوگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی جو کبھی یہاں رہتے تھے اور جن کے دم قدم سے ان کے اپنے اپنے زمانے میں علم و فن کی شمع روشن رہی۔

اب کہ عمر رواں کا کارواں زندگی کے سفر کی ستر منزلیں طے کر چکا ہے اور ڈاکٹر عاشق حسین بھی اپنی تقریر میں انہیں نامور لوگوں میں سے دو چار ایسے بزرگوں کا ذکر کر چکے ہیں جو اس زمانے میں بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اور جن کی یاد میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کمی پوری کر دوں جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ اور ان تمام ادیبوں، شاعروں اور دوسرے نامور لوگوں کے حالات مختصر طور

پر لکھ دوں جو میرے سامنے بھاٹی دروازے اور ٹکسالی دروازے کی حدود کے اندر رہتے تھے اور جن کے کارنامے کی درخشانی سے صرف لاہور ہی کی نہیں بلکہ سارے پنجاب کی قومی مجلسی اور ثقافتی تاریخ کے اوراق منور ہیں۔ اور جن کی زندگی کے کارنامے ہماری پرانی تہذیب کے امتیازی آثار ہیں۔

لاہور ایک بہت ہی پرانا شہر ہے۔ تاریخ میں مذکور ہے کہ رام چندر جی کے دو بیٹے تھے۔ لو اور کسو۔ لو نے لاہور آباد کیا اور کسو نے قصور۔ انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں لاہور کئی بار آباد ہوا اور آباد ہو کر اجڑا۔ کبھی تو یہ شہر اس جگہ واقع تھا جہاں آج کل اچھرہ آباد ہے اور کبھی اس مقام پر جو اب نواں کوٹ سے موسوم ہے۔ بہرحال مغلوں کے زمانے میں لاہور اسی جگہ آباد تھا جہاں آج کل آباد ہے جب شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر نے اپنے بھائیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے لاہور کو اپنا عسکری مرکز بنایا تو اس وقت لاہور کا قلعہ تعمیر ہوا. یہ جگہ لاہور کے شمال مغرب میں ایک وسیع و عریض اور اونچے ٹیلے پر واقع تھی۔ پنجابی زبان میں کسی مقام کی سطح مرتفع کو ٹبی کہتے ہیں اسی لیے لاہور کا وہ علاقہ جو بستی دروازے سے لے کر بھاٹی اور ٹکسالی دروازوں کی حدود کے اندر واقع ہے "ٹبی" کہلاتا ہے۔ شاہجہاں کے وقت میں لاہور تین حصوں میں منقسم تھا۔ ٹبی، میانی اور چوک دارا شکوہ۔ ٹبی کی حدود کے اندر ایک تو قلعہ تھا اور اس کے مضافات میں شاہی ٹکسال، بارود خانہ، اور امرائے حکومت کی حویلیاں۔ میانی کا علاقہ چوک دارا شکوہ اور ٹبی کے درمیان واقع تھا۔ آج کل یہ محض ایک قبرستان ہے بلکہ میانی کا نام سنتے ہی آنکھوں کے سامنے قبرستان کا تصور آ جاتا ہے۔ اس وقت شہر لاہور کا بیشتر حصہ اسی مقام پر واقع تھا شہر کا یہ حصہ نواں کوٹ سے شروع ہو کر ایک طرف بھاٹی دروازے تک اور دوسری طرف مزنگ جس کا اصلی نام "مرزنگ" ہے اور اچھرے تک پھیلا ہوا تھا۔ چوک دارا شکوہ شہر کے اس حصے کا نام تھا جو دہلی دروازے سے شروع ہو کر ایک طرف شاہو کی گڑھی اور حضرت میاں میر علیہ الرحمۃ کے مزار مقدس تک اور دوسری طرف بدھو کے آوے سے لے کر باغبان پورے تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اس مقام کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے جو اس وقت ٹبی کہلاتا تھا اور جس کی حدود میں وہ علاقہ شامل ہے جو بھاٹی دروازے سے لے کر ایک طرف ٹکسالی دروازے تک اور دوسری طرف ہیرا منڈی میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی سے گزر کر بستی دروازے تک پھیلا ہوا ہے کہ یہی علاقہ اس مضمون کا موضوع ہے۔ ہاں یہ کہہ دینا بھی لازم ہے کہ بھاٹی دروازہ کا نام اصل میں بھٹی دروازہ تھا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں مغلوں کی سلطنت سے پہلے بھٹی قوم کے جنگجو دلیروں نے فتح ملتان کے بعد لاہور آ کر پڑاؤ ڈالا تھا۔ امتدادِ زمانہ سے بگڑتے بگڑتے بھٹی دروازہ بھاٹی دروازہ ہو گیا۔ بھاٹی دروازے کی تاریخی حیثیت سے قطع نظر چونکہ مجھے اس علاقے کی محض ان سرگرمیوں کا ذکر کرنا ہے جن کی بنا پر ڈاکٹر عاشق حسین نے اسے "لاہور کے چیلسی" سے موسوم کیا ہے اس لیے میں اب اس مضمون کے اصلی موضوع کی طرف آتا ہوں۔

جب بھاٹی دروازے کے اندر داخل ہوں تو کچھ دور چل کر بائیں طرف ایک کوچہ ہے جسے کوچہ چابک سواراں کہتے ہیں۔ آج سے کوئی ساٹھ ستر برس پہلے اسی کوچے کے ایک مکان میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جیسے نامور ماہر السنۂ مشرقیہ کے استاد مولوی اصغر علی روحی رہتے تھے۔ یہ گویا کرامت تھے اور سرچشمۂ ہدایت و رشد۔ ان کے درسِ کلام مجید کا شہرہ دور دور تھا۔ بعد میں انھوں نے کشمیری بازار میں جمعہ قرآن مجید کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ بڑے پاک باطن اور فرشتہ صفت انسان تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کی صورت دیکھ

سیرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جو بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اور اس زمانے میں جب تک متعلق امل سکول لاہور سے رہا اسی کوچے کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے مولانا کی شاگردی کے فیض صحبت ہی سے عربی اور فارسی کے علوم میں وہ دستگاہ حاصل کی جو آگے چل کر ان کی ناموری کا باعث ہوئی اور جس کی بدولت انھوں نے ان دونوں زبانوں کی مشہور کتابوں اور دستاویزوں کے متعلق بڑی کاوش اور کوشش سے ریسرچ کی۔ ان کی تصانیف سے "العقد الفرید لابن عبد ربہ" جو ان کی پندرہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے اور چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے پنجاب یونیورسٹی نے اردو میں شائع کی۔ مولوی محمد شفیع کے اہم علمی کارناموں اور تحقیقی دستاویزات کی فہرست اتنی طویل ہے اور ان کے مندرجات اس قدر تفصیل کہ اس مضمون میں ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔ یہاں تو ان کے ذکر سے بس یہی مدعا ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی بھاٹی دروازے اور اس علمی اور ادبی ماحول میں گذری جو اس مضمون کا موضوع ہے۔

اورینٹل کالج لاہور کے پرانے استادوں میں چار پانچ ایسے بزرگ ہیں جن کا نام اس وقت بھی لوگ عزت و احترام سے لیتے تھے اور جن سے آج بھی اس احترام کے نقوش ابھرتے ہیں جو اس زمانہ کے استادوں کے علمی تصرفات کا خراج مقصود ہوتا تھا۔ اسے حسن اتفاق کہیے یا دروازے کی خوبی قسمت کہ یہ سب لوگ بھاٹی دروازے ہی کے اندر رہتے تھے۔ اور شاید اس لیے کہ یہ علاقہ اورینٹل کالج بہت ہی قریب تھا۔

اورینٹل کالج اپنے ابتدائی زمانہ میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں واقع تھا۔ اگر میں ان صاحبان علم و فضل کے کمالات گنوانے بیٹھوں تو ان میں سے ایک ایک بزرگ کے فضائل کی تفصیل کے لیے دفتر کے دفتر چاہئیں۔

یہاں اگر اورینٹل کالج کی مختصر سی تاریخ بیان ہو جائے تو مناسب ہے۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں لاہور میں علوم مشرقیہ کی ترویج کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر ایک انجمن قائم کی گئی تھی۔ جس کا نام "انجمن پنجاب" تھا۔ اس کی داغ بیل ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں ڈالی گئی۔ ڈاکٹر لائٹنر اس انجمن کے روح رواں تھے۔ اسی انجمن کی سرپرستی اور ڈاکٹر لائٹنر کی رہنمائی میں اسی سال مجلس علوم شرقیہ کی بنیاد رکھی گئی اور اس جگہ جہاں لاہور سنکشا سبھا نے ۱۸۶۳ء میں ہیرا منڈی کے قریب ایک پاٹھ شالہ قائم کیا تھا اور جس میں محض ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ قائم ہوا۔ اور انجمن پنجاب نے اس پاٹھ شالہ کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور اس کے نصاب میں اردو عربی اور فارسی کی تعلیم کا اضافہ کر دیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آج کل ہیرا منڈی میں حضرت پیر بزرگ علیہ الرحمۃ کے مزار کے سامنے لاہور کارپوریشن کا ہسپتال واقع ہے۔ اس کے مقابل راجہ دھیان سنگھ کی حویلی ہے جہاں گورنمنٹ کالج پہلے پہل قائم ہوا۔

مارچ ۱۸۷۲ء تک علوم السنہ مشرقیہ کا یہ ادارہ اورینٹل سکول کہلاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا نام اورینٹل کالج رکھ دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اورینٹل کالج کے لیے کھڑک سنگھ کی حویلی حاصل کر لی گئی۔ یہ حویلی لوہاری دروازے کے اندر نہال چند کے مندر کے سامنے واقع تھی۔ ۱۸۷۳ء میں اورینٹل کالج انارکلی میں کرائے کی ایک عمارت میں منتقل ہو گیا۔ ۱۸۷۶ء میں جب گورنمنٹ کالج کی عمارت مکمل ہو گئی تو اس کے لیے اس عمارت کا شمال مشرقی گوشہ مقرر ہوا۔ اور ڈاکٹر لائٹنر اس کے پہلے پرنسپل نامزد کیے گئے۔ اس وقت مولوی

فیض احمد صاحب چودھری صدر مدرس ہوا کرتے تھے اور مولوی عبد الحکیم کلانوری صدر مدرس فارسی۔ یہ دونوں بزرگ بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے جن صاحب کا میں ذکر کر رہا ہوں ان سے پہلے مفتی محمد عبد اللہ ٹونکی صدر مدرس عربی تھے۔ مفتی محمد عبد اللہ ٹونکی بازار حکیماں میں ماسٹری حاجی محمد کے مکان میں رہتے تھے۔

لوہاری منڈی سے کچھ آگے بڑھیں تو ایک گلی آتی ہے جو نائیوں کی گلی کہلاتی ہے۔ اس کے کونے پر ایک مکان تھا جس میں شیخ گلاب دین وکیل رہتے تھے۔ اس زمانے میں ان کا وکیل ہونا اس کی قانون دانی کی سند تصور ہوتی تھی۔ شیخ گلاب دین سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ وہ زبان میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے قانون شہادت اور قانون رواج کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کوچے سے ذرا آگے چل کر دائیں طرف کو ایک کوچہ ہے جسے ملا جلویاں کہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل وہ مکان ہے جہاں سر محمد اقبال رہتے تھے۔ وہ کئی برس تک یہیں رہے۔ اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک محلہ آتا ہے جسے "چوہٹہ" کہتے ہیں۔ اس میں اونچی مسجد کے خطیب مولوی علم الدین رہتے تھے جو اپنے علم و فضل کے باعث بہت مشہور تھے۔ اسی محلے میں آج کل مولانا غلام مرشد خطیب مسجد شاہی رہتے ہیں۔ معارف دین سے جن کی آگاہی کی تعریف میں نے اقبال کی زبان سے بھی سنی ہے اور جن کا درس قرآن مجید اب بھی مرجع ماہران راہ حق ہے۔ اس سے کچھ دور آگے بازار کے بائیں طرف تو محلہ واقع ہے اور دائیں طرف محلہ شیش محل۔ محلہ میں سید محمد شاہ وکیل رہتے تھے جو اس زمانے میں دیوانی قانون کے ماہر تصور ہوتے تھے۔ انھوں نے پہلے تو ملتان میں وکالت شروع کی اور بعد میں لاہور چلے آئے اور اپنی محنت کی کمائی سے ایک عالیشان مکان اسی محلے میں تعمیر کیا۔ محلہ شیش محل میں ڈاکٹر محمد حسین رہتے تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور آ گئے تھے۔ وہ اور ڈاکٹر رحیم خاں جن کی حویلی اب انارکلی کے قریب دھنی رام روڈ پر ٹریڈرز بینک سے ملحق واقع ہے۔ اس زمانے کے بہت بڑے طبیب سمجھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسین اپنی طبی مہارت کے باعث وائسرائے کے آنریری فزیشن تھے اور ڈاکٹر رحیم خاں اپنی جراحی کے کمال کی بدولت وائسرائے کے آنریری سرجن۔ انہی ڈاکٹر محمد حسین کے بڑے صاحبزادے منشی احمد حسین خاں تھے جو اپنے زمانے کے بہت مشہور ناولسٹ اور شاعر تھے اور دو سو سے زائد کتابوں کے مصنف۔

شیش محل سے آگے چل کر رائے بہادر میلا رام کی حویلی تھی جس کا دست برد زمانہ سے اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ رائے بہادر میلا رام کی حویلی بھاٹی دروازے کی عمارتوں میں نہ صرف اپنی وسعت اور شان کے اعتبار سے اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی بلکہ خود رائے بہادر میلا رام اور ان کے بعد ان کے بیٹے رائے بہادر رام سرن داس کی شخصیت ایسی تھی کہ اس علاقے کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ یہ سناتن دھرم کے پیرو تھے اور پرانی وضع کے رئیس۔ خود ادیب نہ تھے مگر ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست تھے۔ ۱۸۸۰ء میں جب امرتسر سے لاہور تک ریل چلی اور لاہور کا اسٹیشن تعمیر ہوا تو انارکلی والے میاں سلطان ٹھیکیدار بھاٹی دروازے والے میاں محمد بخش دلال گر اور رائے بہادر میلا رام کی مشترکہ ٹھیکیداری میں یہ کام انجام پایا۔ رائے بہادر میلا رام اور رائے بہادر رام سرن داس جب تک زندہ رہے۔ ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے تہوار بڑی شان سے مناتے رہے۔ ہر تہوار پر اپنی لال کوٹھی میں جو بھاٹی دروازے کے باہر واقع ہے محفل رقص و سرود سجاتے اور اپنے تمام احباب کو بلا تفریق مذہب و ملت بلا کر اس کی رونق بڑھاتے۔ سر محمد اقبال، سر عبد القادر، سر شہاب الدین، میاں سراج الدین، راجہ نریندر ناتھ، راجہ سر دیا کشن کول، نواب لیاقت حیات خاں، نواب احمد یار خاں دولتانہ

سر سکندر حیات خان، میاں محمد نصیر الدین خان، خان بہادر سید مراتب علی، سردار سندر سنگھ مجیٹھیہ اور سردار جوگندر سنگھ کریں نے اکثر ان محفلوں میں اس بات کا شکوہ کر بیٹھے دیکھا ہے۔ اب یہ داستان ایک قصۂ پارینہ معلوم ہوتی ہے۔

اس کے سامنے ایک کوچہ ہے جسے موتی ٹبہ کہتے ہیں۔ اسی کوچے میں سر عبد القادر رہتے تھے جن کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ گلی کے سامنے ہی خلیفہ نظام الدین رہتے تھے جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے صدر دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے اور اپنی حساب دانی کے باعث بہت مشہور تھے۔ اسی محلے میں مولانا عبد الحکیم کلانوری بھی رہتے تھے۔ اس محلے سے ذرا آگے چلیے تو بائیں طرف کو ایک گلی آتی ہے جسے "پیر بھولے کی گلی" کہتے ہیں۔ اس کے کونے پر ایک مکان ہے جس میں ڈاکٹر امیر دین رہتے تھے۔ یہ ان طبیبوں میں سے تھے جنھوں نے انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہومیوپیتھک طریقۂ علاج میں بڑی مہارت حاصل کی۔ وہ کم سن بچوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج کرنے میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور اپنی ہمدردی اور منکسر مزاجی کے باعث شہر کے غریب طبقے میں بہت مقبول تھے۔ کچھ دور آگے جا کر یہ بازار جوگی محلے کو جا نکلتا ہے۔ مسٹر میراں بخش بیرسٹر ایٹ لا جو جرنیل میراں بخش کے نام سے معروف تھے، انگلستان جانے سے پہلے اسی محلے میں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں ایک مشہور انگریز بیرسٹر مسٹر ٹیگین اور اس کے بعد ایک اور انگریز بیرسٹر مسٹر رینلڈ کے ساتھ کام کیا۔ یہ رینلڈز اس مشہور و معروف افسانہ نگار جارج ڈبلیو۔ ایم رینلڈز کے بیٹے تھے جنھوں نے "مسٹریز آف دی کورٹ آف لنڈن" لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اسی محلے میں اس زمانے میں منشی طاہر الدین بھی رہتے تھے۔ یہ اپنے ابتدائی زمانے میں میاں سر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا کے منشی تھے اور قانونی رموز سے خوب واقف۔ جب میاں سر محمد شفیع وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہو کر دہلی چلے گئے تو انھیں منشی طاہر الدین کے مشورے سے ڈاکٹر سر محمد اقبال انارکلی میں اسی مکان میں چلے آئے جس میں سر محمد شفیع پریکٹس کیا کرتے تھے۔ سر محمد شفیع اپنے باقی ماندہ مقدمات کی پیروی کا کام سر محمد اقبال کو سونپ گئے تھے اس لیے منشی طاہر الدین اس کام میں ان کے بہت ممد و معاون ثابت ہوئے۔ بعد میں انھوں نے ایک دوا "دل روز" کے نام سے ایجاد کی۔ اور اس کے موجد ہونے کی حیثیت سے زیادہ تر مشہور ہوئے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اقبال کے دل میں اپنی بے لوث خدمت سے ایسا اعتبار پیدا کر لیا کہ انھوں نے اپنی وصیت میں اپنے معاون دوستوں کے ساتھ ان کو بھی اپنی اولاد اور جائیداد کا ولی مقرر کیا۔ اس محلے میں ایک اور مکان ہے جس میں محمد طفیل ایک نوعمر صاحبزادے رہتے تھے۔ ان کو خوش نویسی کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ آگے چل کر انھوں نے اسی محلے سے "نقوش" کے نام سے اردو کا ایک مشہور اور کئی لحاظ سے لاثانی مجلہ شائع کرنا شروع کیا جو آج کل ایبک روڈ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ضخامت، مضامین کے تنوع اور کتابت کے تکلف کے اعتبار سے اپنے تمام پیش رو رسالوں سے مختلف اور ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعض شمارے تو ایسے ہیں کہ زمانۂ مستقبل میں ایک تاریخی مقام حاصل کر لیں گے۔ اور ان مصنفین کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے جنھیں موجودہ اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں مواد کی تلاش ہو۔

آگے چل کر شیخ سندو صاحب الرحمۃ کے مزار مبارک کے پہلو میں محلہ کا خذیاں واقع ہے جہاں میر ناظر حسین ناظم شروع شروع میں رہتے تھے۔ وہ بعد میں کوچہ فقیر خانہ میں جو اسی بازار میں واقع ہے رہنے لگے۔ اسی کوچے میں میاں پیر بخش پہلوان رہتے تھے جو پہلوان بھی تھے اور سارے علاقے میں صاحب اثر بھی۔ ہر شخص ان کی طاقت کا لوہا مانتا تھا اور کسی آوارہ منش شخص کی یہ مجال نہ تھی کہ اس بازار سے

ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے اس تمام علاقے میں نہ تو کوئی چوری کی واردات ہوئی اور نہ کوئی ایسا ہنگامہ و فساد جس سے یہاں کے لوگوں کا امن و سکون متاثر ہوتا ہو۔

محلہ کا خدیاں کے بالمقابل لال حویلی کا کوچہ ہے جس میں سکھوں کی حکومت کے زمانے میں فقیر سید نورالدین اور فقیر سید شمس الدین رہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ حویلی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک حصے میں فقیر سید قمرالدین اور دوسرے حصے میں فقیر سید شہاب الدین رہنے لگے۔ آگے چل کر کوچہ دربار صاحب آتا ہے۔ اس میں ایک سجادہ اس سے ملحق ایک مکان واقع ہے جس میں وہ تبرکات عالیہ رکھے گئے ہیں جو فقیر سید عزیزالدین نے شاہ شجاع الملک سے حاصل کیے تھے۔ یہاں دن رات قرآن مجید کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔ اسی مکان کے قریب حافظ محمد حنیف رہتے تھے جو اپنے زمانے میں قرأت کے ماہر تھے اور جن کے درسِ قرآن کا فیض عام تھا۔

اسی کوچے کے قریب پہلوانوں کا کوچہ واقع ہے جہاں پنجاب کے ایک مشہور پہلوان محمد حسن جو "حسا پہلوان" کے عرفِ عام سے مشہور تھے، رہتے تھے۔ انہی کے بیٹے دوست محمد حیات ہیں جو بعد میں سیاست ہند میں مولانا محمد علی کے دستِ راست تھے اور اس کے بعد ریاست بھوپال میں ایگزیکٹو کونسل کے سیکرٹری ہوئے۔ ان کی جوانی انہیں گلیوں میں گزری ہے۔ کوچہ دربار صاحب بازار حکیماں میں واقع ہے۔ اس بازار میں چار مکان بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو میرے والد کے بڑے بھائی حکیم حسام الدین کا مکان جن کے بیٹے حکیم امین الدین تھے جو ان مسلمان طلبا میں سے تھے جو پہلے پہل انگلستان گئے اور جنہوں نے قانونی سند لے کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہی وہ مکان ہے جس میں ۱۸۹۵ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین کی سرپرستی میں ایک اردو بزمِ مشاعرہ قائم ہوئی۔ اور جس کے دوسرے مشاعرے میں اقبال نے جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اپنی اردو غزل پڑھی۔ حکیم حسام الدین لاہور اور امرتسر دونوں جگہ طبابت کے فرائض انجام دیتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں لاہور کا بازار حکیماں اور امرتسر کا کٹڑہ حکیماں انہیں کے دم قدم سے آباد تھا۔ یہ مہاراجہ کشمیر کے طبیب خاص ہونے کے علاوہ ریاست ہائے پھلکیاں کے برادر ریاست کے طبی مشیر بھی تھے اور ان کی تشخیص مرض اور حذاقت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی خدا پرستی اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ لوگ دوا سے زیادہ ان کی دعا کے طالب نظر آتے تھے۔ اس کے بالمقابل میرے دوسرے عم زاد بھائی حکیم شہباز دین کا مکان تھا۔ یہ مکان لاہور کی ادبی زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کی بیٹھک میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۲۲ء تک جب تک حکیم شہباز دین زندہ رہے۔ ہر روز شام کو لاہور کے ادیبوں شاعروں، عالموں اور سیاستدانوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق یہ ایک قسم کا لٹریری کلب تھا۔ اس میں جو لوگ باقاعدہ ہر شام کو جمع ہوتے تھے ان میں مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، منشی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا محمد حسین جالندھری، مولوی اصغر علی روحی، سید محمد شاہ وکیل، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، سر محمد اقبال، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین اور ماسٹر مولا بخش کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اس محفل احباب میں کبھی کبھی سر محمد شاہ دین، سر محمد شفیع، فقیر سید افتخارالدین اور مرزا سلطان احمد بھی آ بیٹھتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے بانیوں اور ارباب نظم و نسق میں سے حاجی شمس الدین، خواجہ احمد بابا، مولوی حاکم علی اور خلیفہ حمید الدین بھی اس بزم احباب میں آ کر مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ اس مکان کے ساتھ ہی ہمارا مکان ہے جس میں میرے والد

حکیم شجاع الدین رہتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور طبیب، فلسفی اور شاعر تھے۔ یہاں زیادہ تر ان کے وہ شاگرد دن بھر موجود رہتے تھے جن کو طب، اشعار اور فلسفہ میں اُن کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید افتخار الدین کا مکان تھا۔ وہ چونکہ اپنے زمانے میں فقیر خانے کے ایک ممتاز رکن اور سرکاری ملازمت کے اعتبار سے ایک جلیل القدر عہدیدار تھے۔ ان کے ہاں زیادہ تر سرکاری اہلکاروں کا مجمع رہتا تھا۔ اس مجمع کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ان کے ہندو، سکھ اور مسلمان دوست جو یا تو سرکاری ملازمت سے منسلک تھے یا ان کے خاندان سے دیرینہ تعلقات کے باعث وابستہ تھے مل بیٹھتے تھے۔ ان میں لالہ ہرکشن لال، سردار دیال سنگھ مجیٹھہ مجیٹھیہ، چوہدری سلطان احمد (فیض احمد فیض کے والد)، مرزا سلطان احمد، میاں نصیر الدین (نواب امام الدین صوبیدار کشمیر کے بھتیجے)، سید اقبال علی شاہ اور سید مراتب علی شاہ (نواب امام الدین خان صوبیدار کشمیر کے نواسے) قابلِ ذکر ہیں۔ جب فقیر سید افتخار الدین لاہور میں آتے تو اپنے مکان پر ایک پُرلطف مجلس شعر و سخن جمائے رکھتے۔ ان لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے پنجاب کے بڑے بڑے جاگیردار اور اُمرا جب کبھی لاہور آتے تو وہ اس محفل میں ضرور شریک ہوتے۔ اس سلسلے کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ چوہدری سلطان احمد اسی بازار میں اپنے بڑے بھائی چوہدری نبی بخش کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ بیرسٹر ہونے کے علاوہ علمِ ریاضی میں بھی بڑی دسترس رکھتے تھے۔ اور ریاضی ہی میں کیمبرج میں ٹرائی پاس حاصل کر کے آئے تھے۔ اسی بنا پر انہیں حکومتِ افغانستان نے اپنا وزیر مالیات مقرر کیا اور ان کی اس شہرت سے متاثر ہو کر مرزا ارشد گورگانی نے اس تقرر پر ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کا یہ ایک شعر ان کی اس مہارت پر شاہد ہے جو انہیں علمِ ریاضی میں تھی ۔۔۔

برُد ز هندسه بُرد فضیلت گر تو ریاضی می بینی

زاں رو ہست کہ خواہش کردہ والیٔ افغانستان

مرزا سلطان احمد ایک معزز سرکاری عہدہ پر فائز ہونے کے علاوہ بڑے پائے کے ادیب، شاعر اور سخن فہم تھے۔ جب ایبٹسن نے جو بعد میں صوبہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے اپنی "سنسس رپورٹ" لکھی تو اس میں اُنھوں نے مسلمانوں کے خلاف بہت زہر اُگلا۔ مرزا سلطان احمد نے جو اگرچہ اس زمانے میں اُنہیں کے ماتحت ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ اس رپورٹ کے خلاف ایک مدلل، بے ریا اور درشت رسالہ شائع کیا جس نے نہ صرف ایبٹسن کے دانت ہی کھٹے کر دیے بلکہ مرزا سلطان احمد کی غیرت و حمیت کا سکہ مسلمانوں کے دلوں پر بٹھا دیا۔ یہ بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ فقیر سید افتخار الدین کبھی کبھی اقبال کو بھی بڑے چاؤ سے کھینچ لاتے اور ان کی صحبت سے محفل کی رونق بڑھاتے۔ فقیر سید افتخار الدین کے بڑے داماد فقیر سید نجم الدین جو میرے بھائی بھی ہوتے ہیں اور بھتیجے بھی اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ انہیں مراسم یگانگت کی یادگار میں فقیر سید نجم الدین کے بیٹے فقیر سید وحید الدین نے "روزگارِ فقیر" کے نام سے دو جلدوں میں ایک نہایت ہی مفید، دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب لکھی ہے جسے دلدادگانِ اقبال حرزِ جاں سمجھتے ہیں۔ فقیر سید افتخار الدین کے چھوٹے بھائی فقیر سید اقتدار الدین جو انہیں کے ساتھ رہتے تھے اس زمانے کے مذاق کے مطابق شاعری کو اپنی شرافتِ نسبی اور وراثتِ علمی کا جُزو سمجھتے تھے۔ اور اس مشاعرے کے ہر اجلاس میں جو حکیم امین الدین کے مکان پر ہوتا تھا ہمیشہ اپنی نئی غزل پڑھتے تھے۔ فقیر قمر الدین جو فقیر خانے کے بزرگ تھے اور جن کا مکان لال حویلی کہلاتا ہے اگرچہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے

تھے۔ سکھوں کے دربار میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وہ بھی بہت اچھا شعر کہتے تھے اور [illegible] تخلص کرتے تھے۔

اس سے آگے چل کر استاد شریف کا کوچہ آتا ہے جس میں فقیر سید جلال الدین کی تعمیر کی ہوئی لال مسجد واقع ہے۔ اور اسی کی بغل کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جس میں فقیر خاندان کے جد امجد فقیر سید غلام محی الدین کا مزار ہے جو "نوشہ ثانی" کے لقب سے ملقب تھے۔ اسی احاطے میں فقیر سید عزیز الدین، فقیر سید امام الدین، فقیر سید نور الدین اور فقیر سید شمس الدین کے مزار بھی ہیں۔ اسی کوچے میں امیر سید مراتب علی شاہ کی اہلیہ محترمہ سیدہ مبارک بیگم کا امام بارہ ہے۔ اور ان کے والد فقیر سید افتخار الدین کی چھوٹی حویلی بھی۔ اسی حویلی سے ملحق فقیر سید امام الدین کی حویلی ہے جو سکھوں کے زمانے میں قلعہ گوبند گڑھ کے صوبیدار اور شاہی خزانے کے محافظ تھے۔ اس کے سامنے فقیر سید حفیظ الدین کی حویلی میں مرزا اسلم بیگ ایک پرانی وضع کے رئیس رہتے تھے۔ ان کے بیٹے مرزا اسلم بیگ کو شعر و شاعری کا شوق وافر تھا اور وہ میر ناظر حسین ناظم کے تلامذہ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اس قدر زیادہ دولت ان کے ہاتھ آئی کہ وہ لکھ لٹ مشہور ہو گئے۔ اس لوٹ میں ان کے ذوق سخن کو بھی مال غنیمت ملا۔ انھوں نے اپنی حویلی میں ایک محفل مشاعرہ قائم کی جس کے میر مشاعرہ ان کے استاد میر ناظر حسین ناظم تھے۔ اس بزم میں زیادہ تر موصوف کے شاگرد ہی اپنا کلام پڑھتے اور اپنے استاد سے داد سخن پاتے۔ اس بزم مشاعرہ کے سیکرٹری فقیر سید امام الدین کے پوتے فقیر سید سعید الدین تھے جو میر ناظر حسین ناظم ہی کے شاگرد تھے۔ اور بہت صاف شعر کہتے تھے۔ اور اسی کوچے میں اپنے دادا کی حویلی میں رہتے تھے۔

شاید اس زمانے میں یہ بیان کر دینا موجب تعجب ہو کہ مرزا اسلم بیگ نے اپنے استاد میر ناظر حسین ناظم کے دولت کدے کو فی الحقیقت ہی دولت کدہ بنا دیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ کی وفات کے ساتھ ہی اس محفل کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال اور ان بزرگوں کی محفل جن کے نام اوپر گنوائے گئے ہیں بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین ہی کی بیٹھک میں جمتی تھی۔ اور اس محفل کا مذاق مرزا اسلم بیگ کی بزم مشاعرہ سے کچھ الگ تھا۔ وہاں زیادہ تر ادبی و قومی مسائل کا چرچا تھا۔ اور اس محفل میں وہی کا گل و زلف کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اس کوچے کے بالمقابل بہت بڑا اور جد حکیم عبداللہ انصاری کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے جس کی تعمیر کی تاریخ اس مصرعے سے نکلتی ہے۔

کرد با صدق ایں عبادت گاہ عبد اللہ حکیم

انھیں نے بازار حکیماں کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا یہ گھر بنایا تھا۔ اس کے سامنے ہی حکیم خدا بخش کی حویلی تھی جس کا اب نام و نشان بھی موجود نہیں مگر اس کے کھنڈر میں ان کا مزار باقی ہے۔ یہ اپنے زمانے میں بہت بڑے طبیب تھے اور اپنے توکل اور فیاضی کے باعث مرجع خلائق۔

چند قدم آگے چلیں تو بازار کے بائیں طرف کوچہ فقیر خانہ آتا ہے جس میں فقیر سید ظفر الدین رہتے تھے۔ اور ان کے سامنے ہی وہ مکان ہے جس میں میر ناظر حسین ناظم عمر بھر اقامت گزیں رہے۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید حسن الدین کا مکان اور امام بارہ ہے اس میں ان کے بڑے والد سید علی شاہ رہتے تھے جن کی مصوری کی شہرت اس امر کے باوجود کہ انھوں نے اسے ایک پیشے کی حیثیت سے کبھی اختیار نہ کیا محتاج بیان نہیں۔ بڑے بڑے مصور ان کی خدمت میں آتے اور ان سے رنگ آمیزی کا فن سیکھتے۔ مناظر قدرت کی جو صحیح عکاسی ان

یہ مرتبہ کلام فہمی کا کسی دُوسرے معتبر کی یا کسی دستی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی سخن فہمی کا یہ عالم تھا کہ جو اشعار بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور جن کی تعداد بے شمار ہے وہ ہر بڑے بڑے شعراء کے نتائج فکر کا آئینہ تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر یہی محسوس ہونے لگتا کہ فطرت کے عجائبات کا ایک لازوال خزانہ ہے جس کے پٹ کھل گئے ہیں اور وفادارِ شعر و سخن کا ایک چمنستان ہے جس پر بہار آ گئی ہے۔ انھوں نے بڑی طویل عمر پائی اور قریب قریب ایک سو بیس سال کی عمر میں ابھی پچھلے ہی برس رحلت فرمائی۔

بازار میں آگے چل کر دائیں طرف فقیر سید عزیز الدین کی حویلی ہے جو ان کے بعد ان کے بیٹے فقیر سید جمال الدین کو ورثے میں ملی۔ اور آج کل اس میں ان کا امام باڑہ واقع ہے۔ کچھ دُور آگے چل کر کوچہ تحصیل آتا ہے جہاں اس زمانے میں لاہور کے تحصیلدار کی کچہری ہوا کرتی تھی۔ اس کچہری کے مقابل ایک مکان ہے جس میں دار الاشاعت پنجاب اور رسالہ "تہذیب نسواں" کے مالک سید ممتاز علی رہتے تھے۔ اور اسی کوچے میں ایک عرصے تک مولانا محمد حسین آزاد بھی رہے۔ اس کوچے کے مقابل ایک بازار ہے جسے اس زمانے میں پھمبوں کا بازار کہتے تھے اور جو آج کل جج بازار کہلاتا ہے۔ اسی بازار میں ایک طرف سر شہاب الدین کا مکان اور چھاپہ خانہ تھا اور دُوسری طرف تاریخ لاہور کے مشہور مصنف سید محمد عبداللطیف کی حویلی۔ وہ اس زمانے میں سیشن جج تھے۔ اور اسی نسبت سے یہ بازار اب جج بازار کہلانے لگا ہے۔ اس بازار میں ایک اور بزرگ بھی رہتے تھے جن کا نام مولوی عبدالغنی تھا۔ وہ لکھنؤ میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ انہی کے بھانجے میاں شمس الدین کے مکان میں آغا حشر کا ایک مُدت تک قیام رہا۔ اور یہیں ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔

اس مکان سے ذرا آگے چل کر پروفیسر عبدالغنی کا مکان تھا جو اپنے زمانے میں شیکسپیر کے اسلوب نگارش کے فہم میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتے تھے۔ بعد میں اپنے علم و فضل کی بدولت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

کچھ دُور آگے چلیں تو وہ بازار آتا ہے جو آج کل ٹبی بازار کہلاتا ہے۔ زمانے کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں اور اس کے بعد سکھوں کے عہد میں بھی اس بازار میں عمائدِ حکومت کی حویلیاں تھیں۔ مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہُوں اس زمانے میں اس بازار میں زیادہ تر طوائفوں ہی کے ڈیرے تھے۔ ہاں اس بازار میں ایک عالیشان مسجد بھی ہے اور انجمن نعمانیہ کا مدرسہ بھی جس میں علوم اسلامیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مسجد کو دیکھ کر ایک دن میر ناظر حسین ناظم نے غالب کا یہ مصرعہ برجستہ دُہرا دیا۔ اور سُننے والوں نے لُطف اُٹھایا ——

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے

جہاں یہ بازار ختم ہوتا ہے اس کی بائیں طرف شیخو پوریوں کا بازار ہے۔ اس کے کونے پر ایک مکان ہے جس میں اس زمانے میں مولوی محرم علی چشتی رہتے تھے۔ یہ پنجاب کے ایک پُرانے اخبار "رفیقِ ہند" کے ایڈیٹر تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان کا اثر اور رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جسے وہ چاہتے لاہور میونسپل کمیٹی کا ممبر منتخب کرا دیتے۔ اسی لیے لوگ انھیں "کنگ میکر" کہتے تھے۔ بعد میں یہ اس مکان سے اُٹھ کر ہیرا منڈی کے عقب میں ایک وسیع حویلی میں رہنے لگے۔ بڑے علم دوست تھے اور خود بھی اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر۔ حضرت مستان شاہ کابلی کے مرید تھے۔ ان کے ہاں اکثر حال و قال کی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان کا دستر خوان اس قدر وسیع تھا کہ مشائخ کرام اپنے مریدوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے سے آتے اور انھیں کے ہاں قیام فرماتے۔ اپنے ابتدائی

زمانے میں انگریزی تعلیم کے بہت خلاف تھے۔ اور اسی لیے سر سید احمد خاں کی اس باب میں ہر تحریک کی مخالفت کرتے رہے۔ مدرسہ نعمانیہ جس کا ذکر اوپر آیا ہے انھیں کی جد و جہد سے ایک زمانے تک منبع علم و فضل بنا رہا۔

اس مکان کے قریب ہی ایک پرانی حویلی تھی جس میں مرزا عبدالرحیم رہتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مرزا محمد سعید ایم۔ اے انگریزی زبان میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ میں نے گورنمنٹ کالج کے ایک انگریز پروفیسر مسٹر لینگ ہارن کو یہ کہتے سنا کہ انھوں نے مرزا محمد سعید کا سا صحیح انگریزی بولنے اور لکھنے والا کوئی ہندوستانی طالب علم یا اُستاد نہیں دیکھا۔ مجھے مرزا محمد سعید کی شاگردی کا فخر اس زمانے میں حاصل ہوا جب وہ ماڈل سکول میں مدرس تھے۔ بعد میں وہ انڈین ایجوکیشنل سروس سے منسلک ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کے دو ناول "خوابِ ہستی" اور "یاسمین" اُردو زبان میں بھی اعجاز کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بلند پایہ انگریزی مضامین کو اُردو زبان کا جامہ پہنا کر شیخ عبدالقادر کے رسالے "مخزن" کی محفل میں سجایا اور بڑا نام پایا۔ پروفیسر محمد سعید دہلی کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے آئے اور دو برس گزرے ہیں کہ انھوں نے اسی (۸۰) برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصہ چونکہ بھاٹی دروازے کے اندر ہی گزرا ہے اس لیے ان کی شہرت کا اسی علاقے ہی کے سر سہرا ہے۔

شیخوپوریوں کے بازار میں بھی شیخ عزیز الدین کی کٹڑی تک طوائفوں ہی کے مکان تھے۔ جن میں سے اکثر اپنے فن کے کمال کے باعث بہت مشہور تھیں۔ شیخ عزیز الدین کی کٹڑی میں مسجد پایاں کے قریب ایک مکان تھا جس میں مرزا ارشد گورگانی ایک مدت تک مقیم رہے۔ یہ سلاطینِ مغلیہ کی اولاد میں سے تھے اور اسی نسبت کے باعث گورگانی کہلاتے تھے۔ بڑے بلند پایہ شاعر تھے۔ اور درس و تدریس کے مشاغل کو اپنا سرمایۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں لاہور کے جن نوجوانوں کو شعر و شاعری سے وابستگی تھی وہ یا تو اپنے کلام کی اصلاح ان سے لیتے تھے اور یا میر ناظر حسین ناظم سے۔ یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شروع شروع میں یہی دو بزرگ پنجاب میں اُردو زبان کی ترویج کا باعث ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی انھیں کے معاصر تھے۔ اور انھوں نے اُردو شاعری کو جس نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ان کی اس کوشش میں یہ دونوں بزرگ ہمیشہ ممد و معاون رہے۔ منشی احمد حسین خاں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ انھیں مرزا ارشد گورگانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اقبال اگرچہ بذریعہ خط و کتابت اپنی ابتدائی غزلوں کی اصلاح حضرت فصیح الملک مرزا داغ سے لیتے رہے لیکن لاہور میں وہ اپنی غزلیں مرزا ارشد گورگانی ہی کو دکھایا کرتے تھے۔

نیچی بازار کے چوک سے جو راستہ ہیرا منڈی کو جانکلتا ہے اس کے وسط میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی ہے۔ اس بازار میں بھی اس زمانے میں زیادہ تر طوائفیں ہی رہتی تھیں۔ آگے چل کر یہ بازار دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک راستہ تو لاہور واٹر ورکس سے گزر کر چوک رنجیت سنگھ کو جانکلتا ہے اور دوسرا بارود خانے سے ہو کر چونے منڈی کو جہاں شیخوپورہ کے راجہ دھیان سنگھ رہتے تھے۔ بارود خانے کے بازار میں میاں شمس الدین اور میاں نظام الدین دو علم دوست اور معارف پرور بھائی بستے تھے۔ اور اسی علم دوستی کے باعث ان کا دولت کدہ ان ادیبوں اور شاعروں کا ملجا و ماویٰ تھا جو ان کی فیاضی کے سہارے پر اپنی زندگی کے اوقات بے فکری سے بسر کرتے تھے۔ میاں امیر الدین جنھوں نے پنجاب کی سیاست میں ہمیشہ بہت نمایاں حصہ لیا۔ میاں شمس الدین کے چھوٹے بھائی

میاں جلال الدین کے صاحبزادے اور پنجاب کے سابق گورنر میاں امین الدین کے بڑے بھائی ہیں۔ اور میاں محمد اسلم جن کا نام ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں میاں نظام الدین کے بیٹے ہیں۔ محمد الدین تاثیر جن کے علم و فضل کا چرچا اردو اور انگریزی میں جن کا اسلوبِ نگارش آج بھی طلبا کے دل کو گرما دیتا ہے اور جو ایک مدت تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے اُسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بارُود خانے ہی میں رہتے تھے۔

حکیم یوسف حسن جو "نیرنگ خیال" جیسے مقبولِ عام اُردو رسالے کے مالک بھی تھے اور ایڈیٹر بھی شروع شروع میں اسی بازار میں رہتے تھے۔ وہ طبیب بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور خاکسار بھی۔ ہر اسلامی تحریک میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اور اُردو زبان کو مقبولِ عام بنانے میں انھوں نے اپنے رسالے کی قیمت اتنی کم کر دی کہ اپنا سارا اثاثہ اسی پر لُٹا بیٹھے۔ بارُود خانے کا علاقہ جن مایہ ناز ادیبوں کی سکونت کی بدولت دُنیائے ادب میں شہرت رکھتا ہے ان میں حکیم یوسف حسن کا مرتبہ کسی سے کم نہیں۔

بارُود خانے سے آگے جائیں تو قلعے کے عقب میں ایک میدان آتا ہے جو کھائی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کسی زمانے میں مُغل فوجوں کی خیمہ گاہ تھی۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہُوں اس وقت یہ ایک بے آب و گیاہ ڈھلوان تھی۔ اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک بازار آتا ہے جسے موتی بازار کہتے ہیں۔ یہ چوک سرجن سنگھ سے شروع ہو کر مستی دروازے تک چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک بہت مشہور طبیب اور نیک سیرت انسان حکیم سیّد بزرگ شاہ رہتے تھے جو لاہور کے سادات کے ایک معزز خاندان کے نامور رُکن تھے۔ خُدا نے انھیں ایسا دستِ شفا بخشا تھا اور ان کی دُعا ایسی مُستجاب تھی کہ لوگ دُور دُور سے آتے اور نسخوں کے ساتھ ساتھ ان کے تعویذ بھی لے جاتے تھے۔ پُرانے زمانے ہی سے لاہور کے دو چار خاندانوں میں طبابت کا پیشہ موروثی تھا۔ ایک تو بازار حکیماں میں ہمارا خاندان تھا کہ اس کا ہر رُکن طبابت کے فن میں ماہر تھا۔ اور حکیم کہلاتا تھا۔ میں بھی اسی نسبت سے حکیم کہلاتا ہوں۔ دُوسرا موتی بازار میں انہی حکیم سیّد بزرگ شاہ کا خاندان۔ ان کے صاحبزادے بھی بیرسٹر ہونے کے باوجود حکیم سیّد عباس علی ہی کہلاتے تھے۔ تیسرا شاہ عالمی دروازے کے اندر حکیم عالم شاہ کا خاندان جو ان کی ذات والاصفات کے باعث بہت مشہور ہُوا۔ چوتھا موچی دروازے کے اندر تیلیوں والے رڑے میں حکیم سیّد مراتب علی اور حکیم سیّد نوازش علی کا خاندان۔ حکیم سیّد نوازش علی نے سو برس کے قریب عُمر پائی۔ اور ابھی دو چار برس ہی گزرے ہیں کہ ان کا انتقال ہُوا۔ اور پانچواں چُونے منڈی میں حکیم سیّد بہادر شاہ کا خاندان۔ یہ شیخوپورے کے راجہ دھیان سنگھ کے ذاتی طبیب تھے۔ اگرچہ سکھوں کے زمانے میں لاہور میں لالہ حاکم رائے اور بھائی وسطی رام جیسے مشہور ہندو اطبا فنِ طبابت میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہُوں اس میں ہندو زیادہ تر مغربی طریقہ علاج کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ اور مغربی طبیبوں میں مُسلمان ڈاکٹروں کے سوا جس طرف بھی دیکھیے ہندو ڈاکٹر ہی نظر آتے تھے۔

موتی بازار میں حکیم سیّد بزرگ شاہ کے مکان سے ذرا آگے چل کر ایک گلی آتی ہے جس میں لاہور کے دو مشہور پہلوان جنھوں نے ملک بھر میں بڑے بڑے میدان مارے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رُستم ہند نوٹا پہلوان تھا اور دُوسرے کا نام کریم بخش پیلڑے والا۔ چونکہ میں بھاٹی دروازے اور مستی دروازے کے درمیانی علاقے کے نامور لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس لیے ایسے لوگوں کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا جن کی شہرت محض اکتسابِ علم ہی پر مبنی نہ تھی یا جن کا حلقۂ اثر درس و تدریس ہی تک محدود نہ تھا۔ ان دونوں پہلوانوں

نے اپنے زمانے میں نام پیدا کیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر لاہور اور امرتسر کے پہلوانوں کے جسمانی کمالات کا درجہ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کے علمی اور ادبی اکتسابات کے درجے سے کم نہیں تو ان پہلوانوں کے اکھاڑے بھی کسی طرح تعلیمی درسگاہوں سے کم اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ امرتسر کے غلام پہلوان اور کلو پہلوان اور لاہور کے گاماں پہلوان اور امام بخش پہلوان کے کمال فن کی شہرت اپنے ملک کی حدود ہی تک محدود نہیں بلکہ ممالک مشرق و مغرب میں ان کی شہ زوری کا اور داؤ پیچ کا لوہا مان چکے ہیں۔

اس گلی کے اندر ایک مسجد ہے جس کے امام اور خطیب حافظ خیر محمد ایک نہایت باخدا بزرگ تھے۔ ان کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ اسلام کی حقیقی سیرت سے آشنا تھے۔ دن بھر کتابوں کی جلد بندی کرتے اور اس کی مزدوری ہی پر اوقات بسر کرتے۔ لیکن مسجد میں پانچوں وقت باقاعدہ نماز پڑھاتے۔ اور صبح و شام درس قرآن دیتے۔ انھیں طبابت میں بھی بہرہ وافر حاصل تھا۔ اور لوگ ان کے تعویذوں پر بھی بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔ اس قسم کے بزرگوں کا اب قحط الرجال ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو اس بات پر یقین ہے کہ جس دینی یا دنیاوی خدمت کا اصل مقصد کسب زر ہو یا نمائش و شہرت وہ نہ تو وسیلۂ عزت ہوتی ہے نہ باعث برکت۔ اس بازار میں آگے چل کر مستی دروازے کے قریب ایک مسجد ہے جسے بیگم شاہی مسجد کہتے ہیں۔ اس کے امام اور خطیب مولانا غلام قادر تھے۔ حسب و نسب کے لحاظ سے یہ افغان تھے اور گلینی کے صاحب فیض پیر صاحب کے مرید۔ عربی اور فارسی کے علوم میں ان کو وہ دستگاہ حاصل تھی کہ بڑے بڑے عالم و فاضل ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔ میرے والد جو اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں دہلی میں قاضی القضاۃ ہند صدر الصدور مفتی صدر الدین سے اکتساب علم کر چکے تھے عربی زبان کے فاضل اجل ہونے کے باوجود اپنی عربی اور فارسی [illegible] کی تصنیفات مولانا غلام قادر ہی کو دکھلاتے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مجھے بھی اپنے بچپن میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اور میں نے اکثر دیکھا کہ وہ درس دیتے وقت بھنے ہوئے چنے اور منقیٰ چباتے رہتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اسی پر ان کی خوراک کا دارومدار ہے۔ ہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے درس و تدریس کا سلسلہ انھیں لوگوں تک محدود ہے جو علم و فضل میں منتہائے کمال کو پہنچ چکے تھے۔ بچوں کو درس قرآن دینے کے لیے ان کے ایک شاگرد اور مرید تھے جو قاضی جی کہلاتے تھے۔ اس فقیر گوشہ نشین کو میں نے اس زمانے میں دیکھا جب مجھ میں ان کے علم و فضل کو پرکھنے کی استعداد نہ تھی۔ میں تو ان کی خدمت میں محض اکتساب سعادت و شرف کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ اور وہ اس لیے کہ میری بسم اللہ کی رسم اسی مرد حق آگاہ کی زبان سے ادا ہوئی تھی۔ نام و نمود سے ان کو نفرت تھی اور اپنے کام سے کام۔ میں نے جب کبھی انھیں دیکھا مسجد کے محراب کے قریب ایک مصلی پر بیٹھے دیکھا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہمارے گھر میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔

اس مضمون میں بعض بزرگوں کے علم و فضل کا تذکرہ محض اشارۃً کیا گیا ہے لیکن ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے کمالات کا بیان کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ یہ تفصیل اگر اختصار کے ساتھ بیان کر دی جائے تو مناسب ہے۔ اس سے ان بزرگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی اور اس مضمون کی تاریخی حیثیت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

مولانا فیض الحسن سہارنپور کے رہنے والے تھے اور قاضی القضاۃ ہند صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد۔ اپنی تعلیم کے زمانے میں انھیں مولانا امام بخش صہبائی حکیم مومن خاں مومن میرزا اسد اللہ خاں غالب اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کی صحبت کا بھی

شرف حاصل رہا۔ ابتدا میں اپنا کلام مولانا امام بخش صہبائی کو دکھاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دہلی کے دوران دلی سے نکل کر اپنے وطنِ مالوف سہارنپور چلے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ جا کر عربی کی چند کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۰ء میں لاہور آگئے ڈاکٹر لائیٹنر ان کے علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھیں اسی سال اورینٹل کالج میں شعبۂ عربی کا صدر مقرر کر دیا۔ لاہور میں ان کا قیام بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں رہا۔ ۱۸۷۱ء میں اُنھوں نے اسلام کی سیاسی اور علمی تاریخ پر دو جلدوں میں "سنین اسلام" کے نام سے ایک بڑی مفید تالیف شائع کی۔ ان کی تصنیفات سے اُن کے علم و فضل کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "حیاتِ شبلی" میں سید سلیمان ندوی کا یہ قول مولانا فیض الحسن کے علم و فضل کی عظمت پر شاہد ہے ـــ

"مولانا فیض الحسن اس پائے کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند
نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔"

میرے والد حکیم شجاع الدین شاعری میں انھیں کے شاگرد تھے۔ مولانا فیض الحسن کا ہر شعر ان کے جوہرِ کمال کا آئینہ دار ہے۔ میں نے حضرت اقبال کو بھی اکثر ان کے اشعار کو پڑھتے اور ان کی تعریف کرتے سُنا ہے۔ مولانا فیض الحسن نے سترہ برس تک اورینٹل کالج لاہور کے طلبا کو اپنی شاگردی کی سعادت سے فیض یاب کرنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں انتقال فرمایا۔

مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ وہ میری پیدائش سے پہلے ہی رحلت فرما چکے تھے۔ ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے بزرگوں کی زبانی سُنا ہے اور وہ اس لیے لکھا ہے کہ بھاٹی دروازے میں رہنے والے صاحبان علم و فضل میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ اور اگر یہ مضمون ان کے ذکر سے محروم رہ جاتا تو گویا ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جاتا۔

شمس العلما مولانا عبدالحکیم کلانوری اورینٹل کالج لاہور میں ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۶ء تک صدر مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بہت دھیما انسان تھے اور ان کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی اچھی طرح سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہو۔ شام کے وقت اکثر میرے بھائی شہاب دین کی بیٹھک میں آ بیٹھتے تھے۔ جب وہ آتے تو حضرت اقبال زیادہ تر انھیں سے مخاطب ہوتے اور شعر و شاعری کے ادبی محاسن پر گفتگو کرتے۔ انھوں نے قواعد فارسی کے علاوہ عروض صنائع و بدائع اور املا کے خصائص پر کئی رسالے لکھے ہیں جن سے فارسی ادب کے طلبا کو اکتساب علم میں بڑی مدد ملی ہے۔ ان کے مکان پر ان کے شاگردوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اور جب بازار میں چلتے تھے تو اس وقت بھی اُن کے شاگرد ان کے ساتھ ساتھ چلتے اور شعر و سخن کی گتھیاں سلجھانے میں ان کی رہنمائی کے طالب نظر آتے۔ سر پر بہت بڑا عمامہ ہوتا اور بدن پر ایک ڈھیلا ڈھالا جُبہ۔ ہاتھ میں عصا کی وضع کی لکڑی رکھتے تھے۔ آخر کار اورینٹل کالج میں چوالیس برس تک استادی کے فرائض انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اُردو فارسی اور عربی میں ان کی کئی تصنیفات مشہور ہیں۔

شمس العلما مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ۱۸۸۳ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن کے انتقال کے بعد عربی کے صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ ہمارے مکان کے دیوار بہ دیوار رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے مفتی انوارالحق اور میرا بچپن ساتھ ساتھ گزرا ہے۔ مفتی انوارالحق بھوپال میں ایک مدت تک ناظم تعلیمات رہے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی فقہ اسلامی کے بہت بڑے عالم تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فتویٰ ناقابلِ تردید سند متصور ہوتا تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جو کچھ

ان کی ذہانت سے نکلتا تھا یہاں تک کا حکم رکھتا تھا۔ یہ کبھی ہر شام حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جا بیٹھتے تھے۔ اس مجلس میں بیٹھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا پیشہ وکالت تھا۔ اور کچھ ایسے بھی جن کو قرآنی احکام کی حکمتوں کو سمجھنے کا شوق تھا۔ اس باب میں مفتی محمد عبد اللہ ٹونکی کی رہنمائی ان لوگوں کے بڑے کام آئی۔

مفتی محمد عبد اللہ بہت دبلے پتلے انسان تھے۔ پان ہر وقت چباتے رہتے تھے اور جب بات کرتے تو منہ پر رومال رکھ کر بات کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس انسان جسم میں علم و فضل کا اتنا ذخیرہ ہے کہ کوزے میں دریا بند ہونے کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔ ۴۴ سال تک اورینٹل کالج میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور لاہور کو جسے وہ اپنا دوسرا وطن کہا کرتے تھے داغِ مفارقت دے گئے۔ شرح محمدی پر چار جلدوں میں ان کی کتاب اردو زبان کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ کئی مسائل پر ان کے فتاویٰ رسالوں کی صورت میں شائع ہوئے۔ اور تشنگانِ رموز و نکاتِ شرعِ اسلامیہ نے ان سے بڑا فیض پایا۔ لاہور سے جا کر کچھ عرصہ تک دار العلوم ندوہ میں کام کیا۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں رحلت فرمائی۔ ان کی وفات سے عربی زبان ایک فاضلِ اجل اور اسلامی شریعت ایک بے نظیر نکتہ دان کی ذات سے محروم ہو گئی۔ سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق وفات کے وقت مفتی محمد عبد اللہ کی عمر کوئی ستر برس کے قریب تھی۔

اسے بھاٹی دروازے کی خوش قسمتی کہیے کہ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دلی اجڑی تو دلی کے سب سے پرانے اردو اخبار کے مالک اور ایڈیٹر مولوی محمد باقر کے بیٹے مولوی محمد حسین آزاد نے انقلاباتِ زمانہ کے گوناگوں مصائب سے تنگ آ کر اپنے وطنِ مالوف سے ہجرت کی اور آخر کار لاہور آ کر بھاٹی دروازے کے اندر وہ تحصیل بازار میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ان کے علم و فضل کا جوہر ایسا نہ تھا کہ چھپائے چھپتا۔ سررشتہ تعلیم پنجاب نے لاہور میں ان کی آمد کو غنیمت جانا اور انھیں سررشتہ ملازمت میں منسلک کر کے جہاں اُن کے جوہرِ کمال کی قدر دانی کی وہاں ان کے لیے ایسے مواقع بھی بہم پہنچائے کہ ان کی شہرت کا آفتاب جسے گردشِ تقدیر سے گہن لگ چکا تھا، افقِ علم و ادب پر بڑی درخشانی سے چمکنے لگا۔ محکمہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۸۷ء میں اورینٹل کالج میں شعبہ عربی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ اور اسی سال انھوں نے شمس العلما کا خطاب بھی پایا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے ادبی کارنامے محتاجِ تعارف نہیں۔ پنجاب میں اردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے باب میں جو سنہری کارنامے ان کی ذات سے منسوب ہیں وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قصص الہند اور دربارِ اکبری جیسی مستند تصانیف ان کے علم کی وسعت اور دنیائے ادب میں ان کے مرتبے کی عظمت پر شاہد ہیں۔ لیکن سب سے بڑا احسان جو انھوں نے اردو زبان کے طلبا پر کیا ہے یہ ہے کہ انھوں نے کرنل ہالرائڈ کے ایما پر جو اس زمانے میں سررشتہ تعلیم کے ناظم الامور تھے اردو نصاب کی کتابیں لکھیں۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے لکھے ہوئے نصاب کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ انھیں کی دکھائی ہوئی راہ کی پیروی تھی۔ مگر کسی وجہ سے وہ بات نہ آئی جس کی طرح وہ ڈال چکے تھے۔
ایک اور احسان جو انھوں نے اردو شاعری پر کیا وہ یہ تھا کہ اسے غزل کے پرانے ڈگر سے ہٹایا اور اس کی انگلی پکڑ کر اسے نیچرل شاعری کی نئی راہوں پر چلانے لگے۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعرے اب "خال و رخِ یار"، "گیسوئے خم در خم" اور "حسن و عشق" اور "ہجر و وصال" کے خیالی صنم کدے نہ تھے بلکہ مناظرِ قدرت کے وہ عجائب خانے بن گئے جن کے نوادر کو دیکھ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک بے مثال ادیب اور ایک عدیم النظیر

ناعر کی حیثیت سے مولانا محمد حسین آزاد کے کمالات کو ان چند سطور میں محدود کرنا ایک گستاخی ہے جس کا ارتکاب محض اس لیے قابلِ عفو ہے کہ اس مضمون کی حدود میں ان کی غیر محدود صلاحیتوں کا بیان نہیں سما سکتا۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف اکثر حاصل ہوا۔ اور اس زمانے میں جب انہیں انش فروشانِ سطح پرست ہوش و حواس سے بیگانہ سمجھتے تھے۔ میں نے انہیں بڑے داناؤں سے زیادہ دانا پایا۔ آخری زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اٹھ کر اکبری دروازے کے اندر نواب صاحب کی حویلی کے عقب میں اپنے صاحبزادے آغا محمد ابراہیم کے مکان میں چلے آئے۔ اور وہیں ۱۹۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

شیخ سر عبدالقادر جو شروع شروع میں بھاٹی دروازے کے اندر موتی ٹبے میں رہتے تھے اپنے علمی اور ادبی کارناموں کے علاوہ ان اعزازات کے باعث جو انہیں سرکار دربار میں حاصل ہوئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ چند سطور محض ان کی عظمت کے اعتراف اور ان کے کمال کی عظیم تفصیل کے اجمال کے طور پر لکھی جا رہی ہیں۔ وہ ۱۸۷۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے ۱۸۹۵ء میں مسلمانوں کے پہلے انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" کے مدیر مقرر ہوئے۔ انگریزی زبان میں ان کی قابلیت کی یہ پہلی سند تھی جو انہیں بن مانگے ملی۔ ۱۸۹۶ء میں جب سر سید احمد خاں نے لاہور میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کو پنجاب میں متعارف کرنے کے سلسلے میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی اور اس میں کالج کے پرنسپل سر تھیوڈور بیک نے انگریزی میں تقریر کی تو شیخ عبدالقادر نے ان کی تقریر کے ختم ہوتے ہی اس کا ترجمہ ایسی شستہ اردو میں کیا کہ اور لوگ تو کیا خود سر سید احمد خاں بھی حیران ہو گئے۔ اس دن سے وہ انہیں مولوی عبدالقادر کہنے لگے۔ اردو زبان کی ترویج کی دھن اب ان کے دل میں ایسی سمائی کہ وہ روز و شب اسی کوشش میں مصروف رہتے کہ پنجاب کو اردو زبان کا مرکز بنا دیں اور علم و ادب کی جو بساط دلی اور لکھنؤ میں الٹ چکی تھی۔ اسے ایک نیا رنگ روپ دے کر لاہور میں سجا دیں۔

وہ اس وقت بازار حکیماں میں فقیر جمال الدین کی حویلی کے سامنے میاں حسین بخش کے مکان میں رہتے تھے۔ اور یہیں سے ۱۹۰۱ء میں رسالہ "مخزن" جاری ہوا۔ اس رسالے کے سرورق پر ہندوستان کا ایک نقشہ ہوتا تھا جس میں تین مختلف نشانوں سے ان مقامات کی نشاندہی منظور تھی جن میں یا تو اردو بولی جاتی ہے یا اردو سمجھی جاتی ہے اور یا جن کے رہنے والوں کی مادری زبان اردو ہے۔ یہ رسالہ بہت مقبول ہوا اور اس نے اپنے بے جان اوراق میں نئے نئے ادیبوں اور شاعروں کے رشحاتِ فکر و قلم سے زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی اور شائقینِ ادب کے دل میں اس دور کی یاد تازہ ہو گئی جب سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، نواب محسن الملک، سید احمد خاں دہلوی، مولانا شبلی، مولانا حالی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور ان کے دوسرے ہمعصر ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دہلی کے بعد گیسوئے اردو کی مشاطگی میں سرگرم رہے تھے۔ مخزن نے ایک ایسی محفل سجائی کہ اس میں اس زمانے کے تمام ممتاز ادیب مل بیٹھے۔ سر محمد اقبال، چودھری خوشی محمد ناظر، مرزا اعجاز حسین، میر غلام بھیک نیرنگ، عبدالرشید چشتی، مولوی ظفر علی خاں، شیخ محمد اکرام، اور تلوک چند محروم اس محفل کے مستقل رکن تھے۔ یہ محفل کوئی محفلِ مشاعرہ نہ تھی، بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نئے رنگ کی محفل تھی۔ اس میں شعر و شاعری کے علاوہ نثر کی سحر طرازیاں بھی اپنے پورے جوبن پہ نظر آتی تھیں۔ اس محفل میں مخزن کا رسالہ ترتیب پاتا تھا اور جو کچھ اس محفل میں پڑھا جاتا ہر مہینے مخزن میں شائع ہو کر تشنگانِ ادب کی پیاس بجھاتا۔ جب تک شیخ عبدالقادر لاہور میں رہے اس محفل کا رنگ جما رہا۔

اسی قسم کی ایک دوسری محفلِ ادب اُس وقت گرم ہوئی جب میں نے ۱۹۱۹ء میں "ہزار داستان" کا رسالہ شائع کیا۔ احمد شاہ بخاری پطرس، سید عابد علی عابد، سید امتیاز علی تاج، مسٹر ہادی حسین، سرو اسما، میر صوفت، حامد حسین خان بیدل، عبدالمجید سالک، پنڈت سدرشن اور اختر شیرانی اس فضائے ادب کے روشن ستارے تھے۔ عبدالرحمان چغتائی کے موقلم کی سحر نگاری سے ہزار داستان کا ہر شمارہ دیدہ وروں کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور ہوتا تھا۔ مخزن ہی کی طرح ہزار داستان بھی ان نامور ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں ترتیب پاتا اور شعر و ادب کی وہ بساط بچھاتا جو کسی زمانے میں شیخ عبدالقادر نے بچھائی تھی۔ ہزار داستان کا ذکر اس جگہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ اس کی اشاعت کی ابتدا بازار چلیاں میں میرے مکان ہی سے ہوئی۔ اور یہ ستارہ بھی اس اُفق پر روشن ہوا جو بھاٹی دروازے کی زمین سے آملتا ہے۔ ہزار داستان کو وہ ایسی سعادتیں نصیب ہوئیں جن کا ذکر میرے تخیل کی مسرتوں کی معراج اور گزرے ہوئے زمانے کی یادگار کا سرور و کیف ہے۔ ہزار داستان کا سرورق حکیم فقیر محمد جیسے نامور خطاط نے لکھا اور سر محمد اقبال نے نہ صرف اس رسالے کا نام ہی تجویز کیا بلکہ اپنے قلم سے اس کے سرورق پر مجھے مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر تحریر فرمایا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے

اب یہ شاعرِ مشرق کی فطرتِ روشن ہی پر آشکار ہوگا کہ انھوں نے میرے عشق کے داغِ ناتمام میں کیا سوز و ساز دیکھا اور وہ حاصلِ سوز و ساز کیا تھا جس سے وہ چاہتے تھے کہ اس زمانے کی بزمِ ادب میں اُجالا ہو جائے۔

شیخ عبدالقادر ۱۹۰۴ء میں انگلستان چلے گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۹۰۷ء میں واپس آئے۔ اقبال بھی اسی زمانے میں انگلستان میں تھے۔ میں نے ان دونوں بزرگوں کی زبان سے سنا ہے کہ قیامِ انگلستان میں انھیں ہمیشہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات پر غور و فکر کرنے میں مصروف دیکھا۔ اقبال کے دل پر شیخ عبدالقادر کی شخصیت کے جو تاثرات تھے اس خط سے ظاہر ہیں۔ جو انھوں نے ان کے نام ایک نظم کی صورت میں لکھا۔ اور ان الفاظ میں انھیں دعوتِ عمل دی۔

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
دیکھ یثرب میں ہُوا ناقۂ لیلیٰ بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزمِ گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

آگے چل کر ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کی تنظیم میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ان تصورات کے آئینہ دار ہیں جن کی جھلک اس نظم کے اشعار میں نظر آتی ہے۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں شیخ عبدالقادر اپنی زندگی میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس قانون ساز پنجاب کے صدر بنے۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں مجلس اقوام متحدہ میں ہندوستان کے نمائندے مقرر ہو کر جنیوا گئے۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے اور سر کا خطاب پایا۔ ۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں انڈیا کونسل لنڈن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے۔ ۱۹۴۰ء میں دوبارہ لاہور ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے اور پھر سرکار برطانیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۴۲ء میں بہاولپور ہائی کورٹ کے چیف جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر لاہور میں مقیم ہو گئے۔

زبانِ اُردو کی ترویج میں جو انہماک سر عبدالقادر کو تھا وہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ۱۹۴۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایم۔ اے (اُردو) کی جماعتوں کا سلسلہ شروع کیا تو انھوں نے اورینٹل کالج میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے ایم۔ اے (اُردو) کی جماعت کو پڑھانا شروع کر دیا اور اس طرح کشت زارِ اُردو کو اپنے ابرِ کرم سے سیراب کیا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود درس و تدریس کے باب میں وہ سرگرمی دکھائی کہ جواں سال اساتذہ کے لیے ایک مثال بن گئے۔ ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو ایک معروف اور کامیاب زندگی کے شب و روز گزار کر سر عبدالقادر نے رحلت فرمائی۔ میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو جگہ اُنھوں نے خالی چھوڑی وہ پھر کبھی پُر نہ ہوئی۔

سر شہاب الدین بھی بھاٹی دروازے ہی کے اندر سمیوں کے محلے میں رہتے تھے۔ وہ پنجاب کے اُن نامور اور فقید المثال لوگوں میں سے ہیں جو ایک پسماندہ علاقے میں ہوش سنبھالنے کے باوجود کامیابی اور ترقی کے ان مدارجِ اعلیٰ تک پہنچے جہاں پہنچنا ہر انسان کے بس میں نہیں۔ ایک نہایت ہی کامل زندگی اور شب و روز کی محنت و مشقت کے جتنے انعامات ہو سکتے ہیں اُنھوں نے حاصل کیے۔ ۱۹۰۰ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ پھر اس ملازمت سے دستبردار ہو کر کچھ دنوں تک اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں "پنجاب کریمنل لا جرنل" ایک قانونی رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس رسالے کی کامیابی سے حوصلہ پا کر "انڈین سٹیچوٹس اینڈ کیسز" (Indian Statuies and Cases) ایک ہمہ گیر قانونی مجموعہ مرتب کرنے لگے۔ لاہور کی شہری اور پنجاب کی سیاسی زندگی میں عمر بھر ایک نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ایک مدت تک کارپوریشن آف دی سٹی آف لاہور کے میئر رہے۔ اور بائیس برس تک پنجاب کی مجلس قانون ساز کی صدارت پر فائز رہے۔ سر شہاب الدین پنجابی کے بڑے حامی اور بڑے مشہور شاعر تھے۔ مسدس حالی کا پنجابی زبان میں ایسا ترجمہ کیا کہ وہ ترجمہ ان کی اپنی ہی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ اُنھوں نے مجلس قانون ساز پنجاب کی صدارت کے فرائض ایسی خوبی سے انجام دیے کہ پھر ان جیسا صدر اس مجلس کو کبھی میسر نہ آیا۔ یہ

بھی ہر شام کو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے۔ اقبال اور ان کے بے تکلفانہ مراسم بھی شہرہ آفاق شاعر ہی کے بیان کی اس مختصر میں گنجائش نہیں۔ اپنی محنت اور مشقت سے بہت دولت کمائی اور اس دولت کا بیشتر حصہ راہِ خدا کی راہ میں صرف کیا اور یا اپنے دُور و نزدیک کے رشتہ داروں کو دیا۔ نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع کرنے کے شوق نے ان کی ذاتی لائبریری کو ایک بے نظیر کتب خانہ بنا دیا تھا۔ یہ کتب خانہ ان کی وصیت کے مطابق اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ اسی وصیت کے مطابق وفات سے پہلے ہی وہ اپنی قیمتی زمین جو شاہدرہ ریلوے سٹیشن کے سامنے واقع ہے انجمن حمایت اسلام کو دے گئے تھے۔ عمر بھر ان کا دولت کدہ سیاسی تحریکوں کا اکھاڑہ بنا رہا۔ جس میں ہر سیاست فروش نے زور آزمائی کی۔ سر شہاب الدین نے کبھی اس پہلوان کی پیٹھ زمین کو لگنے دی کبھی اس پہلوان کو چت کر دیا۔ سیاست کے فن میں ایسے ماہر تھے کہ جیت ہمیشہ انہی کی رہتی تھی۔ بڑے بلند قامت اور رعب داب والے انسان تھے۔ آواز میں ایسا جلال تھا کہ جب ٹیلیفون پر بات کرتے تو ٹیلیفون کے تار دھشت بر اندام ہو جاتے۔ مجلس قانون ساز میں ان کی آواز کسی مائیکروفون کی محتاج نہ تھی۔ قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا کہ پارلیمنٹری پریکٹس کی کتابوں کے صفحوں کے صفحے ازبر تھے۔ ان کی قانون دانی سے مجلس قانون ساز کا ہر رکن مرعوب رہتا تھا۔ انسان کی نکتہ وری کا لوہا سبھی مانتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن سے ان کے دمِ واپسیں تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس رفاقت سے بڑا فیض پایا۔ اس سرچشمۂ فیض کی اتنی خوبیاں مجھے یاد ہیں کہ ان کے بیان کے لیے اس مختصر مضمون میں نہ گنجائش ہے نہ وسعت۔ بس یہی کہہ دینا کافی ہے کہ سر شہاب الدین بجائے خود ایک محفل تھے اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ محفل بھی سونی ہو گئی۔

مولوی احمد دین وکیل جن کا نام ان لوگوں میں آیا ہے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمع ہوتے تھے اپنے زمانے کے دیوانی قانون کے ماہر تھے۔ اور بڑے پائے کے ادیب۔ الفاظ کی تاریخ میں انھوں نے "سرگزشت الفاظ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اس مضمون پر ایک لاثانی تصنیف ہے اور اپنے مصنف کی عرق ریزی اور ژرف نگاہی پر شاہد۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ جو اب شاید کسی کی یاد میں محفوظ نہیں ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اقبال کو ان کے اصلی روپ میں دیکھا اور ان کی شاعری کو اس کے اصلی رنگ میں سمجھا۔ اور اقبال کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اور اس میں اقبال کے وہ تمام اشعار جمع کیے جو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ابھی کسی لڑی میں نہ پروئے گئے تھے۔ اور پھر ان اشعار کی اس طرز پر تشریح کی جس طرز پر "مائنڈ اینڈ آرٹ آف شیکسپیئر" (Mind and Art of Shakespeare) لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب لاہور کے ایک نامور ناشر شیخ مبارک علی نے چھاپی۔ لیکن ابھی یہ کتاب شائع نہ ہوئی تھی کہ اقبال کو اپنے کلام کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہی وہ مجموعہ ہے جس نے بعد میں "بانگ درا" کی شکل اختیار کی۔ مولوی احمد دین نے اس خیال سے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے "بانگ درا" کی اشاعت کو نقصان پہنچے گا۔ اپنی کتاب خود ہی تلف کر دی۔ اور اس طرح دُنیائے ادب ایک بڑی مفید تحقیقی یادداشت سے محروم ہو گئی۔ مولوی احمد دین کی تحریر کا اسلوب اپنے استاد مولانا محمد حسین آزاد کا ہو بہو خاکہ تھا اور بڑے بڑے نقاد ادب کو بھی شاگرد کی تحریر میں استاد ہی کی تحریر کا عکس نظر آتا تھا۔

مولوی احمد دین بھی کشمیری بازار میں "دال والی گلی" میں رہتے تھے۔ ان کے مکان سے ملحق مولوی تاج الدین کا مکان تھا جو ان مسلمان گریجویٹوں میں سے تھے جنھوں نے انگریزی زبان میں بے مثال مہارت پیدا کرنے میں بڑا نام پایا۔ یہ بھی پہلے سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہوئے اور بعد میں ریاست پٹیالہ کے محکمۂ تعلیم میں ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بڑے متین اور صاحب الرائے بزرگ تھے۔ شیخ عبدالقادر

مولوی احمد دین اور مولوی تاج دین پُرانی وضع کے اس قدر پابند تھے کہ میں نے انہیں اُن کی جوان سالی کے زمانے میں بھی کبھی ننگے سر یا ریش منڈھی نہیں دیکھا۔

وہاں کی گلی سے آگے چل کر اسی تحصیل بازار میں ایک اور کوچہ ہے جسے بھابڑوں کی تھڑیاں کہتے ہیں۔ خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش اور خواجہ امیر بخش تینوں بھائی اسی کوچے میں رہتے تھے۔ یہ بزرگ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظر عام پر نہیں آئے۔ مگر وہ اس محفل کی رونق و روح رواں تھے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمتی تھی۔ ان کی جرأتِ تنقید اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ جب تک سر محمد اقبال اپنا کلام ان بزرگوں کو نہ سنا لیتے تھے اسے کسی مجلس عام میں نہ پڑھتے تھے۔ "نالۂ یتیم"، "ہلالِ عید"، "تصویرِ درد" اور "شمع و شاعر" کی سی مشہور و معروف نظمیں اقبال نے پہلے انہیں لوگوں کے سامنے پڑھیں اور پھر ان سے دادِ سخن پا کر انہیں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھ کر جہانِ اسلام سے خراج تحسین و عقیدت وصول کیا۔ خواجہ فیروزالدین بیرسٹر ایٹ لا جو اقبال کے ہم زلف تھے اور جنہوں نے آگے چل کر ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے بڑا نام پایا انہی خواجہ رحیم بخش کے بیٹے تھے۔ اور خواجہ عبدالمجید "جامع اللغات" جیسی جامع اور ضخیم لغت کے مصنف خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے۔ اس لغت کی گہرائی اور اس کے مؤلف کی وسعت نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رموز ادب کا دلدادہ اپنی سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود عمر بھر کس انہماک سے اس عظیم الشان تالیف کی تکمیل کے درپے رہا جو آج اردو ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیض اسی گھرانے کا ہے جس کے کنارِ عاطفت میں ان دونوں نوجوانوں نے پرورش پائی۔

اسی بازار میں اس کوچے کے سامنے ایک طرف پنڈت رگھبر دیال جوتشی (رر دو د ۔ ۔ ۔ ؟) اور دوسری طرف ڈاکٹر ہیرا لال رہتے تھے۔ جیوتش کے علم کے متعلق لوگوں کے نظریات مختلف ہیں۔ لیکن ان سب نظریات سے قطع نظر میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پنڈت رگھبر دیال اس علم میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ سر شہاب الدین ان کے بہت قائل تھے۔ اور سر شہاب الدین ہی کیا بڑے بڑے لوگ دور دور سے آتے اور ان سے اپنا زائچہ بنواتے۔ بڑے نیک دل اور خدا پرست انسان تھے۔ میں بھی ان کی خدمت میں کئی مرتبہ حاضر ہوا اور ان سے جیوتش کے رموز سیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ سنسکرت کے علم سے بہرۂ وافر کے حصول کے بغیر اس تجربے پایاں کا شناور ہونا بہت مشکل ہے۔ ان کے مکان کے سامنے ہر قسم کے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور ہر شخص ستاروں کی گردش کے اس راز داں کی زبانی اپنے مستقبل کے ان اسرار کا جویا نظر آتا تھا۔ جو پردۂ غیب میں مستور رہتے ہیں۔ بہر حال پنڈت رگھبر دیال کا مکان کوئی نصف صدی تک مرجع خواص و عوام رہا۔

ڈاکٹر ہیرا لال اپنے زمانے کے بڑے مشہور سرجن تھے۔ بہت ہنس مکھ، بڑے ملنسار اور اپنے فن میں ماہر۔ غریب ہو یا امیر ہر مریض کو بڑی احتیاط سے دیکھتے اور اپنے ہر مریض کا علاج بڑی توجہ سے کرتے۔ اس زمانے میں انگریزی طریقۂ علاج کا بھی ایسا چرچا نہ تھا۔ تاہم ڈاکٹر بیلی رام، ہیرا لال، ڈاکٹر نہال چند، ڈاکٹر محمد حسین اور ڈاکٹر رحیم خاں انگریزی طریقۂ علاج میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ہیرا لال کے مکان کے سامنے ڈاکٹر دولت رام کا مطب تھا۔ یہ ڈاکٹر ہیرا لال کے شاگرد تھے اور ان ہی کی طرح

کیا ہو۔ رفتہ رفتہ ان کے کمالات کو ایسی شہرت ہوئی کہ انھوں نے لاہور کے دو مختلف علاقوں میں اپنا مطب جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ صبح سات بجے سے بارہ بجے دوپہر تک وہ اسی تحصیل بازار میں مطب کرتے اور دن کے دو بجے سے رات گئے تک نکلسن روڈ پر مریضوں کو دیکھتے۔ میں نے ان میں ایک صفت ایسی دیکھی جس کی نظیر اس زمانے میں کہیں نہیں ملتی۔ خیر! اگر کیا ذکر وہ کسی متوسط الحال شخص سے بھی فیس نہیں لیتے تھے اور جو سب سے عجیب بات تھی وہ یہ ہے کہ اچھے اچھے خوشحال مسلمان مریضوں کا بھی علاج مفت کرتے تھے۔ ہندو مریضوں سے منہ مانگی فیس لیتے۔ ان کو میں نے اکثر یہ کہتے سنا کہ مسلمان امیر بھی غریب ہوتا ہے اور ہندو غریب بھی امیر ہوتا ہے۔ ہندو مریضوں سے اتنی فیس مل جاتی ہے جتنی میری ضرورت کے لیے کافی ہو۔ ان کے والد لالہ کرپا رام نے لاہور میں سب سے پہلے ڈاکٹر کیمپ سے عینکوں کے شیشے بنانے کا فن سیکھا۔ اور پھر ان شیشوں کو بنانے کا ایک بڑا کارخانہ بنایا۔ یہ بڑے نیک دل بزرگ تھے اور کرشن جی کی گیتا کے والہ و شیدا۔ جب ڈاکٹر کیمپ نے گیتا کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو لالہ کرپا رام نے اسے بڑے اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا۔ گیتا کا یہ ترجمہ بعض نقادوں کی رائے میں لوک مانیہ تلک اور مسز اینی بیسنٹ کے ترجموں سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہے۔

تحصیل بازار سے آگے بڑھ کر سید مٹھے بازار کے قریب رائے صاحب لالہ مدن گوپال اور پنڈت پربھو دت شاستری کے مکان تھے۔ مجھے ان دونوں ماہر اساتذۂ تعلیم کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ پنڈت پربھو دت کی دماغی وسعت اور فطری صلاحیت ایک اعجاز کا درجہ رکھتی تھی۔ انھوں نے کئی مضامین میں ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ سنسکرت اور فلسفے سے ان کو خاص شغف تھا۔ جرمنی سے فلسفے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ لیکن جلد ہی انڈین ایجوکیشنل سروس سے منسلک ہو کر کلکتے چلے گئے۔

رائے صاحب مدن گوپال پہلے تو ماڈل سکول لاہور میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ بعد میں ریلوے ٹیکنیکل سکول لاہور کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور ابھی ملازمت سے سبکدوش نہ ہوئے تھے کہ بار ہستی سے سبکدوش ہو گئے۔ ایسا استاد اس زمانے میں بھی خال خال نظر آتا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کی دیکھ بھال اپنے بچوں کی طرح کرتے تھے۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مضمون میں کمزور دیکھتے تو اس سے بیزار ہونے کی بجائے اس کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو جاتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا رعب داب ایسا تھا کہ ان کی مربیانہ شفقت سے حوصلہ پا کر کسی کو ادب کی حد سے گزرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اب پنجاب کے دارالحکومت میں شاعری کا اچھا خاصا چرچا ہو چلا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین نے اردو زبان کی روز افزوں مقبولیت سے متاثر ہو کر ایک اردو بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ "شور محشر" اسی بزم مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے میرے بھائی حکیم امین الدین کے وسیع دیوان خانے میں منعقد ہوتا تھا۔ اور جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا وہ "شور محشر" میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد حسین کے بیٹے خان احمد حسین خاں تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ان کی شہرت ایک [illegible] ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ آگے چل کر انھوں نے "شباب اردو" کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی شائع کرنا شروع کیا جس نے ادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ سر محمد اقبال بھی جو اس زمانے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے ہر

بھیجتے اس مشاعرے میں اپنی غزل سناتے تھے۔ اسی مشاعرے کی ایک محفل میں انھوں نے وہ غزل بھی پڑھی جس کا یہ شعر اب تک پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر جاری ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے تھے جو مرے عرقِ انفعال کے

اسی غزل کے مقطع سے اقبال کی طبیعت کا وہ رجحان صاف ظاہر ہو جاتا ہے جس نے آخر کار انھیں ان لوگوں کی پیروی سے بے نیاز کر دیا جن کو محض زبان دانی کا دعویٰ تھا اور جن کے اشعار کا تار و پود لکھنؤ اور دلی کے محاوروں کے تانے بانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

مرزا ارشد گورگانی دلی سکول کے پیرو تھے اور میر ناظر حسین ناظم لکھنؤ کی زبان کے دلدادہ۔ دونوں کی ٹولیاں جب اس بزمِ مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لیے غزل سرا ہوتیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کے اکھاڑوں کا نقشہ کھنچ جاتا۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی پنجاب کے شعرا میر اور مرزا ہی کے زیرِ قیادت میدانِ سخن طرازی میں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتے رہتے تھے۔ اس بزمِ مشاعرہ کی مقبولیت اس روداد سے ظاہر ہے جو "شورِ محشر" کے پہلے شمارے میں اس بزم کے پہلے مشاعرے کے متعلق چھپی۔ اس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اس میں اس زمانے کے کیسے کیسے نامور لوگ شامل ہوتے تھے۔ اور اردو زبان اس وقت پنجاب میں کس حد تک مقبول ہو چکی تھی۔

"۳۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو پہلا جلسہ مشاعرے کا جناب حکیم امین الدین بیرسٹرایٹ لا کے عالیشان مکان پر شام کے چھ بجے ہوا۔ اس جلسے میں علاوہ مفصلہ ذیل اصحاب کے قریباً تین سو شائقین کی بھیڑ بھاڑ تھی۔

۱۔ جناب حکیم شجاع الدین صاحب شجاع، میرِ مشاعرہ
۲۔ جناب نواب غلام محبوب سبحانی صاحب محبوب
۳۔ جناب مرزا عبدالغنی صاحب ارشد دہلوی
۴۔ جناب منشی محبوب عالم صاحب مالک پیسہ اخبار
۵۔ جناب منشی عبدالعزیز صاحب، منیجر پیسہ اخبار
۶۔ جناب لالہ موہن لعل صاحب مطلب، نائب میرِ مشاعرہ
۷۔ جناب میر نشاد علی صاحب شہرت
۸۔ جناب مولوی احمد دین صاحب بی۔ اے پلیڈر
۹۔ لالہ دھنپت رائے صاحب، بی۔ اے، ایل۔ ایل بی

۱۰. جناب منشی میران بخش صاحب، بیرسٹرایٹ لا۔

۱۱. جناب میر ناظر حسین صاحب ناظمؔ

۱۲. جناب لالہ منوہر لال صاحب بی۔ اے

۱۳. جناب مرزا محبوب بیگ صاحب بی۔ اے۔

۱۴. جناب پنڈت سکھ چین ناتھ صاحب در۔ ایم۔ اے۔

۱۵. جناب لالہ گوبند رام صاحب، رئیس لاہور

۱۶. جناب لالہ دیانت رائے صاحب مالک البرٹ پریس لاہور

۱۷. جناب شیخ دانشمند سقراط صاحب ایم۔ اے

۱۸. جناب منشی شام لال صاحب مجبورؔ

۱۹. جناب مرزا عبدالحسین صاحب عارفؔ۔

۲۰. جناب حکیم شہباز دین صاحب

۲۱. جناب فقیر سید زین العابدین صاحب چیف جج

۲۲. جناب منشی غلام حسین صاحب شیداؔ

۲۳. جناب شہزادہ محمد علی صاحب المتخلص بہ شہزادہ۔

۲۴. جناب آغا سلطان علی صاحب کربلائی

۲۵. جناب سردار گنڈا سنگھ صاحب مشرقیؔ

۲۶. جناب مولوی عبدالرؤف خاں صاحب رافتؔ بھوپالی، ایڈیٹر پیسہ اخبار

۲۷. جناب فقیر سید افتخار الدین صاحب

۲۸. جناب خلیفہ نظام الدین صاحب

۲۹. جناب حکیم امین الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا، سیکرٹری

۳۰. جناب منشی احمد حسین خان احمد صاحب، اسسٹنٹ سیکرٹری

اس بزمِ مشاعرہ کی اہمیت صرف اسی امر سے ظاہر ہے کہ اس میں جناب امیر احمد صاحب امیرؔ استاد، جناب نواب صاحب بہادر والیِ ریاست رامپور، جو اس زمانے میں لاہور تشریف لائے ہوئے تھے، نہ صرف شریک ہی ہوئے بلکہ مصرعِ طرح پر ایک غزل لکھی اور خود پڑھی اور پھر اسی بزمِ مشاعرہ کا آفتاب اقبالؔ ملاحظہ ہو کہ اس کے دوسرے مشاعرے میں اقبالؔ نے لاہور میں سب سے پہلے اپنی غزل پڑھی: "شورِ محشر" کی روداد بابت دسمبر ۱۸۹۵ء میں ان کی غزل پر ان کا نام اس طرح درج ہے۔

"جناب شیخ محمد اقبال صاحب اقبال

تلمیذ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی"

ں غزل کے مقطع میں انھوں نے خود داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا ہے ۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

جب تک میرے والد زندہ رہے شعر و شاعری کے یہ ہنگامے بھی جاری رہے۔ اور "شورِ محشر" قیامت برپا کرتا رہا۔ میرے والد حکیم
الدین اپنے زمانے کے بلند پایہ شعرا میں سے تھے ۔ "داغ ہجراں" کے نام سے ان کی غزلیات کا دیوان اور "تعزیۂ حزینہ" کے نام سے
کے لکھے ہوئے مرثیوں کا مجموعہ ان کی ادبی کاوشوں کی یادگار ہیں۔ ان تصنیفات کے علاوہ انھوں نے طب کے علمی اور عملی پہلوؤں پر بہت سی
بیں لکھیں جن سے اس زمانے کے طبیبوں نے بہت فیض پایا۔ ان کی وفات کے بعد میرے بھائی حکیم امین الدین اور میرے دوسرے بھائی حکیم
از دین نے اس بزمِ مشاعرہ کو جاری رکھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر جو بات ایک دفعہ بگڑ چکی تھی نہ بنی۔ اور جذبِ صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی
مت میں تھی نوجوانوں کی ہمت کو نصیب نہ ہوئی۔ لیکن ایک بات ضرور ہوئی کہ وہ صاحبانِ ذوق جنھیں اس بزمِ مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دوسرے
بت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہوگئی تھی اب ہر روز شام کے وقت حکیم شہباز دین کے مکان پر جمع ہو جاتے تھے۔ بسا اوقات
ا بھی ہوتا تھا کہ ان ارباب علم و ادب کی دید کے شائق دور دور سے آتے اور ان کی صحبت سے اکتسابِ شرف کرتے۔ اس مجلس کا ذکر اوپر آچکا ہے
م شہباز دین ایک بہت ہی لاغر اور نحیف انسان تھے۔ مگر ان کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جس میں سمندر کی وسعت اور ابر کی فیاضی تھی۔ وہ
چھ کماتے اپنے احباب کی خاطر مدارات پر صرف کر دیتے۔ ان کی زبان کی شیرینی ان کی منکسر مزاجی اور مہمان نوازی نے ان کی خاکِ آستاں کو
م و ادب کے درخشاں ستاروں کا آسماں بنا دیا۔

حکیم امین الدین اپنے زمانے میں نہ صرف ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے مشہور تھے بلکہ اپنے اس علم و فضل کے باعث جو انھوں
نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں پایا تھا بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی ذکاوت اور طلاقت اس زمانے میں مشہور تھی۔ انجمن حمایت اسلام
ے سالانہ جلسوں میں جب وہ تقریر کرنے کے لیے آتے تو ان کی تقریر کو سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے۔ اور مسلمانوں کی عظمتِ
ذشتہ کے تاریخی واقعات کے آئینے میں اپنی آئندہ نسلوں کے شاندار مستقبل کی جھلک دیکھ کر اپنے دل میں ایک نئی زندگی کی حرارت
سوس کرنے لگتے۔ ان کی آواز میں خداداد جذب و اثر تھا اور ان کی عبارت میں ان کی وسعتِ نظر کا عکس۔ ان کے تبحر علمی کی یہ کیفیت تھی کہ
ن کے کتب خانے میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی سینکڑوں ایسی کتابیں موجود تھیں جن پر ان کے قلم کے لکھے ہوئے حواشی ان کی
معلومات کی وسعت اور ان کی تنقید کی گیرائی کی دلیل روشن تھے۔ انھوں نے قانون پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔ اور اسلامی تاریخ پر بھی بہت سے
مضامین تحریر کیے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ جو حضور رسولِ مقبول صلعم کی زندگی کے واقعات اور سیرت کی عظمت کو ہر ناظر کے زاویے
سے پرکھنے پر مبنی تھا افسوس کہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اور وہ اس آرزوئے ناتمام کو دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بازار حکیماں
کی جن محفلوں کا ذکر اوپر آچکا ہے ان کی رونق حکیم امین الدین ہی کے دم قدم سے تھی۔ جب تک وہ زندہ رہتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان

مضمون کی مدح بھی قطعہ منظوم سے پرواز کر گئی ہے۔

اوپر سر عبدالقادر کے مشہور رسالے "مخزن" کا ذکر آ چکا ہے اس کے متعلق یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ جب سر عبدالقادر اپنی سرکاری ملازمت کے مشاغل کے باعث اس رسالے کی ادارت اور اشاعت کے لیے وقت نہ نکال سکے تو انھوں نے یہ کام اپنے ایک عزیز دوست شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی اس رسالے کو انارکلی ہی سے شائع کرتے رہے۔ یہ وہی شیخ محمد اکرام ہیں جنھوں نے بعد میں دہلی جا کر "عصمت" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جس نے نسوانی طبقات میں بڑا نام پایا۔ "مخزن" کے مالک شیخ محمد اکرام کے دہلی چلے جانے کے باعث کئی دور آئے۔ ایک زمانے میں شمس العلما مولانا احسان اللہ خاں تاجور اس کے ایڈیٹر رہے اور پھر جب انھوں نے اس سے قطع تعلق کیا تو یہ رسالہ ایک مدت تک مولانا حامد حسین بیدل کی ادارت سے مستفیض رہا۔ جب تک یہ رسالہ شائع ہوتا رہا اس کا اہتمام اشاعت بھاٹی دروازے کے کسی نہ کسی کوچے ہی میں رہا۔ اور جب تک سر عبدالقادر شیخ محمد اکرام مولانا تاجور اور مولانا بیدل اس کے ساتھ متعلق رہے وہ بھاٹی دروازے ہی میں مقیم رہے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ ہیرا منڈی بازار کے اس کونے پر جہاں یہ بازار ایک طرف باردو خانے کو اور دوسری طرف چوک سرجن سنگھ کو جا نکلتا ہے حکیم فقیر محمد رہتے تھے۔ حکیم فقیر محمد ۱۹۰۹ء میں دلی کے طبیہ کالج سے طبابت کی سند حاصل کر کے لاہور آئے تھے۔ وہ پنجاب کے ایک پھملے سے قصبے چکواڑی کے رہنے والے تھے۔ مگر اردو زبان پر کچھ اس طرح شیدا تھے کہ میں نے انھیں کبھی اردو کے سوا کسی دوسری زبان میں بات کرتے نہیں سنا۔ فن طبابت میں انھیں وہ دستگاہ حاصل تھی کہ دودمان شریف خانی کے کوکب اقبال مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں بھی ان کی ذکاوت تشخیص اور طریقۂ علاج کی تعریف کیا کرتے تھے۔ خطاطی میں انھیں وہ ملکہ حاصل تھا کہ مریض ان کے نسخوں کا ایک نستعلیق پڑھ کر ہی روبصحت ہو جایا کرتے تھے۔ میں اکثر عبدالمجید پروین رقم کو جو اس زمانے کے ایک صاحب کمال خطاط تھے اور اپنی جواہر نگاری کی بدولت پروین رقم کے لقب سے مشہور ہوئے اور جن کو اقبال نے اپنی تصنیفات کی کتابت کے لیے منتخب کیا خطاطی کے نکات اور نصف خال کے تناسب کی تبیین کے لیے حکیم فقیر محمد ہی سے مشورہ کرتے دیکھا۔ عبدالمجید پروین رقم کے بیٹے محمد اقبال جو اپنے والد باپ کی نسبت سے اپنے مخطوطات کو ابن پروین رقم کے نام سے منسوب کرتے ہیں ایک صاحب کمال خطاط ہیں۔ جب اقبال کے لوح مزار پر اعلیٰ حضرت شہنشاہ کابل ظاہر شاہ نے ان کے قلم سے لکھے ہوئے کتبے دیکھے تو اس قدر محظوظ ہوئے کہ اپنی زبان سعادت نشان سے فرمایا "خوشنویسی خوب است"۔ حکیم فقیر محمد کو مصوری میں بھی بدرجہ اتم مہارت حاصل تھی۔ بڑے خوش لباس، بڑے ہنس مکھ، بڑے شیریں گفتار اور بڑے خندہ انسان تھے۔ مریض مرض لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے مگر مرض سے شفا پا کر عمر بھر کے لیے ان کے گرویدۂ احسان ہو جاتے تھے۔ شطرنج، تجکت، پھبتی میں استاد تھے۔ لیکن حفظ مراتب کا ان کو اس قدر پاس تھا کہ اپنی تحریر اور تقریر کو مناسب اور نامناسب کی تمیز سے کبھی آزاد نہ ہونے دیتے تھے۔ جہاں ان کے کمال فن نے انھیں لاہور کے ہر کو و مہ کو ان کے دست شفا بخش کا دست نگر بنا رکھا تھا وہاں ان کے حسن مذاق نے ہر با مذاق اہل قلم کو بھی ان کا دلدادہ و شیدا کر رکھا تھا۔ فارسی نظم میں اقبال کی پہلی کتاب "اسرار خودی" انھیں کے اہتمام میں شائع ہوئی۔ اٹھائیس برس تک ان کا مطب مرجع روزگار رہا اور ان کی ذات مرجع اہل کمال حیثیت میں رہی کہ ۱۹۳۷ء میں عالم طب ایک ایسے طبیب سے اور فن طبابت ایک ایسے ماہر فن سے محروم ہو گیا جس کا بدل اس زمانے میں مشکل اور حیرت کا

نعم البدل ملنا ہی ناممکن ہے۔

مشرقی دواخانہ قائم کرکے انھوں نے طبابت یونانی کی وہ کمی پوری کر دی جس کے باعث یونانی اطبا کے تجویز کیے ہوئے نسخے دواؤں کی قیود سے آزاد اور تاثیر سے محروم تھے۔ ہر دوا اس کے نام اور وزن کے مطابق اور ہر مرکب اس کے اجزائے ترکیبی کے توازن اور تناسب کے ساتھ اگر کہیں مل سکتے تھے تو اسی دواخانے سے۔ یہ دواخانہ ان کے مکان کی نچلی منزل میں اس طرف کو واقع تھا جو رستہ چوک سرجہانسکھ کو جاتا ہے۔ مگر یہ دواخانہ بھی اپنے بانی کے ساتھ معدوم ہوگیا۔

اس دواخانے کے سامنے ایک کنواں تھا جس کی منڈیر پر رائے بہادر سانجھی مل بدن سے ننگے ایک دھوتی باندھے بیٹھے رہتے تھے اور ہر آنے جانے والے کو اپنے ہاتھ سے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پلاتے تھے۔ یہ کنواں اپنے آب سرد کے باعث شہر بھر میں مشہور تھا۔ رائے بہادر سانجھی مل پنجاب یونیورسٹی کے ان گریجویٹوں میں سے تھے جنھوں نے اس یونیورسٹی کے قیام کے بعد سب سے پہلے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد یہ پروونشل سول سروس سے منسلک ہوگئے۔ اور پنشن پانے کے بعد اپنے آپ کو تمام دنیاوی تعلقات سے منقطع کرکے تیاگ کا آشرم دھار بیٹھے۔ اور اپنا آخری زمانہ پیاسوں کو ٹھنڈا پانی اور بھوکوں کو اپنی توفیق کے مطابق کھانا کھلانے میں صرف کر دیا۔ بچوں کو بہت پیار کرتے تھے اور ہر راہ چلتے مسافر کو ذرا سی دیر کے لیے روک کر اپنی میٹھی باتوں سے اس کا دل خوش کر دیا کرتے تھے۔ لوگوں کے دل میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اور بڑے بڑے امرا بھی انھیں جھک کر سلام کرتے تھے۔

ڈاکٹر عاشق حسین نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ آغا حشر بھی بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ یہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ جب وہ اپنی کمپنی کے ساتھ لاہور آتے تھے تو بھاٹی دروازے ہی کے باہر اس مکان میں رہتے تھے جو ہری کرشن تھیٹر سے ملحق تھا جس میں ان کی کمپنی کے کھیل دکھائے جاتے تھے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جب وہ اپنی بیوی کی بیماری کے سلسلہ میں لاہور آئے تو پہلے بھاٹی دروازے ہی کے اندر میرے غریب خانے ہی میں رہے اور اس کے بعد نخ بازار میں میاں شمس الدین کے مکان میں رہنے لگے۔ اور پھر جب وہ اپنی فلم کمپنی کا کاروبار چلانے کے لیے لاہور آئے تو اس زمانے میں بھی کچھ عرصے تک میرے ہی مکان میں رہے۔ اس کے بعد وہ ریس کورس روڈ پر ایک بنگلے میں رہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ لیکن ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ بمبئی اور کلکتے میں گزرا۔ جب بھی ان کا قیام لاہور میں رہا ان کو ڈرامہ نویسی سے کبھی ایسی فرصت نہ ملی کہ وہ لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں کچھ زیادہ حصہ لے سکتے۔ ان ڈراموں میں جو انھوں نے لاہور میں رہ کر لکھے 'سفید خون' 'خواب ہستی' اور 'آنکھ کا نشہ' قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ نخ بازار میں میاں شمس الدین کے مکان میں رہتے تھے۔ اس مکان میں ایک شہ نشین تھی جس کے دروازے ایک گلی کی طرف کھلتے تھے۔ اسی میں ایک بخارچہ تھا۔ جس میں ایک چھوٹی سی دری بچھی رہتی تھی۔ حشر دن کا بیشتر حصہ اسی بخارچے میں گزارتے تھے۔ ان کی نشست کا سامان بہت مختصر ہوتا تھا۔ ایک دری ایک پنسل اور کچھ سادہ کاغذ۔ اس زمانے میں ان کے دوستوں میں سے حکیم فقیر محمد اور مداحوں میں سے عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت ان سے ملنے آتے تھے۔ میں بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ آغا صاحب کی بیوی کی بیماری روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس پریشانی کے باعث ان کی ڈرامہ نگاری کے کام میں ایسے زمانے میں تعطل واقع ہوا جب ہر طرف سے ان کے ڈراموں کی مانگ بڑھ رہی تھی۔ بیوی کی علالت کے دوران وہ بہت افسردہ خاطر رہتے تھے۔ آخر کار آپریشن کی نوبت پہنچی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ جب

ہم نے ان کی رفیقۂ حیات کو سپردِ خاک کیا تو آغا حشر بہت دیر تک قبر کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر اپنی چھڑی سے قبر کے ساتھ زمین پر ایک مستطیل کا خاکہ کھینچا اور کہا یہ حشر کی قبر ہے۔ اس کے بعد وہ بنارس چلے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں ناگہاں یہ خبر ملی کہ آغا حشر بہت زیادہ بیمار ہیں اور علاج کے لیے لاہور آئے ہیں۔ حکیم فقیر محمد کے علاج اور پنجاب کی آب و ہوا اور ایک نئے موسم کی گرم جوشی کی بدولت ان کی صحت جلد ہی بحال ہو گئی۔ اپنی ذاتی فلم کمپنی "حشر پکچرز" کے سلسلے میں اب وہ اس سرگرمی اور اتنی مستعدی سے کام کرنے لگے کہ میں نے انھیں ان کی جوانی کے زمانے میں بھی اس طرح کام کرتے نہ دیکھا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمت اور طاقت کا تمام باقی ماندہ سرمایہ جو شاید ایک مدت تک ان کی زندگی کا کفیل ہوتا ایک بیک بروئے کار آگیا اور ایک ہی برس میں ختم ہو کر رہ گیا۔

وفات سے دو روز پہلے یہ شعر کہا۔

کھو چکا جو جوشِ طاقت پھر ملے دشوار ہے
حشر اب صحت میری گرتی ہوئی دیوار ہے

حشر ایک درخشندہ آفتاب کی طرح افقِ ہند پر چمکا اور ایک شہابِ ثاقب کی طرح اپنی تابانیوں کو اپنے ساتھ لے کر گم ہو گیا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو یہ سرمایہ دارِ سرور و کیف اور ہنگامہ آرائے عیش و نشاط اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حشر لاہور کے مشہور قبرستان میانی شریف میں اسی مستطیل میں دفن ہیں جس کا خاکہ انھوں نے ۱۹۱۶ء میں اپنی بیوی کی قبر سے پیوستہ کھینچا تھا۔ یہ اس نیک بخت بیوی کا معراج تھا یا حشر کے خواب کی تعبیر۔ بہرحال یہ سعادت بھی بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی کہ حشر کی زندگی کا ایک اہم حصہ اسی کے حجاب میں گزرا۔ اور لاہور ہی کی خاکِ پاک میں ان کو ابدی راحت ملی۔

آغا حشر نے اردو اور ہندی میں بے شمار ڈرامے لکھے ہیں جو ہمیشہ مقبول ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو انڈین شیکسپیئر کہا کرتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ لقب ان کی ندرتِ تخیل اور ان کے اسلوبِ نگارش کو بہت راس آیا۔

چونکہ ڈاکٹر عاشق حسین نے اپنے مضمون میں پچھلے ساٹھ ستر برس کے عرصے سے بہت دور جا کر فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید نور الدین کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے اور بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ اس لیے لازم آتا ہے کہ ان کا ذکر بھی کر دیا جائے اور اس معزز خاندان کی عظمت کا کچھ سرسری سا بیان ہو جائے جس سے وہ تعلق رکھتے تھے۔

بھاٹی دروازے کے اندر موتی تبے کے کوچے سے شروع ہو کر کوچہ تحصیل تک ایک بازار ہے جسے بازار حکیماں کہتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کی بنیاد میرے جدِ امجد حکیم عبد اللہ انصاری نے اس زمانے میں ڈالی تھی جب وہ قاضی القضاۃ ہند اور صوبیدار کشمیر تھے۔ ان عالی قدر عہدوں کے علاوہ وہ بہت بڑے طبیب تھے۔ ان کے بھائی حکیم خدا بخش بھی جو نواب محمد ذکریا خاں صوبیدار لاہور کے عہد میں وزارت کے منصب پر ممتاز تھے۔ اور ملک الحکماء کے خطاب اور فرزند خانی کے اعزاز سے سرفراز، بہت بڑے طبیب اور اپنے تمول اور جود و سخا کے باعث مرجع خلائق تھے۔ قصبہ چونیاں کے ایک بزرگ سید غلام شاہ کے بیٹے سید غلام محی الدین کی شادی حکیم خدا بخش کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے ان کے تین بیٹے تھے۔ فقیر عزیز الدین، امام

[illegible]۱۸۴۵ء)، فقیر امام الدین (متوفی ۱۸۴۴ء) اور فقیر نورالدین (متوفی ۱۸۵۲ء)۔ فقیر نورالدین کے دوسرے بیٹوں کے علاوہ فقیر سید شمس الدین (متوفی ۱۸۷۲ء) تھے۔ فقیر سید شمس الدین کے بیٹے فقیر سید شہاب الدین تھے۔ اور ان کے بیٹے فقیر سید وحید الدین کے والد سید نجم الدین تھے۔ چونکہ سید غلام محی الدین کو فقر سے رغبت تھی اور خود بھی ایک روحانی پیشوا کی حیثیت سے صاحب رشد و ہدایت تھے۔ انھوں نے فقیر کا لقب اختیار کیا اور ان کی اولاد نے بھی اسی لقب کو اپنا سرمایۂ افتخار و امتیاز سمجھا۔

فقیر سید عزیز الدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں وزارت امور خارجہ کے عہدے پر فائز تھے۔ پنجاب کی کسی تاریخ پر بھی نظر ڈالیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ خالصہ دربار میں جو عزت فقیر سید عزیز الدین کو حاصل تھی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ وہ صاحب قلم بھی تھے اور صاحب سیف بھی۔ ان کی دانشوری اور حاضر جوابی کے تذکرے زبان زد خلائق ہیں۔ یہ جگہ ان کے سیاسی کارناموں کی تفصیل کے بیان کے لیے موزوں نہیں۔ فقط اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس بحران کے زمانے میں خالصہ حکومت اور برطانوی ارباب حل و عقد کے مابین جو خط و کتابت یا گفت و شنید ہوتی تھی فقیر سید عزیز الدین ہی کی وساطت سے ہوتی تھی۔ اور ان دونوں حکومتوں کے مابین جو آخری معاہدہ ہوا وہ "عزیز الدین شکاف ٹریٹی" ہی کہلاتا ہے۔ فقیر سید عزیز الدین نثر اور نظم دونوں میں مشاق اور اپنے زمانے کے بڑے بلند پایہ ادیب اور طبیب تھے اور آزاد تخلص کرتے تھے۔ ان کی نظم کا مجموعہ "دیوان آزاد" اب تک پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔

فقیر سید نورالدین اپنے بھائی فقیر سید عزیز الدین کی طرح خالصہ دربار میں بڑے مراتب عالی پر فائز رہے۔ ۱۸۱۲ء میں وہ جالندھر کے صوبیدار مقرر ہوئے اور اس کے بعد سیالکوٹ اور وزیرآباد کے پرگنوں کے عامل کی حیثیت سے انھوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح صاحب قلم اور صاحب سیف تھے۔ اور نہ صرف سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مدد و معاون رہے بلکہ اپنی عسکری صلاحیتوں کی بدولت بھی انھوں نے بڑا نام پایا۔ شاہ شجاع الملک والی افغانستان جب اپنے وطن اور تخت کو چھوڑ کر لاہور آئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مہمان ہوئے تو فقیر سید نورالدین ہی نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ "کوہ نور" جیسے مشہور زمانہ اور بے مثال ہیرے سے دستبردار ہو جائیں اور پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شاہ شجاع الملک کی من مانی شرائط اور منہ مانگی قیمت پر رضامند کر کے یہ ہیرا حاصل کیا۔ اور اسے ان کی کلغی کی زینت بنایا۔ اس تمام واقعہ کی روداد فقیر سید نورالدین کے قلم سے فارسی زبان میں لکھی ہوئی اب تک محفوظ ہے۔ یہ شاعر بھی تھے اور منور تخلص کرتے تھے۔ "دیوان منور" کا قلمی نسخہ اب بھی ان کے خاندان میں موجود ہے۔

فقیر سید غلام محی الدین کے تیسرے بیٹے میرے پھوپھا فقیر سید امام الدین (متوفی ۱۸۴۴ء) جو عمر میں فقیر سید عزیز الدین سے چھوٹے اور فقیر سید نورالدین سے بڑے تھے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں امرتسر میں قلعہ گوبند گڑھ کے صوبیدار تھے اور شاہی خزانے کے محافظ۔ خالصہ فوج کا تمام اسلحہ بھی انھیں کی تحویل میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں دربار کا سارا کاروبار انھیں تین نامور بھائیوں کی نگرانی میں انجام پاتا تھا۔

فقیر سید نورالدین کے ایک بیٹے فقیر سید شمس الدین (متوفی ۱۸۷۲ء) تھے۔ یہ بھی میرے پھوپھا تھے۔ یہ بڑے بیدار مغز

اور صاحبِ علم و فراست تھے۔ انھوں نے خالصہ حکومت کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد جب پنجاب میں انگریزی تسلط ہو گیا تو اس زمانے میں بھی اپنے علم و فضل اور بے مثال جرأتِ عمل کی بدولت بڑا نام پایا۔ بہبودِ عامہ کے سلسلے میں ان کی کارگزاریاں اس زمانے میں جب حکامِ حکومت کی تمام تر توجہ اپنے ذاتی مفاد تک محدود تھی بڑی وقعت رکھتی ہیں۔ یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر لاہور کے شہریوں میں اکتسابِ علم کا شوق پیدا کیا تھا۔ اور اسی مقصد کے پیشِ نظر "انجمن پنجاب" کی بنیاد رکھی۔ اور پھر پرانی روایات کو بالائے طاق رکھ کر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بھاٹی کے میدان میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ انگریزی عہد میں یہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے اور لاہور میونسپل کمیٹی کے رکن بھی۔ وہ فارسی میں بہت اچھا شعر کہتے تھے اور شمس تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں فقیر سید برہان الدین، فقیر سید زین العابدین اور فقیر سید شہاب الدین کو دنیاوی ثروت کے علاوہ علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ ۱۸۷۶ء میں فقیر سید برہان الدین اور فقیر سید زین العابدین نے وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور پھر یہ دونوں بھائی مدت تک پنجاب کی مختلف ریاستوں میں وزارت کے عہدوں پر فائز رہے۔ فقیر سید شمس الدین کے تیسرے بیٹے فقیر سید شہاب الدین پہلے تو تحصیلدار ہوئے اور پھر اپنے علم و فضل کی بدولت ضلع لاہور کے مدارس کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ یہ میرے والد کے بڑے بھائی حکیم حسام الدین کے داماد تھے۔ اور اس لیے رشتے میں میرے بھائی ہوتے ہیں۔ عربی اور فارسی زبان میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالےٰ کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ اپنے معزز خاندان کی روایات کے پابند تھے اور نجابت و شرافت کی زندہ تصویر۔ سردی کے موسم میں سبز رنگ کی مخمل کی عبا پہنتے تھے اور اسی رنگ کی مخمل کی چوگوشیہ اوڑھتے تھے۔ اپنے دونوں لاولد بھائیوں کی وفات کے بعد جب اپنے والد کی جاگیر جو لاہور تحصیل میں رائے ونڈ کے قریب واقع تھی۔ اور نو سو ایکڑ زمین پر مشتمل وراثت میں پائی تو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ یہ بھی ہر شام حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آکر بیٹھتے تھے اور اس محفلِ ادب کی رونق بڑھاتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹے فقیر سید نجم الدین جو اس سے پہلے سرکاری ملازمت سے منسلک تھے اپنے نامور والد کی طرح اپنی جاگیر کے انتظام کی مصروفیتوں کے باعث ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ فقیر سید نجم الدین رشتے میں میرے بھتیجے بھی تھے اور بھانجے بھی۔ اپنے ماموں حکیم امین الدین کی صحبت میں رہنے کے باعث انھیں اسلامی تاریخ سے عموماً اور ہسپانیہ کی تاریخ سے خصوصاً بہت دلچسپی ہو گئی تھی۔ اور انھیں کی رہنمائی میں انھوں نے ان مضامین پر بہت سی کتابیں پڑھیں۔ آخر کار وہ سید امیر علی کی ان دو کتابوں "سپرٹ آف اسلام" اور "ہسٹری آف دی سیریسنس" کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ان کا اردو ترجمہ کیا۔ میں نے ان کا ترجمہ دیکھا ہے۔ اور ترجمے کے مسودات بھی پڑھے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بڑی کامیاب تھی۔ مگر افسوس کہ ان کی دوسری مصروفیتوں کے باعث یہ دونوں کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوئیں۔ ان کی ناگہانی وفات کے بعد کچھ ایسے حالات ہو گئے کہ ان کے باپ دادا کے قیمتی کتب خانے کی نادر کتابوں کے ساتھ یہ مسودات بھی ضائع ہو گئے۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جس کا صدمہ میرا دل اب تک محسوس کر رہا ہے۔ فقیر سید نجم الدین کو موسیقی اور مصوری سے بھی بڑا شغف تھا۔ اور دلربا پر تو ان کا ہاتھ ایسا چلتا تھا کہ اس فن کے بڑے بڑے ماہر بھی ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ اقبال اکثر اصرار سے انھیں مجبور کر کے ان سے نغمے دلربا سنتے۔ اس وقت ان پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری رہتا۔ ان کے بیٹوں میں سے فقیر سید وحید الدین

نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں فوج میں ملازمت اختیار کی۔ اور ترقی کرتے کرتے کرنل کے بلند مرتبہ عہدے تک پہنچ گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر انھوں نے تجارت کا کاروبار شروع کیا۔ اس سے پہلے ان کے خاندان میں کسی نے تجارت کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ مگر فقیر وحید الدین کی ذاتی صلاحیتیں ان کے بڑے کام آئیں۔ اور انھوں نے کئی تجارتی ادارے قائم کیے جو ان کے لیے بہت منفعت بخش ثابت ہوئے۔ لیکن وہ بہت جلد ہی اپنے تجارتی کاروبار کو اپنے بیٹوں کے سپرد کر کے اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اچھی کتابیں پڑھنے والوں کے دل پر اپنے اندازِ فکر کی ندرت اور اسلوبِ نگارش کی دل آویزی کا سکہ بٹھا دیا۔ اقبال کی زندگی کے حالات اپنی کتاب "روزگارِ فقیر" کی دو جلدوں میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے قلمبند کیے اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے حضور رسولِ مقبول صلعم اور اصحابِ کبار کی زندگی کے حالات اپنی کتاب "محسنِ اعظم و محسنین" میں ایسی سلیس عبارت اور ایسے عام پسند زاویۂ نگاہ سے لکھے کہ اب اس کتاب کا انگریزی اور سندھی میں بھی ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ آج کل ان کے وقت کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف ہی میں صرف ہوتا ہے۔ اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ انھوں نے اس مصروفیت سے اپنے بزرگوں کی روایاتِ تصنیف و تالیف کو قائم رکھا ہے۔ اور اس زمانے میں جب قحط الرجال کے باعث ان کے نامور خاندان کی عظمت کے نشان معدوم ہو چلے تھے انھیں اپنی محنت مشقت اور فطری استعداد سے از سرِ نو بڑی آب و تاب سے روشن کیا ہے۔ اس خاندان کے سب بزرگ جن کا میں نے ذکر کیا ہے بھاٹی دروازے کے اندر بازارِ حکیماں میں بستے تھے اور اس بازار کی وہ معتبر حیثیت جو اسے صدیوں تک حاصل رہی ہے انھی بزرگوں کی درویشانہ صفات اور بے ریا زندگی کے باعث ہی رہی ہے جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ فقیر سید قمر الدین کے پوتے سید مغیث الدین اب بھی اپنے بزرگوں کی لال حویلی کے اس حصے میں رہتے ہیں جس کا پھاٹک بازارِ حکیماں میں کھلتا ہے اور انھوں نے اس حویلی کی دوسری منزل کو اپنے بزرگوں کے تبرکات اور زمانہ قدیم کے عجائبات سے آراستہ کر کے حقیقی معنوں میں ایک خزینۂ پارینہ بنا رکھا ہے۔

میں نے اوپر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا کچھ سرسری سا ذکر کیا ہے۔ ایک تو اس سلسلے میں کہ وہ بھاٹی دروازے کے اندر محلہ جلوٹیاں کے سامنے ایک مکان میں رہتے تھے۔ اور پھر اس سلسلے میں کہ وہ ایک عرصے تک اس محفلِ علم و ادب کی رونق بنے رہے جو ہر شام بازارِ حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمتی تھی۔ میں نے دانستہ ان کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس سے پہلے نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی عظمت کا سکہ اب دنیائے علم و ادب پر اس قدر بیٹھ چکا ہے اور ان کی زندگی کے حالات اور ان کے فکر و ذکر پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کا تعارف محتاجِ بیان نہیں۔ تاہم بھاٹی دروازے کی سب سے بڑی عظمت جس کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے اس کا مختصر سا ذکر بھاٹی دروازے کی نسبت سے کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اقبال کو اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق کچھ ایسا صحیح علم نہ تھا۔ جب وہ ایک طویل بیماری کے باعث بہت ضعیف ہو گئے اور اس وقت ان کا یہ اندازہ تھا کہ ان کی عمر ۶۰ برس سے تجاوز کر چکی ہے تو ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ اب میں زیادہ دیر تک زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری عمر ۶۳ برس سے زائد نہ ہو جائے اس لیے کہ حضور رسولِ مقبول صلعم کی عمر جہاں تک یقینی طور پر معلوم ہو سکا ہے ۶۳ برس کی تھی۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور انھوں نے بڑی دھیمی اور پرسوز آواز

روزِ محشر اعتبارِ ماست او

در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

پھر ان کی آواز بھرا گئی۔ اور سسکیاں بھر کر رونے لگے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اپنی کتاب 'ذکرِ اقبال' میں ان کی ولادت ۲۲ ذوالحجہ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ان کی وفات کے وقت ۶۵ برس کی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا ماخذ غالباً ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بیان ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہوتی تو اقبال کی حسرت دل ہی دل میں رہ جاتی۔ اور ۶۳ برس کی عمر سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کی آرزو بر نہ آتی۔ لیکن خدا فقیر سید وحید الدین کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اپنی کتاب 'روزگارِ فقیر' میں بڑی تحقیق کے بعد اقبال کی پیدائش کی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ۶۱ برس کی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اس تاریخ پر اعتبار کیا جائے تو اقبال کی آرزو پوری ہو گئی۔ اور وہ ۶۳ برس کی عمر سے پہلے واصل بحق ہو گئے۔

فقیر سید وحید الدین کے بیان کے مطابق اقبال نے ۱۸۹۳ء میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہرحال جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے۔ اور گورنمنٹ کالج کی بی۔ اے کی جماعت میں داخل ہوئے اور انگریزی فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ شورِ محشر کے ۱۵ دسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی غزل اس مشاعرے میں پڑھی جو بازار حکیماں میں اسی سال منعقد ہوا۔ مجھے اپنے بھائی حکیم امین الدین سے زبانی معلوم ہوا تھا کہ ان کے مکان پر اقبال کا آنا جانا ۱۸۹۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۷ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور عربی اور انگریزی میں اوّل آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ انھوں نے ایم۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا۔ اس وقت تک اقبال گورنمنٹ کالج کے کواڈرینگل کے کمرہ نمبر ۱ میں رہتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں جب اقبال ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے تو وہ بھاٹی دروازے کے اندر اس بالاخانے میں جو محلہ جلوٹیاں کے سامنے گمیٹو حلوائی کی دکان کے اوپر واقع ہے رہنے لگے۔ اقبال ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک اسی مکان میں رہے۔ اس تمام عرصے میں وہ ہر شام کو بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے اور اپنے دوستوں کو اپنا کلام سناتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھنے کے لیے اپنی نظم "تصویرِ درد" لکھی تو سب سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سنایا۔ وہ اسی طرح ہر سال جب کوئی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھتے تو انھیں جلسۂ عام میں پڑھنے سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سناتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ "مخزن" بازار حکیماں سے شائع کیا تو اقبال کی پہلی نظم "ہمالہ" جسے شیخ عبدالقادر نے اسی بیٹھک میں سنا تھا مخزن کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔

اقبال کی وہ نظمیں جو انھوں نے انگلستان جانے سے پہلے لکھیں اور جو بعد میں ان کی کتاب "بانگ درا" میں شائع ہوئیں اس انے میں لکھی گئی تھیں جب وہ بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اور اس لیے اس عظمت کی سعادت جو اقبال سے منسوب ہے بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی۔

اقبال نے جو نظمیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہ کر لکھیں ان کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال ۱۹۰۸ء میں لستان سے واپس آئے۔ اور وکالت شروع کی۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اٹھ کر موہن لال روڈ پر جو آج کل اردو بازار سے موسوم ہے اس باغ کے عقب میں جو بھاٹی اور موری دروازے کے درمیان میں واقع ہے لالہ چونی لال مونگا کے مکان میں رہنے لگے۔ مگر اس مکان میں وہ کچھ زیادہ دیر تک نہ رہے۔ منشی طاہر الدین کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۰۸ء کے ماہ اکتوبر میں انارکلی کا وہ بالاخانہ کرائے پر لے لیا جس میں پہلے سر محمد شفیع وکالت کرتے تھے۔ اس مکان میں وہ ۱۹۲۲ء تک رہے۔ اس نقل مکان سے مطلب نہیں کہ ان کا بھاٹی دروازے سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ شاید یہ کہنا بجا ہوگا کہ حکیم شہباز دین کی بیٹھک کی کشش ان کے دل میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ وہ اس تمام عرصے میں ہر روز شام کو بلا ناغہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس بیٹھک میں آ بیٹھتے اور جیسا میں اوپر لکھا ہے ان کے دم قدم سے یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی۔ وہ تمام نظمیں جو انھوں نے اس زمانے میں لکھیں اور جن میں "اسرار خودی" کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق اسی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی کوئی نظم خلیفہ نظام الدین کو جن کی آواز بہت دل کش اور پر سوز تھی پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ اور ان کی زبان سے اپنے اشعار سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ ان نظموں کا بھاٹی دروازے ہی کے سر سہرا ہے حقیقت سے کچھ بعید نہ ہوگا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ۱۹۲۲ء میں حکیم امین الدین کی وفات کے بعد بازار حکیماں کی یہ پرانی محفل اجڑی اور ادھر اقبال ی برس انارکلی کے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک بنگلے میں جو اس زمانے میں سید محمد لطیف مصنف "تاریخ لاہور" کی بیوہ کی ملکیت تھا اٹھ گئے۔ اور ان کی محفل جو کبھی بازار حکیماں میں جمتی تھی۔ کوئینز روڈ پر نواب سر ذوالفقار علی خاں کے دولت کدے "زرفشاں" میں جمنے لگی۔ اب بھاٹی دروازے سے اقبال کی آمد و رفت کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہو گیا۔ مگر وہ شیخ گلاب دین وکیل سے ملنے کے لیے جو ان کے وطن مالوف سیالکوٹ ہی کے رہنے والے تھے اور مولوی احمد دین وکیل کی مزاج پرسی کے لیے جو اس عرصے میں مسلسل بیمار رہے کبھی کبھی بھاٹی دروازے کی طرف آ نکلتے۔ اور اس طرح چند لمحوں کے لیے بازار حکیماں کی پرانی محفل کی یاد تازہ ہو جاتی ن فقیر سید نجم الدین جو ابھی تک سلسلۂ ملازمت سے منسلک تھے جب کبھی چھٹیوں میں لاہور آتے تو وہ خود جاکر ہر روز انھیں اپنے کان لال حویلی میں اپنے ساتھ لے آتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اقبال ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ کبھی ان سے دربار پر اپنے دل پسند راگ سنتے اور کبھی تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانان عالم نے جو عروج یا زوال کی منزلیں طے کی تھیں ان کے اسباب پر پنے خیالات ظاہر فرماتے۔ اور پھر عالم اسلامی کے مستقبل پر ان امید افزا توقعات سے سننے والوں کا دل گرما دیتے جن کی جھلک ن کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ فقیر سید نجم الدین کے اصرار پر اپنا تازہ کلام سناتے۔ ان کی آواز

میں ایسا درد اور سوز تھا کہ پڑھنے والے جن میں سے اکثر اگرچہ ان کے اشعار کے معانی کی تہ کو تو نہ پہنچ سکتے مگر ان کی زبان سے ان کے اشعار سن کر بے تاب ہو جاتے۔

اس زمانے میں اقبال کی شاعری مقبول خاص و عام ہو چکی تھی۔ اور ان کا نام ایک ایسا طلسم بن گیا تھا کہ جو شعر بھی ان کے نام سے منسوب ہوتا یا شائع ہوتا لوگ اس کے الفاظ سے نہ صرف متاثر ہی ہوتے بلکہ اس کے مطالب کی گہرائیوں پر غور و فکر کرنے لگ جاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب اقبال کا انداز تفکر اور اسلوب بیان ملک بھر کے تعلیم یافتہ طبقوں کے دل پر عموماً اور مسلمان نوجوانوں کے دل پر خصوصاً ایسا حاوی ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اسلام کے مستقبل کو اسی آئینے میں دیکھنے لگے تھے۔ اور ملک کا ہر برنا و پیر ان کی تصنیفات کو حرز جاں سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے اس عظیم الشان شاعر کی تصانیف کی اشاعت کی تعیین کر دی جائے کہ اس سے ان کی شاعری کے ارتقا کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اقبال کی بعض نظمیں جو "بانگ درا" میں شائع ہوئیں ان کی شاعری کے دور ارتقا کی ابتدائی منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مگر وہ ایک مجموعے کی شکل میں ۱۹۲۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ اس سے پہلے ان کی کتابیں "اسرار خودی" ۱۹۱۲ء میں، "رموز بے خودی" ۱۹۱۸ء میں اور "پیام مشرق" ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی دوسری کتابیں "زبور عجم" ۱۹۲۷ء میں "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں "بال جبریل" ۱۹۳۵ء میں "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ۱۹۳۶ء میں "ضرب کلیم" بھی ۱۹۳۶ء میں اور "ارمغان حجاز" ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئیں۔ بلاشبہ اکبر الہ آبادی کے اشعار نے درپردہ ہندوستان کے رہنے والوں کی آنکھوں پر سے وہ پردہ اٹھا دیا تھا جو مغربی تعلیم اور تہذیب نے ان پر ڈال رکھا تھا۔ لیکن اقبال کے ان غیر مبہم نظریات نے جو ان کے اشعار کے افق پر درخشاں ستاروں کی طرح ابھر ابھر کر ایک نئی صبح زندگی کا پیغام دیتے ہیں مغربی تہذیب کا وہ قلعہ مسمار کر دیا جو مغربی تعلیم کی بنیادوں پر طلبا کے ذہنوں میں استوار ہوا تھا۔

اس مضمون کے مقتضیات کے پیش نظر اس جگہ شاعر مشرق کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے عدیم المثال جوہر فکر و نظر پر افسوس کہ تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ——

دورہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

اور یقیناً اقبال وہ مرد حق تھا جو قرنہا قرن کے بعد پیدا ہوا اور اب شاید دور پر دور گزر جائیں تو مشکل ہی گیتی ایسا مرد حق پیدا نہ کر سکے گی۔ اور گردش ازل و نہار اس نہان خانۂ ہستی کے ہزار در ہزار اسرار فاش کرتی چلی جائے مگر وہ دانائے راز پھر پیدا نہ ہوگا جو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالم اسلام کو ایک حیات نو کا پیغام دے کر خود موت کی آغوش میں سو گیا۔

اقبال نے اپنی علالت کے زمانے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے ایک رباعی کہی تھی ——

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگار این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

س رُباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں اس احسان کا ایک ذرا سا شائبہ ضرور موجود تھا کہ شاید آئندہ کسی زمانے میں پردگی ے پارینۂ روزگار کا کوئی دانائے راز پھر پیدا ہو جائے مگر میں جو اپنے بچپن سے ان کی وفات کے وقت تک سائے کی طرح ان ے ساتھ ساتھ رہا ہوں الحمدللہ فطرت کے اس رازداں کی قدرتِ فکر و نظر سے خوب واقف ہوں انہیں کے ایک شعر پر ان کی عظمت ی اس مختصر داستان کو ختم کرتا ہوں ـــــ

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

مقصدِ بیان قطعی نہیں مگر جب بھاٹی دروازے کے بازارِ حکیماں کا ذکر آ ہی گیا ہے تو یہ بیان خود نمائی پر محمول نہ کیا جائے کہ راقم الحروف نے بھی علم و ادب کی مختلف اصناف میں جو خدمات انجام دی ہیں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آبِ رواں کا ایک جرعہ اور انہیں انایانِ آئینِ فطرت کے خوانِ نعمت کا ایک ریزہ ہیں جن کی صحبت کی سعادت خوبیٔ تقدیر سے مجھے نصیب ہوئی۔

میں نے ابتدا میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی۔ یہ مدرسہ اس وقت بھی آج کل کی طرح سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ملحق تھا۔ اہلِ پنجاب کے سررشتہ تعلیم نے اس بات کا خاص انتظام کر رکھا تھا کہ اس مدرسے کے اساتذہ علم و فضل میں فقید المثیل و طریقۂ تعلیم میں عدیم المثال ہوں۔ مولوی سید احمد کبیر، لالہ مدن گوپال، مولوی غلام رسول قریشی، پنڈت پربھو دت شاستری، لالہ سکھ دیال، مرزا احمد سعید، مولوی عبداللہ خاں، اور ماسٹر پران ناتھ جہاں تعلیم و تعلم میں سخت کوش تھے وہاں اپنی شفقت اور شرافت کے باعث طلبا میں ہر دلعزیز اور حکام کی نظر میں واجب احترام تھے۔ یہ مدرسہ میرے زمانۂ تعلیم کے دوران میں ایسے ایسے نامور ہیڈ ماسٹروں کی نگرانی میں سرچشمۂ علوم و فنون رہا جن کے نام جوہرِ کمال کے ضامن اور سرمایۂ ثقافت و شرافت کے کفیل تھے۔ رائے بہادر شو دیال، رائے بہادر سندر داس سوری، مسٹر ٹائیڈ مین، مسٹر لنگاب ا.ن، مسٹر وانٹ اور ان سب سے بڑھ کر سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل مسٹر نولش وہ شفیق استاد تھے جنہوں نے طلبا کی نظر میں مدرسے کو گھر سے زیادہ محبوب اور اکتسابِ علم کو جان سے زیادہ عزیز بنا دیا۔ میرے ذہنی نشو و نما کی تربیت بھی انہیں استادوں کے دامنِ عاطفت میں ہوئی۔

انہیں ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسر آئی جس پر میں جس قدر بھی فخر کروں بجا ہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد جو اس زمانے میں امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے کچھ دنوں کے لیے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں مولوی غلام رسول کی جگہ ہمیں عربی فارسی اور اردو پڑھانے لگے۔ جب وہ ہمیں سبق دیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک بحرِ مواج ہے کہ اُبل پڑا اور حکمت و دانش کا ایک ابرِ محیط ہے کہ فضائے آسمان پر چھا گیا۔ ہم تشنگانِ علم نے اپنی تنگیٔ ظرف کے باوجود اس بحرِ بیکراں کی چھال سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور ان کی بارشِ دانش سے جتنے لالی آبدار جمع ہو سکتے تھے ان سے اپنا دامن بھر لیا۔

سنٹرل ماڈل سکول اور اس کے اساتذہ کرام کا میں نے اس مضمون میں اس لیے ذکر کر دیا ہے کہ یہ دانش گاہ بھی بھاٹی دروازے ہی کے علاقے میں ہے۔ اور وہ اکتسابِ علم کے لحاظ سے طلبا کی ناموری اور شہرتِ دوام کا باعث بنتے رہے۔ علاقے کے ان ہی فیض رساں بزرگوں کی تلاش کے مرہونِ احسان ہیں۔ میرے دل میں کچھ تقاضا ہے کہ ان نامور اساتذہ کے متبرک علم و فضل پر خامہ فرسائی کرکے اور کچھ ان بزرگوں کے قدموں میں بیٹھ کر جو ہر شام میرے بھائی حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمع ہو جایا کرتے تھے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے ہی میں حصولِ علم کا شوق اور صنائع ادب کا ذوق پیدا ہوگیا۔ اور میں اپنے لڑکپن ہی میں اپنے مستقبل کو جس کی بہار اب اسی کی خزاں کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہے اور جس کی یاد کے سوا اب کچھ باقی نہیں۔ اردو ادب ہی کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس باب میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے اس کا بیان بہ ہر نوع اپنی ستائش پر محمول ہوگا اور اس سے میرے جبلی انکسار اور فطری عجز کے مجروح ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے ۱۹۱۹ء میں ماہنامہ کہکشاں ہی سے سر عبدالقادر اور سر محمد اقبال کی تحریک اور حوصلہ افزائی سے "مخزن" ہی کے نقشِ قدم پر چل کر ایک پندرہ روزہ ادبی رسالہ "ہزار داستان" اور اس کے ساتھ ساتھ ہی بچوں کے لیے ادب لطیف کا ایک ہفتہ وار رسالہ "نونہال" شائع کیا۔ یہ دونوں رسالے ۱۹۲۳ء تک میری ذاتی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ اور جب میں اس سال سرکاری ملازمت سے منسلک ہوگیا تو میں نے ان رسالوں کی ادارت اپنے دو نہایت ہی عزیز دلدادگانِ ادب سید عابد علی عابد اور مسٹر ہادی حسین کو سونپ دی۔ سید عابد علی عابد جن کا نام اب علمی اور ادبی حلقوں میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں بعد میں قانون کا امتحان پاس کرکے اور مسٹر ہادی حسین انڈین سول سروس سے منسلک ہو کر جب لاہور سے باہر چلے گئے تو یہ دونوں رسالے بند ہو گئے۔

میں نے افسانہ نگاری بھی کی ہے ڈرامے بھی اور نظم کے ٹکڑے بھی لکھے ہیں۔ شعر بھی کہے ہیں لیکن وہ حقیر خدمت جو محض اللہ کی توفیق ہی سے میرے ہاتھوں انجام پائی ہے اور جسے میں اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے اس لفظی ترجمے کو جو قدیم اردو زبان میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا موجودہ زمانے کی آسان و سلیس زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس تالیف کے پانچ پارے شائع ہو چکے ہیں اور باقی زیرِ طبع ہیں۔

ڈاکٹر عاشق حسین کی خواہش کے مطابق میں نے بھاٹی دروازے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مختصر سا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن یہ اجمال اب بھی تفصیل چاہتا ہے۔ اگر زندگی نے فرصت دی تو شاید یہ تفصیل بھی کبھی قلمبند ہو جائے۔ اس مضمون میں میں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جو میرے ذہن میں محفوظ تھیں لیکن سنین، واقعات اور بعض دوسرے تعینات کی صحت کے پیشِ نظر میں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کی تاریخ جسے ڈاکٹر غلام حسین نے بڑی محنت اور تلاش سے مرتب کیا ہے اور سر لیپل گرفن کی مشہور تالیف "تذکرۂ رؤسائے پنجاب" سے استفادہ کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔ یہ دونوں معتبر اور مستند ذرائع اگر دستیاب نہ ہوتے تو یہ مضمون تشنۂ اسناد رہ جاتا اور اس لیے ان دونوں کتابوں کے مؤلفین کا غائبانہ شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تاریخ ولادت اور کئی دوسری معتبر معلومات کے لیے میں جناب اقبال پر فقیر سید وحید الدین کی بے مثال کتاب "روزگارِ فقیر" کا مرہونِ منت ہوں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ایک نثری اشاعت کے مقتضیات کے اعتبار سے یہ مضمون اختصار کی حد سے کسی قدر گزر گیا ہے مگر۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

کھلونے

(ناولٹ)

مسعود مفتی

کھلونے

مسعود مفتی

عبدالرحمان نے دو اینٹیں جوڑ کر رکھیں اور ان پر کھڑا ہو کر کھڑکی کے شیشے میں سے اندر جھانکنے لگا۔

چھوٹا سا کمرہ ـــــ درمیان میں بڑی سی میز ـــــ میز کے اوپر کنارے پر ایک شکنجہ ـــــ دوسرے کنارے کے پاس چھت سے بندھی ہوئی دو رسیاں لٹک رہی تھیں ـــــ میز پر ایک مرد بنیان اور دھوتی پہنے لیٹا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں شکنجے میں کسے تھے اور دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر چھت سے لٹکی ہوئی رسیوں سے بندھے تھے ـــــ کمر کمان بنی تھی جس کا نچلا سرا ادھی سا میز پر ٹکا تھا ـــــ دھوتی سمٹ کر کمر کے گرد اکٹھی ہوئی تھی اور ننگی ٹانگوں پر شکنجے کے دباؤ کی وجہ سے رگیں پھول رہی تھیں۔

عبدالرحمان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس نے اپنا چہرہ شیشے پر اتنا دبایا کہ ناک چپٹی ہونے لگی۔

میز کے پاس بڑی بڑی مونچھوں والا تھانیدار ہاتھ میں کچھ کاغذ پکڑے کھڑا تھا۔ اس کے تیور خشمگیں تھے اور جسم کا ہر رواں رعب چھانٹ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلتے نظر آئے ـــــ میز پر لیٹے ہوئے آدمی نے تھوڑا سر اٹھایا۔ آنسو بھری آنکھوں سے تھانیدار کو ملتجیانہ انداز میں دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔

تھانیدار نے سٹپٹا کر سر جھٹکا اور پاس کھڑے ہوئے سپاہی کو اشارہ دیا۔ سپاہی نے گول پہیئے کو گھما کر شکنجے کو ذرا سا کسا اور بڑا سا جوتا اٹھا کر میز پر لیٹے ہوئے مرد کو دھڑا دھڑ پیٹنے لگا۔

وہ مرد تڑپ تڑپ کر ایسے چیخنے لگا کہ اس کی آواز بند کھڑکیوں میں سے بھی باہر آنے لگی۔

آج چند منٹ پہلے عبدالرحمان نے یہ چیخیں سنی تھیں اور چلتے چلتے گلی میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے شک گزرا کوئی کسی کو قتل کر رہا ہے۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر کھڑکی دیکھ کر اس کے شیشوں میں سے اندر جھانکنے لگا تھا۔ اب جو اس نے یہ نظارہ دیکھا تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائلیں زمین پر رکھ دیں۔ ناک کو ایک دفعہ سہلایا اور پھر سے چہرہ شیشے پر دبا دیا۔ ناک چپکنے سے اس نے بڑی مشکل سے ایک چھینک روکی۔

پٹنے والا مرد بڑے زور سے ہائے ہائے کر رہا تھا اور سپاہی اس کو تڑا تڑ جوتے مار رہا تھا۔ مرد کی ہر چیخ کے ساتھ عبدالرحمان کا دل حلق کو آنے لگتا۔ جب اس کے جسم پر جوتے کی چوٹ لگتی تو سارا جسم اچھلتا۔ چھت سے لٹکی ہوئی رسیاں عجب تانے بانے بُننے لگتیں اور عبدالرحمان کانپ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ٹانگیں بھی ہولے ہولے کانپنے لگیں۔

پیچھے سے ایک زوردار تھپڑ عبدالرحمان کی کمر پر پڑا۔

ـــــ وہ کلبلا کر پیچھے ہٹا۔

ایک سپاہی اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر اُس نے فائیلوں کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ڈپٹ کر بولا۔

"چل ہٹ پرے۔ آیا ہے ماں کا خصم تماشہ دیکھنے۔"

عبدالرحمان فائیلیں اُٹھا کر ایسا بھاگا کہ تھانے کی حد سے کافی دُور جا کر اُس نے سانس لیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور خوف کے مارے ہر آتے موٹر یا سائیکل سے بھی دُور دُور رہنے کی کوشش کرتا۔ اسی کوشش میں وہ کئی دفعہ دُوسرے راہگیروں سے بھی جا ٹکرایا۔ چلتے چلتے اُس نے محسوس کیا کہ پیٹھ سے ساری قمیص پسینے سے تر ہے۔ تب اُس نے فائیلیں دُوسرے ہاتھ میں پکڑ لیں اور فارغ ہاتھ کو قدرے مشکل سے گھما کر پیٹھ کے پیچھے لے گیا۔ دو اُنگلیوں کی چٹکی میں قمیص کا ذرا سا کپڑا پکڑ کر کھینچا تو قمیص کے بتدریج الگ ہونے سے ایک لہر سی ساری پیٹھ پر گھوم گئی اور اُسے سکون سا مل گیا۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "توبہ، میری توبہ" اور وہ زیرِ لب آیت الکرسی پڑھنے لگا تا کہ خوف کچھ کم ہو۔

گھر پہنچا تو ڈیوڑھی میں داخل ہو کر اُس نے دروازہ بڑے زور سے بند کیا۔ اندر سے اُس کی بیوی کی آواز آئی۔

"کون ہے باہر؟"

مگر وہ جواب دیے بغیر گھبرایا ہوا سا آگے بڑھ گیا۔ صحن میں چارپائی پر اُس کا تین سالہ بچہ سویا پڑا تھا۔ وہ بے تابی سے آگے بڑھا اور بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ ایک دو دفعہ والہانہ چُوما اور پھر زیرِ لب بولا "توبہ میری توبہ۔"

بچہ نیند میں اچانک چونکنے پر رونے لگا تو عبدالرحمان اُسے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ مگر وہ روتا گیا۔ اُس کے کھلے مُنہ کے آر پار رال تن جاتی۔ جو بوجھل ہو کر ایک طرف کو ڈھلک جاتی۔ ادھ کھُلی آنکھوں کی باریک درزوں میں پانی بھرنے لگا جو باہر کے کونوں سے ڈھلک کر کانوں سے ہوتا ہوا گردن تر کرنے لگا۔

"ہائے کیا تماشہ کھڑا کر دیا آتے ہی۔"

بیوی کی آواز پر سر اُٹھا کر اُس نے دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چھُری تھی اور دُوسرے میں آدھا چھِلا ہوا شلغم تھا۔

"اتنی مشکل سے سلا کر ذرا کی ذرا کام کرنے لگی تھی اور اس فتنے کو پھر جگا دیا آپ نے۔"

بچے کے رونے کی تان بلند ہونے لگی تو بیوی پاس آکر بولی:

"لائیے مجھے دیں ـــــ میں سلاؤں اس کم بخت کو ـــــ نیند پوری کیے بغیر جاگ اُٹھا تو ساری شام اجیرن کر دے گا۔"

عبدالرحمان نے خاموشی سے بچہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

بیوی نے کندھے سے لگا کر دو تھپکیاں دیں اور ساتھ ساتھ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے کندھوں کو گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلانے لگی۔ بچے نے ایک دو دفعہ ننھی ننھی ٹانگیں ہلائیں۔ بے تابی سے سر کو پٹخا۔ ایک آدھ دفعہ آں آں کو زور سے ماں کے

میں اپنا یہ شعر پڑھتے

روزِ محشر اعتبارِ ماست او

در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

پھر ان کی آواز جواب دے گئی۔ اور سسکیاں بھر کر رونے لگے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اپنی کتاب "ذکرِ اقبال" میں ان کی ولادت ۲۲ ذی القعدہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ان کی وفات کے وقت ۶۵ برس کی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا ماخذ غالباً ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بیان ہے۔ مگر یہ تاریخ صحیح ہوتی تو اقبال کی حسرت دل ہی دل میں رہ جاتی۔ اور ۶۳ برس کی عمر سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کی آرزو بر نہ آتی۔ لیکن ڈاکٹر فقیر سید وحید الدین کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اپنی کتاب "روزگارِ فقیر" میں بڑی تحقیق کے بعد اقبال کی پیدائش کی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ۶۱ برس کی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اس تاریخ پر اعتبار کیا جائے تو اقبال کی آرزو پوری ہو گئی۔ اور وہ ۶۳ برس کی عمر سے پہلے ہی واصل بحق ہو گئے۔

فقیر سید وحید الدین کے بیان کے مطابق اقبال نے ۱۸۹۳ء میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہرحال جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے۔ اور گورنمنٹ کالج کی بی۔ اے کی جماعت میں داخل ہوئے اور انگریزی فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ شور محشر کے ۱۵ دسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی غزل اس مشاعرے میں پڑھی جو بازار حکیماں میں اسی دن منعقد ہوا۔ مجھے اپنے بھائی حکیم امین الدین سے زبانی معلوم ہوا تھا کہ ان کے مکان پر اقبال کا آنا جانا ۱۸۹۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۷ء میں اچھے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ انھوں نے ایم۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا۔ اس وقت تک اقبال گورنمنٹ کالج کے کواڈرینگل کے کمرہ نمبر ۱ میں رہتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں جب اقبال ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے تو وہ بھاٹی دروازے کے اندر اس بالاخانے میں جو محلہ جلوٹیاں کے سامنے گھیبڑ حلوائی کی دکان کے اوپر واقع ہے رہنے لگے۔ اقبال ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک اسی مکان میں رہے۔ اس تمام عرصے میں وہ ہر شام کو بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے اور اپنے دوستوں کو اپنا کلام سناتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھنے کے لیے اپنی نظم "تصویرِ درد" لکھی تو اسے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سنایا۔ وہ اسی طرح ہر سال جب کوئی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھتے تھے تو جلسۂ عام میں پڑھنے سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سناتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ "مخزن" بازار حکیماں سے شائع کیا تو اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم "ہمالہ" جسے شیخ عبدالقادر نے اسی بیٹھک میں سنا تھا مخزن کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔

اقبال کی وہ نظمیں جو انھوں نے انگلستان جانے سے پہلے لکھیں اور جو بعد میں ان کی کتاب "بانگ درا" میں شائع ہوئیں اس زمانے میں لکھی گئی تھیں جب وہ بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اور اس لیے اس عظمت کی سعادت جو اقبال سے منسوب ہے بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی۔

اقبال نے جو نظمیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہ کر لکھیں ان کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آئے۔ اور وکالت شروع کی۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اٹھ کر موہن لال روڈ پر جو آج کل اُردو بازار سے موسوم ہے اس باغ کے عقب میں جو بھاٹی اور موری دروازے کے درمیان میں واقع ہے لالہ چونی لال مونگا کے مکان میں رہنے لگے۔ مگر اس مکان میں وہ کچھ زیادہ دیر تک نہ رہے۔ منشی طاہر الدین کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۰۸ء کے ماہ اکتوبر میں انارکلی میں وہ بالاخانہ کرائے پر لے لیا جس میں پہلے سر محمد شفیع وکالت کرتے تھے۔ اس مکان میں وہ ۱۹۲۲ء تک رہے۔ اس انتقال مکان سے یہ مطلب نہیں کہ ان کا بھاٹی دروازے سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ شاید یہ کہنا بجا ہوگا کہ حکیم شہباز دین کی بیٹھک کی کشش ان کے دل میں پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی۔ وہ اس تمام عرصے میں ہر روز شام کو بلا ناغہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس بیٹھک میں آبیٹھتے اور جیسا میں نے اوپر لکھا ہے ان کے دم قدم سے یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی۔ وہ تمام نظمیں جو انھوں نے اس زمانے میں لکھیں اور ان میں "اسرار خودی" کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق اسی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی کوئی نظم خلیفہ نظام الدین کو جن کی آواز بہت دل کش اور پُرسوز تھی پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ اور اُن کی زبان سے اپنے اشعار سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ ان نظموں کا بھاٹی دروازے ہی کے سر سہرا ہے تو حقیقت سے کچھ بعید نہ ہوگا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ۱۹۲۲ء میں حکیم امین الدین کی وفات کے بعد بازار حکیماں کی یہ پرانی محفل اُجڑی اور ادھر اقبال اسی برس انارکلی کے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک بنگلے میں جو اس زمانے میں سید محمد لطیف مصنف "تاریخ لاہور" کی بیوہ کی ملکیت تھا اٹھ گئے۔ اور ان کی محفل جو کبھی بازار حکیماں میں جمتی تھی۔ کوئینز روڈ پر نواب سر ذوالفقار علی خاں کے دولت کدے "زر افشاں" میں جمنے لگی۔ اب بھاٹی دروازے سے اقبال کی آمد و رفت کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہوگیا۔ مگر وہ شیخ گلاب دین وکیل سے ملنے کے لیے جو ان کے وطن مالوف سیالکوٹ ہی کے رہنے والے تھے اور مولوی احمد دین وکیل کی مزاج پرسی کے لیے جو اس عرصے میں مسلسل بیمار رہے کبھی کبھی بھاٹی دروازے کی طرف آنکلتے۔ اور اس طرح چند لمحوں کے لیے بازار حکیماں کی پرانی محفل کی یاد تازہ ہو جاتی ہاں فقیر سید نجم الدین جو ابھی تک سلسلۂ ملازمت سے منسلک تھے جب کبھی چھٹیوں میں لاہور آتے تو وہ خود جا کر ہر روز انھیں اپنے مکان لال حویلی میں اپنے ساتھ لے آتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اقبال ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ کبھی ان سے دلربا پر اپنے دل پسند راگ سنتے اور کبھی تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانانِ عالم نے جو عروج یا زوال کی منزلیں طے کی تھیں ان کے اسباب پر اپنے خیالات ظاہر فرماتے۔ اور پھر عالمِ اسلامی کے مستقبل پر ان امید افزا توقعات سے سننے والوں کا دل گرما دیتے جن کی جھلک ان کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ فقیر سید نجم الدین کے اصرار پر اپنا تازہ کلام سناتے۔ ان کی آواز

میں پیدا درد اور سوز تھا کہ ملت کے طلبہ میں سے اکثر اگرچہ ان کے اشعار کے معانی کی تہ تک تو نہ پہنچ سکتے مگر ان کی زبان سے ان کے اشعار سن کر بے تاب ہو جاتے۔

اس زمانے میں اقبال کی شاعری مقبول خاص و عام ہو چکی تھی۔ اور ان کا نام ایک ایسا طلسم بن گیا تھا کہ جو شعر بھی ان کے نام سے منسوب ہوتا یا شائع ہوتا لوگ اس کے الفاظ سے نہ صرف متاثر ہی ہوتے بلکہ اس کے مطالب کی گہرائیوں پر غور و فکر کرنے لگ جاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب اقبال کا انداز تفکر اور اسلوب بیان ملک بھر کے تعلیم یافتہ طبقوں کے دل پر عموماً اور مسلمان نوجوانوں کے دل پر خصوصاً ایسا حاوی ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے نادیۂ نگاہ سے اسلام کے مستقبل کو اسی آئینے میں دیکھنے لگے تھے۔ اور ملک کا ہر برنا و پیر ان کی تصنیفات کو حرز جاں سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے اس عظیم الشان شاعر کی تصانیف کی اشاعت کا تعین کر دیا جائے کہ اس سے ان کی شاعری کے ارتقا کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے اگرچہ اقبال کی بعض نظمیں جو "بانگ درا" میں شائع ہوئیں ان کی شاعری کے دور ارتقا کی ابتدائی منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مگر وہ ایک مجموعے کی شکل میں ۱۹۲۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ اس سے پہلے ان کی کتابیں "اسرار خودی" ۱۹۱۲ء میں "رموز بے خودی" ۱۹۱۸ء میں اور "پیام مشرق" ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی دوسری کتابیں "زبور عجم" ۱۹۲۷ء میں "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں "بال جبریل" ۱۹۳۵ء میں "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ۱۹۳۶ء میں "ضرب کلیم" بھی ۱۹۳۶ء میں اور "ارمغان حجاز" ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئیں۔ بلاشبہ اکبر الہ آبادی کے اشعار نے وہ پردہ ہندوستان کے رہنے والوں کی آنکھوں سے دور ہٹا دیا تھا جو مغربی تعلیم اور تہذیب نے ان پر ڈال رکھا تھا۔ لیکن اقبال کے ان غیر مبہم نظریات نے جو ان کے اشعار کے افق پر درخشاں ستاروں کی طرح ابھر ابھر کر ایک نئی صبح زندگی کا پیغام دیتے ہیں مغربی تہذیب کا وہ قلعہ مسمار کر دیا جو مغربی تعلیم کی بنیادوں پر طلبا کے ذہن میں استوار ہوا تھا۔

اس مضمون کے مقتضیات کے پیش نظر اس جگہ شاعر مشرق کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے عدیم المثال جوہر فکر و نظر پر افسوس کہ تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ —

دورہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

اور یقیناً اقبال وہ مرد حق تھا جو قرنہا قرن کے بعد پیدا ہوا اور اب شاید دور پر دور گزر جائیں تو بطن گیتی ایسا مرد حق پیدا نہ کر سکے گی۔ اور گردش لیل و نہار اس نہاں خانۂ ہستی کے ہزار در ہزار اسرار فاش کرتی چلی جائے مگر وہ دانائے راز پھر پیدا نہ ہوگا جو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالم اسلام کو ایک حیات نو کا پیغام دے کر خود موت کی آغوش میں سو گیا۔

اقبال نے اپنی علالت کے زمانے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے ایک رباعی کہی تھی —

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں اس احساس کا ایک ذرا سا شائبہ ضرور موجود تھا کہ شاید آئندہ کبھی زمانے میں پردگی لئے پارینۂ روزگار کا کوئی دانائے راز پھر پیدا ہو جائے مگر میں جو اپنے بچپن سے ان کی وفات کے وقت تک سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہا ہوں اور رموز فطرت کے اس رازداں کی قدرتِ فکر و نظر سے خوب واقف ہوں انہیں کے ایک شعر پر ان کی عظمت کی اس مختصر داستان کو ختم کرتا ہوں ـــ

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

مقصد بیان تعلّی نہیں مگر جب بھاٹی دروازے کے بازار حکیماں کا ذکر آ ہی گیا ہے تو یہ بیان خود نمائی پر محمول نہ کیا جائے کہ راقم الحروف نے بھی علم و ادب کی مختلف اصناف میں جو خدمات انجام دی ہیں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آبِ رواں کا ایک جرعہ اور انہیں دانایانِ آئینِ فطرت کے خوانِ نعمت کا ایک ریزہ ہیں جن کی صحبت کی سعادت خوبیٔ تقدیر سے مجھے نصیب ہوئی۔

میں نے ابتداً میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی۔ یہ مدرسہ اس وقت بھی آج کل کی طرح سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ملحق تھا۔ اور پنجاب کے سررشتہ تعلیم نے اس بات کا خاص انتظام کر رکھا تھا کہ اس مدرسے کے اساتذہ علم و فضل میں فقید النظیر اور طریقۂ تعلیم میں عدیم المثال ہوں۔ مولوی سید احمد کبیر، لالہ مدن گوپال، مولوی غلام رسول قریشی، پنڈت پربھودت شاستری، لالہ سکھ دیال، مرزا احمد سعید، مولوی عبداللہ خان، اور ماسٹر پران ناتھ جو ان تعلیم و تعلّم میں محنت کوش تھے وہاں اپنی شفقت اور شرافت کے باعث طلبا میں ہردلعزیز اور حکام کی نظر میں واجب احترام تھے۔ یہ مدرسہ میرے زمانۂ تعلیم کے دوران میں ایسے ایسے نامور ہیڈ ماسٹروں کی نگرانی میں سرچشمہ علوم و فنون رہا جن کے نام جوہر کمال کے ضامن اور سرمایۂ ثقافت و شرافت کے کفیل تھے۔ رائے بہادر شودیال، رائے بہادر سندر داس سوری، مسٹر ہائیڈ مین، مسٹر لیتھ برن، مسٹر واٹس اور ان سب سے بڑھ کر سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل مسٹر نولش وہ شفیق استاد تھے جنہوں نے طلبا کی نظر میں مدرسے کو گھر سے زیادہ محبوب اور اکتسابِ علم کو جان سے زیادہ عزیز بنا دیا۔ میرے ذہنی نشوونما کی تربیت بھی انہیں اُستادوں کے دامنِ عاطفت میں ہوئی۔

انہیں ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسر آئی جس پر میں جس قدر بھی فخر کروں بجا ہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد جو اس زمانے میں امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے کچھ دنوں کے لیے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں مولوی غلام رسول کی جگہ ہمیں عربی فارسی اور اُردو پڑھانے لگے۔ جب وہ ہمیں سبق دیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک بحرِ مواج ہے کہ اُبل پڑا اور حکمت و دانش کا ایک ابرِ محیط ہے کہ فضائے آسمان پر چھا گیا۔ ہم تشنگانِ علم نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود اس بحرِ بیکراں کی چھاگل سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور ان کی بارشِ دانش کے جتنے لآلیٔ آبدار جمع ہو سکتے تھے ان سے اپنا دامن بھر لیا۔

سنٹرل ماڈل اسکول اور اس کے اساتذہ کرام کا میں نے اس مضمون میں اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ دانش گاہ بھی بھاٹی دروازے ہی کے علاقے میں ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے طلبا کی نامورى اور شہرت دوام کا باعث بھی اسی علاقے کے اہل فن ہی کی تلاش کے رہین احسان ہیں۔ جب میں دل ہی دل میں کچھ سوچتا ہوں تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ان نامور استادوں کے متبحر علم و فضل پر ناصیہ فرسائی کرکے اور کچھ ان بزرگوں کے قدموں میں بیٹھ کر جو ہر شام میرے بھائی حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمع ہوا کرتے تھے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے ہی میں حصول علم کا شوق اور صنائع ادب کا ذوق پیدا ہوگیا۔ اور میں اپنے لڑکپن ہی میں اپنے مستقبل کو جس کی بہار اب ماضی کی خزاں کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہے اور جس کی یاد کے سوا اب کچھ باقی نہیں۔ علم و ادب ہی کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس باب میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے اس کا بیان بہر صورت اپنی ستائش پر محمول ہوگا اور اس سے میرے جیسی انکسار اور فطری عجز کے مجروح ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے ۱۹۱۹ء میں ماہنامہ کہکشاں ہی سے سر عبد القادر اور سر محمد اقبال کی تحریک اور حوصلہ افزائی سے "مخزن" ہی کے نقش قدم پر چل کر ایک پندرہ روزہ ادبی رسالہ "ہزار داستان" اور اس کے ساتھ ساتھ ہی بچوں کے لیے ادب لطیف کا ایک ہفتہ وار رسالہ "نونہال" شائع کیا۔ یہ دونوں رسالے ۱۹۲۳ء تک میری ذاتی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ اور جب میں اس سال سرکاری ملازمت سے منسلک ہو گیا تو میں نے ان رسالوں کی ادارت اپنے دو نہایت ہی عزیز دلدادگان ادب سید عابد علی عابد اور مسٹر ہادی حسین کو سونپ دی۔ سید عابد علی عابد جن کا نام اصحاب علمی اور ادبی حلقوں میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں بعد میں قانون کا امتحان پاس کرکے اور مسٹر ہادی حسین انڈین سول سروس سے منسلک ہو کر جب لاہور سے باہر چلے گئے تو یہ دونوں رسالے بند ہو گئے۔

میں نے افسانہ نگاری بھی کی ہے سٹیج اور فلم کے لیے بھی لکھے ہیں۔ شعر بھی کہے ہیں لیکن وہ حقیر خدمت جو محض اللہ کی توفیق ہی سے میرے ہاتھوں انجام پائی ہے اور جسے میں اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے اس لفظی ترجمے کو جو قدیم اردو زبان میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا موجودہ زمانے کی آسان و سلیس زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس ترجمے کے پانچ پارے شائع ہو چکے ہیں اور باقی زیر طبع ہیں۔

ڈاکٹر عاشق حسین کی خواہش کے مطابق میں نے بھاٹی دروازے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مختصر سا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن یہ اجمال اب بھی تفصیل چاہتا ہے۔ اگر زندگی نے فرصت دی تو شاید یہ تفصیل بھی کبھی قلمبند ہو جائے۔ اس مضمون میں میں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جو میرے ذہن میں محفوظ تھیں لیکن سنین، واقعات اور بعض دوسرے تعینات کی صحت کے پیش نظر میں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کی تاریخ جسے ڈاکٹر غلام حسین نے بڑی محنت اور تلاش سے مرتب کیا ہے اور سر لیپل گرفن کی مشہور تالیف "تذکرۂ رؤسائے پنجاب" سے استفادہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ یہ دونوں معتبر اور مستند ذرائع اگر دستیاب نہ ہوتے تو یہ مضمون تشنۂ اسناد رہ جاتا اور اس لیے ان دونوں کتابوں کے مؤلفین کا غائبانہ شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تاریخ ولادت اور کئی دوسری معتبر معلومات کے لیے میں جناب [illegible] فقیر سید وحید الدین کی بے مثال کتاب "روزگار فقیر" کا مرہون منت ہوں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ایک نثری اشاعت کے مقتضیات کے اعتبار سے یہ مضمون اختصار کی حد سے کسی قدر گزر گیا ہے مگر۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

کھلونے

(ناولٹ)

مسعود مفتی

کھلونے

مسعود مفتی

عبدالرحمان نے دو اینٹیں جوڑ کر رکھیں اور اُن پر کھڑا ہو کر کھڑکی کے شیشے میں سے اندر جھانکنے لگا۔

چھوٹا سا کمرہ ——— درمیان میں بڑی سی میز ——— میز کے اوپر کنارے پر ایک شکنجہ ——— دُوسرے کنارے کے پاس چھت سے بندھی ہوئی دو رسیاں لٹک رہی تھیں ——— میز پر ایک مرد بنیان اور دھوتی پہنے لیٹا تھا۔ اُس کے دونوں پاؤں شکنجے میں کسے تھے اور دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا کر چھت سے لٹکی ہوئی رسیوں سے بندھے تھے ——— کمر کمان بنی تھی۔ جس کا نچلا سرا ابھی سا میز پر ٹکا تھا ——— دھوتی سمٹ کر کمر کے گرد اکٹھی ہوئی تھی اور ننگی ٹانگوں پر شکنجے کے دباؤ کی وجہ سے رگیں ابھری پھول رہی تھیں۔

عبدالرحمان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے اپنا چہرہ شیشے پر اتنا دبایا کہ ناک چپٹی ہونے لگی۔

میز کے پاس بڑی بڑی مونچھوں والا تھانیدار ہاتھ میں کچھ کاغذ پکڑے کھڑا تھا۔ اُس کے تیور خشمگیں تھے اور جسم کا ہر رواں رُعب چھانٹ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلتے نظر آئے ——— میز پر لیٹے ہوئے آدمی نے تھوڑا سر اُٹھایا۔ آنسو بھری آنکھوں سے تھانیدار کو ملتجیانہ انداز میں دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔

تھانیدار نے سٹ پٹا کر سر جھٹکا اور پاس کھڑے ہوئے سپاہی کو اشارہ دیا۔ سپاہی نے گول پہیے کو گھما کر شکنجے کو ذرا سا کسا اور بڑا سا جوتا اُٹھا کر میز پر لیٹے ہوئے مرد کو دھڑا دھڑ پیٹنے لگا۔

وہ مرد تڑپ تڑپ کر ایسے چیخنے لگا کہ اُس کی آواز بند کھڑکیوں میں سے بھی باہر آنے لگی۔

ابھی چند منٹ پیشتر عبدالرحمان نے یہ چیخیں سنی تھیں اور چلتے چلتے گلی میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسے شک گزرا کوئی کسی کو قتل کر رہا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کھڑکی دیکھ کر اس کے شیشوں میں سے اندر جھانکنے لگا تھا۔ اب جو اُس نے یہ نظارہ دیکھا تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائلیں زمین پر رکھ دیں۔ ناک کو ایک دفعہ سہلایا اور پھر سے چہرہ شیشے پر دبا دیا۔ ناک چپکنے سے اُس نے بڑی مشکل سے ایک چھینک روکی۔

پٹنے والا مرد بڑے زور سے ہائے ہائے کر رہا تھا اور سپاہی اُس کو تڑاتڑ جوتے مار رہا تھا۔ مرد کی ہر چیخ کے ساتھ عبدالرحمان کا دل حلق کو آنے لگتا۔ جب اس کے جسم پر جوتے کی چوٹ لگتی۔ تو سارا جسم اُچھلتا۔ چھت سے لٹکی ہوئی رسیاں عجب طرح سے کھنچ کھنچ جاتیں اور عبدالرحمان کانپ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی ٹانگیں کھڑے کھڑے کانپنے لگیں۔

پیچھے سے ایک زوردار تھپڑ عبدالرحمان کی کمر پر پڑا۔

——— وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

ایک سپاہی اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر اُس نے فائیلوں کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ڈپٹ کر بولا۔

"چل ہٹ پرے۔ آیا ہے ماں کا خصم تماشہ دیکھنے۔"

عبدالرحمان فائیلیں اُٹھا کر ایسا بھاگا کہ تھانے کی حد سے کافی دُور جا کر اُس نے سانس لیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور خوف کے مارے ہر تانگے، موٹر یا سائیکل سے بھی دُور دُور رہنے کی کوشش کرتا۔ اِسی کوشش میں وہ کئی دفعہ دُوسرے راہگیروں سے بھی جا ٹکرایا۔ چلتے چلتے اُس نے محسوس کیا کہ پیٹھ سے ساری قمیص پسینے سے تر ہے۔ تب اُس نے فائیلیں دُوسرے ہاتھ میں پکڑ لیں اور فارغ ہاتھ کو قدرے مشکل سے گھما کر پیٹھ کے پیچھے لے گیا۔ دو اُنگلیوں کی چٹکی میں قمیص کا ذرا سا کپڑا پکڑ کر کھینچا تو قمیص کے بتدریج الگ ہونے سے ایک لہر سی ساری پیٹھ پر گھوم گئی اور اُسے سکون سا مل گیا۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "توبہ، میری توبہ" اور وہ زیرِ لب آیت الکرسی پڑھنے لگا تاکہ خوف کچھ کم ہو۔

گھر پہنچا تو ڈیوڑھی میں داخل ہو کر اُس نے دروازہ بڑے زور سے بند کیا۔ اندر سے اُس کی بیوی کی آواز آئی۔

"کون ہے باہر؟"

مگر وُہ جواب دیے بغیر گھبرایا ہُوا سا آگے بڑھ گیا۔ صحن میں چارپائی پر اُس کا تین سالہ بچہ سویا پڑا تھا۔ وُہ بے تابی سے آگے بڑھا اور بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ ایک دو دفعہ والہانہ چُوما اور پھر زیرِ لب بولا "توبہ میری توبہ"۔

بچہ نیند میں اچانک چونکنے پر رونے لگا تو عبدالرحمان اُسے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ مگر وہ روتا گیا۔ اُس کے کھلے مُنہ کے آر پار رال تن جاتی۔ جو بوجھل ہو کر ایک طرف کو ڈھلک جاتی۔ ادھ کھُلی آنکھوں کی باریک درزوں میں پانی بھرنے لگا۔ جو باہر کے کونوں سے ڈھلک کر کانوں سے ہوتا ہوا گردن تر کرنے لگا۔

"ہائے کیا تماشہ کھڑا کر دیا آتے ہی۔"

بیوی کی آواز پر سر اُٹھا کر اُس نے دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چھُری تھی اور دُوسرے میں آدھا چھلا ہُوا شلغم تھا۔

"اتنی مُشکل سے سُلا کر ذرا کی ذرا کام کرنے لگی تھی اور اس فتنے کو پھر جگا دیا آپ نے۔"

بچے کے رونے کی تان بلند ہونے لگی تو بیوی پاس آ کر بولی:

"لائیے مجھے دیں ——— میں سلاؤں اس بجھتنے کو ——— نیند پُوری کیے بغیر جاگ اُٹھا تو ساری شام اجیرن کرے گا۔"

عبدالرحمان نے خاموشی سے بچہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

بیوی نے کندھے سے لگا کر دو تھپکیاں دیں اور ساتھ ساتھ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے کندھوں کو گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلانے لگی۔ بچے نے ایک دو دفعہ ننھی ننھی ٹانگیں ہلائیں۔ بے تابی سے سر کو پٹخا۔ ایک آدھ دفعہ آں کو زور سے ماں کے

کندھے پر رکھا اور پھر آہستہ آہستہ سو گیا۔

اس عرصہ میں عبدالرحمان غسل خانے میں جا چکا تھا اور اندر سے منہ دھونے کی آواز آرہی تھی۔

بیوی باورچی خانے کی طرف چلی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج پھر دفتر میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ نہ معلوم کیسی عادت ہے ان کی۔ کسی کے کام تو آتے ہی نہیں باہر لوگوں کو ناراض کر دیتے ہیں اور گھر میں آکر کبھی بچوں کو جھنجھوڑا۔ کبھی چیزیں توڑ پھوڑ دیں۔ کبھی ویسے ہی [illegible]۔ شلغم پر چھری چلاتے ہوئے وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔

"نہ معلوم کس جنجال میں پھانس دیا اللہ نے مجھے۔"

تھوڑی دیر بعد عبدالرحمان باورچی خانے میں داخل ہوا۔ دیوار سے لگی ہوئی پیڑھی کو پاؤں مار کر نیچے گرا دیا۔ اور اُس پر بیٹھتے ہوئے دھوتی کے پلو سے گیلا منہ صاف کرنے لگا۔ چہرہ جب پلو کی اوٹ سے باہر آیا تو وہ جھرجھری لے کر بولا:

"توبہ میری توبہ!"

بیوی اُس کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ جن میں لاتعلقی بھی تھی اور سوال بھی تھا۔ ابھی تک بچے کو جگانے کا قصور معاف نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔

"لو۔ چائے ڈال۔"

دیگچی کے ڈھکنے کو اُس نے لال دسترخوان سے اٹھایا اور پیالی میں اُنڈیلتے اُنڈیلتے پھونک مار کر چائے کی پتی کو گرنے سے بچانے لگی۔ جب تک چائے سے پیالی بھرتی اُس کی ناراضگی تجسس میں بدل چکی تھی۔

"کیا ہو گیا آج؟"

"کچھ نہ پوچھو گڈو کی ماں۔ کیا بتاؤں کیا دیکھا آج۔ میں تو کہتا ہوں —— شررررر" اُس نے چائے کی چسکی بڑے زور سے لی اور زبان جلنے پر پیالی ایک دم نیچے رکھ دی۔

"آج تھانے میں ایک ملزم کو پٹتے دیکھا ہے۔"

"ہائے —— میں مر گئی ——" اُس نے اپنا ہاتھ پھیلا کر قمیص کے گریبان پر رکھ دیا "آپ کیوں چلے گئے تھے وہاں؟"

عبدالرحمان نے چائے کی پیالی دوبارہ اُٹھائی اور پھر رکھ دی۔

ابھی تک اُس کے اوسان برقرار نہ ہوئے تھے۔ دھوتی کے پلو سے ایک دفعہ منہ پونچھتے ہوئے اُس نے پیڑھی میں پہلو بدلا اور بیوی کو بات سنانے لگا۔ شکنجے میں پاؤں ایسے جکڑے تھے جیسے سیمنٹ سے لگائے ہوں۔ ہاتھ بھر لمبے جوتے کی خوفناک آواز —— پاؤں کٹ ہونے کی وجہ سے اوپر والے جسم کی کربناک تڑپ۔ جیسے پوپھٹے تناور درخت سخت آندھی میں اوپر سے سر پٹختے ہیں۔ مرد کی دردناک چیخیں —— عبدالرحمان کا دہشت کھا جانا۔

وہ پیالی اٹھا کر ہونٹوں تک لے گیا۔ مگر چسکی لیے بغیر پھر سے نیچے رکھ دی اور کانوں کی لوؤں کو ہاتھ لگا لیا۔

"گڈو کی ماں، سچ پوچھو تو میرا جسم ایسے کانپ رہا ہے جیسے چکی کے آس پاس کی زمین دھڑکتی ہے۔"

"توبہ۔ توبہ۔" بیوی چولھے میں لکڑی گھسیڑتے ہوئے بولی "اللہ کسی کو مصیبت میں نہ ڈالے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیگماں۔ مگر آدمی ایسے کرتوت ہی کیوں کرے۔ جو بعد میں ایسی حالت میں پھنسے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔"

بیوی کچھ قائل نظر نہ آتی تھی اور دونوں میں بحث چل پڑی۔ عبدالرحمان کو اصرار تھا کہ ہماری ساری مصیبتیں ہمارے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ نہ کیچڑ میں پتھر پھینکو نہ چھینٹے تم پر گریں۔ کسی فقیر سے بادشاہ نے پوچھا تم مجھ سے زیادہ ڈرتے ہو یا خدا سے۔ تو اُس نے کہا میں نہ تم سے ڈرتا ہوں نہ خدا سے، بلکہ اپنے اعمال سے ڈرتا ہوں۔ اگر میرے اعمال اچھے ہیں۔ تو نہ تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو نہ اللہ میاں اور اگر اعمال خراب ہیں تو میرا کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔ اس لیے ساری بات اپنے پر ہے۔ اپنی مصیبتیں ہم خود لاتے ہیں۔ دوسرا کوئی ذمہ دار نہیں۔"

بیوی یہ سب کچھ مانتی تھی مگر پھر بھی وہ پوری طرح قائل نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی عقل پر پتھر بھی تو پڑ جاتے ہیں۔ آدمی سے اُلٹی سیدھی حرکت ہو ہی جاتی ہے۔ آخر انسان جو ہوا۔ کوئی فرشتہ تو ہے نہیں کہ بدی کر ہی نہیں سکتا۔

"نہ بیگماں۔ نہ —— یہ بات نہیں" عبدالرحمان اُٹھتے ہوئے بولا "اب مجھے ہی دیکھو میں کبھی رشوت نہیں لیا۔ حالانکہ میرے دفتر میں کون ہے جو رشوت نہیں کماتا۔ اِس زمانے میں چپراسی بھی اپنے افسر جیسی پوشاک پہننا چاہتا ہے اور لوگ اپنی جیب دیکھنے کی بجائے ہمسائے کی شان دیکھ کر مقابلے میں خرچ کرتے ہیں۔ میں اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں خوش ہوں۔ مزے سے رات کو سوتا ہوں۔ گھر میں صوفہ نہیں۔ ایرکنڈیشنر نہیں۔ فرج نہیں ہے تو کیا ہوا۔ اطمینان تو ہے اور دیکھ لینا یہ اطمینان مجھے ساری عمر نصیب رہے گا۔"

بیوی نے کوئی جواب نہ دیا اور پنکھے پر شلغم کے چھلکے اکٹھے کر کے باہر لے جانے لگی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے جب اُس نے ایرکنڈیشنر، صوفے اور فرج کا ذکر سنا تو اُس کے چہرے پر کرب کی ہلکی سی لہر آئی اور گزر گئی۔ جیسے نیچی اُڑان والے پتنگ کا سایہ آپ کے قدموں میں لوٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔

اتنے میں عبدالرحمان کو باہر سے کسی نے آواز دی تو وہ دھوتی کے پلّو سے مُنہ صاف کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بیگماں صحن سے گزر کر ڈیوڑھی تک گئی۔ وہاں خالی ڈرم میں شلغم کے چھلکے پھینکے۔ پنکھے کو جھاڑا۔ ایک لمبا سا چھلکا ڈرم کے کنارے میں اٹک گیا۔ دو ایک چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باہر زمین پر لڑھک گئے۔ بیگماں نے پاؤں کی گھسیٹ سے اُن کو ڈرم کے قریب کیا اور پھر دروازے پر لٹکے ہوئے پردے پر آنکھ لگا کر باہر دیکھنے لگی کہ کون آیا ہے۔ پردے کا یہ سوراخ اُسی دن بنا لیا گیا تھا۔ جب نیا پردہ لٹکایا تھا اور اُس وقت سے اب تک نہایت مفید ثابت ہو رہا تھا۔

عبدالرحمان کے ساتھ عاقل کھڑا تھا۔ وہ اُسے پہچانتی تھی۔ یہ بھی اُسی دفتر میں کام کرتا تھا اور اکثر ان کے ہاں آیا کرتا تھا۔ بیگماں نے اُسے اسی سوراخ میں سے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ دونوں ایک ہی دفتر میں ہیں۔ ایک ہی طرح کی ملازمتیں ہیں تنخواہیں بھی برابر ہیں۔ مگر دونوں میں کتنا فرق ہے۔ عبدالرحمان پرانی دھوتی اور بوسیدہ سی قمیص میں کھڑا تھا اور عاقل نے بڑھیا بوسکی کی قمیص اور کڑکڑاتے لٹھے کی اُجلی سی شلوار پہنی تھی۔ وہ عمر میں عبدالرحمان سے کچھ بڑا ہی تھا۔ مگر سنہری فریم والے چشمے کے نیچے اُس کا چہرہ نیا؛

بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ بیگماں کو قاتل سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مگر اُسے صدبرس پر افسوس آرہا تھا جو قاتل کی طرح رہ سکتا تھا مگر رہتا نہ تھا اور سوکھی تنخواہ کے محدود چوکھٹے میں اپنے بوسیدہ کپڑے لٹکایا کرتا اور بیگماں کے سامنے قاتل اور اُس قماش کے دوسرے لوگوں کو رشوت خوری کی وجہ سے گالیاں دیا کرتا۔ بیگماں کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر اپنے خیالوں میں خاوند کے لیے عجیب سی ہمدردی لیے واپس لوٹ آئی۔ ایسی ہمدردی جس میں پیار بھی تھا۔ ترس بھی تھا اور افسوس بھی تھا۔ جیسے امتحان کا نتیجہ سن کر پاس ہونے والے ہمسایہ بچوں کے جمگھٹے میں ایک ماں اپنے فیل ہونے والے معصوم بچے کو دیکھتی ہے۔

صحن سے گزرتے گزرتے بیگماں کا پاؤں شلوار کے پائنچے میں اٹکا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ اس دھچکے سے چارپائی کو ٹھوکر لگی تو بچہ پھر سے بیدار ہو کر رونے لگا۔ ماں نے ایک دم اٹھا کر چوما اور پھر کندھے سے لگا کر اپنا جسم ہولے ہولے جھلانے لگی۔ بچہ ذرا خاموش ہوا تو اُس نے جسم کی حرکت کو روک دیا۔ مگر وہ پھر سسکنے لگا۔ بیگماں ذرا جھلائی لیکن پھر جسم کو جھلانے لگی اور بچے نے آرام سے سر ٹکا دیا۔

اندر سے ہنڈیا جلنے کی بو آنے لگی۔ تو اُس نے آہستگی سے بچے کو لٹانا چاہا۔ مگر وہ سسکنے لگا تو بیگماں نے اُسے چارپائی پر پٹخ دیا۔

بچہ ایک دم رونے لگا۔

بیگماں نے زور سے ایک دھپ اُس کی کمر پر جمایا۔ "چپ بھی ہو ——— لاڈ اتنے اور باپ کی اتنی توفیق بھی نہیں کہ ایک بھولا ہی لے دے۔"

بولتے بولتے اُس نے اُٹھ کر چارپائی پر پٹخا اور باورچی خانے میں گھس گئی۔ بچے کے رونے کی یکساں آواز اور اس میں بتدریج بڑھنے والے وقفوں کو کبھی کبھی ماں کی ڈانٹ یا گڑگڑاہٹ توڑ جاتی۔

اتنے میں ایک کوا صحن میں آن اترا اور لپک کے چارپائی کے پائے کے پاس سے ہڈی اُٹھانے لگا۔ مگر جھاڑو کے دو تنکے پائے کے نیچے دبے تھے اور ان کے درمیان ہڈی پھنسی ہوئی تھی۔ اس لیے کوے کی چونچ ہڈی کا پہلو چھونے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔

گڈو نے آنسوؤں کی جھلمل میں سے کوے کو دیکھا اور منہ کا نقشہ بنے بگڑنے کی آواز بند ہوگئی ....

کوا پھدک کر دوسری طرف گیا۔ گردن نیہوڑا کر ہڈی کو تاکا۔ اُچھل کر قریب ہوا۔ سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور قینچی کی طرح چونچ کھول کر لپک سے ہڈی پر جا پڑا۔ مگر وہ ایک کنارے پر لگی اور ہڈی تنکوں کے شکنجے میں اور زیادہ پھنس گئی۔

گڈو کا منہ آہستہ آہستہ بند ہونے لگا اور وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ آنسو کا آخری قطرہ پہلے رُخساروں پر گیلے راستے سے ہوتا ہوا ٹھوڑی پر آن ٹکا اور تارے کی طرح ٹمٹمانے لگا۔ اس کی بھیگی بھیگی پلکوں میں مسکراہٹ سمٹنے لگی۔

کوا اِدھر سے اُدھر پھدک کر کوشش کر رہا تھا اور گڈو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی ٹھوڑی کا آنسو ابھی تک قائم تھا۔ پھر اُس نے اپنا موٹا بھرا بھرا سا بازو اُٹھا کر ہوا میں ہلایا اور ہونٹوں سے شیش کی غیر مکمل آواز نکالنے کی ناکام سی کوشش کی۔ کوا تھوڑا اُڑ کر پھر پیچھے ہٹا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے دوبارہ ہڈی تک آن پہنچا۔

مُنہ سے ایک سیٹی نکلی اور ساتھ ہی ہڈی ٹکڑوں کے چنگل سے نکل آئی۔ کوّے نے اُچھل کر پوزیشن تبدیل کی۔ اُس پر چونچ جمائی اور لے اُڑا۔

گُڈو کی آنکھیں اور چہرہ اُس کی اُڑان کے ساتھ ساتھ اُوپر اُٹھتی گئیں۔ وہ منڈیر پر جا بیٹھا۔ ہڈی کو سامنے لٹکایا مگر وہ لڑھک کر پھر سے نیچے صحن میں آ گری۔

گُڈو کھل کھلا کر ہنس دیا اور جب کوّا دوبارہ نیچے آیا تو وہ چارپائی سے اُٹھ کر اُس کے پیچھے بھاگا۔

عبدالرحمان اپنے دوست سے مل کر فارغ ہُوا اور اندر داخل ہونے لگا تو اُس نے بچّے کو انہماک سے کوّے کا تعاقب کرتے دیکھا۔ کوّا ہڈی ہتھیانے کی کوشش کرتا۔ تو گُڈو اس کے پیچھے بھاگتا اور کوّا اُچک کر اُس کی پہنچ سے باہر ہونے کے لیے کبھی نلکے کی ٹونٹی پر کبھی دیوار سے لگی چارپائی کے پائے پر اور کبھی کپڑے سکھانے والی رسّی پر بیٹھ جاتا۔ گُڈو نیچے کھڑا شور کرتا رہتا۔ ادھر پہنچ کر کوّے کی طرف گُڈو ہاتھ بڑھاتا تو وہ جھٹ سے ہڈی تک آن پہنچتا اور گُڈو پھر شور کرتا۔ بازو ہلاتا ادھر کو بھاگتا۔

عبدالرحمان اندر آنے کی بجائے وہیں ٹک کر شفقت اور مسرت سے بچّے کو دیکھتا رہا۔ یہ بچہ اُس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ اُس نے دُنیا میں اور کسی لالچ کی تمنا نہ کی تھی بلکہ بہت قناعت پسند انسان تھا۔ اُس کے دل میں ایک ہی تمنا تھی کہ گُڈو کی مناسب تربیت کر کے اُسے اچھا اور ایماندار انسان بنا دے۔ جس کا کردار مثالی ہو۔ کوئی اُس پر اُنگلی نہ اُٹھا سکے اور لوگ اُس کی عزت کریں۔

کوّا نلکے کے پاس لوٹے پر بیٹھ گیا۔ گُڈو چھوٹی سی چھڑی ہاتھ میں اُٹھائے اُسے مارنے بھاگا۔ گیلی زمین سے اُس کا پاؤں جو پھسلا تو گرتے ہی اُس نے زور سے چیخ ماری۔

کوّا پھر سے اُڑ گیا ——

عبدالرحمان بھاگ کر آگے آیا۔ گُڈو کو اٹھایا تو وہ بے تحاشا چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ باپ نے اُس کی ٹانگ سہلا کر دیکھی۔ بازوؤں کو ٹٹولا۔ مگر وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا امکان نہ تھا۔ مگر گُڈو چیخ رہا تھا۔ اُس نے پہلے کسے کندھے سے لگایا۔ پیار کیا۔ مگر بچہ اُسی طرح بے کل رہا۔ وہ اُسے سہلانے لگا۔ مگر اُس کے گھٹنے پر ہاتھ پہنچا تو وہ اور چیخا۔ عبدالرحمان نے کپڑا اُٹھا کر دیکھا —— اور آنکھیں پھاڑے دیکھتا ہی رہا۔ پھر ایک دم چلّایا۔

"اری بیگماں۔ گُڈو کو تو بہت بڑا پھوڑا نکل رہا ہے۔"

عبدالرحمان کچھ تھک گیا تھا۔ قلم رکھ کر ہاتھ میز پر دھرتے ہوئے اُس نے انگلیاں پُوری پھیلا دیں۔ پھر دونوں بازو اُٹھا کر سر کے پیچھے رکھتے ہوئے ایک انگڑائی لی اور جمائی لیتے ہوئے فائل بند کر دی۔ انگڑائی لینے کے بعد اُس نے ادھر اُدھر دیکھا تو سب لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ مگر عاقل اُس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

اُس کمرے میں چھ اشخاص بیٹھتے تھے۔ دو جونیئر کلرک، دو سینیئر کلرک اور دو اسسٹنٹ۔ عاقل اور عبدالرحمان دونوں اسسٹنٹ تھے ان کے میز آمنے سامنے تھے اور بیچ میں تنگ سا راستہ تھا۔

کمرے کی فضا بوجھل سی تھی۔ ایک کلرک پنو پرانی مشین پر ٹائپ کر رہا تھا جیسے ٹین کی چھت پر بارش گر رہی ہو۔ میزوں پر فائلوں کے بے ترتیب انبار کے علاوہ کمرے میں اور کوئی سجاوٹ نہ تھی۔ پرانی تعمیر میں جدید تعمیرات کی بہ نسبت سفیدی میں سے جا بجا جھانک رہی تھیں۔ اوپر ایک تیل بھرا پنکھا چل رہا تھا۔ جس کا ڈھیلا ڈنڈا ہولا ہوپ ناچنے والے حبشیوں کی کمر کی طرح جھول کھاتا چھت سے جھانکتی ہوئی ماروں سے جا ملتا تھا۔ بیزار کلرک سست انداز میں کاغذ ادھر سے ادھر اٹھا کر رکھتے اور بے دلی سے فائلوں کے اوراق اُلٹتے۔ ذرا سی آہٹ پر آنکھیں اٹھا کر دیکھنے لگتے اور پھر دیکھتے رہتے۔ دیر تک کام کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ کبھی کبھار ایک سست الوجود چپڑاسی بیڑی پیتا ہوا کوئی فائل لے کر اندر آتا۔ مگر اس ڈھیلے انداز سے، جیسے بیگار میں پکڑا گیا ہو۔ کسی کی میز کے گرد زیادہ چکر لگاتا۔ کسی کے کم اور کسی کے بلانے کو بھی نظر انداز کر دیتا۔ چپڑاسی کی توجہ کے تناسب سے فوراً اندازہ ہو جاتا کہ کون سا شخص جونیئر ہونے پر بھی زیادہ اہم ہے اور کون سینیئر ہونے کے باوجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس اہمیت کا پیمانہ افسروں تک رسائی، دفتر کے اہل اثر و رسوخ اور کام آسکنے کی اہمیت تھی۔ موجودہ دور کا چپڑاسی دفتری ضابطے سے زیادہ موجودہ دور کی اقدار کا زیادہ لحاظ رکھتا تھا۔

عاقل اپنی میز سے اٹھ کر عبدالرحمان کے پاس آیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "ہو جائے ایک پیالی چائے؟"

عبدالرحمان نے گھڑی پر نظر ڈالی اور سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر گھنٹی بجائی۔

"یہاں نہیں یار۔" عاقل کہنے لگا "کینٹین میں چلتے ہیں۔ ذرا گپ رہے گی۔"

ان کے باہر نکلتے ہی کمرے کا ماحول ڈھیلا ہو گیا۔ ایک کلرک نے آہستہ سے ہونٹوں سے وسل بجائی۔ دوسرے نے قلم رکھ کر انگلیاں چٹخائیں اور مسکرا کر مزہ لینے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ تیسرے نے زور سے فائل بند کی۔ اس کو دھڑاک سے میز پر رکھا اور کرسی کی پشت پر پھیل کر بولا:

"یار یہ عاقل جب تک بیٹھا ہوتا ہے۔ اپنا تو سانس خشک رہتا ہے۔" وہ عاقل کے ماتحت کام کرتا تھا۔

"تم تو خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔" دوسرا کلرک بولا جو عبدالرحمان کے ماتحت کام کرتا تھا۔ "ہمارا بھی تو عبدالرحمان ہے۔ قسم لے لو جو کبھی خواب میں بھی اس سے ڈر لگا ہو۔"

"سانپ اور نیولے کی تبدیل تو پوچھوں گا۔ دو دن میں نوکری چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔"

"کیوں کیا بات ہے اس میں؟"

"تو پھر جا کر سپرنٹنڈنٹ سے جو عاقل کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوتا ہے۔ عبدالرحمان کی تو وہ پروا تک نہیں کرتا اور سپرنٹنڈنٹ ہی کیا۔ سبھی اوپر والے ڈرتے ہیں اس سے —— پتہ نہیں کہاں کہاں سلسلے قائم کر رکھے ہیں اس نے۔"

"اللہ قسم میں نہ ہوا اس کا افسر۔ دو دن میں نکال باہر کرتا۔ آخر اتنے قانون ہیں ان لوگوں کے لیے۔"

"پتہ نہیں اسے باہر کرتے یا خود باہر ہو جاتے —— قانون خود بخود تو کچھ نہیں کرتا۔ جب تک اس کو چلانے والے

وعدہ کرییا اور حوصلہ کو کم کرے۔ یہاں تو جو بھی افسر ہے وقت گزارنے کی فکر میں ہے۔"

بات چلتی گئی۔ گھر اسے عیز دیپ پا کر دونوں تازہ ترین پاکستانی فلم پر بحث کرنے لگے۔ ایک سین پر اختلاف رائے ہو گیا۔ تو وہ دونوں اُٹھ کر دُوسری برانچ میں ایک اور کلرک سے فیصلہ کروانے چلے گئے۔ جو ہر پکچر پہلے ہی روز دیکھنے کے لیے جان کی بھی بازی لگا دیا کرتا تھا۔

صدا نسے کے باہر سٹول پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے انگڑائی لی۔ پھر اطمینان سے اُٹھا اور برآمدے کا موڑ مڑ کر غائب ہو گیا۔

دفتر کی کینٹین میں پتھر کی سِل والی میزیں تھیں۔ لکڑی کی سیٹ والی کُرسیاں تھیں۔ سوکھی ہوئی کریم والی پیسٹری تھی۔ ٹوٹے ہوئے کنڈوں والی پیالیاں تھیں اور چپک جانے والی مکھیاں تھیں۔

وہ اندر داخل ہوئے تو کینٹین میں کافی لوگ بیٹھے تھے۔ مُختلف اطراف سے بیٹھنے والوں نے حسب تعلقات آواز دے کر ہاتھ ہلا کر یا سر کی حرکت سے سلام کیا۔

دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ پہلے دفتر کی باتیں ہوئیں۔ پھر دوستوں کی باتیں ہوئیں اور پھر عاقل عبدالرحمان کی بوسیدہ ٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یار کبھی ذوق کی توہین کرتے ہو۔ ٹائی تو کوئی ڈھنگ کی خرید و۔"

"میاں جب تک نئی کے پیسے نہیں ہوں گے۔ پُرانی ہی چلے گی۔"

"اگر یہی کچھ رہے تمہارے تو پیسے آ چکے۔"

عبدالرحمان سر جھکا کر مچی سے پیالی کا کنارا ہلانے لگا۔

"رحمان میاں۔ یہ بتاؤ" عاقل آگے جھک آیا "تم کیوں اپنی جان پر ظلم کرتے ہو۔ اللہ نے ایک ہی زندگی عطا کی ہے۔ اُس کو بھی رسیوں سے باندھ کر جکڑ دیا ہے تم نے۔"

"تو کیا کروں۔ اللہ کی مرضی ہی یہی تھی کہ ایسے رہوں۔ ورنہ وہ بڑی آسانی سے کسی رئیس کے گھر پیدا کر سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے میاں۔ اگر اُس نے یہ نہیں کیا تو یہ تو کر دیا نا کہ تم رئیسوں کی جیبوں میں شراکت کر سکو —— اچھی بھلی ملازمت ہے۔ ذرا ہمت کرو تو سب دلدر دُور ہو جائیں گے۔"

"چھوڑو بھی یہ بکواس۔ تم تو ہمیشہ مجھے غلط راستے پر ہی ڈالتے رہو گے۔"

"دیکھو میاں بچے نہ بنو" عاقل بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا "غلط اور صحیح کا معیار ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز سب لوگ کرنے لگ جائیں وہ صحیح ہو جاتی ہے اور جب سب نہ کریں تو البتہ وہ غلط ہے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے برقعہ نہ پہننا عورتوں میں بہت بُرائی سمجھی جاتی تھی۔ مگر آج کل بے پردگی کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اسی طرح رشوت اُس زمانے میں غلط تھی جب زیادہ تر لوگ پاکباز تھے۔ مگر آج کل سوائے تم جیسے چند سرپھروں کے باقی تو سبھی دُنیا دونوں ہاتھوں سے پیسے بنا رہی ہے۔ زبان کے معاملے

کی اصطلاح میں بھی اگر کوئی چیز غلط العام بن جائے تو صحیح گنی جاتی ہے اور یہ تو عملی زندگی کی بات ہے جو چیز سب لوگ کہتے ہیں۔ وہ غلط کیسے ہوئی۔"

رحمان خاموش رہا۔ وہ ایک چسکیاں چاٹ کی لیتا اور پیڑی کی پلیٹ عاقل کے آگے کر دی۔

عاقل نے تیکھی نظروں سے پلیٹ کو دیکھا۔ پیڑی کی سوکھی سوکھی سطح پر دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ صرف ایک دانہ قدرے بہتر تھا۔ جو پلیٹ کے رحمان والے کنارے پر پڑا تھا۔ عاقل نے آگے بڑھ کر وہی دانہ اُٹھایا اور مُنہ چلانے لگا۔ رحمان نے بھی ایک سڑی ہوئی پیڑی کا اُٹھائی۔

"بھیا! غلط صحیح کے چکروں میں تو کتابیں لکھنے والے ناحق پڑیں۔ ہم تو زندگی گزارنے والے لوگ ہیں۔" عاقل بولا "جیسے مسائل زندگی کو پیش کرتی ہے ویسا ہی اُن کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ساری دُنیا تو عیش کرے اور ہم اپنے بچوں کو اپنے سامنے آرام کو ترستے دیکھیں۔ ہمارے بچے دُوسروں سے کم ہیں کیا؟"

"بھئی دُوسروں نے اپنی قبر میں جانا ہے۔ ہم نے اپنی قبر میں۔ مجھے دُوسروں سے کیا!" عبدالرحمان نے جیسے بات ختم کرنا چاہی ——"

"ٹھیک ہے میاں۔ ہم تو تب قبر میں جائیں گے جب وقت آئے گا۔ فی الحال تو جینا ہے —— مگر تم تو ابھی سے قبر میں گھس کے بیٹھ گئے ہو —— اپنے پہ تو جو ظلم تم نے کیا وہ چاہے ٹھیک ہو۔ مگر تمھارے بچوں نے کیا قصور کیا ہے کہ اپنی اُلٹی عقل سے اُن کو بھی اچھی زندگی سے محروم کر رہے ہو۔ اس تنخواہ میں تم نہ تو انھیں اچھی تعلیم دلا سکتے ہو۔ نہ اچھا پہنا سکتے ہو۔ آج کل وہ بچے ہیں میں کمتر محسوس کرتے رہیں گے۔ جوان ہونے پر ملازمت کے وقت تعلیم کی کمی کی وجہ سے پیچھے رہ جائیں گے۔ اُن کی تو ساری زندگی تمھاری وجہ سے خراب ہوئی نا —— آخر کچھ تو سوچا کرو۔"

"یہ غلط ہے عاقل۔ اگر بچے اپنے جیسے لوگوں میں رہیں گے تو کمتر محسوس نہیں کریں گے اور اگر اُن کی تربیت مناسب ہے ...."

مگر عاقل نے بات کاٹ دی اور ہنس کر بولا "ارے میاں۔ آج کل کون ہے اپنے جیسا۔ پندرہ روپے تنخواہ والا بھی جائز یا ناجائز طریق سے رئیسوں کے ٹھاٹھ رکھتا ہے۔ تم پتہ نہیں اپنے جیسا کہاں سے لاؤ گے۔"

رحمان زچ ہو گیا "یہ تم پر آج پکڑ بازی کا بھوت کیوں سوار ہے۔ ادھر فائیلوں سے منہ ماتے آئے ہیں اور ادھر تم نے جھک جھک شروع کر دی ہے۔"

"میاں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ شاید تمھاری اُلٹی کھوپڑی میں کوئی سیدھی بات سما جائے ——" وہ آگے جھک گیا "دیکھو آج کل موقعہ ہے ایک ہاتھ میں۔ چاہو تو اس سے کئی گنا بہتر چاہے ٹائیاں خرید لو۔"

"میاں تم یہ موقعے اپنے پاس ہی رکھو۔ اپنے بس کا تو روگ نہیں یہ۔"

"روگ کی بات نہیں پیارے۔ بس تمہیں زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔ نہ ہینگ لگے گی نہ پھٹکڑی اور اللہ کے فضل سے اتنا

چمکار مگ لگانے کا کر ہماری بھابی شادی کے چھ سال بعد بھی تم پہ نئے سرے سے عاشق ہو جائے گی۔"

عبدالرحمان خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

عاقل نے پیالی رکھی، پرچے کو تھوڑا سا آگے سرکایا۔ خود بھی جھک گیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

"تھکو صاحب۔ کام ہو جائے تو ایک ہزار روپے مل جائیں گے۔"

"چھوڑو میاں۔ میرے پاس تو ایسا کوئی کام ہی نہیں۔ افسر بھی آدمی دیکھ لیتے ہیں۔ ایسی ساری چیزیں تمھاری میز پر رکھی ہوئی ہیں۔"

عاقل اس کی چوٹ کو نظرانداز کرتا ہوا بولا "وہ فائل ہے نا سیٹھ اکرام والی۔ اس میں سے قاعدے والا حصہ کہیں گم کرنا ہے ——

بس اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"مگر اس سے کیا ہوگا؟"

"ہوگا یہ کہ قاعدہ نہ ہونے کی وجہ سے فیصلہ سیٹھ کے حق میں ہو جائے گا —— اور کیا؟"

"اور جو ریکارڈ روم میں رکھے ہیں؟"

عاقل کھل کھلا کر ہنس دیا۔ پیچھے ہٹ کر چائے کی پیالی اٹھائی۔ زوردار لمبی چسکی لی اور فتح مندانہ سرگوشی میں بولا۔

"پیارے وہ تو گم ہو بھی چکے۔"

عبدالرحمان تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا "تم نے مجھ سے یہ بات کیوں کی —— تم جانتے ہو میں اس قسم کی چیزوں سے بچتا

ہوں۔ اگر کاغذات ہی گم کرنے تھے تو وہ تم بھی تو چرا سکتے تھے۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔" عاقل بے تکلفی سے ہاتھ پھیلا کر بولا "مگر تمھاری کھوپڑی میں تو سارے قاعدے بھرے پڑے ہیں۔ تم

وہ زبانی ہی نوٹ کر ڈالو گے۔"

"ہوں اوں اوں۔" عبدالرحمان بولا "تو گویا مجھے ناموش کرانا چاہتے ہو کہ میں نوٹ میں صحیح رائے بھی نہ لکھوں۔"

عاقل بولا "کوئی نرالی درخواست تو نہیں کر رہا۔ تمھارے سارے دفتر میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

"سارے والی بات تو نہ کہو۔" عبدالرحمان اٹھتے ہوئے بولا "تمہیں سارے اپنے جیسے نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے تو اب بھی کئی

لوگ ایماندار لگتے ہیں —— بہرحال جس کا کام اُسی کو ساجھے۔ مجھے تو تم معاف ہی رکھو —— اور نہ ہی آئندہ مجھ سے اس

قسم کی بات کرنا۔"

صحن میں داخل ہوتے ہی عبدالرحمان کو چارپائی پر میلی کچیلی آنکھوں والا کالا برقعہ نظر پڑا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ پارو کی ماں آئی

ہوئی ہے۔ وہ غالباً گلے کمرے میں بچیاں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بچے کو سینے سے چمٹا کر عبدالرحمان نے برقعہ ایک طرف ہٹایا اور دوسرے

ہاتھ سے بستر ٹھیک کر کے بچے کو احتیاط سے لٹا دیا۔ گڈو نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور پھر غنودگی سے سر ایک طرف

ڈال دیا۔

عبدالرحمان نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو تیز بخار کی تپش محسوس کر کے اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ اُس چارپائی پر بیٹھ کر اُس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے قدموں میں نظریں جمائے سوچنے لگا۔

اندر سے پارو کی ماں کے مسلسل بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ عبدالرحمان کی پڑوسن تھی۔ وہ خود وہاں مشہور و معروف ہستی تھی کیونکہ گاؤں میں پارو کے باپ کو شاید ہی کوئی جانتا تھا۔ اور اگر جانتے بھی تھے تو پارو کی ماں کے خاوند کے طور پر۔ اُس کی خاص صفت بلا قیمت مشورے دینا تھی۔ گھریلو یا بیرونی زندگی میں کیسا ہی مسئلہ درپیش کیوں نہ ہو ———— وہ کوئی نہ کوئی مشورہ تیار رکھتی تھی اور تلقین کرتی تھی کہ اُس پر عمل ہو گا اور اگر عمل نہیں ہوتا تھا تو سب ہمسایوں کے سامنے فوراً گزشتہ تمام واقعات کا ذکر کرتی۔ پھر اس پر اپنے غلط مشورے کا۔ پھر کوئی تمام خدشات کا جو اُس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ممکن ہو سکتے تھے۔ مشورہ دینے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور عقل تجربہ چاہتی ہے مگر ہمسایوں کی بدقسمتی سے چالیس سالہ پارو کی ماں کو اتنا تجربہ تھا کہ خضر کی عمر کے بڑے بوڑھوں کو بھی نہ ہو۔ وجہ یہ تھی کہ دنیا میں کوئی بھی واقعہ یا مسئلہ جو وہ اُس سے پہلے اس کے خاندان کے کسی نہ کسی فرد سے پیش آ چکا ہوتا۔ اور یہ سب واقعات سالوں کی گردش کے ساتھ بند اصولوں کی طرح اس اصول کے سختی سے پابند تھے کہ اگر وہ واقعہ اچھا ہوتا تو وہ ہمیشہ پارو کی ماں کے میکے میں ظہور پذیر ہوتا اور اگر برا ہوتا تو اس کی سسرال میں۔
—— مگر یہ ناممکن تھا کہ پارو کی ماں کے لیے کوئی چیز نئی ہو۔

گڈو کے پھوڑے کی خبر سن کر اس نے کئی علاج بتائے۔ پھوڑے کے ارد گرد پان کھلانے والا چونا لگانا۔ نیلے تھوتھے کو نیم کے پانی میں حل کر کے لگانا۔ پٹی باندھنا اور باسی تھوک لگانا۔ ان سب علاجوں کی سند کے طور پر اس نے اپنے عزیزوں کے اتنے چشم دید واقعات پیش کیے کہ یہ تمام علاج بیک وقت شروع کرنے میں بھی اُسے کوئی حرج نظر نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ اُس کی نند نے حسد کی وجہ سے اُس کی بات ٹالی تھی تو بلا غرض بہت خراب ہو گیا تھا۔ اور اُس کی چھوٹی بچی کی ٹانگ کٹوانی پڑی تھی۔

مگر عبدالرحمان اُسے سرکاری ہسپتال لے گیا۔ گزشتہ چار روز وہاں کا علاج ہو رہا تھا اور آج عبدالرحمان سیدھا ہسپتال سے واپس آکر گڈو کی پائنتی بیٹھا سوچ رہا تھا۔

آہٹ سن کر اندر سے اُس کی بیوی نکل آئی۔

منتظر ماں کی مامتا میں ایک نئی حس بھروسے یقین رہتی ہے جو چشم زدن میں امید و مایوسی کی جھلک دکھا دیتی ہے۔ بیگاں نے خاوند کے انداز دیکھے تو اسی حس کی لرزش سے اُس کا دل کانپ گیا۔

"کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟" مختصر سا سوال تھا۔

"ڈاکٹر نہ کہو بیگاں، قصائی کہو" عبدالرحمان جیسے پھٹ پڑا "ڈاکٹر کے دل میں تو خدا کا خوف ہوتا ہے۔ بیمار کے لیے ہمدردی ہوتی ہے۔ فرض کا خیال ہوتا ہے۔ —— مگر ان لوگوں میں تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

مگر وہ اپنے خیال میں بولنے لگا "ہمارے سرکاری ہسپتال نہیں ہیں بیگاں بلکہ سرکار نے بڑے بڑے ذبح خانے کھول رکھے

ہیں۔ جہاں مرنے کے بعد آسانی دی جاتی ہے۔

"ہائے ہائے کیا اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ کوئی خیر کا کلمہ نکالیے مُنہ سے۔"

بیگماں نے آگے بڑھ کر گُڈو کو ساتھ چپٹا لیا اور کپڑا اُٹھا کر پھر ڈالا دیکھنے لگی۔ خاوند کا موڈ دیکھ کر کچھ پُوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اُس کا دل مُنہ کو آ رہا تھا کہ ڈاکٹر نے گُڈو کے متعلق کیا کہا ہے۔ جب قابُو نہ پا سکی تو اُس نے طریقے سے پُوچھنے کی کوشش کی۔

"دوائی کہاں ہے؟ میں پلاؤں اپنے لال کو۔"

تھکا تھکا سا جواب تھا۔ "دوائی شام کو لاؤں گا ——— بازار والے ڈاکٹر سے ——— ابھی نہیں لایا۔"

بیگماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ہسپتال سے خالی ہی لوٹ آئے کیا؟"

"خالی تو نہیں آیا ——— ڈاکٹر سے سخت جھگڑ کر آیا ہوں۔"

بیگماں نے ہتھیلی اپنے ماتھے پر مار کر جھنجھلاہٹ اور بیزاری سے ہاتھ اُس کی طرف پھیلاتے ہوئے بولی "آپ کو تو ہر وقت لڑنے ہی کا شوق رہتا ہے۔ ساری رات بچے کا تڑپنا نہیں دیکھا جاتا جناب سے شام تک اور سُولی پر چڑھائے رکھو گے۔"

عبدالرحمان فکرمند نظروں سے اپنے دونوں پاؤں کے بیچ کی زمین دیکھتا رہا۔ بیگماں نے گُڈو کا غنودگی میں ڈوبا ہوا سر اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"ہائے ہائے میں واری جاؤں۔ کیسا مُرجھا کر جھلس رہا ہے پنڈا ہے میں۔ نہ معلوم کتنا بُخار ہے ——— بے تو ہوا کرے، کسی کو کیا ——— دُکھ تو ماں کو ہوتا ہے۔"

بچے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اُس نے جسم کو ٹٹولا اور پھر ماتھے سے بال ہٹانے لگی ——— پھر جس طرح سائیکل کی خالی ٹیوب ہوا بھرنے سے آہستہ آہستہ پھولتی ہے اسی طرح اُس کی آنکھوں میں نمی پھُوٹنے لگی اور وہ جذباتی آواز میں بولتی گئی۔

"ماں کا دل اور کسے بلا ہے جو یہ جیس جانے ——— دُوسروں کو تو بس اپنی لڑائیوں کا نشہ ہے ——— وُہ پورا ہوتا رہے ——— گھر میں بیوی پر رُعب۔ دفتر میں لوگوں سے ماتھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں سے جھگڑا۔ بچے جائیں جہنم میں ——— وُہ تو پہاڑی کے پتھر ہیں۔ خود ہی ڈھلانوں سے لڑھک لڑھک کر کہیں اٹک جائیں گے یا ٹوٹ پھُوٹ جائیں گے ——— اُن کو کون ہے رونے والا۔"

آنسو پلکوں کی جڑوں میں موتی پرونے لگے۔ پھر مزار پر جانے والے عقیدت مندوں کی طرح ننگے پاؤں آنکھوں سے باہر نکلنے لگ گئے۔ تھوڑے وقفے بعد اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنا احتجاج جاری رکھا۔

"وہ کوئی اور ہی مرد ہوتے ہیں جن کو بیوی بچوں کی لگن ہوتی ہے ——— یہاں تو بیوی بھی دن پُورے کر رہی ہے اور جو شامت کا مارا پیدا ہو گیا وُہ بھی اُسی سڑک پر چل پڑے گا ——— نہ گھر میں برتن۔ نہ تن پر ڈھنگ کا کپڑا ——— دل کے شوق تو کوئی پورے کرے گا۔ یہاں تو خالی خولی زندگی گزارنا ہی عذاب ہے . . . . ."

عبدالرحمان دونوں ہاتھوں کے پیالے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چہرہ اُٹھائے بغیر دھاڑا۔ "بند کرو یہ بکواس۔ اسے تو ہر

وقت یہی باتیں سوچتی ہیں۔"

بگیاں نے دوپٹہ اٹھا کر آنسو صاف کیے۔ ناک سے زور کی شوں کی اور بغیر کچھ کہے اس نے گڈو کے نیچے کا گدیلا کھینچ کر ٹھیک کیا۔ جھاڑو کو چادر سے ڈھانپا اور سسکیاں لیتی اندر کو چلی۔

عبدالرحمان اُسی لہجے میں بولا "ساری رات تڑپتا دیکھا تھا اسی لیے تو ڈر کر آیا ہوں۔"

عبدالرحمان کے کانوں میں بگیاں اور پارو کی ماں کی آوازیں پڑتی رہیں۔ مگر اُس نے سننے کی کوئی کوشش نہ کی۔ حالانکہ اُن میں بگیاں کی سسکیوں کی آواز اور پارو کی ماں کے دلاسے بھی شامل تھے۔ وہ سر جھکائے سوچوں میں غرق رہا۔ . . . .

ہسپتال میں جب وہ پہلے روز گیا تھا تو گڈو کو گود میں لیے بنچ پر بیٹھا تھا۔ اردگرد بہت سے دوسرے مریض بھی جمع تھے۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے، فرش پر بیٹھے ہوئے، کواڑ کے سہارے ٹکے ہوئے، سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ــــــــ کوئی درد سے بے حال، کوئی نقاہت سے نڈھال، کوئی تکلیف سے بے چین، کوئی بالکل بیزار اور خالی الذہن سا۔ کبھی کبھار ہسپتال کے کارندے ان سب کو نظرانداز کرتے گزرتے تو تمام مریضوں کی نظریں اُن کی طرف شک بھری امید سے اٹھ جاتیں۔ مگر وہ ایسے گزر جاتے جیسے پاکستان بننے سے پہلے فرنگی حاکم مقامی لوگوں کے سامنے سے گزر جاتا تھا۔ ہر چند کہ عبدالرحمان کبھی یہی وہاں انتظار کرتا رہا۔ اور گڈو کی گرم گرم بے کل کروٹیں اس کی گود میں جاڑا بھرتی رہیں۔ باری آئی۔ تو وہ ڈاکٹر کو مفصل حال بتانا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ احتیاط سے بچے کو دیکھے۔ مگر ڈاکٹر تو ایسے مریضوں کو آگے چلا دیتا تھا جیسے جلدی جلدی میں تاش کے پتے پھینٹ رہا ہو۔ وہاں سے نکلا تو ڈریسنگ والے کمرے میں کمپاؤنڈر چائے پی رہے تھے۔ پھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے اُن میں سے ایک نے پھوڑے پر ایسا سخت ہاتھ ڈالا کہ گڈو اور عبدالرحمان دونوں چیخ پڑے۔ زخم پھاڑنے کے بعد اس نے نسخہ پڑھا تو کہنے لگا کہ یہ دوائی ختم ہو گئی ہے۔ بازار سے خرید لاؤ۔ عبدالرحمان نے بچے کے جسم سے خون کے فوارے کی طرف اشارہ کیا تو اُس نے دوسری مرہم لگا کر چلتا کیا۔

یہ سب تفصیلات اُس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ چار روز تک اس قسم کے چکر چلتے رہے۔ ہیولے کے شکووں نے اُسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی نظر میں بھی قصوروار بنا دیا تھا۔ مگر جب اُسے یہ سب حالات یاد آنے لگے۔ جن میں اُس کے بچے کی حالت مسلسل سنگ دلی اور لاپرواہی کی وجہ سے بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور ڈاکٹر سے جھگڑنے پر سفید ایپرن میں ملبوس اردلی نے اُسے باہر نکال دیا تھا۔ تو اُس کا غصہ پھر سے تازہ ہو گیا اور اب ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ اُس کی طبیعت بیوی پر بھی کھولنے لگی۔ جو باہر کے حالات سے بے خبر اس کے دماغ کھاؤ کر چارپائی کی ادوائن کی طرح کس رہی تھی۔

عبدالرحمان کافی دیر سوچتا رہا پھر اٹھا اٹھا کر نلکے کی ہتھی چلانے لگا۔ کہ اس میں سے پانی نکلے مگر ہتھی کا پیچ ڈھیلا تھا۔ اس نے جھنجلا کر نلکے کو دو تین جھٹکے دیے اور اسے کروڑ تک سے فرش پر پٹک مارا۔ پیتل کے نلکے کی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ایک ہلکی سی جھنکار بھی فضا میں پھیل گئی۔ پاؤں پٹختا ہوا عبدالرحمان باہر نکل آیا۔

کمرے کے اندر سے پارو کی ماں نے چوکھٹ سے ایک آنکھ نکال کر جھانکا۔ عبدالرحمان کی پیٹھ باہر نکلتی دکھائی دی تو وہ پورا سر باہر نکال کر دیکھنے لگی۔ پورا جائزہ لے کر جب ساتھ پوزیشن میں دوبارہ جم چکی تو ترس بھری نظروں سے بگیاں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"توبہ ہے ۔۔۔۔۔ یہ مرد بھی کیا ذات ہے ۔۔۔۔ اب خود ہی اُلٹے بھی ہو رہے ہیں۔"

بیگماں کی نند بڑی مسکین سی پارو کی ماں کو تسلی ہو گئی کہ موجودہ موقع اس موضوع کے لیے مناسب ہے اور جب دونوں اکٹھ کر بیٹھ ... ہیں تو پارو کی ماں اُن تمام خاوندوں کا نوحہ کر رہی تھی جو بیوی بچوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ مثال کے طور پر اپنی بدقسمت بہن کے خاوند کے قصّے ... رہی تھی جو عبدالرحمان سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ اسی ذکر میں بیگماں نے ایک دفعہ کہا کہ سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں تو پارو کی ماں نے فوراً ... دیور کی اور اپنے بھائی کی مثال دی جو اپنی کم ظرف بیوی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ حالانکہ اُس جیسی عورت قطعاً اس قابل نہ تھی کہ اتنے شاندار بھائی ... بیوی بن سکے یا پارو کی ماں کی بھاوج بن سکے۔ اسی طرح اُس کی ایک نند بالکل چڑچڑی تھی۔ مگر اُس کا خاوند بہت خیال رکھتا تھا ۔۔۔۔ پارو ... ماں کے دلائل جاری تھے اور بیگماں اپنی کھوٹی قسمت پر خود ہی ترس کھاتی مری جا رہی تھی۔

بازار والے ڈاکٹر نے گڈو کی حالت دیکھی اور کچھ کہے بغیر ایک ٹیکہ لگا دیا۔ نئی مرہم پٹی کی اور بخار کے لیے پینے کی دوا دی۔ دو تین ... کے علاج سے بخار تو ٹوٹ گیا۔ مگر گڈو کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ عبدالرحمان نے جب وجہ پر اصرار کیا تو اُس نے مختصر سا جواب دیا کہ ... سے ٹھیک کرنا ہے تو فوراً ہسپتال میں داخل کر کے پھوڑے کا اپریشن کروا دو۔ مگر عبدالرحمان اس کے لیے تیار نہ تھا۔ ہسپتال میں داخل ہونا آسان ... نہ تھا مریض پندرہ پندرہ دن انتظار کرتے ہیں۔ سو سفارشیں ڈلواتے ہیں۔ تب کہیں جنرل وارڈ کے ایک کونے میں جگہ ملتی ہے اور پھر ... طبیعت یہاں بھی نہیں کٹتی بلکہ علاج میں کوئی پروا نہیں کرتا۔ ہسپتال کا عملہ ایسی بے رُخی اور اوپرے دل سے بات کرتا ہے جیسے سات پشتوں ... احسان کیا ہوا ہو۔ اگر خون بہنے لگتا ہے تو پڑے پکارو کوئی نہیں منہ دکھاتا۔ پچھلے دنوں خود اُس کا ایک عزیز ہسپتال میں ہی مر گیا تھا کیونکہ ... اپریشن کے چند گھنٹوں بعد ہی پھر سے خون نکلنے لگا تھا وہ چیختا رہا۔ مگر پہلے تو کوئی آیا ہی نہیں اور جب نرس آئی تو اُسے آرڈر لینے میں اتنی دیر ہو گئی کہ دوبارہ پٹی کرنے سے پہلے وہ مر چکا تھا۔

"نہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں اسے ہسپتال میں داخل نہیں کرواؤں گا۔ آپ خود اس کا اپریشن کر دیں۔"

مگر ڈاکٹر کے پاس کوئی مناسب انتظام نہ تھا اُس نے بتایا کہ ہسپتال کا جو بڑا ڈاکٹر ہے اُس کا پرائیویٹ مریض بن جائے تو وہ خود ہی داخل کروا دے گا۔ یہ آسان ترین طریقہ تھا ۔۔۔۔۔ اور اُس کی فیس مشورہ بتیس روپے تھی۔ سپیشلسٹ جو ہوا۔

عبدالرحمان سپیشلسٹ کے پاس پہنچا تو کوٹھی میں کئی کاریں کھڑی تھیں۔ وقفے وقفے کے بعد اور بھی آتی گئیں اور اُن میں سے مریض نکل نکل کر کرسیوں پر بیٹھتے گئے۔ وہ خود بھی کافی دیر سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ پھر جب ایک آدمی نے آکر اُس سے پرچی طلب کی تو یہ معلوم ہونے پر کہ وہ نیا مریض ہے اُس نے بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے وقت مقرر کرنا ضروری ہے۔ جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں اُن کا وقت مقرر ہے۔ اور اُن میں سے کسی کا وقت ڈاکٹر صاحب کسی کو نہیں دے سکتا۔ عبدالرحمان نے جب وقت مانگا تو اُس نے تین دن بعد کی تاریخ دے دی۔ وہ بھونچک سا رہ گیا لیکن اگر علاج کروانا تھا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ مجبوراً عبدالرحمان یہ تین دن بازار کے ڈاکٹر سے علاج کرواتا رہا۔

سپیشلسٹ نے معائنہ کیا تو اُس کا خیال تھا کہ ابھی یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا فوری طور پر اپریشن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ

اُس نے چار عدد مختلف قسم کے ٹسٹ کروانے کو کہا۔ تین مختلف اطراف سے ایکس رے لینے کو کہا تاکہ پتہ چل سکے کہ پھیپھڑے کی جڑیں وہاں تک گئی ہیں یا نہیں اور پھوڑے پر سے گوشت کے ذرا سے ٹکڑے کا خورد بین کے نیچے معائنہ کروانے کو کہا۔

عبدالرحمان کا دل بیٹھ گیا۔ اُس نے سمجھا کوئی بہت ہی خطرناک بیماری ہے۔ ڈاکٹر سے نسخہ لیتے وقت اُس کی انگلیوں میں ہلکا سا رعشہ تھا اور اُس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "مگر ڈاکٹر صاحب۔ اس کو ہے کیا؟"

ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی اندر آیا تو کہنے لگا: "اگلا مریض بھیجو۔ جلدی۔"

پھر کاغذ سمیٹتے ہوئے بولے "ابھی کچھ اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔ یہ سب ٹسٹ کروالو تو کچھ پتہ چلے گا۔ اس دوران میں مرہم لگاتے جاؤ۔"

سارے ٹسٹ ہونے میں توقع سے زیادہ دن لگ گئے کیونکہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی دقت تھی۔ بعد میں جب عبدالرحمان دوبارہ بچے کو لے کر گیا تو سپیشلسٹ نے چند اور ٹسٹ لکھ دیے اور دوسری دوائیاں تجویز کر دیں ——— علاج جاری رہا۔ ٹسٹ ہوتے رہے۔ ٹیکے لگتے رہے۔ بازار سے مہنگی دوائیں آتی رہیں۔ دفتر والے عبدالرحمان کو بتاتے رہے کہ چونکہ علاج سرکاری ہسپتال سے نہیں ہو رہا اس لیے اس کو گورنمنٹ سے علاج کے پیسے نہیں مل سکتے اور وہ گھر کے گہنے کپڑے رہن رکھ کے روپے لے اور پیسے کم پڑنے کے بعد ادھر اُدھر سے قرض لے کر علاج کراتا رہا۔

اس عرصے میں پارو کی ماں بڑا نذر نیاز کرتی رہی۔ وہ اپنے مشوروں سے نوازتی رہتی۔ نتیجے میں منگل کے روز سفید تل کالے چیونٹوں کی گزرگاہ پر بکھیرے گئے۔ کالے بکرے کی سری آدھی رات کو چوراہے میں پھینکی گئی۔ پیر صاحب کی زیارت پر پانچ روپے کی دیگ کی منت مانی گئی۔ عبدالرحمان پر جو قرض چڑھا اُس میں پندرہ روپے پارو کی ماں کے بھی شامل تھے۔ اور وہ صبح و شام آ کر بیگماں کی دلداری کرتی رہتی تھی۔ جب کبھی گڈو کوکو گود میں لیے رونے لگتی تو پارو کی ماں اُسے بہت دلاسے دیتی اور پھر اڑوس پڑوس میں خود بھی آ بیٹھ کر بیگماں کی بپتا کی بات سناتی۔ کبھی کبھار ساگ یا حلیم وغیرہ پکاتی تو بیگماں کو بھی بھجوا دیتی تاکہ وہ رسوئی کے جھنجھٹ سے بچی رہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی ماں کا ذکر ضرور کرتی جو ہمسایوں کے گھر میں بیماری ہونے پر کئی کئی دن اُن کے لیے پورا کھانا پکوا کر بھیجتی اور پھر اُس کا مقابلہ اپنی ساس سے کرتی جو اتنی سنگدل تھی کہ ہمسایہ چاہے بھوکا مرنے والا ہو، وہ اُس کا کھانا پینا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عبدالرحمان عجیب بولایا ہوا سا سڑک پر چل رہا تھا۔ راستہ دفتر کا ہی تھا۔ مگر کتنا غیر مانوس لگتا تھا۔ دھوپ کی چمک کے باوجود ہر چیز کی رنگت اُڑی اُڑی سی تھی۔ جیسے سینما میں فلم کی روشنی میں دکھائی جا رہی ہو۔ ہر راہگیر اُس کے دکھ سے بے خبر ہشاش بشاش سا نظر آتا تھا۔ اُسے یوں لگتا جیسے سارے عالم میں صرف وہی پریشان ہے اور دوسرے کسی کو کوئی پریشانی نہیں۔ اس کے ناہموار سے قدم چھوٹی اور روڑوں کو ٹھوکر لگا رہے تھے اور ہاتھ مستقل طور پر جیب پر تھا۔

اُس کی جیب میں کچھ نہ تھا۔

آج صبح جب اُٹھتے تو ناشتے کے دوران میں عبدالرحمان بالکل خاموش تھا۔ بیگماں جیسے خاموشی کی ایک ایک سطر کا مطلب سمجھتی تھی

اور دونوں کے درمیان بے زبانی کا ایک پُل تھا جس پر سے گزر کر اُن کے خیالات ایک دُوسرے تک پہنچ رہے تھے ——— بڑے ہی واضح اور صاف گفتگو سے بھی بہتر کپڑے بدلتے وقت اُس نے کنکھیوں سے بیگماں کی طرف دیکھا تھا جو سر جھکائے کُنڈے کے پاس بیٹھی تھی اور جیسے آپ ہی آپ عبدالرحمان کے مُنہ سے کوئی اجنبی سی آواز نکل گئی۔

"کچھ ہے ؟ " ——— بیگماں نے نگاہ اُٹھائی۔

"بیچنے کے لیے ۔"

اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ جب باہر آئی تو وہ تیار ہوکر دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ بیگماں نے ہاتھ بڑھایا اُس نے بھی خاموشی سے ہاتھ آگے کیا اور ایک دُوسرے سے نظریں چُراتے ہوئے کاغذ کی پڑیا اُس کے پاس منتقل ہوگئی۔ دونوں ایسے مُنہ پھیر کر بھاگے جیسے اُنھوں نے کوئی شرمناک جُرم کیا ہو اور اب احساسِ شرمندگی سے شکل نہ دکھا سکتے ہوں۔ مکان سے باہر نکل کر وہ کافی دُور تک ایسے ہی چلا گیا ——— پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر پُڑیا کو پھاڑا اور اُس کا انگوٹھا ایک گول چکر پر پھرنے لگا۔

"ارے یہ تو کنگن ہے " ایک زلزلہ سا اُس کے سارے جسم میں کوندگیا۔

کنگن کی یادیں لاوے کی طرح دماغ میں پھٹنے لگیں . . . .

. . . . . . چند سال پہلے وُہ جھجکتا ہُوا حجلۂ عروسی میں داخل ہُوا تھا۔ آنکھوں میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں اور سارا جسم اندر ہی اندر ایک سُہانے ارتعاش سے پھڑک رہا تھا۔ قابو پانے کے لیے وُہ کبھی ایک پیتے کو اکڑاتا کبھی دُوسرے کو اور اپنی دانست میں بہت ہی نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا ——— دُلہن کے پاس بیٹھا تو گھونگھٹ کے پیچھے سے نقوش کا ہیولیٰ لہریں مارتا معلوم دیا۔ اور کبھی ایک آدھ زیور کا اودھ سوا چمکارا گھونگھٹ کے تاروں میں سے اندھی دُھوپ کی طرح چھن کر آنے لگا۔

اُس کا مُنہ خشک ہوگیا۔ دماغ میں فلیتہ سا دہکنے لگا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پہلو بدل کر اُس نے جائزہ لیا ——— سر کی گولائی سے نیچے پھیلتا ہُوا جھلملاتا گھونگھٹ اور پہاڑی سڑک کی طرح بل کھاتا اُس کا سنہری کنارہ۔ نیچے ملے ہوئے گھونگھٹ تلے گود میں دو منہدی والے ہاتھوں کا ڈھیر سا تھا۔ ہر چیز گڈمڈ سی تھی۔ سوائے ایک کنگن کے جو اُس وقت کی بہت ہی صاف اور نمایاں یاد تھی۔

اُس نے پھر پہلو بدلا ——— ہاتھ تھوڑے اُٹھائے ——— پھر روک لیے ——— جھجک سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور ہاتھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔

دو لانبی لانبی پلکیں ——— اُن پہ ہلکی سی مسکراہٹ ——— وہ دیکھتا رہا اور متوقع رہا کہ اب آنکھیں کُھلیں گی۔

. . . . کھلیں گی . . . . . کھلیں گی . . . . . مگر وہ ویسی ہی رہیں ——— اتنے میں چند رنگے ہوئے ناخن ٹھوڑی سے اوپر اٹھتے اُٹھتے اتنے تک گئے ——— اور منہدی والا ہاتھ چہرے سے پسینہ پونچھنے لگا ——— اُنگلیوں کے دباؤ تلے نرم گوشت غوطے لگانے لگا۔

اُس ہاتھ کی کلائی میں ایک کنگن کندے مارتا ہُوا نیچے کو کھسکنے لگا۔ جیسے چوڑیوں کی جھنکار پر ناچ رہا ہے ——— اور پھر نہ

نرمی سے کنگن بازو میں پھنس گیا۔ جیسے بچہ اطمینان سے ماں کی آغوش میں سمٹ جائے۔

عبدالرحمان کے جسم میں آتش بازی چھوٹنے لگی۔ اُسے زندگی میں کسی لڑکی کے اتنا قریب آنے کا پہلا موقع تھا۔ اس لیے ذرا گھبراہٹ تھی۔ وہ باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا ——— پہلے رُک رُک کر ——— پھر ذرا اعتماد سے اور بعد ازاں مزے سے۔ مگر وہ باتوں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ پر اُسے کوئی طریقہ نہ سوجھتا تھا۔ وہ کمرے میں پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھتا کہ شاید ان میں سے کوئی کام کی نکل جائے۔ دُلہن کے کپڑوں پر نظر ڈالتا کہ شاید اِدھر سے کوئی بہانہ ہاتھ آجائے۔ گفتگو میں خواہ مخواہ موڑ توڑ لاتا مگر کوئی حل نظر نہ آیا۔

اتنے میں دلہن نے پہلو بدلا۔ سُرخ کپڑوں کے انبار میں کہیں ہاتھ اٹکا اور چھناکے سے کنگن زمین پر آرہا۔

دو نیم وا آنکھوں نے شرمیلے سے کیلنے پن سے کہا "اس کا پیچ کچھ ڈھیلا ہے۔"

اگلے لمحے وہ گھٹنوں کے بل فرش پر پیچ ڈھونڈ رہا تھا ——— پھر کپڑوں کی سرسراہٹ اور خوشبو کے جھونکے بھی اُس کے پاس آ بیٹھے ——— اور تلاش میں شامل ہوگئے ——— چارپائی کے نیچے ——— کُرسی کے پاس ——— میز کے پائے کی اوٹ میں ——— ہر جگہ عبدالرحمان کی انگلیوں اور کنگن نے زندگی میں پہلی بار کئی دفعہ نیا لمس پایا ——— بالآخر پیچ مل گیا۔ عبدالرحمان نے کنگن اُٹھا کر اُس میں ڈالا اور دُلہن کی طرف دیکھا

——— مسکراہٹ

——— لالی

——— خواہش

ہاتھ بڑھا کر اُس نے کلائی تھامی ——— نرمی سے کنگن پہنا دیا اور پھر ——— اُس نے کلائی نہ چھوڑی۔ . . . .

دو چار روز بعد جب حجاب کی دیواریں گرگئیں اور اُن کے تعلقات مذاق کی سرحد میں داخل ہوگئے تو عبدالرحمان نے اُس کنگن کو "مشکل کشا" کا نام دیا۔ اور بیگماں بہت ہنسی۔ پھر وہ آئندہ بھی اُسے مشکل کشائی کے لیے استعمال کرنے لگے۔ وقت گزرنے پر وہ واقعی ثابت بھی ایسا ہی ہُوا۔ ازدواجی تعلقات کے خالص پیار کے رنگ میں جب زندگی کی سنگلاخ حقیقتیں بھی جھلک اُٹھنے لگیں۔ تو اُن میں کبھی کبھی لڑائی جھگڑے بھی ہو جاتے۔ شروع شروع میں معمولی ناراضگیوں کے بعد دو تین روز تک بول چال بند رہنے لگی۔ ایسی حالت میں عبدالرحمان جب بھی صلح کرنا چاہتا۔ کمرے میں جاکر چپکے سے کنگن نکال لیتا اور کسی وقت بیگماں کے بازو میں پہنا دیتا ——— جھگڑا کتنا ہی شدید کیوں نہ ہُوا ہوتا بیگماں کنگن پہنتے ہی فوراً مان جاتی اور دونوں اگلے جھگڑے تک ٹھیک ٹھاک رہتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہُوا کہ بیگماں خود صلح کے موڈ میں عبدالرحمان سے پہلے آگئی تو وہ کنگن نکال کر ایسی جگہ رکھ دیتی جہاں عبدالرحمان کی نگاہ سیدھا پڑنے کا امکان ہوتا تھا۔ وہ ایک دفعہ نظر پڑنے پر وہ فوراً اُس کی چمک کا شکار ہو جاتا تھا۔

ایک دن مالی تنگ دستی کا ذکر کرتے ہوئے عبدالرحمان نے جذباتی سا ہوکر کہا تھا "پگلی جب سے تیری شادی ہوئی ہے۔ تجھے کوئی زیور بھی نہیں بنوا کر دے سکا۔"

تو بیگماں نے ہنسے لگاؤ سے کہا تھا "آپ مجھے جب بھی کنگن پہناتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں نیا بنوا کر پہلی دفعہ پہنا رہے ہیں۔"

عبدالرحمان کتنی ہی دیر تک مسکراتا رہا تھا۔

آج بیگم نے وہی کنگن اُسے بیچنے کو دیا تھا۔ وہ اِسے لے کر دفتر جا رہا تھا تا کہ وہاں کچھ دیر کام کرنے کے بعد گھنٹہ بھر کی چھٹی لے کر بیچ آئے اور دوائیوں وغیرہ کا قرضہ ادا کر کے گڈو کا علاج جاری رکھ سکے۔

پیں۔۔۔ پیں۔۔۔۔ چونک گ گ۔۔۔۔۔ ایک دم کار کے ہارن اور پھر سخت بریک کی آواز نے اُسے اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر رُکا۔ سوچوں میں غرق وہ کار کے نیچے آنے لگا تھا مگر بر وقت بریک نے اُسے بچا لیا۔ معذرت کے انداز میں اُس نے کار پر نظر ڈالی تو اندر پرویز بیٹھا تھا۔ عبدالرحمان نے مسکرا کر سر کے اشارے سے اُسے سلام کیا۔ مگر وہ ایک دفعہ گھورنے کے بعد آگے نکل گیا اور عبدالرحمان پیچھے سے لمبی نیلے رنگ کی امپالا کار کے پیچھے پھیلاؤ پر گول گول سُرخ شیشے دیکھتا رہا۔

پرویز سکول کے زمانے میں عبدالرحمان کا ہم جماعت تھا۔ حد سے زیادہ نالائق۔ رعایتی نمبر لے کر یا نقل کر کے پاس ہونے والا۔ امتحانوں کے قریب عبدالرحمان کے پیچھے پیچھے گھومتا تھا۔ بعد ازاں کسی سرکاری ملازمت میں گیا تھا۔ سُنا تھا بہت سا روپیہ غبن کر کے استعفیٰ دے دیا اور اب اپنا کاروبار کرتا تھا۔ یہ نہیں پتہ کیا کاروبار کرتا تھا۔ مگر عبدالرحمان کو یقین تھا کہ اُس جیسا بے اصول اور کوئی اُلٹا ہی دھندا کرتا ہو گا۔

سڑک پار کر کے فٹ پاتھ پر چڑھنے میں اُس کا انگوٹھا پھر سے کنگن کی گولائی پر پھسلا۔ لمحہ بھر کو اُس کے دل میں خیال آیا کہ پرویز جیسے لوگ جو کامرانی کے دعوے دار ہیں۔ مزے کرتے ہیں اور وہ اپنے اصولوں کی خاطر اتنی تکلیف اُٹھا رہا تھا۔ کہ زندگی کا سب سے پیارا اثاثہ فروخت کرنے جا رہا تھا۔ اِس کنگن کی قیمت سُنار تولوں ماشوں کے حساب سے دے گا۔ مگر اُس کا ترازو اُن پیار بھرے چکروں کو نہ تول سکے گا۔ جو پیچ کے سرے پر ان گنت دفعہ عبدالرحمان نے دیے تھے۔ سُنار گھڑائی کی قیمت تو ضرور دے گا۔ مگر اُس کی ہتھوڑی کے بعد اُس پر بجلے بجے، مدھم مدھم، نیم گرم گوشت کے دباؤ زندگی کی حرارت پیتے رہے ہیں۔ اِس گولائی میں کتنے ہی سُہانے لمحے اور ہری بھری یادیں لپٹی ہیں جو کبھی نہ دُہرائی جائیں گی۔ اُس نے جیب کے اندر ہی اندر کنگن کو ہاتھ سے پیار کیا اور دفتر میں داخل ہو گیا۔

کُرسی میں بیٹھ کر اُس نے فائیلوں کے ڈھیر پر نظر ماری۔ ایک فائل کے ساتھ گلابی رنگ کا "فوری" کا لیبل چسپاں تھا۔ اُٹھا کر سامنے رکھی اور کھول کر پڑھنے لگا۔ اتنے میں چپراسی دو اور فائلیں لے آیا۔ جن میں سے ایک اور پر بھی اُسی قسم کا گلابی رنگ کا لیبل چسپاں تھا۔ عبدالرحمان نے پہلی فائل رکھ دی اور دُوسری اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

کمرے میں سب لوگ موجود تھے۔ عاقل اپنی میز پر جھکا ہوا افسر کی ڈانٹ کی چٹھی پڑھ رہا تھا جس میں اُس کے پاس بہت سی پُرانی فائیلوں کے اکٹھے ہونے کا ذکر تھا۔ ایک کلرک کام میں منہمک تھا۔ دُوسرا انگڑائیاں لے کر صبح صبح کی سُستی دُور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور تیسرا بڑی بے دلی سے قلمیں اور پنسلیں رکھ رہا تھا۔

چپراسی ایک رقعہ ہاتھ میں پکڑے پیر گھسیٹتا اندر آیا اور عبدالرحمان کو دیتے ہوئے بولا ' صاحب نے یہ کیس مانگا ہے۔'

اُس نے میز کی فائیلوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک فائیل نکال کر دے دی۔

عبدالرحمان کمرے کے ماحول سے بیگانہ سا بیٹھا تھا۔ وہ ایک "فوری" فائیل اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ پہلی چند سطروں کو بار بار پڑھتا

مگر پھر طبیعت مطمئن نہ تھی اُسے رکھ دیتا تھا دُوسری فوری فائیل اُٹھا لیتا۔ اس طرح کئی دفعہ اُس نے دونوں فائیلوں پر نظریں جمائیں مگر چند سطروں سے آگے نہ چل سکا ——— اُس کا دماغ قطعی غیر حاضر تھا۔

اتنے میں صاحب کی طرف سے بلاوا آگیا اور وہاں جانے پر اُسے ڈانٹ پڑی کہ اُس نے غلط فائیل کیوں بھجوائی تھی۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ کام پر تو اُس کا دل نہیں لگ رہا کیوں نہ ابھی جا کر ٹکٹ فروخت کر دے۔ چنانچہ اُس نے ایک صاف کاغذ اٹھایا اور بڑی سنجیدگی سے ایک گھنٹے کی رُخصت کی درخواست لکھنے لگا ——— دستخط کر کے اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور کرسی کی پیٹھ سے ٹیک لگا دیے ہی بیٹھ گیا۔ اُس کے ذہن میں خیالوں کے بگولے اُٹھنے لگے۔ بغیر کسی ربط یا تسلسل کے ——— بیگم کا اُترا ہوا اُداس چہرہ۔ گڈو کی بے چین کروٹیں۔ ڈاکٹر کا شیشی انداز۔ صبح ٹکٹ دیتے وقت بیوی کا ضبط ——— اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ کو ٹٹولا اور نہ معلوم کیوں، اُس وقت اُس کو پرویز یاد آگیا اور اُس کی بڑی سی امپالا کار میں لال لال روشنیاں . . . . .
وہ اسی طرح جیب میں ہی ٹکٹ کی گولائی پر انگلیاں جمائے سوچتا رہا . . . . . کبھی کبھار انگوٹھے کا ناخن غیر محسوس حرکت سے پیک کے سرے کو گھمانے کی کوشش کرتا ——— اور وہ سوچتا رہا۔

بالآخر وہ اُٹھا کہ عرضی افسر کو دے کر بازار جائے۔ اُٹھ کر اُس نے لمحہ بھر کو دم لیا۔ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب لوگ سر جھکائے کام میں مصروف تھے اور مکمل سکوت تھا۔ اُس کی نظر عاقل پر پڑی ——— وہ بڑے مطمئن انداز میں فائیل پر جھکا ہوا تھا۔ میز کے کونے کے اُس پار اُس کا پاؤں جھانک رہا تھا۔ جیسے وہ بڑی لاپرواہی سے ہلا رہا تھا۔ پنسل میز پر رکھتے وقت وہ دھیمی سی کوئی سُر گنگنایا اور پھر اُٹھا کر سر میز پر جھکاتا ہوا فائیل کے ورق اُلٹنے لگا۔

عبدالرحمان اُسے دیکھتا رہا ——— جیب میں ٹکٹ پر اُس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

——— کمرے میں مکمل سکوت

——— عبدالرحمان کی ذہنی پریشانی

——— عاقل کا اطمینان

——— پرویز

——— ٹکٹ

ان سب نے جیسے سازش کر کے ایک ایسے طوفانی لمحہ کو جنم دیا جو ہماری زندگی میں کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ جس میں ہماری شخصیت کی نفی ہو جاتی اور ہم وہ کچھ کر گزرتے ہیں جو ہم نہیں ہیں۔ اس حادثہ لمحے کے سامنے عبدالرحمان بالکل بے بس ہو گیا . . . .
کرسی پیچھے کر کے وہ دروازے کی طرف چلا مگر اُس کے قدم عاقل کی طرف خود بخود اُٹھ گئے ——— عاقل نے کندھے پر ہاتھ محسوس کر کے سر اُوپر اُٹھایا۔

"آئیے سرکار ——— کیا حال ہیں؟" وہ ترنگ میں بولا۔

"چائے پیو گے؟" عبدالرحمان نے جیسے نیند میں پوچھا۔

"مزدور۔ مزدور" وہ چیخا "چائے سے کون کافر انکار کر سکتا ہے ——— " اسے کدھر گیا یہ لاٹ صاحب" اُس
نے ادھر اُدھر چپراسی کو دیکھ کر کہا اور گھنٹی پر ہاتھ مارنے لگا مگر عبدالرحمان نے ہاتھ روک لیا۔ اُس کا جسم اندر سے ایسے کانپ
رہا تھا جیسے دُور سے آنے والی گاڑی کی حرکت سے لائن لرزتی ہے۔ وہ بولا۔

"یہاں نہیں ——— کینٹین میں چلتے ہیں ——— ذرا گپ رہے گی۔"

کینٹین کے راستے میں عبدالرحمان کی گرفت اپنی عرضی پر مضبوط ہونے لگی۔ اُس کی اُنگلیوں کے پوروں نے آہستہ آہستہ
اُس کاغذ کو سمیٹنا شروع کیا۔ جیسے بکری گھاس کے لمبے تنکوں کو ہوتے ہوتے مُنہ میں کھینچتی ہے۔ کاغذ کا سپاٹ پھیلاؤ مُڑ مُڑ ہو کر اس
کی کانپتی ہوئی مٹھی میں غائب ہونے لگا۔ بالآخر وہ سمٹ کر ایک چھوٹی سی گولی بن گیا۔ جس کو عبدالرحمان نے انتہائی زور سے دبایا
اور کینٹین میں داخل ہونے سے پہلے دروازے کے پاس پڑے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں دے ماری۔

چارپائی پر گُڈو سو رہا تھا۔ اُس کا جسم چادر سے ڈھکا تھا۔ کبھی کبھار کوئی مکھی چہرے پر بیٹھتی تو وہ مُنہ سکوڑ دیتا۔ یا نیند
میں سر جھٹک دیتا۔ پاس بیگماں اور پارو کی ماں بیٹھی تھیں۔ پارو کی ماں بولے جا رہی تھی۔

"چودھری کی بیوی میری مانتی تو آج کیوں خوار ہوتی۔ میں نے سو مرتبہ سمجھایا کہ بہن لڑکی کی طلاق ہو گئی سو ہو گئی۔ اب اللہ کا
نام لے کر کہیں اور شادی کر دو۔ کہتے ہیں رنڈیاں تو دن نکال بھی لیتی ہیں مگر مُشٹنڈے نہیں نکالنے دیتے۔ ٹھیک ہے دُنیا میں نیک
عورتیں بھی ہیں اور بد بھی۔ مگر بہن نیکی بدی بھی تبھی ہے جب حالات ساز گار ہیں۔ ورنہ تو مجبوری بڑے بڑوں کی نیکی کو منٹوں میں پیس
کر گنا ہگار بنا دیتی ہے ——— اور وہ ہے بھی خوبصورت۔ چندماہ کی شادی میں مرد کا چسکا بھی پڑ چکا ہے۔ اب وہ
کیسے اکیلی رہے گی۔ مگر چودھری کی بیوی نہیں مانی۔ اب دیکھ لو گھر میں مُنہ چھپائے پڑی ہے۔ آخر کوئی تہ خانے میں تو رکھتی نہ
اپنی بیٹی کو ——— آبادی میں رہتی تھی۔ پاس پڑوس میں ڈھیروں مرد پڑے ہیں۔ کوئی لگا گیا ہو گا داؤ۔"

بیگماں ہنسنے لگی "تم تو بہن خوب حساب لگاتی ہو۔"

"ہاں۔ ہاں۔ تو کیا جھوٹ کہتی ہو۔ بہن مجھے تو ہیر پھیر کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں۔ میں تو صاف کھری کہتی ہوں
اپنی سچی چیز تو یہ ہے کہ اگر اب مجھے بھی مرد کے بغیر رہنا پڑے تو جان عذاب کو آ جائے۔ نہ جانے کیا کر گزروں۔"

پھر وقفہ ڈال کر بولی "اور تم بتاؤ۔ بھلا تم رہ سکو گی۔"

بیگماں پھر ہنسنے لگی۔

"نہ۔ نہ۔ بات کرو نا سیدھی ——— آخر انسان ہو ——— فطرت بھی تو کوئی چیز ہے یا نہیں۔ تم بے شک مومن بن کے
لسدو کر رہ لو گی۔ مگر بھئی ہم تو صاف کہتے ہیں کہ ہمارا گزارہ نہیں ہوگا۔"

بیگماں بولی "سچ ہے بہن۔ کام ذرا مشکل ہی ہے۔"

ہنسنے میں گُڈو کسمایا اور وہ دونوں "ہائے بسم اللہ" کہتی ہوئی ادھر کھسکیں۔

گڈو نے بے چینی میں ہنستے ہوئے بے چینی سے ایک دو کروٹیں بدلیں اور پھر سو گیا۔ مگر ماں کا موضوع بیچ میں ہی رہ گیا۔ کیونکہ اُسی وقت عبدالرحمان گھر میں داخل ہوا۔ پارو کی ماں کی آواز سن کر کہا سنا تو وہ تڑ تڑ قدم اٹھا کر بھاگی۔ "ہائے عبدل جی آ گئے ——— میں چلوں اب۔"

عبدالرحمان نے بیگماں کے سامنے کنگن نکالا تو خوشی کا سیلاب حیرت کے چہرے پر امنڈ آیا۔ اُس نے عبدالرحمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ بیگماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے پیچ ڈھیلا کیا ——— کلائی پکڑی ——— کنگن چڑھایا ——— پیچ کسا ——— اور پھر ساتھ لپٹا لیا۔

بیگماں نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اُس کے لیے یہی تسلی کافی تھی کہ کنگن واپس آگیا ہے۔ مگر عبدالرحمان نے خود ہی کہہ دیا کہ کہیں سے پیسے مل گئے تھے اس لیے بیچا نہیں۔ بیگماں مسرور ہو کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

عبدالرحمان نے جھک کر بچے کو دیکھا۔ پچکے پچکے گالوں میں چھوٹا سا ناک سانس کی آمد سے ہلکی سی آواز پیدا کر رہا تھا جیسے کوئی ننگے پاؤں گھسیٹ کر فرش پر چلے۔ نچلا ہونٹ اوپر والے ساتھی سے بہت چپٹا ہوا تھا اور دونوں کے ملاپ کی لکیر سے پپڑیاں باہر کو پھیل رہی تھیں۔ بند آنکھوں پر پلکوں کے بال ہوا میں لٹکے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح کسی وقت فرد سے مڑ جاتے۔ اس معصوم اور بے خبر چہرے کو بالکل علم نہ تھا کہ اس کے مضبوط اصولوں کو سُرخی میں بدلنے کے لیے باپ کتنی مشکل حدود پھلانگ چکا تھا۔ اور اُس کے مضبوط اصولوں کا ملبہ چند روپے بن کر جیب میں پڑا تھا ——— صبح ہی عبدالرحمان نے جانے سے پہلے بچے کے چہرے کو اسی طرح دیکھا تھا اور اب بھی دیکھ رہا تھا ——— مگر اس اثنا میں اُس کا اپنا چہرہ کتنا بدل چکا تھا۔ ——— کیا وہ اپنی پہلی شکل واپس لے سکے گا؟؟ عبدالرحمان کی آنکھیں سوچ سے بجھ گئیں اور وہ جلدی سے اندر چلا گیا۔

کمرے میں جا کر روپوں کا بنڈل جیب سے نکالا اور دونوں ہاتھوں میں لے کر غور سے دیکھنے لگا۔ دفتر کے وقت کے بعد جب وہ عاقل کے ساتھ اُس آدمی کے پاس روپے لینے گیا تھا تو اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کو عاقل نے کئی دلاسے دیے تھے۔ عبدالرحمان بار بار کہتا کہ میں یہ پہلی اور آخری مرتبہ کر رہا ہوں اور یہ بھی مجبوری کے تحت ہے ورنہ پھر کبھی نہ کروں گا۔ تو عاقل مسکرا کر کہتا۔

"شروع میں سبھی اسی طرح کہتے ہیں میرے بھائی ——— کوئی بات نہیں ——— پہلی بار گھبراہٹ ہوتی ہی ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

اور پھر اُس آدمی نے کیسے کاروباری انداز میں اُسے روپے دیے تھے۔ جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں اور سبزی فروش تولنے کے بعد سودا بغیر کسی بُرے احساس کے دیتا ہے۔ عبدالرحمان کے ماتھے پر ایک دم پسینہ آگیا تھا۔ سارے جسم میں تار کے کھمبوں پر کان لگا کر سنائی دیے جانے والی شاں شاں ہونے لگی اور دل نہ معلوم کہاں ڈوبا جا رہا تھا۔ باہر نکلا تو بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

کمرے میں نوٹوں کا بنڈل اپنی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ ملامت کے تازیانے لگا رہا تھا۔ کھڑکی میں سے آنے والے دن کی

روشنی ناقابلِ بیان طریقے سے غیر مانوس سی تھی۔ کمرے کا سارا ماحول بیگانہ لگتا تھا۔ اور برسوں کے گھسے پٹے سامان کی ہر شے ایک خاموش تماشائی لگ رہی تھی جو اُس کے دل و دماغ کے اندر ہونے والی ہر حرکت کا مخالفانہ دلچسپی سے اندازہ لے رہی ہو۔ جیسے کوئی سخت گیر جج سزا دینے سے پہلے خاموش اور گہری آنکھوں سے ملزم کا بیان سنتا ہے۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہ تھا۔ مگر اس کے دماغ میں ایک بھاری انجن کے چلنے کا شور تھا۔ جس کی بوجھل گونج میں بار بار یہ سوال اُٹھتا تھا۔

'یہ میں نے کیا کر دیا؟'

شوخی میں آکر اپنا کھلونا توڑنے والے بچے کی طرح اب وہ ناسمجھی میں ڈوبا اُس لمحے کو واپس لانا چاہتا تھا۔ جب اُس نے یہ فعل نہیں کیا تھا اور اپنی زندگی از سرِ نو اُس لمحے سے آگے پھر سے جاری کرنا چاہتا تھا۔ مگر کھلونا ٹوٹ چکا تھا اور اس کے بکھرے ہوئے ملبے کے پیچھے آرام و سکون کے سارے سابقہ لمحے غائب ہو چکے تھے ــــــــ جیسے کوئی مُنہ زور ہوائی جہاز ایک دم غوطہ لگا کر فضا کی خاموشی کو پاش پاش کر کے فوراً ہی غائب ہو جائے اور شور سے بے قرار ہو کر اُڑنے والی چڑیاں واپس نہ بیٹھ سکیں۔

اتنے میں گڈو نیند بھری توتلی دار آواز میں بابا کہا تو عبدالرحمان کے اپنے وجود نے نئی کروٹ لی۔ ایک نئی دھار اُس کے دل میں اُترتی چلی گئی اور دونوں جیبوں کے ٹکراؤ پر ایک ہیجان کے عالم میں اُس نے نوٹوں کے بنڈل کو ایسے پکڑا جیسے ڈوبنے والا تنکے کو پکڑتا ہے۔ جیب میں ڈال کر باہر نکلتے ہوئے وہ خود ہی بڑبڑایا۔

'اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔'

آج ڈاکٹر بڑی نرمی سے بات کر رہا تھا۔ گڈو کی حالت دیکھنے میں اُس نے بہت دیر لگائی۔ اور دوائی تبدیل کر دی۔ جب وہ ٹیکے کے متعلق ہدایات دے رہا تھا تو اُس کی آواز میں ہمدردی تھی۔ اور جب عبدالرحمان گڈو کو گود میں لیے اُٹھنے لگا تو ڈاکٹر نے ویسے ہی بچے کے سر پر ہلکا سا پیار پھیر دیا۔

عبدالرحمان کا دل خوشی سے بھر آیا۔ پیسے میں کتنی طاقت تھی۔ اُس نے سوچا۔ آج یہ کتنی ہمدردی دکھا رہا ہے۔ اگر ایسا ہی حساب رہا تو انشاءاللہ گڈو جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔

بچے کو گھر چھوڑ کر وہ ٹیکہ لینے کو بازار چلا گیا۔ دوائی وغیرہ خریدنے کے بعد اُس نے بازار کا چکر لگایا اور اُن تمام دکانداروں کے بل ادا کیے جن کا وہ مقروض ہو چکا تھا۔ سب کو بقایا ادا کرنے کے بعد وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اور گھر کی واپسی کے راستہ میں وہ ایک ریستوران میں گھس گیا۔

کوکا کولا کے ٹھنڈے گھونٹ پیتے ہوئے اُس نے سوچا کہ عاقل سچ ہی کہتا تھا۔ ایک معمولی سی چیز سے میری کتنی مشکلات ختم ہو گئی ہیں۔ اس سے پہلے دُنیا میری نظروں میں تاریک ہو رہی تھی۔ یاروں دوستوں سے قرض مانگنے کی وجہ سے مُنہ چھپانا شروع کر دیا تھا۔ بازار میں نکلنے سے وہ گھبراتا تھا کہ ہر دکاندار بل کے لیے مُنہ پھاڑے بیٹھا تھا۔ ذہنی اُلجھنوں کے گھٹن گھوٹ ....
کو اندر ہی اندر میں سب سے تھے اور اب.....

ٹھنڈا گرم نشہ ہے کہ اس نے پھر مزے لیتے ہوئے ڈکار لی ——— سب کوئی پوچھ نہیں۔ گورنمنٹ کو بیماری کا پتہ ہی

درست ہے۔ مگر وہ انشاءاللہ جلد ٹھیک ہو جائے گا ——— پھر ——— سب ٹھیک ہے۔

ریستوران میں ایک مرد اور ایک عورت داخل ہوئے۔ اُس نے غور سے مرد کو دیکھا۔ پچھلی دفعہ جب وہ دُوسرے دفتر میں میٹنگ کے لیے اپنے افسر کے ہمراہ گیا تھا۔ تو یہ شخص بھی وہاں اپنے افسروں کو کاغذات وغیرہ پیش کر رہا تھا۔ غالباً کوئی کلرک یا اسسٹنٹ تھا۔ ایک آنکھ میچ کر عبدالرحمان نے سوچا کہ یہ عورت اس کی کیا لگتی ہوگی تو اُسے ایک دم ماتل کا قاعدہ کلیہ یاد آیا۔ جو جاسوسوں کی طرح شور کر کر کے سب کو ہنسا ہنسا کر بتایا کرتا تھا۔

"ہماری باتوں سے کچھ سیکھو دوستو۔ سڑک پر لڑکا اور لڑکی جا رہے ہوں تو ان کا رشتہ دیکھنے کے لیے لڑکے کو دیکھو۔ اگر وہ اکڑ کر چل رہا ہو تو عاشق ہے اگر جھینپ کر چل رہا ہو تو بھائی ہے اور اگر بیزار نظر آئے تو خاوند ہے۔"

اُس نے فوراً یہ نسخہ آزمایا اور نتیجہ نکالا کہ وہ لڑکی کا عاشق ہے۔ کوکا کولا کی خالی بوتل کو حسرت سے دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا۔ عیش کرنے دو سالوں کو۔ کیا پڑا ہے اصولوں میں۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہی تکلیف ہوتی ہے۔ دُوسرے تو تمہارے بغیر بھی مزے کرتے ہیں۔ تم چاہے جلوس میں ہو یا نہ ہو۔ اُن کا کیا جاتا ہے نقصان تو اپنا ہی ہے۔

وہ منہ موڑ کر بیٹھ گیا تاکہ اُس بوڑھے کو نظر میں رکھ سکے۔ منہ کی ڈھکی چھپی بے تاب حرکتوں نے اُس کے شبے کو یقین میں تبدیل کر دیا۔ میز کے نیچے سے پاؤں کا ٹکرانا۔ ٹوسٹ پکڑاتے وقت انگلی پکڑ لینا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا۔ کافی واضح نشانیاں تھیں۔

اُس نے جھک کر بوتل میں بچی ہوئی نلی سے دو تین گھونٹ بھرے اور سوچنے لگا۔ اِس قسم کے مزے پیسے کے بغیر ممکن نہیں۔ مگر اب تو یہ مشکل نہ ہوگا۔ مگر یہ کلرک کر سکتا ہے میں کیوں نہیں کر سکتا۔ ایک ہی تو زندگی ہے اُس میں بھی چند روز عیش نہ کیا۔ تو کیا بات ہوئی۔ افسوس کہ اتنا عرصہ پہلے بھی میں نے اصولوں کی قید میں ضائع کیا۔ نہ صرف یہ کہ ایسی خوشیوں سے خود محروم رہا بلکہ اپنی بیوی کی جوانی بھی عذاب میں ڈال ——— کل اتوار ہے ——— پرسوں جاتے ہی اُس فائل میں سے قاعدہ کم کر کے کیس اُوپر بھیج دوں گا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اتنی چیزوں میں ہمارا کیا جاتا ہے بلکہ فائدہ ہی ہے ——— گورنمنٹ کو میں نقصان نہ پہنچاؤں گا تو اور ہزاروں لوگ کریں گے۔ اِس لیے میں کیوں مُفت کی خیر خواہی میں گھاٹا کھاؤں۔

بیرہ بل لایا تو عبدالرحمان نے دس روپے کا نوٹ بڑی شان سے ٹرے میں پھینکا۔ باقی پیسے واپس دیتے وقت پلیٹ میں ایک روپیہ ٹپ دیکھ کر بیرے نے جھک کے سلام داغ دیا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے عبدالرحمان ایڑھی پر گھوم سا گیا۔ باہر نظر دوڑائی تو سڑک پر کاروں، سائیکلوں اور پیدل لوگوں کی ریل پیل میں دُنیا بہت ہی سُہانی نظر آئی۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ ٹہلتا ٹہلتا چل دیا۔ فٹ پاتھ کے ایک کنارے پر پنواڑی بیٹھا تھا۔ اس کے تختے پر اس نے دونی بڑی شان سے پھینکی۔

"میاں۔ ایک میٹھا پان تو دو۔"

اُس نے کٹوری بجائی تو عبدالرحمان لمبا سانس لے کر ہوا کی باس لیتا ہوا بولا۔

"ذرا خوشبو اچھی لگانا۔"

پان والے کے سامنے چوڑا سا تختہ تھا۔ جس کے دونوں طرف ڈھکنے سے کھلے تھے۔ اُن میں سگریٹ کی ڈبیاں جڑی تھیں۔ عبدالرحمان اُن کے نام کے پڑھتا رہا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ مگر اُس نے سوچا آج یہ مزا چکھنے میں بھی کیا حرج ہے۔ چنانچہ دس روپے ایک اور نوٹ نکالتے ہوئے وہ بولا۔

"ایک ڈبیا تھری کاسل اور ایک ماچس۔" عاقل کو یہی سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔

گھر کو جاتے ہوئے اُس نے سوچا کہ ذرا عاقل سے ملتا چلے۔ وہ اُسے اپنا ہمدرد اور محسن نظر آ رہا تھا۔ جس کے بروقت مشورے اور تعاون سے اُس کی پریشانیاں دُور ہوئی تھیں۔

"ابے مولانا۔ کہاں گھوم رہے ہیں؟" عاقل مسکراتے ہوئے بولا۔

"پیرِ مُرشد کے در پر زیارت کے لیے آیا ہوں۔" وہ شرارت سے بولا۔

"ٹھیک ہے بچہ۔ جس نے ہمارے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ سدا سُکھی رہا۔" اُس نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا اور پھر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

عاقل اُسے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ فرش پر قیمتی قالین۔ بہت عُمدہ صوفے اور کُرسیاں۔ بھاری پھولدار پردے نہایت نفیس ریڈیو گرام۔ عبدالرحمان صوفے پر بیٹھا تو ربڑ کی گدیوں میں دھنستا چلا گیا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی آیا تھا اُس نے دل میں عاقل پر ہزار لعنت بھیجی تھی جس نے یہ سب ساز و سامان حرام کی کمائی سے اکٹھا کیا تھا۔ مگر آج اُس نے قدرے تحسین سے ان چیزوں کو دیکھا اور اُس کے دل میں چھوٹی سی اُمنگ نے سر اُٹھایا کہ میں بھی اپنا کمرہ ایسے سجاؤں۔ اپنا گھر تو بالکل کباڑ خانہ ہے۔ اپنی تنخواہ میں تو یہی ہو سکتا تھا نا۔ لیکن اگر اب عاقل اسی طرح آسامیاں پھنساتا رہا۔ تو مشکل نہ ہوگا۔

اُس نے بڑی گرمجوشی سے عاقل کے کندھے پر ہاتھ مارا "اچھا تو اور کیا خبریں ہیں۔"

"بس مزے ہیں۔" عاقل نخوت سے بولا۔

کمرے کے ایک طرف بہت بڑا پیکٹ پڑا تھا۔ جس کے اندر سے نیا ریڈیو جھلک مار رہا تھا۔

"یہ اب خریدا ہے؟"

"نہیں میاں میرا نہیں ہے۔ تمہارے ایک پیر بھائی کا ہے۔"

"پیر بھائی" کی اصطلاح پر دونوں ہنس پڑے۔

"تو یہ پیر صاحب کے پاس کیسے آ گیا؟"

"ابھی تو اُنگلیاں ڈبوئی ہیں برخوردار تم نے۔ آگے چلو گے تو پتہ چلے گا کہ یہ ایک سمندر ہے سمندر۔ سو ڈھنگ کرنے پڑتے ہیں اِس کام میں۔"

"میاں کیا ڈھونگ کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں میاں ——— کسی کی چیز ہے۔ اس نے کسی کا نام کیا۔ تو کسی نے مجھے دے دی کہ اس تک پہنچا دوں۔ بیاہ رستہ میں دیر نہ ہوگا۔"

"ہوں" عبدالرحمٰن مسکرایا "بڑا باقاعدہ نظام ہے۔"

"میاں یہ بڑا لمبا چوڑا کاروبار ہے۔ اس میں اپنی ساکھ بہت ہے۔ آج تک کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ اس لیے آخر میں دیں بیسے ذریعے ہوتا ہے۔"

اس کے بعد عاقل اُسے مختلف قصے سناتا رہا۔ اور ایسی ایسی ہستیوں کے پوشیدہ اعمال بتانے جن کی ایمانداری اور دیانتداری کے متعلق عبدالرحمٰن کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ڈیوڑھی میں سے عاقل کی بیوی کے جھگڑنے کی آواز آئی۔ عاقل اٹھ کر اندر چلا گیا۔ عبدالرحمٰن نے دبی آواز میں بیوی کو ڈانٹتے سُنا۔ پھر پردے کی درز کے سامنے سے اُسے دھکیل کر اندر لے جاتے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد جب عاقل واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تین خط تھے۔ وہ کھول کر پڑھنے لگا اور بیچ بیچ میں ہنستا جاتا۔ عبدالرحمٰن نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا مگر وہ خود ہی بولا۔

"یار یہ بیویاں بھی عجیب مصیبت ہوتی ہیں۔ خواہ مخواہ اپنی اتنی اہمیت سمجھتی ہیں کہ خاوند ان کے لیے ساری دُنیا کے مزے چھوڑ بیٹھے۔ اب ہماری بیگم ابھی چکر میں رہتی ہے کہ ڈاکیے سے بیرے خط خود وصول کرے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"ہوا کیوں نہیں۔ روز روز کی پٹخ پٹخ رہتی ہے۔ میں نے ڈاکیے کو خاص طور پر منع کیا ہے کہ میرے خط میرے علاوہ کسی کو نہ دے۔ مگر یہ بہرحال اس سے جھگڑتی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"یار۔ عورتوں وغیرہ کی چٹھیاں ہوتی ہیں نا۔" عاقل زور سے ہنسا۔

"مگر یہ تو بُری بات ہے عاقل۔"

"سب چلتا ہے پیارے۔" عاقل نے پھر قہقہہ لگایا "آخر کماتے کس لیے ہیں۔ تھوڑی عیش تو کرنا ہوئی۔"

پھر عاقل اُسے اپنے معشوقوں کا حال بتانے لگا۔ کئی جو ختم ہو چکے تھے اور کئی جو چل رہے تھے۔ اتنے میں کوئی آواز سُن کر عاقل اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے میاں بیوی کے جھگڑنے کی آواز آنے لگی۔ اور پھر عاقل نے پکڑ کر بیوی کو مارنا شروع کیا۔ وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

عبدالرحمٰن اُٹھ کر چلا آیا۔

اپنی گلی میں داخل ہونے سے پہلے اس کے سر پر ایک گیند لگی۔ مُڑ کر دیکھا تو چند بچے کھیل رہے تھے۔ اُن میں سے دو ایک ہنسنے لگے۔ دو ایک ڈر گئے۔ اور ایک جرات کر کے گیند لینے آگے آگیا۔ عبدالرحمٰن نے ایک نظر اُن سب پر کو دیکھا اور پھر چپ چاپ اندر نوشی کا طرس

کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ چار روز تک گڈو بھی ٹھیک ہو جائے گا اور ان کے ساتھ کھیلے گا۔ چنانچہ اُس نے بڑی اپنائیت سے مسکراتے ہوئے گیند واپس کر دی ——— جب سے اُس کی معاشی فکریں دُور ہوئی تھیں وُہ ہر چیز کے متعلق بہت پُر اُمید نظر آنے لگ گیا تھا۔

مگر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو صحن میں عورتوں کا ہجوم تھا ——— چارپائی پر گڈو سفید چادر میں ڈھکا تھا اور بگیاں چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

" ہائے بھاجی ۔ اب کیا لینے آئے ہو ۔" پارو کی ماں چلائی تو سب عورتیں مُڑ کر دیکھنے لگیں۔ عبدالرحمان سن ہو کر متوحش سا کھڑا تھا۔ اُسے اپنی بینائی پر یقین نہ آیا۔ بالکل خالی الذہن سا ہو کر آنکھیں پھاڑے سامنے چارپائی کو گھور رہا تھا۔ بگیاں ایک دم " ہائے اللہ " کہہ کر اُٹھی اور دوڑ کر اُس سے چمٹ گئی ۔ اُس کی چھاتی پر بلکتا ہوا چہرہ رکھ کر چلائی " کہاں تھے تم ۔ وہ تمہیں پکارتا گیا ——— ہوں اوں اوں اوں . . . . وہ تمہیں بلاتا رہا ——— وہ ' ابا جی ' ' ابا جی ' کہتا رہا ——— تم کیوں گئے تھے ——— تم نہ جاتے تو وہ کبھی نہ جاتا . . . . . . ہوں اوں اوں اوں . . . . . "

عبدالرحمان نے اُسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ پھپک پھپک کر رو رہی تھی۔

" کہاں چلا گیا میرا گڈو ——— میں اس کے لیے پلیٹس بناتی رہی ——— اور وہ پہلے ہی چلا گیا ——— ہائے اللہ میں کیا کروں ——— میرا ایک ہی بچہ تھا وہ بھی چھین لیا . . . . . "

پارو کی ماں آگے آئی ۔ اُس نے بگیاں کو کھینچ کر پرے کیا " حوصلہ بہن حوصلہ "

اور راستہ چھوڑتی ہوئی بولی " آجائیے بھاجی آپ "

عبدالرحمان مسحور جانور کی طرح آگے بڑھا۔ عورتیں سمٹتی گئیں ۔ وہ اُن کے کندھوں سروں اور گھٹنوں سے ٹھوکریں کھاتا چارپائی تک جا پہنچا ——— بستر پر سفید چادر سپاٹ سی بچھی تھی ۔ بیچ میں ہلکا سا اُبھار تھا۔ عبدالرحمان کو توقع تھی کہ جیسے وہ قریب پہنچے گا ۔ وُہ اُبھار ہلے گا ۔ اُوپر والے سرے پر گُدگُد ہو گی ۔ دو ننھے ننھے ہاتھ چادر کی سلوٹوں سے لڑتے ہوئے نمودار ہوں گے اور گڈو ایک آنکھ نکال کر کہے گا۔

" تا آآ ۔ ابا جی "

مگر وہاں کوئی حرکت نہ ہوئی اور وہ ٹھٹک کر رُک گیا ۔

پھر اُس نے بڑے ہی نرم ہاتھ سے چادر کا سرا اُٹھایا۔

عورتوں کی چیخیں ایک دم آسمان تک چلی گئیں ۔ بگیاں پچھاڑ کھا کر گری ۔ پارو کی ماں اور دُوسری تین چار عورتیں فوراً اُس کی طرف لپکیں۔

گڈو کا چہرہ بالکل بے حس اور خاموش تھا۔ اُس پر جیسے سناٹے کا خول چڑھا تھا ——— مکمل سکوت ۔ ایک مکھی آکر ناک پر بیٹھی مگر اُس نے منہ نہیں سکوڑا۔ پیلی رنگت سفید پڑ گئی تھی ۔ بند آنکھوں کے گرد ایسا تھے پر جیسے دھول کی ہلکی سی تہ تھی ۔ ہونٹ بھینچے

ہوئے دیکھے۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے ملے ہوئے تھے۔ پسینے سے بھیگ کر خشک ہوتے ہوئے بال ابھی تک ماتھے پر چپکے تھے۔

عبدالرحمٰن نے رخسار پر انگلی لگائی۔ تو ایسے لگا جیسے نئی تیار شدہ ریشمی رضائی ہو۔ نرم اور ٹھنڈی۔ گال میں انگلی کی حدود کے گرد کھال سا پھٹنے لگا۔ عبدالرحمٰن بے خود سا ہو کر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر یہ سب ایک جھلملاتی دھند میں غائب ہونے لگا۔ . .

دھند گاڑھی ہوتی گئی . . . .

روشنی اور اندھیرے آپس میں خلط ملط ہونے لگے۔

پھر ایک دم سب کچھ پھر سے نظر آنے لگا ——— انگلی پر موٹا سا آنسو گرا اور اس کے گرد گڑھے میں گھیرا ڈال کر پھیلنے لگا

عبدالرحمٰن نے جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں پر لگا کر جھکتا ہوا چارپائی کے پائے پر جھک گیا

دس دن بعد وہ دفتر میں داخل ہوا۔

وہاں کا ماحول بالکل ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ دروازے پر سپاہی چاق و چوبند کھڑا تھا۔ ذرا آگے انکوائری آفس سے پاس ہونے والے چوکیدار آنے جانے والوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ سائیکلوں کے پہیے اور اکا دکا کاروں کی غراہٹ اُس کے اردگرد سے گزر رہی تھی۔ کچھ آگے فائلوں کے بنڈل اُٹھائے چپراسی ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ ڈرائیور افسروں کو کمروں میں اتار کر گاڑیاں کھڑی کرنے جا رہے تھے اور ابھی ابھی پہنچنے والے صاحبوں کے کمروں کے دروازوں پر گھنٹی کی آواز سن کر چپراسی اندر کو لپک رہے تھے۔ کوئی واقف کار پاس سے گزرتا تو ہاتھ اٹھا کر سلام کر دیتا۔ تنخواروں پر انعام لینے والے خاکروب جھک جھک کر لمبے ہاتھ کا سلام کر رہے تھے۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا پہلے ہُوا کرتا تھا۔ مگر اُسے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔ جو یگانگی اور اطمینان وہ پہلے اندر داخل ہونے پر محسوس کیا کرتا تھا اُس کی بجائے اس کے اندر ایک خلا تھا جو ہر قسم کی دلچسپی یا لگاؤ سے خالی تھا۔ فضا میں ایک ہمہ گیر اداسی تھی جس کے بے رنگ اور پھیکے چوکھٹے میں دُنیا کا کاروبار آویزاں تھا۔ اور ایک اَن دیکھا پردہ اُس کو ماحول سے جُدا کر رہا تھا۔

دفتر کے کمرے میں داخل ہُوا تو ساتھیوں نے اُسے ہمدردی سے دیکھا۔ اکثر لوگ اُس کے گھر ماتم پُرسی کے لیے ہو آئے تھے مگر چند ایک جو نہ جا سکے تھے اب ایک ایک کر کے آنے لگے۔ وُہ تعزیت کے رسمی جُملے کہتے۔ اُسے حوصلہ دلاتے۔ صبر کی تلقین کرتے اور چلے جاتے مگر کسی کی باتوں سے اطمینان نہ ہوتا۔ وہ خلا بدستور قائم تھا جس کی ضخیم وسعتوں میں وہ انتہائی اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے انسان گھُپ رات کے اندھیرے میں تاریک آسمان کو دیکھ کر کرتا ہے۔

چپراسی کی آواز دروازے میں سے سنائی دی

"وہ بیٹھے ہیں!"

اُس نے مُڑ کر دیکھا تو چپراسی ایک ادھیڑ عمر آدمی کو اندر دکھا رہا تھا۔ وہ اس کا واقف نہ تھا۔ صرف شکل سے شناسائی تھی۔

رکا ہے۔ اُس نے سمجھا کوئی سرکاری کیس لینے آیا ہے۔ مگر وہ قریب آکر سٹول پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"میرا نام عبدالخالق ہے۔"

عبدالرحمان نے سر ہلایا۔

"مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ کا بچہ فوت ہو گیا ہے۔"

عبدالرحمان نے پھر سر ہلایا۔

عبدالخالق نے ہاتھ میز پر رکھا۔ شہادت کی اُنگلی کے ناخن سے میز کی سطح کو کھرچنے لگا۔ وہ خود ہی اُنگلی کی حرکت ارہا۔ پھر بولا۔

"میرا بھی بچہ فوت ہو گیا تھا ـــــ"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ ـــــ عبدالرحمان متوقع رہا کہ وہ کچھ کہے گا۔ مگر وہ چپ رہا۔ عبدالرحمان کچھ بات کرنا ا۔ مگر کچھ سوجھتا نہ تھا۔ وہ تھوڑا سٹپٹایا مگر خاموش رہا۔

عبدالخالق پھر بولا۔

"اُس کی عمر پانچ سال کی تھی۔ . . . . پچھلے ہفتے چالیسواں کیا ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ عبدالرحمان بھی چپ تھا۔

پھر وہ بڑی دیر اُس کے پاس بالکل گم سم بیٹھا رہا۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ مگر عبدالرحمان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن م ایک اَن دیکھے تار سے بندھ رہے ہیں اور اُن کی بے زبانی ایک دُوسرے کے دُکھے ہوئے دلوں کو پُرخلوص ہمدردی ینے لگ گئی۔ اپنے مشترکہ غم میں وہ ایک دُوسرے کا دُکھ اپنے دیکھ رہا تھا۔ جیسے آئینے میں جھانک رہے ہوں۔ اُن کے دلوں و دھڑکن میں اب تنہائی کی ٹیس نہ تھی۔ بلکہ کسی کی شرکت کی تسلی تھی جو انہیں سکون دے رہی تھی۔ اُس غیر محسوس اُنگلی کی طرح جو ستار نا تے ہوئے تاروں کی جھنکار کو آہستہ آہستہ سہلاتی ہوئی بالکل سلا دیتی ہے۔

کافی دیر کی خاموش نشست کے بعد عبدالخالق اُٹھ کھڑا ہوا۔ عبدالرحمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہولے سے دبایا اور بولا۔

"اب چلتا ہوں۔"

وہ نرم قدموں سے باہر نکل گیا۔ جاتے میں عبدالرحمان نے اُس کی دُور ہٹتی پیٹھ دیکھی۔ اُس کے سر کی پُشت پر بے کسی ، چارگی کے سائے تھے۔ ناہموار چال میں اداسی کی زنجیریں بجتیں اور دروازے سے مڑتے وقت نظر آنے والے ایک چہرے پر خاموش قرب کا سایہ تھا۔ ترس کی پُرجوش لہر عبدالرحمان کے سینے کی گہرائیوں سے نکل کر منہ کو آنے لگی۔ وہ اپنا ل کر عبدالخالق کے متعلق سوچنے لگا۔ بہت سے کئی آدمی اُس کے پاس تعزیت کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے رسمی بناوٹی ں اور ہمدردانہ الفاظ بھی کہے تھے۔ مگر کسی کی باتوں سے عبدالرحمان کو اتنی تسلی نہ ہوئی تھی۔ جتنی اس ناواقف شخص کی خاموشی سے۔ وہ اس کے غم کا ہم پایہ تھا اور ہمسایگی کی تسلی سیکڑوں خالی خولی دلاسوں سے بہتر ہوتی ہے۔

اٹھ بیٹھا، وہ فائلیں اٹھانے لگا۔

اتنے دن بعد فائلوں کے چہرے اجنبی تھے۔ مگر وہ کام کرتا گیا۔ کسی فائل کو واپس بھجواتا تھا، کسی کو ریکارڈ میں رکھتا تھا، کسی پر نوٹ لکھتا تھا۔ کسی کے متعلق کلرک سے پچھلے کاغذات نکلوانے تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے سب کچھ کرتا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا دل کام میں لگنے لگا اور وہ اس میں منہمک ہوتا گیا ———— مگر ایک نئی فائل اٹھائی تو ایک جھرجھری سارے جسم میں دوڑ گئی ——

———— یہ وہی فائل تھی ————

اور اس فائل نے اس کے بچے کی جان لی تھی۔

پچھلے دس دنوں میں یہ خیال اس کے دل میں جڑ پکڑ تا گیا تھا کہ بچے کی موت خدا کی طرف سے سزا تھی۔ اگر وہ رشوت نہ لیتا تو اس کا بچہ یقیناً ٹھیک ہو جاتا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوتا اور پاروکی ماں کی آواز سن رہا ہوتا جو بیگماں کو تسلی دینے اکثر آیا کرتی۔ وہ کئی قصے بیان کرتی۔ مگر جب کبھی یہ کہتی کہ زندگی کے دن گنتی کے ہیں اور انہیں کوئی نہیں بڑھا سکتا تو عبدالرحمان کے دل میں کوئی دھیرے سے اشارہ کرتا ایسا نہیں ہے۔ گڈو ٹھیک ہو رہا تھا۔ میں نے رشوت لی اور بعد ازاں اپنے سارے چلن کو بدلنے کا ارادہ کیا جس کی فوری سزا مجھے قدرت کی طرف سے ملی۔ اگر میں اپنے ایمان کو خراب نہ کرتا تو یقیناً اس عذاب سے بچ جاتا۔

اس خیال نے مزید تقویت اس رات پکڑی جب اس نے خواب دیکھا ——

یہ تیسری رات تھی۔ سہ پہر کو قل کا ختم دلوانے کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ اور گھر میں رات کے بند بازار کی سی ویرانی تھی۔ اس کے بوجھ سے تنگ آکر بیگماں نے وہ دراز کھول لیا جس میں گڈو کی چیزیں تھیں۔ چاک کے ٹکڑے، بڑے بڑے نیلے موٹے سگرٹوں کی خالی ڈبیاں، جن کو ایک دوسرے پر رکھ کر وہ مکان بنایا کرتا تھا۔ مٹی کے گھوڑے جو دروازے کی دہلیز کو سڑک فرض کر کے اس پر دوڑائے جاتے تھے۔ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جن کے گرد جلتا ہوا کپڑا لپیٹ کر وہ کمک بنایا کرتا تھا، ٹوٹی ہوئی چائے دانی کا ڈھکنا جس میں مٹی کے گھروندے کی مویشیوں کے چارہ کھلایا جاتا۔ پھر ٹائیل کا ٹوٹا ہوا کونا اور ایسی ہی کئی الم غلم چیزیں۔ بیگماں ہر چیز دیکھ کر یادوں کے طوفان اٹھاتی اور زار زار روتی جاتی۔

عبدالرحمان نے بڑی مشکل سے اسے چیزوں سے علیحدہ کیا۔ بازوؤں میں اٹھایا اور آہستہ آہستہ نرمی سے دھکیل کر چارپائی تک لے گیا۔ وہاں اسے بٹھایا۔ بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کا سر اپنے سینے پر رکھا اور آہستہ آہستہ اس کے چہرے کو سہلانے لگا۔ خود اس کا دل رو رہا تھا مگر وہ ضبط کیے بیگماں کو چپ کراتا رہا۔ کبھی خدا کی مرضی کا ذکر کرتا۔ کبھی حوصلہ کرنے کو کہتا۔ کبھی زیادہ غم سے اس کی صحت کی خرابی کے خطرے کا خدشہ ظاہر کرتا۔ کبھی اور بچوں کی امید دلاتا۔ کافی دیر بعد آہستہ آہستہ بیگماں کی سسکیوں میں کمی آنے لگی۔ اور وہ سینے پر ٹکی ہوئی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کسی سسکی سے تھرا جاتی۔ اور عبدالرحمان اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگتا یا ہاتھوں کے ہلکے سے دباؤ سے سر تھپک دیتا۔ یا پھر ماتھے پر سے ہاتھ نیچے لا کر اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگتا ——

شام گہری ہو رہی تھی۔ جھٹپٹے کی سیاہی میں وہ ڈھیر سا بن کر چارپائی پر بیٹھے تھے۔ عبدالرحمان نے اُس کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ کندھا دبایا۔ پھر نرمی سے اپنے سے علیحدہ کیا اور ایک ہاتھ سے ٹھوڑی اُٹھا کر کہنے لگا۔

"اُٹھو۔ بیگی۔ کھانا کھالو۔"

بیگماں کا سارا جسم ایک دبی ہوئی سسکی کے اُبھرنے سے کانپ اُٹھا۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں نہیں کھاؤں گی آپ کھالیں۔"

"تھوڑا سا تو چکھ لو" عبدالرحمان نے منت کی۔

"اوں ہوں" وہ پرے ہو کر ناک صاف کرنے لگی۔

خاوند کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اندر سے بستر اُٹھا کر لائی۔ کھیس کو جھاڑ کر چارپائی پر بچھایا۔ تکیے پر دھپ مار کر مٹی اڑائی۔ اور بستر پر رکھ دیا۔ اور پھر چادر کو دونوں کونوں سے پکڑ کر جھاڑا ——— شام کے اندھیرے میں کوئی چیز اُچھل کر چارپائی پر گری ——— چادر کے دو کونے ایک ہاتھ میں سمیٹتے ہوئے بیگماں نے دُوسرے ہاتھ سے وہ چیز اُٹھائی اور عبدالرحمان بھی جھک کر دیکھنے لگا۔

...... وہ گڈو کا موزہ تھا۔ پنجے پر پیلی اُنگلیاں بنیں اور ٹانکے والے حصے پر سلوٹوں کے گول گول دائرے تھے۔ ایڑی پر معمولی سا سوراخ تھا اور اُس میں سے دو ایک پھوسڑے باہر کو جھانک رہے تھے۔ یہ موزہ اتنا چھوٹا تھا کہ بیگماں کی کھلی ہتھیلی پر پورا پھیل رہا تھا۔ کپڑے کا چپٹا سا ٹکڑا۔ جس میں اب سلوٹیں بنیں لیکن اُس میں سے بھری بھری سی سڈول پنڈلی باہر کو آتی تھی۔

بیگماں زور سے مٹھی بھینچ کر اسے اپنے سینے میں دبانے لگی۔ اور اُونچی اُونچی روتی ہوئی اُسی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ اب اُس کے خاوند سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور وہ بھی اُسی چارپائی پر ڈھلک گیا۔ دونوں کی شدید سسکیوں سے چارپائی ہلتی رہی اور تاریک آسمان پر تارے بھید بھری آنکھوں سے اُن کو دیکھتے رہے۔ جیسے انہیں پتہ ہو کہ آگے کیا ہونے والا ہے ——— ایسے ہی روتے روتے وہ نہ معلوم کب سو گئے۔

اُسی نیند میں عبدالرحمان نے وہ خواب دیکھا...

...... تاریک آسمان ——— بادلوں کی گرج ——— بجلی کی چمک اور بھیانک ہوائیں ——— کسی وقت بجلی چمکتی ہے تو گڈو ایک سیدھی سڑک پر سفید کپڑے پہنے بھاگتا جاتا ہے۔ عبدالرحمان اُسے پیچھے سے بلاتا ہے۔ تعاقب کرتا ہے۔ مگر وہ آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ سڑک پر کبھی گڑھے ہیں۔ کبھی جھاڑیاں اور وہ ان میں غائب ہو جاتا ہے ——— پھر عبدالرحمان ایک چوٹی پر کھڑا ہے۔ جس کے نیچے گہری وادی ہے اور اُس کے پار ایک اور بہت اُونچی چوٹی ہے جس پر بادلوں کے دھوئیں میں آگ جل رہی ہے۔ اُس آگ کے شعلوں کے اُوپر ہوا میں گڈو معلق ہے اور گرمی سے تڑپ رہا ہے۔ عبدالرحمان اُسے آوازیں دیتا ہے تو ایک بھیانک سا شور سا ہوتا ہے جو چیزوں سے آگ جلا کر زیادہ روشن کرتا ہے۔ عبدالرحمان غصے میں کال دیتا ہے تو وہ مڑ کر دیکھتا ہے ———

وہ تب یہ پوچھتا ہے کہ وہ گڈو کا صاحب ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر ہنس کر عبدالرحمان کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر اپنے بیگ میں سے نوٹوں کے بنڈل نکال نکال کر آگ میں جھونکنے لگتا ہے۔ شعلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ گڈو کی تڑپ زیادہ ہو جاتی ہے اور عبدالرحمان کی چیخ حلق میں پھنس جاتی ہے.....

آنکھ کھلی تو وہ پسینہ میں شرابور تھا۔ حلق خشک تھا اور جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ساتھ ہی بیگمان گھاس پھونس کر پڑی تھی۔ اُن کی گردن ڈھیری ہونے کی وجہ سے چہرہ اُوپر کو اُٹھا تھا۔ اور چاند کی مدھم روشنی میں رُخساروں پر آنسوؤں کا راستہ چمک رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے سانس لے رہی تھی۔ عبدالرحمان دبے دبے اُٹھا اور باہر چھت پر نکل آیا۔ بے قراری میں وہ ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

رات کا سناٹا گہرا اور بھاری تھا۔ دُور دُور پھیلے ہوئے تاروں اور اُفق کے دبیز اندھیروں میں کائنات کی لامحدود وُسعت میں خود کو دیکھ دیکھ ڈر رہا تھا۔ تاروں کی پھیکی روشنی نے لمبے لمبے سائے پیدا کر کے ہر چیز کو دن کی نسبت زیادہ بھیانک بنا دیا تھا۔ اس وسیع و عریض نیم تاریک پس منظر میں عبدالرحمان ایک نامعلوم تنکے کی طرح تھا جیسے سمندر کی چوڑی لامحدود سطح پر دیو پیکر لہروں میں خشخاش کا ایک دانہ بھٹک رہا ہو ——— مگر اُس کے دہشت زدہ دماغ کی ہراسانی ماحول سے بھی وسیع تر تھی۔ ایک پریشان ذہن کی پریشانی سے سانسے آفاق بھی ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس متزلزل دُنیا میں عبدالرحمان کو سارا قصور اپنی ذات میں نظر آیا۔ نیم تاریک فضا ڈراؤنی سیاہی اُسے خدا کے غضب کا مظہر معلوم ہونے لگی۔ اور اس ذہنی کیفیت کے زیر اثر اُس کے اعصاب پر پچھتاوے کے زور دار سیلاب نے حملہ کر دیا۔ یہ سب میرا قصور ہے۔ اگر میں اپنا ایمان خراب نہ کرتا تو مجھے اتنی کڑی سزا نہ ملتی۔ صحیح انسان تو وہ ہے جو بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی نہ ڈگمگائے۔ میں تو ذرا سے جھٹکے سے ہی اپنے حواس کھو بیٹھا۔ یہ سزا میرے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ میں سنبھل جاؤں ——— یہ بھی شکر ہے کہ میں نے وہ کیس ابھی تک نپٹایا نہیں تھا۔ اب میں اُسے ہرگز خراب نہ کروں گا۔ ایمانداری سے نوٹ درست لکھ کر بھیجوں گا۔ جن لوگوں سے میں نے رشوت کا پیسہ لیا ہے۔ اُن کو واپس دے دوں گا۔ زندگی میں ایک غلطی کی ہے۔ اب پوری طرح اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ لوگ بہت کا حال جانیں یا نہ جانیں۔ خدا تو جانتا ہے۔ اب اگر میں بُرے راستے سے ہٹنا چاہوں گا تو یقیناً خدا میری مدد کرے گا۔ یہ روپے واپس کرنے کے لیے اگر مجھے گھر کی چیزیں بھی بیچنا پڑیں تو میں بیچ دوں گا۔ بیگمان یقیناً میرے موافق ہو گی۔

یہ سوچ کر اُسے کچھ اطمینان ہوا۔ ایک گلاس پانی پینے سے اعصاب کو تقویت ہوئی اور وہ اندر آ کر لیٹ گیا۔ چھٹی کے باقی دنوں میں یہ خیال زیادہ تقویت پکڑ گیا اور وہ نماز پڑھتے وقت رو رو کر معافی مانگتا اور آئندہ کے لیے توبہ کرتا۔

آج وہی فائل اُس کے سامنے تھی جو ماضی کا آئینہ بنی اُس کے ضمیر کو کرید رہی تھی۔ اس فائل کے ذریعے اب وہ اپنے گناہ کو مٹانا چاہتا تھا۔ بغیر مزید توقف کیے اُس نے لکھنا شروع کیا۔ نوٹ ختم کر کے فوراً فائل چپراسی کے حوالے کی تو گہرا اطمینان اُس کے دل میں ایسے بیٹھنے لگا جیسے کپڑے کے تھان کو تہ در تہ پٹیا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو پھر سے پہلے جیسا ایماندار سمجھتے ہوئے سوچنے لگا کہ بالآخر میں نے اپنا گندہ ماضی مٹا دیا ہے۔ اب میری زندگی پھر سے پہلے جیسی ہے۔ کرسی کی ٹیک پر پھیلتے ہوئے وہ بڑبڑایا کہ عاقل سے بات کرے گا اور پانچ سو روپے قسطوں میں ادا کرے گا۔ آدھی تنخواہ کافی ہو گی۔

مگر دوسرے دن اُسے پتہ چلا کہ عاقل نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ اس نے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"ہاں یار کیا کرتا۔ روز روز کی چخ چخ سے تو یہی بہتر تھا۔"

"مگر بھائی تم چخ چخ ختم کرنے کی کوشش کرتے ـــــــ یہ بھلا کیا حل سوچا تم نے۔"

"چھوڑو میاں تم کیا نصیحت لے بیٹھے۔ بس اب جھگڑا ہی تو ختم کر دیا ہے۔"

"تو اب کیا کرو گے؟"

عاقل نے سگرٹ کا لمبا کش لے کر مسکراتے ہوئے دھواں چھوڑا اور وقفے کے بعد بولا تو کیا عورتوں کی کمی ہے دُنیا میں بھـ بدھو مہاراج۔ وہ تو ہمیں بیوی کی موجودگی میں بھی مل جاتی تھیں۔ اب تو پھر آزادی ہوگی ـــــــ مزے میں سب کچھ کریں گے۔ نہ روک نہ ٹوک۔"

"اور اُس بے چاری کا کیا بنے گا؟"

"بننا کیا ہے" عاقل لاپرواہی سے بولا "شادی کرے گی۔ یا کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی ـــــــ یا پھر دن کو نمازیں پڑھا کرے گی اور رات کو چوری چوری کسی کے بستر میں گھس جایا کرے گی ـــــــ آخر ہمسائے کس مرض کی دوا ہیں۔"

اور وہ خود ہی اپنے مذاق پر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

عبدالرحمان مزید کچھ کہے بغیر اُٹھ کر واپس چلا آیا۔ اُس نے سوچا روپوں کی بات کرنے کا ابھی موقع نہیں ہے۔ چند دن بعد دیکھا جائے گا۔

مگر ان چند دنوں میں فائل واپس آگئی اور اُس میں عاقل کی پارٹی کے خلاف فیصلہ ہو چکا تھا۔

دفتر کے وقت کے بعد عبدالرحمان کیبنٹ سے نکل کر فٹ پاتھ پر ہو لیا۔ لوگ سائیکلوں پر، ٹیکسیوں پر اور پیدل جا رہے تھے۔ کلرکوں کی ایک ٹولی اُس سے آگے تھی۔ دو ایک پیچھے تھے۔ مگر وہ ان سب سے بے پروا اپنے خیال میں گم جا رہا تھا۔ چوراہے میں پہنچ کر وہ دائیں مڑا اور سڑک عبور کر کے دُوسرے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عاقل کی درشت آواز آئی "ٹھہرو دے۔"

عبدالرحمان نے ٹھٹھک کر اُس کے غضبناک چہرے کو دیکھا اور اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ سائیکل کو دُوسرے ہاتھ میں تھام کر عاقل نے اُس کا بازو پکڑا اور جلدی جلدی اپنے ساتھ چلانے لگا۔

"رحمان۔ یہ کیا حرامزدگی ہے۔"

"کیوں۔ کیا ہوا؟" خشک حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"مجھ سے پوچھتے ہو کیا ہوا حرامی ـــــــ شرم نہ آئی تمہیں دھوکا دیتے۔ کمینے۔ رذیل روپے بھی لے کر ڈکار گئے اور سارا کیس بھی خراب کر دیا۔ تمہیں اتنی بھی شرم نہ آئی کہ میں نے مشکل وقت میں تمہاری مدد کی تھی۔ تمہیں دُنیا میں رہنے کا ڈھنگ بتایا تھا۔ اُلٹا تم مجھی کو روندنے لگ گئے۔ اب میں اُن لوگوں کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔"

"سنو عاقل۔ تم غصہ نہ ہو۔ میں روپے واپس کر دوں گا۔"

"روپے واپس کر دوں گا۔" عاقل غصے میں الفاظ چبا کر بولا "اب میں تمہارے روپوں کا بھوکا ہوں۔ ہزار روپے کی حیثیت ہی کیا ہے۔ میں تو شام تک کئی ہزار اکٹھے کر لوں —— میں تو ان روپوں پر تھوکتا بھی نہیں۔"

"تو پھر چاہتے کیا ہو؟"

"تم نے میرا اعتبار کھو دیا —— میری ساکھ ضائع کر دی۔ ایک منصوبہ پارٹی میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ میں تمہارے اصولوں کو چاٹوں گا۔ آخر زبان بھی تو کوئی شے ہے۔ اصول بھی کوئی چیز ہے۔ میں اب ان لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"عاقل بھائی" عبدالرحمان بہت نرم تھا "اسی اصول نے تو میرے ہاتھ روک لیے اور تم مجھے رشوت پر مجبور کر کے نہ جانے کس اصول پر یقین رکھتے ہو۔"

"میں تمہارے اصولوں کی بات نہیں کر رہا اور نہ تم وہ سکھاؤ مجھے۔ میں بزدلی کو اصول کا نام نہیں دیتا۔ جس میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی وہ مردہ اور بے جان اصولوں کا سہارا لیتا ہے۔ میں تو ان اصولوں کی بات کر رہا ہوں جو زندہ رہ کر زندگی کے کاروبار کرنے والے لوگوں کے اصول ہیں۔ تم مجھے کیا اصول سکھاؤ گے۔"

بحث بڑھتی گئی۔ عبدالرحمان نے اپنی الجھن کا ذکر کیا۔ اپنے بچے کی موت قدرت کی طرف سے سزا بیان کی۔ اپنی توبہ کا ذکر کیا۔ مگر عاقل ان تمام دلائل کو فضول اور لغو بات کہتا تھا۔ اس کی ساکھ بگڑ گئی تھی۔ کاروبار خراب ہو گیا تھا اور یہ اس کے لیے سب سے بڑا صدمہ تھا۔ بالآخر عبدالرحمان بھی غصے میں آ گیا۔

"جب میں تمہارے روپے واپس کر رہا ہوں۔ تو تمہیں اور کیا چاہیے —— میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

عاقل نے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھا۔ اور بولا "باز جیسے تیسے کیس کو دوبارہ ٹھیک کراؤ۔ یا پھر تمہیں دنیا کے سامنے ایسی سزا ملنی چاہیے کہ میری ساکھ قائم رہ جائے۔"

اور وہ پیڈل پر پاؤں رکھ کر یہ جا وہ جا۔

"ایسی تیسی اس کی" عبدالرحمان نے دانت بھینچ کر کہا اور سڑک پر زور سے تھوک دیا۔

اگلے چار پانچ روز ان دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ عبدالرحمان کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ معاملہ کو ختم کرے مگر عاقل کوئی موقع ہی نہ دیتا تھا اور مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

ایک دن دفتر آنے کے گھنٹہ بھر بعد عبدالرحمان سر جھکائے کام کر رہا تھا کہ تین سپاہی اور ایک مجسٹریٹ اندر داخل ہوئے۔ وہ سیدھے عاقل کی میز کی طرف بڑھے۔ ان کے ساتھ وہی آدمی تھا جس نے ہزار روپے عبدالرحمان کو دیے تھے۔ اس نے مجسٹریٹ کے استفسار پر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"ذرا اٹھو تو مسٹر" مجسٹریٹ نے کہا۔

عبدالرحمان متوحش سا کھڑا ہو گیا۔ ایک سپاہی نے گدی اٹھائی تو نیچے دو ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ مجسٹریٹ نے فوراً اٹھا

اور اُن پر اپنے دستخط شناخت کیجے۔ عبدالرحمان نے پھٹی پھٹی نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور پھر چلّا کر بولا:۔

"یہ سب دھوکا ہے۔ یہ نوٹ کسی نے یہاں رکھ دیے ہیں۔"

مگر مجسٹریٹ نے سپاہیوں کو اشارا کیا اور اُنھوں نے آگے بڑھ کر عبدالرحمان کو پکڑ لیا۔ اُس نے زخمی پرندے کی طرح آخری دفعہ نگاہ اُٹھائی۔

عاقل اپنی کرسی پر نہ تھا۔

وارڈر نے تالے میں کنجی گھمائی تو اندر والے قیدی اُٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گئے اور نئے قیدی کو دیکھنے لگے۔

دروازے کی چولوں سے چیخ نکلی اور وہ بھاری گھسیٹ سے تھوڑا کھل گیا۔

"اندر!" وارڈر نے عبدالرحمان کو اشارا کیا۔ وہ جھجکا ـــــ ایک قدم اُٹھایا ـــــ پھر رُکا ـــــ مگر وارڈر نے کندھا پکڑ کر اندر دھکیل دیا۔

"ارے چل اندر ـــــ جو آتا ہے یہاں نخرے ہی کرتا ہے۔"

پھر پیچھے سے بند ہونے والے آہنی دروازے کے زوردار دھکے نے اُسے آگے کمرے میں دھکیل دیا۔

کنجی گھماتے ہوئے وارڈر چلّایا "اب آرام سے رہنا سور کے۔ خبردار جو اس کو کسی بُری حرکت پہ اکسایا۔"

کمرے میں دو اور قیدی تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ نیا قیدی لڑکھڑاتا ہوا سامنے کی دیوار تک پہنچا اور دونوں ہاتھ فرش پر ٹکا کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہ سیدھی نظروں سے فرش کو دیکھتا رہا۔ کمرے کے ماحول یا اُس میں رہنے والوں کا جائزہ لینے کی کوئی حرکت نہ کی۔ بلکہ بادل کی گرج سن کر تالاب میں دَب جانے والی مچھلی کی طرح چُپکا بیٹھا ہوا زمین کو دیکھتا رہا۔

ان دونوں قیدیوں میں سے ایک عظیم شحیم تنومند جاٹ تھا۔ جس کے سات فٹ اُونچے جسم کی اُٹھان میانوالی کے میدانوں میں اُٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں موٹی موٹی، لال لال، باہر کو اُبلتی تھیں۔ سر پہ لمبے لمبے بال تھے اور چوڑی ہڈیوں والے کرخت چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں چوڑے بدنما ناک کے آر پار پھیلی تھیں۔ اُس کے ماتھے پر بڑا سا زخم کا نشان تھا۔ اور قیدیوں کا لباس اُس کے جسم پر عجب طریقے سے ٹنگا کھڑا تھا۔ اُونچے پاجامے میں سے بالوں بھری کسی موٹی پنڈلیاں ایک دم باہر نکل آتی تھیں اور آستینوں میں سے نیلی نیلی رگوں والے موٹے بازو نکل کر ہڈی دار بھاری ہاتھوں کو سنبھالے تھے۔ جن کی موٹی گانٹھ دار اُنگلیوں میں چاندی کے چھلے پڑے تھے۔ اُس کی عمر کوئی چالیس برس کے قریب ہوگی مگر کاٹھی بے حد مضبوط تھی۔ اور وہ اپنے تنومند مضبوط جسم کو ایک دم سیدھا رکھے لال آنکھوں سے نئے قیدی کو دلچسپی سے گھور رہا تھا۔

دُوسرا چوبیس پچیس برس کا نوجوان تھا۔ وہ بھی قیدیوں والا دھاری دار لباس پہنے تھا۔ اور بالوں کے انداز اور وضع قطع سے بوچی قبیلے کا نظر آتا تھا۔ اُس کے چہرے پر مُجرموں والی کرختگی نہ تھی۔ بلکہ ایسے کسان کی پُرخلوص معصومیت تھی جو بڑی لگن سے کھیتوں پر سے کام کر کے آ رہا ہو۔ سیدھی ستواں ناک چھوٹا سا تھا اور تیز چمکدار آنکھیں جن میں سنجیدگی کا ہلکا سا رنگ جھلک مار رہا تھا۔

اُس کمرے کے دروازے میں نئے قیدی کو غور سے دیکھتے ہوئے جو دیوار سے لگا ہوا اپنے ٹخنے دبائے بیٹھک کی طرح گٹھڑی بنا بیٹھا تھا۔ پھر اُنھوں نے مسکرا کر ایک دُوسرے کو دیکھا۔ پہلا آدمی بے تکلفی سے آگے بڑھا اور اُس نے بے تکلفی سے عبدالرحمان کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ سمٹ کر سہمی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"فکر نہ کر بابو" وہ پیلے پیلے دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا "جیل تو مردوں کا سسرال ہے۔ میاں ہنستے آؤ۔ اور ہنستے جاؤ۔"

دُوسرا قیدی بھی ہنسنے لگا۔ تکلف کی ہنسی۔ جیسے واقف ہونا چاہتا ہو اور پہلے قیدی کی بات میں اپنے آپ کو بھی شامل کرنا چاہتا ہو۔

عبدالرحمان نے کوئی جواب نہ دیا۔

"شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔" وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے گھٹنوں کے درمیان منہ سے تھوک دیا۔ "پر اگر وہ چاہیے پہلے دن ہنسنے کے لیے۔"

"کیوں رنگے؟" دُوسرا قیدی بولا "تو بھی ہنسا تھا پہلے دن۔"

رنگے نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارا اور فخریہ مسکراہٹ سے بولا۔

"ہنسنا تو مجھے یاد نہیں۔ مگر یہ ہے کہ آیا بڑے ٹھاٹھ سے تھا۔ جس دن فیصلہ سُنانا تھا میں دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر گیا تھا۔ لمبی ڈب والی دھوتی۔ ابرق والی پگڑی۔ کندھے پر نئی چادر۔ اور پاؤں میں نیا کھُسہ۔ وکیل ماں کے یار نے جھوٹ بولا تھا کہ تم بری ہو جاؤ گے۔ وہاں جج بڑا ہی بھلا مانس نکلا۔ اُس نے اکٹھے سات سال ٹھوک ڈالے۔"

رنگے نے کہیں سے بدبودار تمباکو نکالا اور ہاتھ میں مسلنا شروع کیا۔ بات کرتے وقت وہ ساتھ ساتھ کنکھیوں سے عبدالرحمان کا بھی جائزہ لیتا رہا۔

"دروازے میں سے اندر آیا تو ادھر کونے والی کوٹھڑی سے کوئی قیدی پکارا۔ 'او بھئی دُولہا آگیا' میں نے بھی شرارت سے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا —— مگر یار یہ ٹھاٹھ وہیں ختم ہو گئے۔ (اُس نے تمباکو کو ہتھیلی پر زور سے مسلا) سؤر کے بچوں نے وہ کپڑے اُتروا کر یہ کفن پہنا دیا۔"

اُس نے نفرت سے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ فرش میں سے ایک ڈھیلی اینٹ اُٹھا کر نیچے سے چلم نکال لی۔ پھر اینٹ برابر جما دی اور چلم کو زمین پر جھاڑ کر اُس میں تمباکو بھرنے لگا۔

"او رنگے۔ دُوسری بار کیسے آیا؟" دُوسرے قیدی نے پوچھا۔

"بس پھر تو واقعی دُولہا تھا۔ چھٹے مہینے ہی تو آگیا تھا واپس۔ ابھی باقی سب وہیں تھے۔ راجو حرامی نے تو اپنی کوٹھڑی سے ہی نعرے لگانے شروع کر دیے۔ باقی بھی واقف قیدیوں نے خوب شور کیا۔"

رنگا ہنسنے لگا پھر مُنہ موڑ کر عبدالرحمان سے کہنے لگا "ابھی نئے ہو بابو —— جب اگلی دفعہ آؤ گے تو خوب نخرے

میں ہو گئے۔"

عبدالرحمان نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

"اللہ سے خیر مانگ رہتے ہیں۔" دوسرا قیدی عبدالرحمان کے تاثرات کو تاڑ کر بولا " وہ کیوں آئے گا دوبارہ۔"

رنگا پھر ران پر ہاتھ مار کر چلایا " آئے گا ـــــ ضرور آئے گا ـــــ جو ایک دفعہ آیا وہ آتا ہی رہے گا ـــــ تمہارے بھی خالی دھرے ہی ہیں ـــــ دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں آتے وارث میاں؟"

عبدالرحمان کے دل میں غصے اور نفرت کے اُبال اُٹھنے لگے۔ وہ بڑی ناگواری سے اُٹھ کر دروازے کے پاس آ گیا اور سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔

باہر بہت بڑا صحن تھا جس کے چاروں طرف کوٹھڑیاں تھیں۔ بعض کے دروازوں پر سلاخیں تھیں۔ بعض پر کواڑ لگے تھے اور اُن میں سر کی اُونچائی کے برابر چھ انچ قطر کا سوراخ تھا۔ جس میں سے باہر جھانکا جا سکتا تھا۔ ایک طرف اُونچی اُونچی سلاخوں کا جنگلہ تھا جس میں ویسا ہی دروازہ لگتا تھا۔ اُس کے پاس سپاہی رائفل کندھے پر رکھے کھڑا تھا۔ یہی جنگلہ آگے جا کر جیل کے دروازے پر ختم ہوتا تھا۔ جہاں قوی ہیکل کواڑ بڑے بڑے تالوں اور کنڈوں کو سینے پر سجائے کھڑے تھے۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر ٹین کی چادروں میں گھری ہوئی ٹٹیاں تھیں۔ صحن میں خاکی کپڑے پہنے اکا دکا وارڈر گھوم رہے تھے۔

اندر دونوں قیدی باتیں کر رہے تھے۔ مگر عبدالرحمان کا دھیان اُدھر نہ تھا۔ وہ اس نئے ماحول میں بے حد شرمندہ محسوس کرتا ہوا اپنی گراوٹ اور زوال پر حیران ہو رہا تھا۔ دوسری کوٹھڑیوں کے دروازوں میں سے قیدی اپنے دھاری دار لباس میں نظر آتے تو اُسے یقین نہ آتا کہ اتنی پاک اور صاف زندگی گزارنے کے بعد بھی وہ ایسی جگہ پر آ سکتا ہے۔ جو عام دُنیا کے نزدیک بدترین جگہ تھی۔

جیل کے باہر سپاہیوں کے گارڈ روم کے پاس گھنٹی پر ٹن ٹن پانچ بجے۔

"پانچ بج گئے۔ آج ملاقات نہیں ہو گی۔" وارث بولا۔

"کیا بات ہے؟" رنگے نے کہا " بہت یاد آتے ہیں گھر والے جو منگل کو ہی جمعرات کی آس کرنے لگا۔"

پھر رنگا بھی آ کر عبدالرحمان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ کبھی صحن میں دیکھنے لگتا اور کبھی اپنی لال لال آنکھوں سے اُوپر سے نیچے تک عبدالرحمان کا جائزہ لیتا۔ اُس کا منہ مسلسل کھلا تھا اور اندر سے پیلے دانت اور لال زبان کا تھوڑا سا حصہ نظر آتا تھا۔ اُس کی سانس کے ساتھ عبدالرحمان کو بدبو کے بھبکے آنے لگے۔

"بابو۔ تم نے کیا کیا ہے؟"

عبدالرحمان نے محجوب ہو کر دیکھا اور چپ ہو گیا۔

"شرماتا کاہے کا اس میں ـــــ یہاں تو ہم سب ایک جیسے ہیں۔"

"ایک جیسے" یہ سن کر عبدالرحمان کے دل پر چھری سی چل گئی کہ وہ مکروہ، بدنما اور عادی مجرم اُسے اپنے ساتھ ملا رہا

ہے۔ وہ [illegible] کھڑا ہو گیا۔

"ہے ہے" وہ ہنسا "مت بتاؤ۔ پریڈ پر کارڈ اٹھا کر کھڑے ہو گے تو سب پتہ چل جائے گا۔"

عبدالرحمان نے تھوڑا توقف کیا پھر بولا۔

"مجھے تو معلوم نہ تھا۔"

"ہے ہے ہے" رنگا دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر بے تحاشا ہنسنے لگا۔ پھر اس کے کندھے پر دھپ مار کر بولا۔ "استاد ہمیں کیوں اڑاتے ہو۔ افسروں کے سامنے تو ایسی بات ٹھیک ہے۔ معائنہ ہوتا ہے تو ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ مگر یہاں تو سچ بتا دو۔"

عبدالرحمان نے سوچا کہ اب جیل آ کر جھوٹ سچ کا کیا قصہ۔ جب سزا ہو چکی تو مقدمہ کیسا بھی کیوں نہ ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قدرے رک کر بولا۔

"رشوت لی تھی۔"

"ہے ہے ہے۔" رنگا پھر ہنسنے لگا۔

"رشوت!" وہ طنز سے چلایا۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر اس نے ہاتھ رانوں میں دے لیے اور جھک کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ہنستے ہنستے اسے کھانسی شروع ہو گئی۔ اور وہ لال منہ سے تھوک کے فوارے اڑاتا دوسرے قیدی وارث کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا کندھا پکڑ کر بے صبری سے کھانستا رہا کہ ٹھیک ہونے پر بات کر سکے۔ بالآخر کھانسی رکی تو بولا۔

"رشوت!" وہ پھر ہنسا "یہ بھی کوئی جرم ہے ——— اسے جرم کرنا تھا تو کوئی مردوں والا کرتا ——— زمردوں والا ——— کسی کا خون کرتے۔ کسی کی لڑکی نکالتے۔ کہیں ڈاکہ ڈالتے ——— یہ کیا بزدلوں والا جرم ہے۔"

اس نے حقارت سے مونچھیں ہلائیں اور کونے میں جا کر لپٹے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا۔ جیسے فخر سے اس نے لاتعلقی اختیار کر لی۔ جیسے عبدالرحمان بہت ہی کم تر شے ہو۔ پھر وہیں سے اس نے نخوت سے پوچھا "اور سزا کتنی ہوئی؟"

"ڈیڑھ سال۔" بغیر مڑے عبدالرحمان نے جواب دیا۔

"اچھا۔ اچھا۔ یہ تو کافی ہے۔" وہ ایسے بولا جیسے اس کے دل میں عبدالرحمان کا کھویا ہوا وقار تھوڑا بڑھ گیا ہو۔ جیب ٹٹولتا ہوا وہ بولا "بابو چرس کھاؤ گے؟"

عبدالرحمان نے انکساری سے منہ موڑ لیا۔ رنگے نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا اور پھر ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ بالکل ہی نکما ہے یہ شخص اور کپڑے کی پوٹلی میں سے چرس ڈھونڈنے لگا۔

اس دوران میں وارث چپ رہا تھا۔ اب وہ بھی آ کر رحمان کے پاس کھڑا ہو گیا اور اسے جیل کے قواعد اور کوٹھڑیوں کے متعلق بتانے لگا۔ عبدالرحمان کبھی کوئی سوال کر دیتا ورنہ وہ زیادہ تر خود ہی بتاتا رہا۔ اسے یہاں چار مہینے ہو گئے تھے اور وہ جانتا تھا کہ کون سا وارڈر اچھا ہے۔ کون سا بد دماغ ہے۔ قیدی افسر کیسے ہیں۔ جیلر کا رویہ کیسا ہے۔ ان سب کے بارہ میں وہ آپ

بیتاب عبدالرحمان کو تکتا رہا۔

صحن میں جھنکار سی ہوئی۔ جھٹکے کے اندر والا دروازہ کھلا۔ دو سپاہی ایک قیدی کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہ دُبلا پتلا میانہ سا آدمی تھا مگر اس کے بیڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ٹخنوں پر لوہے کے چھلے پنڈلی کے گرد اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ اُن سے لگی ہوئی دو سیاہ سلاخیں ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اوپر کو چڑھتی ہوئی رانوں کی جڑ تک پہنچ جاتی تھیں اور کمر سے ذرا نیچے رانوں کے گرد لوہے کے بڑے بڑے چھلے اُن کو سنبھالے تھے۔ وہ ٹانگیں چوڑی کرکے آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور ہاتھوں میں لٹکی ہوئی ہتھکڑیاں جب کسی چھلے سے ٹکراتیں تو دھات بجنے کی آواز سارے صحن میں پھیل جاتی۔ ایک کوٹھڑی سے ایک قیدی نے کوئی جملہ کسا تو اُس نے مسکرا کر سر ہلا کر جواب دیا۔

"اسے بیڑیاں کیوں پہنائی ہیں؟"

"یہ بڑا خود سر قیدی ہے۔ قواعد کی خلاف ورزی کی ہوگی تو جیلر نے دو چار روز کے لیے بیڑیاں پہنا دی ہوں گی۔"

"اب کہاں گیا تھا؟"

"دن بھر مشقت کے لیے کہیں لے گئے ہوں گے۔ شاید چکی والے کمرے میں یا جیل کا کنواں چلوانے کے لیے۔ اب شام کو واپس لا رہے ہیں۔"

ایک وارڈر نے سوراخ والے دروازے کا کواڑ کھولا تو وارث کہنے لگا "اچھا! اسے تو قیدِ تنہائی بھی ہے۔ ان کوٹھڑیوں میں صرف وہی رکھے جاتے ہیں۔"

عبدالرحمان خوفزدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ اُس کا دل اندر ہی اندر بیٹھ رہا تھا۔ اور وہ سب کچھ توڑ تاڑ کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ دروازہ چھوڑ کر کمرے کے اندر جا سکتا۔ خاموش کھڑا وہ صحن کو گھورتا رہا۔

اتنے میں گھنٹی بجی۔

"یا علی مدد" رنگے نے انگڑائی لی۔

"چلو برتن سنبھالو!" وارث بولا "کھانا لینے جانا ہے۔"

"تم جاؤ۔ مجھے بھوک نہیں۔" عبدالرحمان نے کہا۔

"یہاں یہ نہیں چلے گا۔ روٹی لے لو۔ ورنہ وارڈر آ کر بڑی غلیظ گالیاں دے گا۔"

"ہونہہ" عبدالرحمان کو ایک دم غصہ آ گیا "تو مجھے گالی دینا نہیں آتی کیا؟"

وارث ہنسا اور ہمدردی سے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"ایسے خیال نکال دو دل سے۔ ورنہ بیڑیاں لگ جائیں گی۔"

وارڈر نے آ کر دروازے میں کنجی گھمائی اور شور کرتا ہوا بولا۔

"اُٹھو نک حرامو جلدی کرو۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

رنگے نے دانت پیس کر زیر لب ایک گالی دی اور برتن اُٹھا کر باہر نکل گیا۔

وارث نے عبدالرحمان کی طرف دیکھا۔

"اللہ قسم میرا دل بالکل نہیں کرتا۔"

"تو نہ کھا۔ یہ تو آد ـــــ مجھے لوٹ دینا۔"

جنگلے کے پاس تین ٹرالیاں کھڑی تھیں۔ ایک کے پاس روٹیاں تھیں۔ دُوسرے کے پاس دال کی دیگ اور تیسرے نے تھال میں اُبلے ہوئے چاول رکھے تھے۔ عبدالرحمان اپنا مٹی کا پیالہ اور مٹی کی پلیٹ لے کر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ قیدی ایک دُوسرے کو ٹھوکے مارتے۔ فحش مذاق کرتے اور ماں اور بہن کے حوالوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے قدم بہ قدم ٹرالیوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور عبدالرحمان کا دل مُنہ کو آ رہا تھا۔

کمرے میں آکر اُس نے اپنا کھانا سامنے رکھ دیا۔ مگر اس نے وارث کو آنکھ ماری اور بولا۔

"پہلے دن نہ کھانا بدشگونی ہے ـــــ زیادہ نہیں تو ایک نوالہ تو لے لو۔"

عبدالرحمان نے بہتیرا انکار کیا۔ مگر دونوں کے اصرار پر اس نے ایک نوالہ مُنہ میں ڈالا۔ بدمزہ، پھیکا ذائقہ اُس کی زبان پر پھیل گیا۔ گھبرا کر مُنہ چلایا تو ریت کی کرکری دانتوں کے نیچے بجنے لگی۔ وہ تھو تھو کرتا موری کی طرف بھاگا۔

رنگا مُنہ اونچا اُٹھا کر قہقہے لگانے لگا

عبدالرحمان نے حجرے سے بوسیدہ کمبلوں کا بنڈل کھولا جو اسے اندر آتے وقت سنتری سے ملا تھا۔ ایک کمبل پھٹا ہوا تھا۔ اس کی تہہ کی اور لٹکتے ہوئے چیتھڑوں کے کنارے دبا کر زمین پر بچھایا۔ سرہانے کی طرف کنارا اُٹھا کر نیچے دو اینٹیں رکھیں۔ دُوسرا کمبل اوڑھنے کو رکھ لیا اور وہ پھر بیٹھ گیا۔

رنگا دیا جلانے لگا۔ تر تیلی کی ماچس گھسنے ہی تڑتڑ کی آواز آئی۔ چھوٹا سا شُعلہ بے ترتیبی سے کانپا۔ تھوڑا لہرا کر سیدھا ہوا تو کاجل کی لمبی لکیر تھمتی باریک ہوتی ہوئی فضا میں کالی ڈوری اُٹھنے لگی۔ ماچس جیب میں ڈالتے ہوئے رنگا بڑبڑایا۔

"حرامزادے ہر شے میں بے ایمانی کرتے ہیں۔ کڑوے تیل کی ملاوٹ سے ان کی ماں کو تسلی نہ ہوتی تھی۔ جو اب یہ اس میں پانی بھی ملانے لگے ہیں۔"

عبدالرحمان سیدھا بیٹھا رہا۔ دروازے کے باہر سامنے والی کوٹھڑیاں صحن کے پار نظر آ رہی تھیں اور اُن کی چھت کے اُوپر سے نیلے آسمان کی گز بھر لمبی اور فٹ بھر چوڑی مستطیل نظر آ رہی تھی۔ اُس کی یکسانیت کسی وقت چشم زدن میں گزر جانے والے پرندے سے ذرا دیر کو ٹوٹ جاتی۔ آہستہ آہستہ اُس کا رنگ بدلنے لگا۔ نیلے رنگ پر سیاہی بکھرنے لگی۔ اور مستطیل بڑھتی ہوئی سیاہی میں ڈوبنے لگی جیسے تاریک سینما ہال میں سفید پردے کا ہلکا سا ہیولا نظر آئے۔ کچھ دیر بعد اُس کے کونے میں اکیلا ستارہ اُبھر آیا۔ جو آہستہ آہستہ قدرے مدھم ستاروں کے جھرمٹ میں گھر گیا۔

دیا جلنے سے کمرے میں گھٹن سی ہونے لگی اور گندے تیل کی کڑواہٹ فضا میں رچ گئی۔ اس سے عبدالرحمان کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا سوچتا رہا۔ اُس نے زندگی ـــ میں ایسی شام کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ایک

دارہ ہی آدمی تھا جو سزا اور جزا کے فارمولوں سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ چند ماہ پیشتر جب اُس نے تھانے میں ایک ملزم
تے دیکھا تھا تو بیوی سے کافی دیر بحث کرتا رہا کہ اس حالت پر پہنچنے کی تمام تر ذمہ داری اُس آدمی کے اعمال پر تھی۔ تاریک
۔ کے کونے میں روشنی کا سے پر نظریں گاڑے اپنی بیوی کے ساتھ وہ بحث یاد آنے لگی ——— پھر وہ سوچنے لگا
ر میں رشوت نہ لیتا تو یہاں کیوں آتا؟ ——— اس خیال میں گم وہ کتنی ہی دیر بیٹا رہا مگر پھر خیالات نے پلٹا کھایا۔
لیکن ہمارے ملک میں اور بھی ہزاروں لوگ جو رشوت لیتے ہیں۔ بلکہ آج کل اکثریت ایسے لوگوں کی ہے اور اُن کی ساری
گیاں اسی چکر میں کٹتی ہیں۔ مگر انہیں کبھی سزا نہیں ہوئی۔ اور میں نے ایک دفعہ ضرورت سے مجبور ہو کر رشوت لی تو مجھے سزا
——— کہتے ہیں اللہ نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ مگر میری کیا مدد کی؟ گڈو کو پھوڑا نہ نکلتا تو واقعات کا یہ سلسلہ ہی شروع
ہوتا۔ اگر وہ نہ مرتا اور مجھے وہ بھیانک خواب نظر نہ آتا تو میں عاقل کو ناراض نہ کرتا اور اگر بالفرض گڈو کو مرنا ہی تھا تو خدا ایک دو
ہ پہلے مار دیتا تاکہ میں رشوت لینے سے بچ جاتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ یا اُس دن دفتر میں داخل ہونے سے پہلے مجھے اتفاقیہ
دیز نہ ملتا اور میرا ایمان اُس کی مثال دیکھ کر نہ ڈولتا۔ خدا نے واقعی میری کوئی مدد نہ کی۔ بلکہ پہلے پھوڑا نکالا اور پھر یکے بعد دیگرے
ب حالات اس طرح چلائے کہ میں یہاں آن پہنچا ——— مگر مجھے رشوت لینے کی سزا تو نہیں ملی۔ اگر میں لیتا جاتا اور عاقل
ے کام کرتا رہتا تو میرے بھی مزے تھے۔ نہ یہ جیل ہوتی۔ نہ عمر کی خواری تھی۔ یہ سب کچھ تو مجھے توبہ کرنے کی وجہ سے ملا ہے ۔
ند میاں بھی عجیب ہے۔ ایک طرف سے توبہ کرنے کو کہتا ہے اور دوسری طرف سے توبہ کرنے پر خواری دیتا ہے۔ مجھے رشوت
لینے پر سزا نہیں ملی۔ اُس سے تو میری مشکلیں حل ہو گئی تھیں۔ قرض اُتر گیا تھا۔ دوائیوں کے لیے کافی پیسے پاس تھے۔ پریشانی کم ہو
ئی تھی۔ مصیبت تو پڑی توبہ کرنے پر۔ جب اپنی ملازمت، عزت اور آزادی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا......

"دھپ ———"
"ماں کا خصم ——— یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا۔" رنگا بڑبڑایا۔
"کیا ہوا رنگے؟" وارث سر اُٹھا کر دیکھنے لگا۔
"بچھو تھا!"
"مار ڈالا؟"
"ہاں ایک ہی چپت میں چپٹا ہو گیا۔"
"ہتھیلی سے مار ڈالا؟" عبدالرحمن حیران تھا۔
"تو اور کیا!" وہ کمبل اوڑھتے ہوئے بولا "ہر کھیل کا طریقہ ہوتا ہے بابو ——— بچھو کو اُوپر سے کمر پہ چپت مارو۔ سانپ
کو پیچھے سے سر پر لاٹھی مارو اور مرد کو سامنے سے رانوں کے درمیان ٹھڈا مارو تو دوسرا سانس نہیں نکلتا ——— ہے ہے ہے۔"
وہ اس فلسفے پر خود ہی مزا لیتا ہوا ہنسنے لگا۔
"اور عورت کو کیسے مارو گے؟" وارث شریر آواز میں بولا۔

رنجھے نے موٹی سی گالی دے کر کروٹ بدلی۔

وارث نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور عبدالرحمان کی طرف منہ اٹھا کر بولا۔

"ابے یار۔ رنجھے نے اپنی بیوی کو مار ڈالا تھا۔"

مگر عبدالرحمان کی طرف سے جواب نہ ملنے پر خاموش لیٹ گیا۔

——— توبہ

——— توبہ

——— توبہ

عبدالرحمان سوچ رہا تھا توبہ کرنے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ماضی کی لغزشیں پاک ہو جاتی ہیں ——— اللہ میاں کے ہاں ہوتے ہوں گے۔ مگر دنیا میں تو ہم توبہ چھوڑ کچھ بھی کر لیں ہمارا ماضی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا ——— ہم ہمیشہ تو ماضی کے کمزور غلام ہیں اور قدم قدم پر سوسائٹی ہمیں وقت کے آئینے دکھاتی ہے۔ جس میں ہمارے ماضی کی لغزشیں ہیبت ناک سایوں کی طرح مجسم رہتی ہیں۔ سات تہ خانوں کی پوشیدہ گہرائیوں میں چھپ چھپ کر کاٹے ہوئے لمحے وقت کے نیر گلیوں اور بازاروں کی چھتوں سے ہمیں پکارنے لگ جاتے ہیں۔ زندگی کے شاہراہی بھی بعض اوقات حالات کے بوجھ سے پھسل جاتے ہیں۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا اور حالات کے الجھاؤ چند لمحوں کو ماؤف کر کے ایسا فعل کروا دیتے ہیں جس سے ہم ساری عمر دامن بچاتے رہے تھے۔ اپنی مرضی کے خلاف ہمارے ماتھے پر کلنک کا ایک ٹیکہ لگ جاتا ہے۔ نادم ہو کر اُسے نیک نیتی سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ماضی کے نقوش وقت کی کروٹ بھی نہیں مٹا سکتی۔ اور اس کلنک کے ٹیکوں کو اپنا جسمانی عضو سمجھ کر ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تب یہ ایک ٹیکہ سینکڑوں نئے ٹیکوں کے حالات پیدا کر دیتا ہے اور ماضی کا طلسم گزر جانے کے بعد بلند بانگ دعووں کے باوجود قدم قدم پر مستقبل کی گود میں سے نکل کر ہماری راہوں میں حائل ہو جاتا ہے۔

اے خدا ——— ہم اتنے بے بس کیوں ہیں؟ . . . .

ہم کیا ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ . . . .

ہماری زندگیوں میں ہمارا اپنا دخل کیوں اتنا کم ہے۔ حالانکہ ہر شے پر ہماری شخصیت کی چھاپ بھی جاتی ہے؟؟

ہمارا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ اگر ریل گاڑی کے ڈبے کی طرح ہمیں حالات کی پٹڑیوں پر چلنا ہے اور کسی اَن دیکھے ہاتھ نے کانٹے بدلنے ہیں؟؟ . . . . .

سوچتے سوچتے عبدالرحمان اونگھ گیا۔

جیل کی زندگی بالکل سپاٹ۔ بےجان اور بے کیف تھی۔ بیلنے کے پہیے جوتے ہوئے تھان کی طرح۔ وہی صبح، وہی شام، وہی چہرے وہی گالیاں اور رخنی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی تھم گئی ہو۔ اور اس میں کوئی تنوع یا تبدیلی نہ ہوتی ہو۔ جیل میں سحر کے قریب

ی تھے۔ اُن میں سے کبھی کوئی رہا ہو کر جانے والا ہوتا تو چند گرمجوشی سے معانقے ہو جاتے اور چند آنکھوں میں جگنو چمک جاتے۔
ئی نیا قیدی آتا تو وہ ایک دن تک دُوسرے قیدی آپس میں چہ میگوئیاں کرتے مگر اُس کے سارے حالات پتہ چل جانے پر یہ جوش
ختم ہو جاتا۔ شروع شروع میں عبدالرحمان کو جب کھانے پر، پریڈ پر، طبی معائنہ کرواتے وقت یا مشقت کے موقع پر دُوسرے
دیوں سے ملنے کا موقعہ ملتا تو اُس کا دل کچھ بہل جاتا۔ مگر پھر یہ بھی باسی معلوم ہونے لگا۔ سبھی دن پُورے کر رہے تھے۔ جس سے بات
۔ وہ یا تو پچھلی یادوں سے تڑپ رہا ہوتا یا آئندہ کے لیے رہائی کے دن گن رہا ہوتا۔ بے کاری نے اُن کے تخیلات کو تیز تر کر دیا
ا اور یادوں کو پھٹے پر ہونے والی خم کی طرح دیکھتے۔ اس میں اُن کو اپنے دشمن قوی ہیکل نظر آنے اور دوست بونے سے لگتے۔ جیل
ں رہنے والوں کو دُوسرے لوگوں کی سرد مہری، بے مروتی اور زیادتیوں کا جتنا احساس ہوتا ہے۔ باہر گھومنے والوں میں کبھی نہیں ہو
تا اور ہر ایک سے ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار سُن سُن کر عبدالرحمان اُکتا گیا تھا۔

سٹاف کے لوگ قدرے مختلف تھے۔ مگر وہ اپنی شان میں گُم رہتے۔ قیدیوں کو وہ بالکل بے جان مشینوں کی طرح سمجھتے، جو
میوں، ڈانٹ، سختی اور بعض اوقات گھونسوں سے چلتی ہیں۔ اُن کے خیال میں قیدی اس قابل ہی نہ تھا کہ اُس سے اچھا سلوک کیا
ئے اور ایک عجیب طرح کی بے جان اور حیوانی فرعونیت جیل کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔

وہاں پندرہ کے قریب وارڈر تھے۔ سپاہیوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ پانچ قیدی افسر تھے جو لمبی سزائیں پا چکے
ر جیل کے قواعد کی پابندی کرنے کی وجہ سے اب دُوسروں پر نگرانی کے لیے مقرر تھے۔ ایک جیلر تھا اور ایک سپرنٹنڈنٹ
ر کبھی کبھار معائنہ پر آیا کرتا۔

عبدالرحمان کا سبھی وارڈروں سے وقتاً فوقتاً واسطہ پڑتا تھا۔ دو ایک کی ڈیوٹی اُس کا کمرہ کھولنے، بند کرنے اور باہر
یجنے پر تھی۔ دو ایک چکی والے کمرے میں تعینات ہونے تھے۔ ایک آدھ جیل کے باغ میں کام کرواتا تھا۔ ایک ٹلیوں پر تعینات
تھا۔ چٹائی بُننے والے کمرے اور بان بٹنے والے درخت پر بھی ایک دو نگرانی کرتے تھے۔ چند ایک مُلاقات کے وقت
گرانی کرتے۔

اُن سب کا کردار حیرت انگیز طور پر ایک سا تھا۔ یہ درست ہے کہ اُن میں نیک بھی تھے اور نرم دل بھی۔ خاموش طبیعت
بھی تھے اور باتونی بھی۔ مگر قیدیوں سے تعلقات کے معاملے میں سب ایسے تھے جیسے ایک ہی کارخانے سے بنے ہوئے جوتے
ہوں۔ خاکی کپڑے، چمڑے کی پیٹیاں کمر کے گرد۔ اُن میں پیتل کی پلیٹ پر "وارڈر" لکھا ہُوا۔ اور چہروں پر ایک سی سختی۔ اُن کے کردار
کا پہلو واقعہ عبدالرحمان کو اُس دن ملا جب شروع شروع میں جمعرات کے روز بیگماں پہلی دفعہ مُلاقات کو آئی۔

وُہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وارث پچھلے گھنٹہ بھر سے اپنا مُنہ دھو کر تیار ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کا ماموں اور ممانی ملنے آ رہے
تھے۔ وُہ ہر جمعرات کو بلاناغہ آتے اور وارث صبح ہی سے بے کل رہنے لگتا تھا۔ رنگا حسبِ معمول اپنے پھٹے ہوئے بستر پر بیٹھا تھا۔
اور چرس کے نشے میں دھت تھا۔ عبدالرحمان نے وارث سے پُوچھا۔

"اِس کی مُلاقات نہیں آئے گی؟"

رنگے نے موٹی سی گالی دے کر کروٹ بدلی۔

وارث نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور عبدالرحمان کی طرف منہ اٹھا کر بولا۔

"ابے یار۔ رنگے نے اپنی محبوبہ کو مار ڈالا تھا!"

مگر عبدالرحمان کی طرف سے جواب نہ ملنے پر خاموش بیٹھ گیا۔

ـــــ توبہ

ـــــ توبہ

ـــــ توبہ

عبدالرحمان سوچ رہا تھا توبہ کرنے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ماضی کی لغزشیں پاک ہو جاتی ہیں ـــــ اللہ میاں کے ہاں ہوتے ہوں گے۔ مگر دنیا میں تو ہم توبہ چھوڑ کچھ بھی کر لیں ہمارا ماضی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا ـــــ ہم تو ماضی کے کمزور غلام ہیں اور قدم قدم پر سوسائٹی ہمیں وقت کے آئینے دکھاتی ہے۔ جس میں ہمارے ماضی کی لغزشیں ہیبت ناک سایوں کی طرح جھوم رہی ہیں۔ سات تہ خانوں کی پوشیدہ گہرائیوں میں چھپ چھپ کر کاٹے ہوئے لمحے وقت کے نئے پرچھیوں اور بازاروں کی چھتوں سے ہمیں پکارنے لگ جاتے ہیں۔ زندگی کے فساد راہی بھی بعض اوقات حالات کے بوجھ سے پھسل جاتے ہیں۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا اور حالات کے اتار چڑھاؤ عقل کو ماؤف کر کے ایسا فعل کروا دیتے ہیں جس سے ہم ساری عمر دامن بچاتے رہے تھے۔ اپنی مرضی کے خلاف ہمارے ماتھے پر کلنک کا ایک ٹیکہ لگ جاتا ہے۔ نادم ہو کر اسے نیک نیتی سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ماضی کے نقوش وقت کی کروٹ بھی نہیں مٹا سکتی۔ اور ان کلنک کے ٹیکوں کو اپنا جسمانی عضو سمجھ کر ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تب یہ ایک ٹیکہ سینکڑوں نئے ٹیکوں کے حالات پیدا کر دیتا ہے اور ماضی کا عرصہ گزر جانے کے بلند بانگ دعووں کے باوجود قدم قدم پر مستقبل کی گود میں سے نکل کر ہماری راہوں میں حائل ہو جاتا ہے۔

او خدا ـــــ ہم اتنے بے بس کیوں ہیں؟۔۔۔

ہم کیا ہیں؟ ہم کیا ہیں؟۔۔۔۔

ہماری زندگیوں میں ہمارا اپنا دخل کیوں اتنا کم ہے۔ حالانکہ ہر شے پر ہماری نیت کی چھاپ لگی جاتی ہے؟؟

ہمارا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ اگر ریل گاڑی کے ڈبے کی طرح ہمیں حالات کی پٹڑیوں پر چلنا ہے اور کسی ان دیکھے ہاتھ نے کانٹے بدلنے ہیں؟؟۔۔۔۔۔

سوچتے سوچتے عبدالرحمان اونگھ گیا۔

جیل کی زندگی بالکل سپاٹ۔ یکساں اور بے کیف تھی۔ لٹھے کے پھیلے ہوئے تھان کی طرح۔ وہی صبح، وہی شام، وہی چہرے وہی گالیاں اور رنجش۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی تھم گئی ہو۔ اور اس میں کوئی تنوع یا تبدیلی نہ ہوتی ہو۔ جیل میں سحر کے قریب

ری تھے۔ اُن میں سے کبھی کوئی رہا ہو کر جانے والا ہوتا تو چند گرمجوشی سے مصافحے ہو جاتے اور چند آنکھوں میں آنسو چمک جاتے ۔
ئی نیا قیدی آتا تو وہ ایک دن تک دُوسرے قیدی آپس میں چہ میگوئیاں کرتے مگر اُس کے سارے حالات پتہ چل جانے پر یہ جوش
ختم ہو جاتا۔ شروع شروع میں عبدالرحمان کو جب کھانے پر، پریڈ پر، طبّی معائنہ کرواتے وقت یا مشقت کے موقع پر دُوسرے
یوں سے ملنے کا موقعہ ملتا تو اُس کا دل کچھ بہل جاتا۔ مگر پھر یہ بھی باسی معلوم ہونے لگا۔ سبھی دن پُورے کر رہے تھے۔ جس سے بات
۔ وہ یا تو پچھلی یادوں سے تڑپ رہا ہوتا یا آئندہ کے لیے رہائی کے دن گن رہا ہوتا۔ بے کاری نے اُن کے تخیلات کو تیز تر کر دیا
ا اور یادوں کو پھوڑے پر بہنے والی مَلم کی طرح دیکھتے۔ اس میں اُن کو اپنے دشمن قوی ہیکل نظر آنے اور دوست بونے سے لگتے۔ جیل
ں رہنے والوں کو دُوسرے لوگوں کی سرد مہری، بے مروّتی اور زیادتیوں کا جتنا احساس ہوتا ہے۔ باہر گھومنے والوں میں کبھی نہیں ہو
تا اور ہر ایک سے ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار سُن سُن کر عبدالرحمان اُکتا گیا تھا۔

شاف کے لوگ قدرے مختلف تھے۔ مگر وہ اپنی شان میں مگن رہتے۔ قیدیوں کو وہ بالکل بے جان مشینوں کی طرح سمجھتے، جو
یوں، ڈانٹ، سختی اور بعض اوقات گھونسوں سے چلتی ہیں۔ اُن کے خیال میں قیدی اس قابل ہی نہ تھا کہ اُس سے اچھا سلوک کیا
ئے اور ایک عجیب طرح کی بے جان اور حیوانی فرعونیت جیل کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔

وہاں پندرہ کے قریب وارڈر تھے۔ سپاہیوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ پانچ قیدی افسر تھے جو لمبی سزائیں بھگت
ر جیل کے قواعد کی پابندی کرنے کی وجہ سے اب دُوسروں پر نگرانی کے لیے مقرر تھے۔ ایک جیلر تھا اور ایک سپرنٹنڈنٹ
کبھی کبھار معائنہ پر آیا کرتا۔

عبدالرحمان کا سبھی وارڈروں سے وقتاً فوقتاً واسطہ پڑتا تھا۔ دو ایک کی ڈیوٹی اُس کا کمرہ کھولنے، بند کرنے اور باہر
ھینے پر تھی۔ دو ایک چکّی والے کمرے میں تعینات ہوتے تھے۔ ایک آدھ جیل کے باغ میں کام کرواتا تھا۔ ایک ٹبّوں پر تعینات
ا۔ چٹائی بُننے والے کمرے اور بان بٹنے والے درخت پر بھی ایک دو نگرانی کرتے تھے۔ چند ایک ملاقات کے وقت
رانی کرتے۔

ان سب کا کردار حیرت انگیز طور پر ایک سا تھا۔ یہ درست ہے کہ اُن میں غصیلے بھی تھے اور نرم دل بھی۔ خاموش طبیعت
ی تھے اور باتونی بھی۔ مگر قیدیوں سے تعلقات کے معاملے میں سب ایسے تھے جیسے ایک ہی کارخانے سے بنے ہوئے جوتے
وں۔ خاکی کپڑے، چمڑے کی پیٹیاں کمر کے گرد۔ اُن میں پیتل کی پلیٹ پر "وارڈر" لکھا ہوا۔ اور چہروں پر ایک سی سختی۔ اُن کے کردار
کا پہلو واقعہ عبدالرحمان کو اُس دن ملا جب شروع شروع میں جمعرات کے روز بیگمان پہلی دفعہ ملاقات کو آئی۔

وُہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وارث پچھلے گھنٹہ بھر سے اپنا منہ دھو کر تیار ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کا ماموں اور بھائی ملنے آ رہے
تھے۔ وُہ ہر جمعرات کو ملاقات کو آتے اور وارث صبح ہی سے بے کل رہتے لگتا تھا۔ رنگا حسبِ معمول اپنے پٹّے ہوئے بستر پر بیٹھا تھا۔
اور چرس کے نشے میں دھت تھا۔ عبدالرحمان نے وارث سے پُوچھا۔

"آج اس کی ملاقات نہیں آئے گی ؟"

تو مجھے گھر سے گئے اُچھال کر جیتا تھا" اسے کہاں ہے بیٹے والا ——— یہ آج برس سے ملاقات کو کہتا ہے۔"

اور اُس نے دیکھا کہ وہ عام دنوں کی نسبت بہت زیادہ چرس لگا رہا تھا۔ بعد میں اُسے پتہ چلا کہ ہر ملاقات کے روز وہ اتنی چرس لگا لیتا تھا کہ نشے میں اُسے پتہ نہ چلتا تھا کہ ملاقات سے واپس آتے تو اُس کے منہ سے رالیں ٹپک رہی ہوتیں۔ اور گھنٹوں کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھا ہوتا یا بستر میں اوندھا لیٹا رو رہا ہوتا یا ویسے ہی ہنس رہا ہوتا۔ وارث نے عبدالرحمان کو خاص طور پر منع کیا تھا کہ اسے جب بہت سے دن تنگ نہ کیا کرو۔ یا نشے میں اُس کے قریب نہ جایا کرو کیونکہ وہ بہت دکھی ہوتا ہے۔

اُس دن وارث ملاقات کو جا چکا تھا۔ عبدالرحمان بیٹھا تھا کہ اتنے میں قیدی افسر نمبر ۱۳ آیا اور عبدالرحمان سے کہنے لگا۔

"تمہاری ملاقات آئی ہے۔"

عبدالرحمان ہڑبڑا کر اٹھا۔ اسے توقع نہ تھی کہ کوئی اسے اتنی جلدی ملنے آ جائے گا۔ وہ کپڑے ٹھیک کرتا ہوا جانے لگا۔

نمبر ۱۳ نے ہنس کر رنگے کو مخاطب کیا۔

"اوئے رنگے۔ تیری ملاقات کرنے والا کوئی نہیں؟"

رنگے کی لال لال نشے بھری آنکھوں میں ایک لہر دوڑ گئی۔ جیسے درد کی ٹیس ہو۔ پھر وہ بڑی ہی زہریلی ہنسی میں بولا۔

"تم اپنی ماں کو بھیج دو۔ سب کے سامنے ایسی ملاقات کروں گا کہ اُسے ساری عمر اتنا مزہ نہ آیا ہوگا۔"

نمبر ۱۳ ایک دم ٹھٹک گیا۔ پھر وہ دانت پیس کر بولا "حرامزادے، سُور کے بچے" اور آگے بڑھ کر زوردار تھپڑ رنگے کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہوا اور پھر اُس پل میں نہ جانے کیسے پانی کے گھڑے کا ڈھکن اٹھایا اور دھڑ سے نمبر ۱۳ کو دے مارا۔ اُس نے چکر کھا کر بچنا چاہا مگر وہ اُس کی کنپٹی پر ٹھک سے لگا۔

عبدالرحمان وہاں سے جلدی بھاگا۔

بڑے دروازے کے پاس لوہے کے جنگلے پر ہجوم سا تھا۔ قیدی جنگلے کے اندر سلاخوں سے چمٹ کر کھڑے تھے۔ جنگلے کی دوسری طرف پولیس والوں کے پہرے میں ملاقاتی تھے۔ عبدالرحمان نے جنگلے کے دو اطراف چکر لگایا۔ مگر کوئی نہ ملا۔ تیسری طرف گیا تو بیگماں نقاب اٹھائے کھڑی تھی۔ جنگلے کی دو سلاخوں کو بھینچتے ہوئے عبدالرحمان نے اپنا چہرہ اُن پر جما دیا اور زور سے روتے ہوئے پکارا۔

"بیگی!!"

بیگماں نے دیکھا اور لپک کر آگے آئی۔ عبدالرحمان نے بے اختیار ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالا۔ بیگماں نے جھپٹ کر اور اپنی تر بتر آنکھوں سے لگا لیا۔

"اوں ہوں" ایک وارڈر سختی سے بولا "دُور دُور کھڑے رہو۔ یہ چوما چاٹی کی جگہ نہیں۔"

بیگماں نے سہم کر دیکھا اور پھر جیسے سہما ہوا بچہ اپنے پیارے کھلونے کو چھننے کے ڈر سے آہستہ آہستہ بے دلی سے چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح اُس نے عبدالرحمان کا ہاتھ چھوڑا اور بہ قدم پیچھے ہٹ کر دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ عبدالرحمان کے چہ

پر اندرونی تکلیف سے کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔

بیگماں اور عبدالرحمان خاموش کھڑے ایک دُوسرے کو تکتے رہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایک لفظ نہ بولا۔ وارڈر کی فہمائش نے دونوں کو گنگ کر دیا تھا۔ بیگماں نے عبدالرحمان کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ دھاری دار لباس کے بے ڈھنگے پن کو دیکھا۔ بغیر کالر کے گلے میں سے اُس کی گردن نکلتی ہوئی عجیب سی لگ رہی تھی۔ اور پاجامہ ٹخنوں سے کتنا ہی اُونچا تھا۔ کہنی سے ذرا نیچے آستین پھٹی ہوئی تھی اور قمیص کے دو بٹن غائب تھے۔

بیگماں کے نتھنے کانپنے۔ آنکھیں بھر نے لگیں اور پھر آنسوؤں کے تار اُس کے بھرے بھرے خُوبصورت گالوں پر بہنے لگے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ بُرقع کے پلّو سے آنسو پونچھ ڈالتی۔ اُس کی بھیگی آنکھیں مستقل طور پر عبدالرحمان پر گڑی تھیں۔ اور وہ کبھی زمین کو تکنے لگتا۔ کبھی بیوی کو اور کبھی دُوسرے ملاقاتیوں کو۔

گھنٹی بجنے لگی۔ ملاقاتیوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔

"چلو جلدی کرو سب لوگ۔" وارڈر چلّایا۔

بیگماں نے جلدی سے بُرقع میں لپٹا ہوا تھیلا نکالا اور عبدالرحمان کی طرف بڑھایا۔

وارڈر لپکا آیا "ٹھہرو، پہلے دکھاؤ، کیا ہے؟"

تھیلا کھول کر وہ چیزیں دیکھنے لگا۔ سگریٹ کا خالی ڈبہ گھی سے بھرا ہوا۔ پڑیا میں کھانڈ، اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا سوجی کا خشک حلوہ۔ بسکٹ کا ڈبہ۔

"یہ نہیں ملے گا۔ واپس لے جاؤ" اُس نے حلوہ بیگماں کو دے دیا۔ بڑی مایوسی سے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے بے دلی سے واپس لے لیا۔

بسکٹ کا ڈبہ اپنی جیب میں گھسیڑتے ہوئے وارڈر نے تھیلے کے خالی کونوں میں جھانکا۔

"سگریٹ نہیں ہیں؟"

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" عبدالرحمان نے غصے میں کہا۔

"مگر میں تو پیتا ہوں" اُس نے مسکرا کر کہا "اگلی دفعہ ضرور لانا بی بی۔" اور پرے ہٹ گیا۔

"یہ بسکٹ کیوں لے گیا؟" بیگماں نے پوچھا۔

"یہ لوگ ایسے ہی سوّر" خاوند غصّہ دباتے ہوئے بولا "تم ادھر دو حلوہ مجھے۔ اگر اس نے ذرا چوں بھی کی تو میں بسکٹوں کی رپورٹ کر دوں گا۔"

بیگماں نے چھپا کر حلوہ آگے کیا۔ مگر وارڈر نے دیکھ لیا لیکن کچھ کہنے کی بجائے اُس نے مُنہ دُوسری طرف موڑ لیا۔

عبدالرحمان کوٹھڑی میں پہنچا تو وہاں ایک ہجوم تھا۔ جیلر اور ہیڈ وارڈر بیچ میں رنگے کھڑے تھے۔ دو تین وارڈر۔ قیدی افسر نمبر ۱ اور دو ایک اور قیدی افسر تھے۔ پولیس کے دو مسلح سپاہی بالکل جیلر کے پاس کھڑے تھے۔ جیلر کا لمبا جسم کا اُونچا لبادہ تھا

کنپٹیوں پر سفید بال اور چہرے کا کھرا کھرا متین نقش تھا۔ سنجیدہ پیشانی میں چمکدار آنکھیں تھیں۔ بھاری [illegible]
کے داخل ہوتے ہی نمبر ۱۳ چلّایا۔

"یہ آگیا ہے جناب ——— اس کے سامنے رنگے نے مجھ کو مارا تھا۔"

جیلر بھرپور نظروں سے عبدالرحمان کو دیکھتا رہا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر بجلیاں سے ملنے کے بعد کے تاثرات بہت نمایاں
تھے۔ اور جذبات کی اندرونی یلغار کی وجہ سے کسی بیرونی چیز میں دلچسپی لینے کے قابل نہ تھا۔ جیلر اپنی آنکھوں سے اس کے چہرے کو ٹٹولتا
رہا۔ مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ہیڈ وارڈر نے ڈپٹ کر عبدالرحمان سے پوچھا۔

"کیوں بے نمبر ۱۳ نے مارا تھا اس کو؟"

عبدالرحمان کچھ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا اور اپنے بستر کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

"ابے بولتا کیوں نہیں۔" نمبر ۱۳ چلّایا۔

عبدالرحمان پھر بھی خاموش رہا۔ مگر رنگا چلّایا "ابے کیوں تنگ کرتے ہو اُسے میں نے مارا تھا ——— مارا تھا ———
مارا تھا ——— اور اب بھی سو دفعہ ماروں گا۔"

"دیکھیے جناب۔" نمبر ۱۳ دونوں ہاتھ پھیلا کر جیلر کو اپیل کرتا ہوا بولا۔

جیلر خاموشی سے رنگے کو گھورتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے سٹاف کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اس نے چرس کہاں سے لی ہے"
سب وارڈر اور قیدی افسر چپ ہو کر دبک گئے۔

"بولتے کیوں نہیں؟" وہ ڈپٹ کر بولا۔

"حضور ہمیں کیا پتہ۔ ملاقاتیوں سے منگوا لیتے ہیں۔"

"اور تم کیا سوئے رہتے ہو۔ دیکھ نہیں سکتے۔ کون کیا لا رہا ہے؟"

جیلر چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "نمبر ۱۳ کو چھ دن کے لیے بیڑی پہنا دو اور دو ہفتے روزانہ چکی دلوا کے
ڈیوٹی لگاؤ ——— افسر کی بھی چھٹی نہیں۔"

باہر نکلتے وقت نمبر ۱۳ نے مڑ کر فتحمندانہ انداز میں رنگے کو دیکھا تو اس نے بازو تان کر گھونسے سے بڑی کوشش ہو کر
کر کے اسے چڑا دیا۔

رنگے کی لال لال آنکھیں اور چڑھا ہوا سانس دیکھ کر عبدالرحمان وارڈر کے پاس پہنچ گیا۔

"اسے چرس کیسے مل جاتی ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"وارڈروں کو خوش رکھو تو یہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔" اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

اس کے بعد رنگے کو روز مشقت پر بھیجا جاتا تھا اور جب وہ شام کو واپس آتا تو تھکن سے نڈھال ہوتا۔ اس کا مضبوط توانا
دھوپ میں مرجھائے ہوئے پتوں کی طرح ڈھیلا پڑا ہوتا۔ ناہموار قدم پڑنے سے بیڑیاں بج اٹھتیں۔ اور وہ گھسیٹ کر

بستر میں گرادیتا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو منہ سے لگا کر اس میں پھونکیں مارتا رہتا۔ نہ وارث سے بات کرتا نہ عبدالرحمان سے۔ بلکہ
نی سے بیزار رہتا۔ اُس کا کھانا بھی باہر سے یہی لوگ لے آتے۔ رات کو اُسے کروٹ بدلنے میں تکلیف ہوتی تو بیڑی کی جھنکار کے ساتھ
ں کراہوں کی بڑبڑاہٹ بھی سنائی دیتی۔

رنگے کی مشقت ختم ہو گئی۔ بیڑیاں اُتر گئیں۔ مگر وہ نڈھال نڈھال اور مُردہ ہو گیا تھا۔ سارا دن لیٹا ہوا کراہتا رہتا۔ اُس کے
ٹ راتوں سے بھیگے رہتے۔ آنکھوں سے پانی بہتا رہتا۔ وہ نہ منہ دھوتا، نہ کھانے میں دلچسپی لیتا۔ کئی دن سے صبح کے وقت اجابت
یے بھی نہ گیا۔

ایک دن عبدالرحمان نے وارث سے کہا "رنگے کی طبیعت خراب ہے۔ اِسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔" وارث ہنسا "نمبر ۱۳ نے دُوسرے وارڈروں سے کہہ کر اس کی چرس اندر آنا بند کر دی ہے
ب تک یہ اُس سے معافی نہ مانگے۔"

عبدالرحمان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اس کے بعد جب کبھی نمبر ۱۳ نظر آتا۔ تو عبدالرحمان نفرت سے اُس کے چیچک زدہ چہرے کو دیکھتا رہتا۔ وہ آنکھوں سے بھینگا
اور لمبوترے چہرے پر نوکدار ٹھوڑی بہت گھناؤنی لگتی تھی۔

دو تین روز بعد وہ کوٹھڑی کے آگے سے گزر رہا تھا کہ رنگے نے دونوں ہاتھ سلاخوں سے باہر نکال کر جوڑ دیئے اور بڑی
ت سے اُسے دیکھنے لگا۔ مگر وہ بڑی اکڑ سے "ہونہہ" کر کے گزر گیا۔

مگر شام کو وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو رنگے نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے "دیکھ اب جانے دے۔ رب کی قسم میرا سارا
سم سو گیا ہے۔"

"ابھی تو تیرا جسم سویا ہے۔" وہ بڑی نفرت اور رُعب سے بولا۔ "مگر تیرا دماغ تب ٹھیک ہو گا۔ جب تو اپنی ماں کے
ساتھ سوئے گا۔"

رنگے نے اُس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ اُس کی پھیلی ہوئی مونچھیں ٹخنوں کو چھونے لگیں "سو ڈوں گا ———
سو ڈوں گا ——— تو جو چاہے گا، کر دوں گا ——— مگر اب خدا کے لیے جانے دے۔"

نمبر ۱۳ نے پاؤں کی ٹھوکر سے اُسے سیدھا کیا اور بولا "چل بیٹھ اِدھر اب اور خبردار جو ایسی حرکت پھر کبھی کی۔"

تھوڑی دیر بعد اُس نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر بند مٹھی اندر کی۔ رنگے نے ایسے جھپٹ کر پکڑا جیسے چیل ہوا میں اُچھالے
ہوئے گوشت پر آتی ہے۔ اور سیدھا اپنے بستر پر پہنچا۔

رات کو جب رنگے کو چرس کا نشہ چڑھا تو وہ بازو ہوا میں لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا۔

"او یار۔ چند دن چکی پیسوا کر یہ سالے میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ میں تو کئی سال لگاتار چکی چلا سکتا ہوں۔ جو یہاں سب کی ماں کا بھی
ا کر دوں۔"

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبدالرحمان جیل کی زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ جب سے بھی مشقت پر لگے تھے، اُس کے دن جلدی جلدی کٹنے لگے۔ جیلر نے ایک دن اُس کا لمبا انٹرویو لیا تھا اور اُس کے بعد تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اُسے سخت مشقت سے چھٹی دے دی تھی۔ چنانچہ وہ چکی والے کمرے میں کبھی نہیں گیا۔ مگر چارپائی بُننا اور بان بٹنے کا کام کرتا رہا۔ ایک آدھ دفعہ ترکھان کے ساتھ اُس نے چارپائی بنانے کی کوشش بھی کی۔ مگر جیلر ادھر سے گزر رہا تھا اور اُس نے منع کر دیا تھا۔ تب وہ زیادہ وقت باغ میں پانی لگانے، نلائی کرنے اور کھاد بچھانے پر صرف کیا کرتا۔

جیل میں جب کبھی قیدی نئے یا پہلی بار ملتے۔ وہ گفتگو شروع کرنے کے لیے ایک دُوسرے سے یہی پُوچھتے کہ جُرم کیا ہے اور کتنی سزا ہوئی تھی۔ اکثر لوگ ایسے بھی تھے جو دُوسری تیسری مرتبہ جیل آئے تھے۔ عبدالرحمان اُن قیدیوں سے بات چیت کرتا رہتا تھا۔ مگر وہ لوگ انتہائی طور پر خود پسند ہو گئے تھے۔ اور اُن کی بات کا موضوع ہمیشہ اپنی ذات، اپنا جُرم اور اپنے ساتھ دُنیا کی زیادتی ہوتا تھا۔

عبدالرحمان کے دل میں بھی ایک ہی خلش رہتی تھی۔ وہ کسی وقت تو اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتا تھا کہ اُس نے رشوت لی تھی بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اُس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ عاقل نے دھوکے سے اُس کی کُرسی پر رقم رکھوا کر اُسے قید کرایا ہے اور وہ بے گناہ ہے۔ اگر اُس نے ایک دفعہ رشوت لی بھی تھی تو خدا نے اُس جُرم کے تناسب سے بہت زیادہ سزا دی ہے۔ اور قسمت نے اُن پر ظلم کیا ہے اس لیے دُوسرے قیدیوں سے بات کرتے وقت وہ ہمیشہ یہ جانچنے کی کوشش کرتا کہ آیا وہ بھی جیل میں آنے کے مستحق تھے یا اُس کی طرح اُن پر بھی ظلم ہُوا ہے۔

قیدیوں کی سرگزشت سے جو کوائف اُس نے اکٹھے کیے تھے۔ اُن سے بنیادی نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر حالات کا شکار تھے۔ ایسے حالات جو اُن کے اختیار سے باہر تھے۔ کبھی جائیداد کا جھگڑا۔ کہیں عورت کی رقابت یا اُس کے پیچھے غیرت کے تقاضوں کا قضیہ اور کہیں حالات کے مسلسل دباؤ سے پیدا شدہ پریشانی کے زیر اثر لوگوں کو کوئی غلط قدم جیل کی طرف لے جاتا۔ عبدالرحمان اکثر قیدیوں سے یہ سوال کرتا کہ اُنھوں نے جُرم کیوں کیا ہے، تو اُسے عجیب و غریب جواب ملے تھے۔ ویسے تو انسانی فطرت کے عین مطابق کوئی بھی تسلیم نہ کرتا تھا کہ قصور اُس کا ہے۔ لیکن وُہ یہ بتاتے تھے کہ وہ یا تو اُکسائے گئے تھے یا مجبور تھے۔ اور بسا اوقات اُن کی باتیں ٹھیک بھی لگتی تھیں۔

عبدالرحمان کے دل میں اکثر یہ سوال گونجتا کہ ہم اپنے اعمال کے کس حد تک ذمہ دار ہیں؟ ہم کتنے خود مختار ہیں؟

یہ درست ہے کہ خدا بار بار کہتا ہے کہ انسان کو ہم نے اچھے اور بُرے میں تمیز کرنے کے لیے عقل دی ہے۔ اُس کے بعد وُہ خود ذمہ دار ہے ——— قانون بھی سزا دیتے وقت یہی پیش نظر رکھتا ہے۔ کہ یہ آدمی اگر چاہتا تو جرم سے بچ سکتا تھا اور اُس نے جان بوجھ کر کیا ہے۔

مگر کیا یہ درست ہے؟

نہیں ——— ہر شخص کی طبیعت مختلف ہے۔ اُس کا ماحول مختلف ہے اور انسان کا طرزِ عمل طبیعت اور ماحول کے

زی جھنکار ہے ——— جبیعت بنانے میں انسان کا اپنا کوئی دخل نہیں اور نہ ہی ماحول کا تعین وہ اپنی مرضی سے کرتا
، بلکہ جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے کم و بیش ساری زندگی اُسی میں گزارتا ہے ——— تو پھر انسان کو اس جھنکار کا ذمہ دا
ں ٹھہرایا جائے ؟ . . . . . . سزا اور جزا کا کیا جواز ہے ؟ ؟ یہاں دُنیا میں جیل کیوں بنائی گئی اور آخرت میں دوزخ کس
ے ؟ ؟ ؟

جب عبدالرحمان کو ایسے خیالات بہت تنگ کرتے تو وہ چاہتا کہ کسی سے اس موضوع پر بات کرے مگر اُسے کوئی
ں نہ ملتا تو وہ تنگ ہونے لگتا۔ وارث گو ذہین تھا مگر وہ جاہل تھا اور ان مسائل کے بارے میں اتنی گہرائی تک نہ جا سکتا تھا۔
ی وہ غنیمت تھا اور عبدالرحمان کا زیادہ تر اُس کے ساتھ دل لگتا تھا۔ وہ متین سنجیدہ اور خاموش طبیعت تھا۔ اور اُس نے
نے آپ کو کبھی بھی مجرموں میں سے نہیں سمجھا تھا بلکہ وہ جیل سے باہر جا کر باعزت زندگی گزارنے کی باتیں کیا کرتا۔ اُس کے پچھلے حالات
ں کر عبدالرحمان کو اُس سے گہری ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ اکٹھے بان بٹ رہے تھے۔ جب وارث نے اُسے اپنی کہانی سنائی۔
. . . وہ درخت کے نیچے بان بٹ رہے تھے۔ عبدالرحمان کو یہ کام کرتے دُوسرا دن تھا۔ مگر اُسے ابھی تک طریقہ نہ آیا تھا۔ اُس
ے ہاتھ بار بار کٹ جاتے اور بازوؤں پر کھجلی ہونے لگی۔

"تم تھوڑی دیر مجھے دیکھو۔" وارث نے ہمدردی سے کہا۔

پھر اُس نے اُسے بتایا کہ پورا مروڑنے سے کچھ پہلے بان کی نئی مونجھیں سوٹوں میں اُڑسا دو اور ہاتھ کو تھوڑا پانی لگا کر گھماؤ۔
جب ہاتھ سے اور ریشے اٹھا رہا ہوں تو رسی کے آخری سرے کو دانتوں میں پکڑ لو۔

"تم شاید یہ کام کافی عرصہ سے کر رہے ہو ؟"

"ہوں! بہت مدت سے۔"

"مگر جیل میں تو ابھی تمہیں چار مہینے ہی ہوئے ہیں۔"

"نہیں - میں اپنے گاؤں میں کبھی کبھار کیا کرتا تھا۔"

"وہاں تمہارا کاروبار یہی تھا کیا ؟"

"نہیں۔ کھیتی باڑی کرتا تھا اور کسان کو ایسے اکثر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتے ہیں۔ میرے ماموں کی زمین کافی تھی۔ اور میں نے
ساری عمر وہیں گزاری ہے۔"

"کیوں؟ تمہارے والدین نہ تھے ؟"

وارث چُپ ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ جواب دے یا نہ دے۔ پھر کافی دیر بعد بولا۔

"جب والدین کی آپس میں ناچاقی ہو تو بچوں کو دُوسروں کے ٹکڑوں پر ہی پلنا پڑتا ہے۔"

عبدالرحمان چُپ ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس سے کچھ اور پوچھنا مناسب ہو گا یا نہیں۔ مگر تھوڑے وقفے بعد وارث رسی کو بل دیتا
ہوا خود ہی بول پڑا۔

"میری بڑی بہن دو سال کی تھی اور میں ابھی ماں کے پیٹ میں تھا جب وہ میرے باپ سے لڑ کر میرے ماموں کے ہاں آگئی۔ میں وہیں پیدا ہوا اور ہم دونوں بہن بھائی ماموں کے ہاں ہی پلے۔"

"باپ کے پاس کبھی نہیں گئے؟"

"نہیں ——— اُس نے دُوسری شادی کر لی تھی۔"

"تو تمھاری والدہ کو اُس نے طلاق دے دی ہوگی؟"

وارث نے نفی میں سر ہلایا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر وارث بولا "بابُو تم ہمارے رواج نہیں جانتے۔ ہم بلوچستان کے قبائلی لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر لڑکا لڑکی کے والدین کو کافی رقم دیتا ہے جسے وُلور کہتے ہیں۔ میری ماں کی شادی پر میرے باپ نے پندرہ ہزار روپیہ دیا تھا۔ اب وہ طلاق دینے کے لیے یہ روپیہ واپس مانگتا تھا۔"

"اور تمھارے ماموں دیتے نہ تھے؟"

"وہ کیسے دیتے۔ یہ اُن کے والدین نے لیا تھا اور وہ مر چکے تھے۔"

"تو تمھاری والدہ کی نہ طلاق ہوئی نہ وہ کبھی واپس گئی۔"

"نہ ——— ہم اپنے ماموں کے پاس جوان ہوئے۔ ہمارے باپ نے ہمیں کبھی نہیں دیکھا۔ اُس نے دُوسری شادی کر لی تھی اور ہم اپنے ماموں کے کھیتوں پر کام کرتے رہے اور بڑے ہوتے گئے ——— ہماری ماں ہمیں دیکھ دیکھ کر رویا کرتی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر..... وہ اسی طرح روتے روتے مر گئی۔"

عبدالرحمان خاموش ہو گیا۔ وارث رسی بانٹ رہا۔ اتنے میں نمبر ۳ اُدھر آیا۔ اُس نے ان دونوں کو باتیں کرنے پر فہمائش کی۔ گالیاں دیں اور خبردار کیا کہ اگر شام تک اُنھوں نے پانچ گز بان نہ تیار کیا تو سزا ملے گی۔

مگر اُس کی تنبیہ کے باوجود وارث نے کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اُس کے دل کی گٹھڑی کُھل گئی تھی اور اب یادیں اُس کے روکے نہ رُکتی تھیں۔ وہ باتیں کر کے دل ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے بات جاری رکھی۔

"تب میرے باپ نے دعویٰ کر دیا کہ دونوں بچے مجھے واپس ملنے چاہئیں۔"

"مگر کیوں؟ جب اُس نے ساری عمر خبر نہ لی تو اب تمھاری ماں کے مرنے کے بعد کیوں آن ٹپکا؟"

"میری بہن جوان ہو گئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور اُس کی شادی پر میرے باپ کو کئی ہزار زرِ وُلور مل جاتا ——— میرے ماموں کو بھی یہی لالچ تھا اور ویسے بھی ہم اُس کے پاس رہے تھے۔ چنانچہ وہ مقدمہ لڑنے کو تیار ہو گیا۔ معاملہ جرگے کے پاس پہنچا۔ مگر ممبرانِ جرگہ میں سے دو نے میرے باپ سے پیسے کھا لیے اور باقیوں نے اس لیے حمایت کی کہ اگلی الیکشن میں وہ اُن کو بہت سے ووٹ دلوا

سکتا تھا۔

"مگر تم لوگوں نے کچھ نہیں کہا؟"

"میں نے اور میری بہن نے صاف طور پر جرگہ کے سامنے کہا کہ ہم اپنے ماموں کے پاس رہنا چاہتے ہیں مگر انھوں نے والد کو جائز نگہبان قرار دیا اور کہا کہ بچوں کو لے جاؤ ـــــ پھر جرگہ والوں اور دوسرے لوگوں کے سامنے میرا باپ میری بہن کو گھسیٹنے لگا۔ اُس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ باپ کے قدموں کو ہاتھ لگایا۔ جرگہ ممبروں کے سامنے اپنی اوڑھنی بچھائی ـــــ اور مجھے پکارا کہ اِس وقت میرا بھائی بھی چھوڑ گیا مجھے۔۔۔۔"

وارث ایک دم چپ ہو گیا۔

"پھر؟"

"پھر۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔ وہ میری بہن تھی۔۔۔۔ اُس وقت بے بس تھی۔۔۔۔ میں غصہ میں پاگل ہو گیا۔۔۔۔ اور وہیں ایک بڑا پتھر اُٹھا کر باپ کو دے مارا۔"

عبدالرحمان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

"اُس کا سر پھٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ مگر قسمت اچھی تھی جان بچ گئی ـــــ اور مجھے قتل کرنے کی کوشش میں پانچ سال کی سزا ہو گئی۔"

"اور بہن؟"

"اُسے باپ لے گیا۔"

"تمھارا باپ کبھی جیل میں ملنے آیا ہے تمھیں؟"

وارث نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔ "کبھی نہیں ـــــ اُس کا ہم سے کیا واسطہ ـــــ ماموں اور ممانی ہر دفعہ ملنے آتے ہیں۔ اتنا لمبا سفر کر کے آتے ہیں۔ وہ بالکل میرے والدین کی طرح ہیں ـــــ سچ مچ کے والدین۔"

عبدالرحمان کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"تم نے غلطی کی۔ تمھیں غصے میں بے قابو نہیں ہو جانا چاہیے تھا۔"

"تم نے میری بہن کو بلکتے ہوئے نہیں دیکھا۔" وارث کام ہاتھ سے چھوڑ کر جوش سے بولا "نہ بھائی بن کر سوچا ہے ـــــ تم نے میرے باپ کی نظروں میں خباثت کی فتحمندانہ چمک نہیں دیکھی تھی ـــــ تم نے جرگہ ممبروں کو اپنی بے ایمانی چھپانے کے لیے قانون اور رواج پر اصرار کرتے نہیں دیکھا تھا ـــــ ہم بے بس تھے اور بے بسی میں غصے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔"

"پھر بھی وہ تمھارا باپ تھا۔"

"اونہوں" اُس نے سر ہلایا۔ "باپ تو وہ تھا جس نے ہماری پرورش کی۔ دوسرا آدمی تو ہمارے لیے اجنبی تھا۔ جو اپنے منافع کی خاطر ہمارے گھر کو جدا کرنا چاہتا تھا ـــــ تم میری جگہ ہوتے تو وہی کرتے جو میں نے کیا تھا۔"

عبدالرحمان کو وارث کی بات کچھ کچھ معلوم ہونے لگی۔ مگر وہ خاموش رہا۔

دونوں کافی دیر تک باہر بیٹھے رہے۔ وارث خاموش تھا۔ کبھی کبھی وقت اس کے ہاتھ کانپ جاتے اور وہ ٹھنڈی آہ بھر لیتا۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم وہ شام تک کام کرتے رہے۔

واپسی پر عبدالرحمان نے پوچھا۔ "اور رنگے نے کیا کیا ہے؟"

وارث ہنسا "کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔ اس کا تو پیشہ ہی یہی ہے۔ کئی بار قید بھگت چکا ہے۔"

"پہلے کیا؟"

"وہ میانوالی کا مشہور بدمعاش ہے۔ ساری عمر جیل کے اندر باہر رہا۔ وہ لوگوں سے پیسے لے کر واردات کرتا ہے۔ کوئی دشمنی کی وجہ سے دوسرے کو قتل کرانا چاہتا ہے۔ یا مویشی چوری کرانا چاہتا ہے یا فصل کو آگ لگوانا چاہتا ہے تو رنگا پیسے لے کر یہ سارے کام کر سکتا ہے۔"

"مگر وہ کیوں ایسا کرتا ہے؟"

"اس سے پوچھو ——— مجھے کیا معلوم؟"

"تم اس روز کہہ رہے تھے کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا تھا۔ وہ کیا قصہ ہے؟"

"ساری بات کا تو مجھے بھی علم نہیں ——— میں نے بھی سنا تھا۔ جب اس سے پوچھا تو وہ گالیاں دینے لگا۔"

عبدالرحمان کو قید ہوئے تین مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصہ میں بگیاں چار دفعہ ملاقات کو آئی تھی۔ وہ ہر دفعہ ادھر اُدھر کی خبریں سناتی تھی۔ پارو کی ماں اس کا بہت خیال رکھتی تھی اور اس کی وجہ سے وہ تن تنہا اپنے مکان میں بے خوف رہ رہی تھی۔ اکثر اوقات وہ سوتی بھی کاسی کے گھر تھی۔ یا بعض اوقات اس کی بڑی لڑکی وہاں سو جاتی۔ ملاقات کا وقت بہت مختصر ہوتا تھا۔ اس لیے موٹی موٹی خبریں ہی چلتے چلتے سنا سکتی تھی۔

جس دن بگیاں مل کر چلی جاتی عبدالرحمان کے لیے رات کو سونا مشکل ہو جاتا۔ بستر پہ لیٹے ہوئے وہ آسمان کی چھوٹی سی مستطیل تکتا رہتا۔ اس شام کے وقت ایک روشن تارہ ابھرتا۔ پھر آہستہ آہستہ جگہ بدلتا وہ آدھی رات تک مستطیل کے دوسرے کنارے تک پہنچ جاتا اور جب اس کی آخری کرن دیوار کی اوٹ چھپ جاتی تو عبدالرحمان صبح کا انتظار کرنے لگتا۔ دو گھنٹوں بعد مستطیل کا نچلا کنارا روشن ہونے لگتا۔ پھر روشنی [illegible] پڑ جاتی اور اس سے ٹھیک آدھا گھنٹہ بعد مستطیل کے سارے کنارے واضح ہونے لگتے۔ پھیکے ستارے آہستہ آہستہ گھل جاتے اور ایک [illegible] چادر کناروں کے آرپار تن جاتی۔ پھر اس میں سے آسمان کا نیلا رنگ ابھرنے لگتا۔ اور ایک روشن ٹھنڈی آہ بھر کر نیند سے بھاری سر کو [illegible] پرے مارتا۔ اور دو چار بے چین کروٹیں لے کر اٹھ کھڑا ہوتا۔

اس دفعہ بگیاں آئی تو عبدالرحمان نے کہا۔ "بگی تم اب اپنے گاؤں چلی جاؤ۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ کب تک [illegible] خراب ہوگی۔"

"مگر گاؤں میں بھی میرا کون بیٹھا ہے۔" بگیاں کے والدین مر چکے تھے۔

"پھر بھی سلاسٹ جاننے والے لوگ ہیں۔"

"مگر اتنی دُور سے تمھیں دیکھنے بھی تو نہیں آ سکوں گی۔"

"تو کیا ہوا ——— اب تمھارے پاس کھانے کو بھی تو پیسے نہیں رہے ہوں گے۔"

"میں ابھی تو ——— میں نے کنگن بیچ ڈالا تھا۔"

"کون سا کنگن" وہ چونکا۔

"وہی والا" بیگماں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

سمجھ کر عبدالرحمان کا دل ڈوب سا گیا۔ مگر وہ چپ رہا۔

"کس کے ہاتھ بیچا؟" بالآخر اُس نے پوچھا۔

"میں نے تو پارو کی ماں کو دیا تھا ——— اُس نے اپنے میاں کو دیا ——— وہ لے کر سنار کے ہاں گیا تو وہاں عاقل بیٹھا تھا۔ اُس کے پوچھنے پر اُس نے بتایا تو وہ پارو کے خاوند کو لے کر سیدھا میرے پاس آ گیا ——— اور کہنے لگا ——— بھابی آپ زیور کیوں بیچتی ہیں ——— ہم کس دن کے لیے ہیں عبدالرحمان بیرا دوست تھا۔ خواہ مخواہ لوگوں نے اُسے غلط فہمی کرا دی کہ میں نے اُس پر مقدمہ کرایا تھا۔ حالانکہ جب چھاپا پڑا تو میں وہاں موجود ہی نہ تھا۔ ——— اور پتہ نہیں کیا الم غلم کہتا رہا۔ بہرحال میں نے کچھ روپے لینے کے لیے انکار کر دیا تو بالآخر کہنے لگا۔ آپ بیچیں نہیں بلکہ گروی رکھیں۔ میرا ایک دوست ہے جو اچھے پیسے دے دے گا۔ جب رقم ہو چھڑوا لینا۔ پارو کے باپ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ اب اگر میں اُن دونوں کی بات نہ مانتی تو کس کے پاس جاتی۔ میرا اللہ کو ن سجن بیٹھا ہے ادھر۔ اس لیے میں نے کہا کہ مجھے نو روپے لا دو۔ چاہے گروی رکھوا دو۔ اگلے روز عاقل نے مجھے دو سو پچاس روپے لا دیے۔"

"تو پھر تو گروی ہوا تھا" عبدالرحمان نے اطمینان کا سانس لیا۔

"گروی کیا۔ بکا ہی سمجھو۔ ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں ہوں گے کہ اسے چھڑوا سکیں۔"

عبدالرحمان خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا "عاقل بہت ذلیل آدمی ہے اس کو منہ نہ لگایا کرو۔ پھر کبھی آئے تو صاف طور پر دھتکار دینا۔"

وقت ختم ہو گیا اور وہ پھر واپس مڑے۔ چلتے وقت عبدالرحمان نے پھر کہا۔ "عاقل کو گھر نہ آنے دیا کرو۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں ہے۔"

عبدالرحمان کمرے میں آیا تو وارث بھی اُسی وقت پہنچا۔ وہ بہت مضمحل اور اداس تھا۔ عبدالرحمان خود بھی بیگماں کے خیال میں کھویا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رنجے سے باتیں کرنے لگا جو اس روز حسب معمول ملاقات کا ذکر ملنے کو بہت چرس کے نشے میں تھا۔ اور اپنے بستی والے کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کر رہا تھا۔ اُس کی پارٹی نے مویشیوں کی ایک منڈی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اور رات ہی رات میں سو مویشی ہنکا کر لے گئے تھے۔

"اور تم ڈاکے کہاں ڈالتے تھے؟" عبدالرحمان پوچھنے لگا۔

"تم ڈکیتی کہاں کرتے تھے بابو؟" سکھے نے اسی لہجے میں طنزیہ پوچھا۔ اور پھر اپنا قصہ شروع کر دیا۔

رات کو زنجا پور سے بے سُدھ ہو کر سویا۔ مگر بیگیاں کے جانے کے بعد عبدالرحمان نہ سو سکا۔ اور وہ حسبِ معمول تنکا کے چھپنے کھٹکے میں اُدون پر نظر جمائے سوچوں میں گم تھا۔ کافی رات گزر گئی۔ اتنے میں وارث پانی پینے اُٹھا۔

"ابھی تک سوئے نہیں تم؟" عبدالرحمان نے پوچھا۔

"نہیں۔"

عبدالرحمان کروٹ بدل کر بیٹھ گیا۔ اُس نے گھڑا اُنڈیلنے کی آواز سنی۔ پھر وارث کے بڑے بڑے گھونٹ گِنے۔ بعد میں پیالہ زمین پر رکھا گیا۔ اور سرسراہٹ ہوئی مگر وہ آواز دُوسری طرف جانے کی بجائے عبدالرحمان کی طرف بڑھی اور اُس نے اپنے کندھے پر ایک ہاتھ محسوس کیا۔

"بابو!"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میری بہن کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔" وارث کا گلا رُندھا ہوا تھا۔ "میرا باپ کر رہا ہے۔" وہ چند لمحے رُکا، پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگ گیا۔

آسمان کی مستطیل میں چاند چمک رہا تھا۔ اُس کی روشنی میں وارث بیٹھا تھا۔ سلاخوں کے سائے اُس کے جسم پر اوپر تلے جمتے ہوئے پڑے تھے۔ اور وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ عبدالرحمان اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ باوجود کوشش اور خواہش کے تسلی کے لیے کچھ نہ کہہ سکا۔ وارث پھر بولا۔

"وہ اُس گھر میں بیاہی جا رہی ہے۔ جس سے ہماری پُرانی دشمنی ہے۔ اور ——— میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

چاند کی روشنی میں سسکیاں بھرتا ہُوا مرد عبدالرحمان کو ایک دم بچے کی طرح لگنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور آہستہ آہستہ اُس کی کمر پر تھپکی دینے لگا۔ اُس کی بے چارگی پر عبدالرحمان کا اپنا دل بھر آیا۔ مگر وہ ضبط کیے رہا۔

تھوڑی دیر بعد جب وارث سنبھلا تو اُس نے بتایا کہ آج ماں آئی تھی۔ اس نے یہ خبر دی ہے کہ اب دو گھروں کا ارادہ ہے کہ یا لڑکی کو اُٹھا کر لے جائیں یا برات پر حملہ کر دیں۔ پھر وہ دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مستطیل سے چاند غائب ہو گیا اور دھندلی سی ہلکی روشنی کے کنارے نظر آنے لگے۔

دُوسرے دن عبدالرحمان اور رنگا باغ میں کام کر رہے تھے۔ سبزی لگانے کے لیے کیاریاں تیار کرنا تھیں اور وہ چوڑے کھرپے لیے بھربھری مٹی کی تھوڑی تھوڑی تہ جاتے۔ پھر کھرپے کے چوڑے بلیڈ سے اُس کو کرش کر دیتے۔ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ اتنے میں نگران وارڈر ادھر آیا۔ ان کے کام کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا: "تم معلوم ان سوروں کو عقل کب آئے گی۔ ہر کام خود دیکھنا پڑتا ہے۔"

عبدالرحمان کام چھوڑ کر ناگواری سے اُسے دیکھنے لگا۔

"ابے پاگلو۔ چاروں طرف مٹی کھڑی کر دی ہے۔ پانی کدھر سے آئے گا ــــــ بناؤ اِس طرف سے راستہ۔"

رنگا بڑبڑاتے ہوئے ٹھیک کرنے لگا اور وہ وارڈر آگے جا کر پولیس کے سپاہی سے باتیں کرنے لگا جو بندوق زمین پر ٹکائے کھڑا تھا۔

رنگا پوچھنے لگا "بابو بات وارث کیوں رو دیا تھا؟"

وہ ہنسا "ارے تم جاگ رہے تھے؟"

"بس ایک آدھ دفعہ کی نیند میں سنا تھا۔"

عبدالرحمان نے ساری بات سنائی۔

"بزدل" اُس نے زمین پر تھوک دیا "مرد ہو کر روتا ہے۔"

"کیوں نہ روئے رنگے۔ اُسے اپنی بہن سے پیار ہے۔"

"پیار ہے تو کچھ کر کے دکھائے ــــ جیل کے دروازے توڑے، بھاگ جائے ــــ یہ رونے کا کیا تماشہ ہے۔"

عبدالرحمان مسکرایا "وہ تمہارے جیسا جری نہیں رنگے۔"

"جری نہیں تو کیا ہوا۔ مرد تو ہے۔"

"اب جیل میں رہ کر وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"نہیں کر سکتا تو مت روئے۔"

"رنگے تمہیں اپنی بہن سے پیار نہیں۔"

"میری بہن ہی نہیں۔"

عبدالرحمان کے دل میں پھر سے رنگے کو کریدنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ "اچھا یہ تو بتاؤ رنگے۔ تم نے کبھی کسی عورت سے پیار کیا ہے؟"

"چھوڑو بابو یہ باتیں۔" رنگا کھرپہ چلانے لگا۔

"نہیں رنگے۔ سچ سچ بتاؤ۔"

"مگر کیوں بتاؤں۔ کوئی زبردستی ہے۔"

عبدالرحمان نے پینترا بدلا "رنگے میں نے سنا ہے کہ تم نے کئی قتل کیے تھے۔ بہت سی لڑکیوں کو اغوا کیا ہے اور ڈاکے ڈالے ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں تو کیا ہے ــــ مرد ہی ایسا کام کرتے ہیں۔"

"مگر تم یہ کیوں کرتے تھے؟"

•رنگا کا باپ ؟•

•آخر دنیا بھی تو کوئی چیز ہے ـــــ کمانے کے اور بھی تو کئی ڈھنگ ہیں •

•مگر میرے باپ نے تو مجھے یہی ڈھنگ سکھایا اس میں میرا کیا قصور ؟

تمہارا باپ بھی یہی کرتا تھا ؟•

•ہاں• رنگا فخر سے بولا • میرے باپ کے ڈر سے تو دو ضلعوں کے لوگ کانپتے تھے۔ بڑا تگڑا بدمعاش تھا وہ۔ بچے کرتا تھا۔ رنگے تو چار زندگیاں لے لے۔ تب بھی اتنے سر نہ کاٹ سکے کا جتنے میں نے کاٹ ڈالے ہیں۔•

رنگا کھرپہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اب موڈ میں آ رہا تھا۔

•اللہ قسم جب میں نے پہلا ڈاکہ ڈالا تھا تو میرے باپ نے بڑی تگڑی دعوت کی تھی اور میں نے بھی تو زردوں کی طرح دن دہاڑے بس کو روکا تھا۔ صرف دو ساتھی میرے ساتھ تھے۔ وہ پستول تانے کھڑے رہے اور میں نے ساری بس والوں سے گھڑیاں، زیورات اور نقدی دھروالی ـــــ ایک عورت نے زیور دینے میں ذرا چیں چاں کی۔ تو میں نے گود میں سے بچہ چھین کر زور سے سڑک پر پھینک دیا سالا ایک ہی چیخ مار کر ٹھنڈا ہو گیا۔

عبدالرحمان اندر ہی اندر کانپ گیا۔ کچھ دیر خاموشی سے رنگے کے چہرے پر خوشی کی فتح مندانہ چمک دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

•رنگے۔ تم اگلے جہان میں خدا کو کیا جواب دو گے ؟•

رنگے نے کھرپہ ہوا میں چلایا اور تیزی سے عبدالرحمان کی طرف گھوم کر بولا• میں جواب دوں گا یا مولا مجھے جواب دے گا ؟ ـــــ میں ؟؟ ـــــ ڈاکو کے گھر پیدا ـــــ کیوں کیا تھا ؟ ـــــ اُس کا کیا جاتا جو مجھے کسی مولوی کے گھر پیدا کر دیتا۔ میں خواہ مخواہ ہی ساری عمر نماز روزے میں لگا رہتا ـــــ ڈاکو کا بیٹا تو ڈاکو ہی ہو گا نا ـــــ کبھی گندم کی ٹہنی پر باجرہ بھی اُگتے دیکھا ہے بابو ـــــ میں نے ایک دو دفعہ مزدوری کی کوشش بھی کی۔ مگر لوگوں نے بدمعاش جان کر اعتبار ہی نہ کیا۔•

عبدالرحمان لاجواب سا ہو کر چپکا بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا• بڑے سنگدل ہو رنگے۔ قتل تو اتنے کیے۔ مگر پیار کبھی بھی نہیں کیا۔•

رنگا ایکدم جوش میں آ گیا• تو کیا میں بالکل ہی جانور ہوں ـــــ کیا کیوں نہیں ـــــ میں بھی تو انسان ہوں ـــــ مرد ہوں ـــــ مرد ہی پیار کیا کرتے ہیں۔•

•جھوٹ : عبدالرحمان نے اُسے چھیڑا۔

رنگے نے کھرپہ ایکدم زمین میں پورا گھسیڑ دیا۔ اور زور سے ہنستے ہوئے بولا• جھوٹ بولنے والے کی ماں ـــــ•

•تو پھر بتاتے کیوں نہیں ؟• وہ بات کاٹ کر بولا

رنگا کھرپہ نکال کر کیاریاں بنانے لگا۔ پھر سر اٹھائے بغیر کانپتی آواز میں بولا• کیاریاں بنا لوں۔•

رنگے کے ہاتھ چل رہے تھے۔ کبھی بہت سُست اور کبھی بہت تیز۔ چہرے کے آثار بدلتے جا رہے تھے۔ اور سر کام میں

جُتا جاتا تھا۔ وہ کام میں مگن اور گہری سوچ میں غرق تھا۔

کام ختم ہوا تو دونوں درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ گئے۔ عبدالرحمان کے پوچھے بغیر بڈھے نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ اُس کے چہرے پر نرمی تھی اور آواز کی کرختگی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔

"چودھری مہر علی نے ایک دن مجھے بلایا اور کہا مجھے ملک معراج دین کی گھوڑی نکالنی ہے اور تھل میں جا کر چھوڑ دینی ہے ـــــ بولو کیا لوگے؟ ـــــ میں نے کہا چودھری کیوں اس سے شریکے ہو۔ بڑا جابر آدمی ہے ـــــ مگر چودھری نے کہا تو اپنے پیسوں سے مطلب رکھ ـــــ میں نے کہا چودھری کام بڑا ہے . . . . تم خود ہی دیکھ لو۔ جان کا بھی خطرہ ہے۔ جیل بھی سامنے ہے ـــــ بات چلتی رہی۔ آخر دو ہزار پر فیصلہ ہوا۔ چودھری نے ہزار اسی وقت دیا اور کہا باقی ہزار کام پورا ہونے کے بعد دوں گا ـــــ میں تیار ہو گیا۔ اُن دنوں ہر کسی کی گھوڑی کا نکل جانا بہت بدنامی کی بات تھی اور چودھری ملک کو کسی رنجش کی وجہ سے نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ ہمیں کیا ـــــ ہمیں تو اپنے مال سے غرض تھی۔

"میرا باپ اُن دنوں جیل میں تھا۔ اُسے پھانسی ہونے والی تھی۔ میں نے کہا منگے چل ذرا۔ یا تو نام بن جائے گا اور باپ چھوٹ سکے گا۔ یا پھر باپ بیٹا اکٹھے ہی چلیں گے ـــــ ماں میری بوڑھی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ ذرا جیل جا رہا ہوں، ملاقات کرنے۔ دو تین دن لگ جائیں گے ـــــ اور خود اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر سیدھا ملک معراج کی ڈھوک کو چل دیا۔

تین دن کو پہنچا۔ تاکہ گھوڑی نظر سے گزار لوں۔ کسی نے بتایا کہ گھوڑی کو گھمانے لے گئے ہیں۔ میں بھی اُسی راستہ پر چل دیا۔ دُور سے گھوڑی نظر آئی ـــــ مگر قریب گیا تو گھوڑی کو دیکھنا بھول گیا ـــــ کیا بتاؤں بابو کیا ہوا مجھے ـــــ ایمان سے وہ بلا کی چھوکری تھی جو گھوڑی کے ساتھ چل رہی تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا ـــــ خیر !! ایک نظر گھوڑی پر ڈالی اور ہزار نظریں چھوکری پر ڈالیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔ پتہ لگا کہ وہ ملک معراج کی لڑکی ہے اور آج کل ڈھوک پر آئی ہوئی ہے۔

رات کو گھوڑی کھولنے پہنچا تو دیکھا کہ ساتھ ہی چارپائی پر لڑکی بھی سوئی ہے۔ دُوسرے گھر والے ذرا ہٹ کے تھے۔ طبیعت تو بڑی بے چین ہوئی۔ مگر دل نے کہا پہلے وہ کام کر جس کی زبان دے آیا ہے۔ چنانچہ گھوڑی کا رسہ کاٹا۔ اُسے ٹھکانے لگایا۔ اگلے دن چودھری سے بقایا پیسے وصول کیے۔ اور پھر اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر سیدھا اُسی ڈھوک پر۔

اُن دنوں میری عمر ہوگی کوئی پچیس برس کی۔ بڑا گبھرو جوان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چھوکری راضی ہو جائے گی۔ چنانچہ رات پھر وہیں جا کر دبا بیٹھا۔ قسمت اچھی تھی اور وہ اکیلی وہاں تھی۔ ملک شاید گھوڑی ڈھونڈنے باہر گیا تھا۔ اور ایک دوسری چارپائی پر خالی بستر تھا . . . . . ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی اُٹھ کر گیا ہے۔ میں نے کہا چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ آگے بڑھ کر پہلے لڑکی کے مُنہ پر ہاتھ رکھا اور پھر جگایا ـــــ بے چاری نے چیخ مارنی چاہی مگر آواز کہاں سے نکلتی۔ میں نے اُسے بتایا کہ کل گھوڑی لینے آیا تھا تو وہ پسند آگئی اور اب اُسے لینے آیا ہوں ـــــ مگر وہ کشتی کرنے لگی۔ تب میں نے اُسے بازو وغیرہ دکھائے مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ جبھی اُس کے ہاتھ باندھ کر مُنہ میں رُومال ٹھونسا اور کندھے پر ڈال کر لے اُڑا۔

دس پندرہ میل دُور جا کر ایک پہاڑی غار میں اُسے بٹھایا۔ کھانے کو دیا۔ جیب سے چودھری کے دیے ہوئے ہزار روپے نکال کر

اُس کی بھولی بھالی شکل دیکھ کر وہ تو بے حد متاثر ہو رہی تھی ——— کبھی چھینیں، کبھی گالیاں، کبھی بے حال، نیچا تو میں نے
کیا ایسے ٹھیک نہیں۔ چنانچہ زبردستی اُس کے کپڑے اُتار دیے اور جب پہننے لگا تو نے واقعہ ہو گئی ——— میں نے کہا جلدی کام کر لیا۔
اس بیچ منہ سے وہ ایک لمحے بھر بے ہوش رہی۔ مگر اُس نے ایک گرنا گر کے بیچ میں دانت گاڑ دیے۔ اور زور سے کاٹا ——— قسم سے
اتنی تکلیف ہوئی کہ میں بلبلا اُٹھا۔ جھٹ ایک رام چھرا نکال کر اُس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا ——— سالی ایک دم چت ہو گئی۔
" بابو ——— مر گئی۔ پر کیا بتاؤں کیا شے تھی۔ خون نکلنا بند ہوا تو میں نے پانی سے زخم صاف کیا اور اُسے دھو کر صاف ستھرا
کر کے لٹا دیا ——— پھر جی بھر کر اُسے چھوا۔ جب دل سیر ہو گیا تو سامنے بیٹھ کر دیکھتا رہا ——— اور لگاتار دو دن اور دو رات
دیکھتا رہا۔ تیسرے دن جسم کچھ پھولنے لگا۔ تو میں نے رات کے وقت اُسے چادر میں لپیٹا اور صبح تڑکے اپنے گھر پہنچ گیا۔
" میری ماں بھی بہت کام والی تھی۔ وہ شوق سے بیٹے کے کمرے میں آنے لگی۔ تو میں نے جانی ایک لات ———
اور وہ جا گری۔ . . . . . اپنے کمرے سے باہر جا کے بیٹھ گئی ——— ٹوٹ گئی تھی پسلی اُس کی۔ میں نے بعد میں علاج تو کیا۔ مگر چند دن بعد ادھر
وہ مری اور ادھر میرا باپ پھانسی چڑھ گیا۔
" ماں تو میں نے کمرے میں ہی گاڑ دی۔ اندر سے کنڈی لگا لی۔ اپنی چارپائی ہٹا کر نیچے گڑھا کھودا ——— اُسے خوب چومنے کے بعد قبر
میں لٹا دیا اور اوپر سے مٹی ڈال دی۔ پھر میں نے کمرے کی کھڑکی توڑی اور چھلانگ لگا کر باہر گیا۔ وہاں سے چکنی مٹی اُٹھا اُٹھا کر اندر لایا۔ اور اُس
سے قبر کی جگہ ایک چبوترہ بنا لیا۔
" اُس دن کے بعد سے میں چارپائی پر کبھی نہیں سویا۔ بلکہ اُسی چبوترے پر سوتا ہوں۔ جب جیل سے چھوٹتا ہوں سیدھا وہاں جاتا ہوں
اور زندگی کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے دو چار روز تک وہیں پڑا رہتا ہوں ——— مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ میرے بازوؤں میں
ہو اور ایک سکون سا مل جاتا ہے ——— اُس دن کے بعد سے عورت میری نظروں میں نہیں رچ سکی۔"
رنگے کی آنکھوں میں ایک مستی کی سی کیفیت تھی اور وہ بالکل بے خود سا ہو کر بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے پر نرمی اور ملائمت تھی اور
آنکھوں کی لالی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی ——— عبدالرحمان چپکے سے اُٹھ کر کنوئیں کی طرف چلا گیا۔ اُس کا دل نفرت سے اُبل
رہا تھا۔ اُسے رنگے سے دہشت ہو رہی تھی ——— وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ انسانیت کے نام پر دھبہ۔ ایسے لوگوں کو جتنی سزا
دی جائے کم ہے ——— وہ کتنی دیر ایسے ہی سوچتا رہا۔ مگر کبھی کبھار اُس کے کانوں میں رنگے کی آواز گونج جاتی۔
" ڈرتا ہے ڈاکے کے گھر پیدا ——— کیوں کیا تھا ؟ اُس کا کیا جاتا جو مجھے کسی کوری کے گھر پیدا کر دیتا۔ "

کئی دن گزر گئے۔

عبدالرحمان کی مشقت آج کنوئیں پر تھی۔ وہ گدی پر بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ گول چکر کاٹتے ہوئے وہ بیلوں کے پچھلے سُموں کے
نیچے سے برآمد ہونے والے مختصر راستے کو دیکھتا جاتا جو گول پگڈنڈی کی طرح کنوئیں کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اور کبھی کبھار بیل کی دُم میں چھڑی چبھو
دیتا۔ کوئی گھنٹہ بھر کام کرنے کے بعد بیلوں کو سستانے کا موقع دیا اور خود کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں قیدی افسر ادھر آن نکلا۔

عبدالرحمان اُسے بالکل پسند نہ کرتا تھا اس لیے جب وہ قریب آ کر کھڑا ہو گیا تو بھی اُس نے کوئی توجہ نہ کی۔

"آج کوٹھڑی پر ڈیوٹی ہے۔" اُس کی آواز میں درشتی کی بجائے نرمی کا احساس کر کے عبدالرحمان قدرے حیران ہوا۔ مگر اُس نے صرف سر ہلا دیا۔

"بابو —— تم پڑھے لکھے آدمی ان سوروں میں کہاں سے آن پھنسے۔ تمہیں میں اس طرح دیکھتا ہوں تو میرا دل کڑھتا ہے۔"

نفرت کے باوجود عبدالرحمان کو اُس کی ہمدردی اچھی لگی اور وہ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہیڈ وارڈر نے کہا ہے کہ بابو کا خاص خیال رکھا کرو۔ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو قواعد وغیرہ کے چکر میں نہ ڈالو۔ بلکہ دے دیا کرو۔"

عبدالرحمان نے اُسے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا —— اُس کا چہرہ چیچک زدہ تھا۔ آنکھیں بھینگی تھیں اور لمبوترے چہرے پر نوکدار ٹھوڑی تھی —— مگر اس وقت وہ عبدالرحمان کو بُرا نہیں لگا۔

"ہیڈ وارڈر نے مجھے بولا تھا کہ اگر بابو کو بیوی سے ملاقات کرنے میں دقت ہوتی ہے تو بابو سے پوچھنا۔ اگر وہ چاہے تو اُسے باہر کوٹھڑی میں بلا لیا کرے۔"

"ہاں - ہاں ضرور۔" عبدالرحمان بولا "اگر کوٹھڑی میں انتظام ہو سکے تو بہت بہتر ہے۔" اُس نے سوچا کہ جیل کی دُنیا میں رنی نشان تو انسانیت کا بھی ملتا ہے۔

"میں اُسے بول دوں گا کہ بابو راضی ہے —— ویسے وہ آدمی بڑا اچھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تو اس پر بھی راضی ہو جائے گا کہ کبھی کبھار تم دونوں رات بھی اس کوٹھڑی میں گزار لو۔ وہاں کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

عبدالرحمان کا دل اُچھل پڑا۔ شرماتے ہوئے وہ مُسکرایا اور کہنے لگا "پُوچھ لینا اُس سے اگر وہ راضی ہو جائے تو"

نمبر۳ نے عبدالرحمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "تم فکر نہ کرو بابو۔ میں سارا انتظام کروں گا —— ہیڈ وارڈر کو منانا میرا کام ہے۔"

پھر قریب ہو کر بولا "بس تم ذرا اپنی بیوی کو سمجھا دینا۔"

"کیا؟"

"یہی یہی" وہ ہنسا "یہی کہ وہ بُرا نہ منائے۔"

"نہیں نہیں بُرا کیوں منائے گی —— ہم تو تمہارے بہت مشکور ہوں گے۔"

"نہیں —— میرا مطلب ہے کہ وہ جھگڑا نہ کرے۔ اگر کبھی کبھی ہیڈ وارڈر —— اور —— میں —— تھوڑا پیار کر لیں۔"

عبدالرحمان ایک دم جھپٹ کر اُٹھا کہ اُس کا مُنہ نوچ لے۔ مگر وہ پلٹ کر ایسا بھاگا کہ مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔

عبدالرحمان غصے سے بے دم ہو کر وہیں گھاس پر لیٹ گیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "او خدا —— میرا گناہ تو ان لوگوں

سے زیادہ تو نہیں جو دُنیا میں سب کچھ آزادی سے کر رہے ہیں ——— مجھے کیوں اتنی سزا ملی ہے؟ یہ ——— کدھر ہے تیرا انصاف۔"

پھر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اگلے دن ملاقات تھی ——— بیگماں پر نظر پڑتے ہی عبدالرحمان چلایا۔ "بیگماں تو خدا کے لیے گاؤں چلی جا ——— آئندہ نہ آیا کر یہاں"

"مگر میں کیسے جاؤں؟"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ تو بس نہ آیا کر یہاں ——— میں جو کہہ رہا ہوں ——— سیدھی گاؤں چلی جا ——— اور جب کبھی یہاں آئے کسی کو ساتھ لے کر آنا۔"

بیگماں بحث کرنے لگی تو عبدالرحمان غصے سے بولا۔ "حرامزادی ——— اگر میری بات نہیں مانے گی۔ تو میں کبھی بھی تم سے نہیں ملوں گا:"

بیگماں حیرت زدہ سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

اس کے بعد قیدی افسر سے بھی اس کی تو تکرار ہو گئی۔ ہیڈ وارڈ سے کہہ کر اس نے اپنی ڈیوٹی تبدیل کروالی تھی ——— ویسے اس دن کے بعد بیگماں بھی نہیں آئی اور عبدالرحمان کو تسلی ہو گئی کہ وہ میکے چلی گئی ہے۔

وارث خراب چپ تھا۔ پچھلے دو ہفتوں سے اس کا ماموں ملنے نہیں آیا تھا۔ اسے اپنی بہن کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔ وہ ہر روز کسی معجزے کا انتظار کرتا۔ مگر بے بس ہو جاتا۔

چند دن بعد جیل کا معائنہ تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی کمشنر جیل کمیٹی کے غیر سرکاری ممبروں کے ساتھ دیکھنے آ رہے تھے۔ سب قیدی سیلوں میں قطار باندھ کر بیٹھے تھے اور اپنے ہاتھوں میں کارڈ پکڑے تھے جن پر ان کے نام، جرم، سزا کی میعاد اور دیگر کوائف درج تھے۔ ابھی ان کے آنے میں دیر تھی اور اکا دکا قیدی اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسروں سے بات کرنے کو ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ وارث اور عبدالرحمان اکٹھے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک قیدی دوڑتے ہوئے آیا اور ان دونوں کے سروں کے درمیان اپنا سر گھسیڑ کر بولا۔

"وارث۔ کل میرا ایک ملاقاتی آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تیرے ماموں نے پارٹی کے ساتھ برات پر حملہ کیا تھا۔ اور جھگڑے میں تیرا ماموں مارا گیا ہے۔"

وارث کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس نے اور کوئی تفصیل نہیں پوچھی۔ صرف سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر بعد معائنہ کرنے والے آئے تو سپرنٹنڈنٹ نے ہیڈ کو خاص طور پر ہدایت کی کہ وارث کا طبی معائنہ کرائے کیونکہ وہ بہت زرد ہو رہا تھا ——— ہیڈ وارث کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس رات عبدالرحمان نے محسوس کیا کہ وارث بالکل نہیں سویا۔ بلکہ کروٹیں بدلتا رہا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید رات وہ پھر اس کے پاس آ کر اپنا دکھ رو دے گا مگر یہ خیال غلط نکلا۔

صبح جب کھانا لینے گئے تو وارث بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ واپس کمرے میں آکر جب تینوں نے اپنے اپنے برتن سامنے رکھے اور کھانے لگے تو وارث بولا۔

"منشی تو سچ ہی کہتا تھا۔ کہ میں رہائی کے بعد دوبارہ واپس آؤں گا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" رنگا منہ میں نوالہ ایک طرف سے دوسری طرف کرتے ہوئے بولا۔

وارث روٹی کو ہاتھ میں مسلتا ہوا مضبوط آواز میں بولا "میں نے جا کر اپنے باپ اور بہن کے خاوند کو قتل کرنا ہے۔"

"اوئے شاباش" رنگا چلایا اور زور سے وارث کی رانوں پر ہاتھ مارا "یہ بات ہوئی نا زوروں والی ——— مرد ہے تو بھی۔"

اس نے آگے بڑھ کر وارث کو ساتھ لپٹایا اور کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بولا "غم نہ کر۔ قتل کے طریقے میں بتاؤں گا۔"

وارث نے پرخلوص مسکراہٹ سے سر ہلاتے ہوئے اس نئی دوستی کا آغاز کیا۔

دو تین روز بعد کھانا لینے کے لیے باہر قطار لگی تھی کہ اتنے میں قیدی افسر ۱۳ آکر عبدالرحمان سے اگلے قیدی سے سرگوشی میں بات کرنے لگا۔ اس نے شاید عبدالرحمان کو دیکھا نہیں تھا۔ مگر جیسے جیسے عبدالرحمان اُسے دیکھتا گیا۔ اس کے دل میں غیض و غضب گھٹنے لگا۔ نمبر ۱۳ نے سرگوشی کر کے آنکھ ماری اور دونوں مسکرا دیے۔ اس پر نہ معلوم عبدالرحمان کو کنوئیں والا لمحہ شدت سے یاد آگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نمبر ۱۳ کو زور سے پکڑا اور دو چار گھونسے لگا دیے ——— قیدیوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر نمبر ۱۳ کو چھڑایا تو وہ سیدھا جیلر کے کمرے کی طرف بھاگا۔

معاملہ سب کے سامنے ہوا تھا۔ انکاری کی گنجائش نہ تھی۔ جیلر نے فقط اتنا کہا "پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں ——" اور پانچ دن کے لیے بیڑی لگانے کا حکم دے دیا۔ عبدالرحمان نے کوئی صفائی پیش نہ کی ——— گھونسے مار کر اس کے دل کو بہت اطمینان ہو گیا تھا۔

آسمان کی مستطیل میں چاند چمک رہا تھا۔ اس کی روشنی سیدھی عبدالرحمان پر پڑتی۔ اور بیڑیوں کے بعض حصے چمک رہے تھے۔ لوہے کے کڑے اور سلاخیں اس کو جگہ جگہ چبھ رہی تھیں۔ پاؤں کے گرد ٹخنے ابھی سے چھل چکے تھے۔ وہ جس کروٹ بھی بیٹھتا۔ رانوں کے گرد کے حصے چھبنے لگ جاتے۔ وہ کبھی لیٹ جاتا۔ کبھی بیٹھ جاتا۔ بالآخر اس نے کمبل تہ کر کے دیوار کے ساتھ رکھا اور اس سے ٹیک لگا کر چاند دیکھنے لگا۔

..... نہ معلوم اسے کالج کے زمانے میں پڑھا ہوا شیکسپیئر کا فقرہ کیوں یاد آنے لگا۔ کہ جس طرح شریر بچے کیڑوں کو مار کر کھیلتے ہیں۔ اسی طرح دیوتا انسان سے کھیلنے میں مزہ لیتے ہیں۔

وہ سوچنے لگا کہ ہم واقعی خدا کے کھلونے ہیں۔ دنیا بالکل کھلونوں کی دکان ہے۔ جس میں بعض کھلونوں کو خوبصورت رنگ دے کر چمک دار کپڑے پہنا کر اونچی جگہ پر سجا دیا گیا ہے اور دوسروں کے نہ تو رنگ بہتر کیے ہیں نہ چہرے پر چمک ہے۔ بعض کا کام صرف قلابازیاں لگانا ہے۔ بعض کی قوت صرف اتنی ہے کہ ہاتھ ہلا سکیں یا آنکھیں مٹکا سکیں۔ یا ٹانگیں چلا سکیں ——— دکاندار جب چاہتا ہے۔ ایک کھلونے کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا رکھ دیتا ہے ——— ان کی اپنی قوت عمل کوئی نہیں۔ وہ فقط اس انتظار میں ہیں

کر کوئی اوپر سے آ کر کھیلے۔ اسی طرح ہم سے بھی حالات کھیلتے ہیں۔ کبھی معاشرے کی اقدار کھیلتی ہیں۔ کبھی مذہب کھیلتا ہے اور کبھی خود ہماری طبیعت اور فطرت ہم سے کھیلتی ہے ــــــ حالات ہمیں چابی دے کر کسی طرف رُخ کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ انھوں نے صاف راستہ چُنا تو ہم بے روک ٹوک نکل گئے۔ ورنہ کسی رکاوٹ سے ٹکرا کر اُلٹ جاتے ہیں اور ہوا میں ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے اپنی چابی ختم کر دیتے ہیں کبھی سینوں سے بھینچ لیے گئے۔ کبھی نظر انداز ہو گئے اور کبھی تو زنگ کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے ــــــ وارث بھی کھلونا تھا، اُس کی پیدائش سے پہلے کے حالات اُس سے کھیلتے ہیں اور پھر جیل کے قیام میں باہر کے حالات کھیلتے ہیں ــــــ رنگا اپنی پیدائش کے حادثے کو جھیلنے سے قاصر ہے اور جس ماحول میں پیدا ہوا اُس کا کھلونا ہو گیا ــــــ خود مجھ سے قسمت کھیلتی رہی ہے۔ میری رضامندی کے بغیر گھسیٹ کر مجھے نکالا اور عجیب غریب حالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اگر اللہ رکھے کی جان چاہیے تھی تو کوٹھے سے گرا کر مار دیتا ــــــ چھوڑا نکالنا کیا ضروری تھا۔ مگر وہ تو مجھ سے کھیلنا چاہتا تھا ــــــ یہ سب قیدی دانستہ جرم کرنے کے لیے جیل میں ڈالے گئے۔ بعض حالات کے کھلونے ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ فلسفی سپائی نوزا (Spinoza) کہتا تھا کہ اگر ایک اینٹ کو ہوا میں اُچھال دیا جائے اور گرتے وقت اُس سے پوچھا جائے کہ تم کیا کر رہی ہو تو وہ یہی کہے گی کہ میں اپنی مرضی سے گر رہی ہوں حالانکہ اُسے زمین کی کشش کھینچ رہی ہے ــــــ اسی طرح ہم جو کچھ بھی ہیں اور جہاں بھی ہیں۔ اُن حالات کی وجہ سے ہیں جن پر ہمارا کوئی قابو نہیں ــــــ ہم محض خدا کے کھلونے ہیں جو اسباب اور نتائج کے لامحدود گورکھ دھندے سے ہمارے اندر مخصوص ذہنی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور ہم ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں جو ہماری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن دراصل ہماری نہیں ہے۔۔۔۔۔۔

چاند سلاخوں میں اپنی جگہ سے سرکتا رہا۔ سیل کی چھت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی اور عبدالرحمان بیٹھا سوچتا رہا۔

ڈیڑھ سال گزر گیا۔

سڑک پر صبح کی دھوپ بہت پھیلی تھی۔ خوانچے والے اپنے اپنے خوانچوں میں چیزیں سجائے بیٹھے تھے۔ لوگ اُجلے چہروں سے دفتروں اور سکولوں کو جا رہے تھے۔ سڑک پر سائیکلوں کا ریلا تھا۔ فٹ پاتھ پہ پیدل لوگوں کا رش تھا۔ اور دُنیا بغیر کسی تبدیلی کے رواں تھی۔

مگر عبدالرحمان ہر ایک چیز کو دیکھ کر عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ ہر شے ایسے ہی تھی جیسی ہونا چاہیے تھی۔ مگر پھر بھی وہ چونکا سا ہر چیز کو دیکھتا۔ متعجب، حیران ہو کر کہ یہ ابھی تک ویسا ہی ہے۔ وہ جیل کے باہر کی دُنیا کو اپنے پرانے اور اصل روپ میں دیکھنے کا متوقع تھا۔ مگر توقع کے عین مطابق دیکھ کر اُسے اچنبھا، حیرانی اور ایک بے نام سی خوشی گھیر لیتی ــــــ جب وہ مین بازار میں پہنچا تو سبزی والا مولوی بالکل پہلے کی طرح سبزی کا نرخ دیے گاہکوں کی بھیڑ میں گھرا تھا۔ گلی کے کنارے پانی کے نل پر بالکل اُسی طرح بالٹیاں اور گھڑے پڑے تھے۔ بجلی کے چار کھمبوں کے بیچ والے میں حجام اپنی دری بچھائے حسبِ معمول کسی کا شیو کر رہا تھا اور چہرے پر سفید صابن میں ایک آدھ خون کا قطرہ بھی تھا۔ اور جب وہ چوڑی گلی میں مڑا تو پان والے کی دکان پر ریڈیو سیلون کے گانے کی آواز ویسی ہی تھی۔ اور جو دو چار جوان لڑکے دھوتیاں اُٹھائے اُسی طرح پھسکڑے مار کر پھٹے پر بیٹھے تھے۔

"ارے اِس عرصہ میں تو کچھ بھی نہیں بدلا" اُس نے بڑے ہی ملے جُلے جذبات کے ہجوم میں سوچا۔

گلی میں مکانوں کی لمبی دو رویہ قطاروں میں سامنے ایک مسجد کے میناروں پر صُبح کی سُنہری دھوپ پڑ رہی تھی اور اُن کی آدھی گولائی سنہری ہو رہی تھی۔ دُوسرے آدھے حصّے پر ٹھنڈا پُرسکون سایہ تھا۔ جیسے جیسے وہ مسجد کی جانب چل رہا تھا۔ اُس کے دل میں ہچکچاہٹ ابھرے ...ادے سر اُٹھانے لگے۔ گردن گھما کر اُس نے اپنے کپڑوں کو دیکھا ——— وہ صاف نہ تھے اور شاید پاک بھی نہ ہوں۔ مگر کیا حرج ہے ...میں تو فقط دُنیا میں دُوسری دفعہ داخل ہونے سے پہلے خُدا سے دُعا مانگنا چاہتا ہُوں کہ وُہ صاف سُتھری اور نیک زندگی بسر کرنے میں میری ...مدد کرے۔ کپڑے اگر خراب ہیں تو کیا ہوا۔ میری نیّت تو صاف ہے۔ ایک دفعہ اپنے گھر میں داخل ہونے کے بعد دُعا مانگنے میں وُہ ...بات نہیں۔

مسجد کے دروازے پر جُوتا اُتار کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ بڑے صدقِ دل سے وضو کیا۔ صبح کی نماز کے دو سنّت اور دو فرض پڑھنے ...کے بعد کچھ دیر دُرود شریف پڑھا۔ پھر دو نفل پڑھے اور سجدے میں گر کر بڑے ہی عجز و انکسار سے دعا مانگی کہ خدا اُس کی مدد کرے۔ دُنیا کی ...سے چینی کا مقابلہ کرنے کی ہمت دے۔ مُشکل آزمائش سے بچائے۔ نیکی کی ہدایت اور توفیق عطا کرے اور ایمان مضبوط کرے۔

مسجد سے نکلا تو اُس کا دل بڑا ہلکا تھا۔ خراماں خراماں چلتا جب وہ اپنی گلی میں مُڑا تو اُس کا دل مُنہ کو آنے لگا۔ بیگماں ضرور گاؤں ...سے آگئی ہوگی۔ میں نے پچھلے ہفتے اُس کو جیل سے خط لکھا تھا کہ میں آج آرہا ہُوں اور وہ گاؤں سے واپس آجائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ...گلے مل جائے گی۔ آنسوؤں سے میرا کندھا بھگو دے گی۔ پھر گلے شکوے کرے گی کہ میں نے اُس کو مشکلات میں ڈال دیا۔ اور میں ہنس کر کہوں ...ا بھا بیگی میں سیدھے راستے سے بھٹکا تو مجھے کتنی سخت سزا ملی۔ اب مجھے پہلے کی طرح ہرگز مجبور نہ کرنا کہ میں دُوسرے لوگوں کی طرح رشوت لوں۔ ...اور ہر وقت میری حیثیت کے لوگوں کی مثالیں دینا کہ اُن کے پاس مجھ سے زیادہ روپیہ ہے اور وہ ٹھاٹھ سے رہتے ہیں اور وہ میری آنکھوں ...میں جھانک کر کہے گی کہ میں سب سمجھ گئی ہُوں۔ یہ ہمارے بس کا روگ نہیں۔ میرے لیے تو جو کچھ ہو۔ تم ہی ہو۔ تم آگئے تو ——— مجھے اب ...کچھ نہیں چاہیے۔ تمھارے ساتھ مجھے ہر قسم کی روکھی سوکھی پسند ہے اور میں اُسے لپٹا لوں گا .....

اُس نے دیکھا وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا ——— گھر وہاں سیڑھیوں پر ایک نوکر کسی بچے کو لے کر بیٹھا تھا۔ پُوچھنے پر پتہ چلا ...وہاں کوئی اور رہتا ہے۔ چند لمحے توقف کرکے اُس نے سوچا کہ پارو کی ماں کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

پارو کی ماں نے جیسے ہی اُسے دیکھا وہ پلّو مُنہ پر ڈالے پردے میں سے جھانکنے لگی۔

"ہائے بھرا جی۔ آپ کب آئے؟"

"بس ابھی سیدھا واپس آرہا ہُوں۔"

"ہائے بڑی خوشی ہوئی دیکھ کر آپ کو۔ پارو کے ابّا تو گھر میں ہی نہیں ——— اری پارو جاؤ ذرا بھاگ کر بازار سے شربت ...لے آ۔"

مگر عبدالرحمان نے منع کر دیا کہ مجھے پیاس نہیں۔ دراصل وہ بیگماں سے ملنے کے لیے بے کل ہو رہا تھا۔ مگر پارو کی ماں حسبِ معمول ...اپنی کے لگاتار سلسلے میں مصروف تھی۔ جس میں اُس کی غیر حاضری میں پاس پڑوس کی خبریں تھیں۔ مع اُن شوشوں کے جو وہ اُن واقعات میں شامل

کر دیتی رہی تھی۔ ایک دفعہ جب وقت تھا تو عبدالرحمان نے بالآخر سیدھا سوال کر ڈالا۔

"بیگماں نہیں آئی گاؤں سے؟"

"بھرا جی۔ صحت تو اچھی رہی آپ کی ——— اپنے کتنے دُبلے ہو گئے ہیں۔ ورنہ پہلے تو ماشاء اللہ کے فضل سے اچھے تھے آپ۔"

عبدالرحمان نے جیوں ہاں کر دی۔ اور دل میں سمجھا کہ اس نے بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ چند منٹ کے بعد اس نے پھر کہا کہ اب گھر جاکر بتاؤں گا۔ مگر وہ بات ٹال گئی۔ عبدالرحمان نے سمجھا شاید میرے بعد ان کے تعلقات بگڑ گئے تھے۔ مگر جب اس کی باتیں جاری رہیں تو وہ بولا "جیل میں بیگماں جب بھی میرے پاس آئی۔ آپ کی بہت تعریف کی۔ کہ آپ نے اس کا بہت خیال رکھا۔ ورنہ اکیلی عورت کا گذر تو بہت مشکل ہوتا ہے۔"

پارو کی ماں خاموش ہو گئی۔ پھر بولی "اچھا تو جیل میں اکثر جاتی رہتی تھی آپ کے پاس۔"

"ہاں شروع میں تو باقاعدہ آتی تھی۔ مگر بعد میں میں نے منع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اب تم گاؤں چلی جاؤ۔"

پارو کی ماں نے پھر خاموشی سادھ لی۔

عبدالرحمان نے تھوڑا انتظار کیا۔ پھر بولا "اب میں چلتا ہوں۔"

"کہاں جائیں گے بھرا جی؟"

"معلوم ہوتا ہے۔ بیگماں یہاں نہیں پہنچی۔ اب اسٹیشن چلتا ہوں اور وہاں سے گاؤں جاؤں گا۔" اس نے کریدنے کی آخری کوشش کی۔

"بھرا جی ——— گاؤں جاکر کیا کرو گے؟"

"کیوں؟"

پارو کی ماں پر ایک تکلیف دہ خاموشی طاری ہو گئی جیسے بات کرنے سے ہچکچا رہی ہو۔

"کیا بات ہے؟؟" وہ بولا۔

"وہ جنم جلی گاؤں گئی ہو تو آپ جائیں نا۔"

"کیوں، کہاں گئی؟" عبدالرحمان حیران رہ گیا۔

وہ بڑے بجھے لہجے میں بولی "اس نے عاشق سے شادی کر لی ہے۔"

عبدالرحمان ایک دم تڑپ گیا "کیا کہا؟"

مگر وہ خاموش رہی۔

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے ——— میں نہیں مانتا۔" اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔

"اب تو آپ ہی کچھ حوصلہ کریں بھرا جی۔" اس نے [illegible] کر دیا۔

عبدالرحمان بالکل سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ پارو کی ماں نے اس عرصہ میں خواہ مخواہ پردے کو درست کیا۔ اپنے چہرے کا پسینہ

دفعہ ٹھیک کیا۔ وہ ایک دفعہ پھر جبے اور کنکھیوں سے عبدالرحمان کو دیکھتی رہی۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے ششدر کھڑا رہا۔

"مگر یہ ہوا کیسے؟"

پارو کی ماں کا جیسے بند ٹوٹ گیا "ہونا تو تھا ہی۔ اُس نے میری بات جو نہ مانی۔ میں نے بہت سمجھایا تھا کہ میری سُن لیتی تو کیوں یہ ظلم ہوتی۔ عاقل تو ایک چالباز ہے۔ پہلے دو تین روز تو کنگھی کے بھاؤ بتانے آتا رہا۔ پھر ایک دن آکر اُسے اڑھائی سو روپے دے دیے کہ گروی رکھ دی ہے۔ اس کے بعد ہفتہ دس دن بعد چکر لگانے لگا ——— بڑی خیر خواہی جتاتا تھا کہ عبدالرحمان تو خواہ مخواہ مجھ سے ناراض ہے۔ مگر میں تو دوستی کا حق نہیں بھولا۔ اس لیے آپ کو کوئی تکلیف ہو کرے تو مجھے بتایا کریں۔ جب آتا فروٹ اور مٹھائی لے کر آتا۔ میں نے بیگماں سے بہت کہا کہ اسے مُنہ نہ لگائے۔ اُس نے بھی کئی دفعہ بے رُخی دکھائی۔ مگر وہ تو بس چمگادڑ کی طرح چمٹا ہی رہا۔ حتیٰ کہ مجھے اصل بات کا تب پتہ چلا جب اس کے گھر سے مولوی کی آواز سُنی جو نکاح کا خطبہ پڑھ رہا تھا۔"

عبدالرحمان بُت بنا کھڑا تھا۔ پارو کی ماں ابھی تک کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو میری بیوی ہے اور بغیر طلاق کے دُوسرا نکاح کیسے کر سکتی ہے۔"

"یہی تو میرا جی میں نے اُس سے پوچھا تھا۔ وہ تو چُپ کر گئی تھی۔ مگر مجھے لوگوں نے بتایا کہ مولوی صاحب کے سامنے اُنھوں نے طلاق نامہ پیش کیا تھا جس پر آپ کے دستخط تھے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ یہ غلط ہے۔"

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ عاقل کے لیے جعلی طلاق نامہ بنانا کون سا مشکل کام ہے۔"

عبدالرحمان غُصّے سے کانپنے لگا "میں اس حرامزادے کو اس دھوکہ بازی کے لیے جیل بھجواؤں گا۔ یہ سراسر دھوکہ ہے ——— میں ابھی عدالت میں جاکر استغاثہ پیش کرتا ہوں۔ . . . ."

"ذرا حوصلہ کرو۔ میرا جی۔ جو بات ہونی تھی ہوگئی۔ اب کیوں اپنا جی جلاتے ہو۔ خواہ مخواہ عدالت میں جاکر پیسے برباد کروگے جب بیگماں ہی راضی نہیں ہے۔"

اُس نے تھوڑا سوچا۔ پھر بڑے ہی زخمی انداز میں پُوچھنے لگا "کیوں وہاں وہ زیادہ خوش ہے کیا؟"

"لو میرا جی۔ وہ تو خوشی سے دیوانی ہو رہی ہے ——— اور خوش کیسے نہ ہو۔ دونوں بازوؤں میں سونے کی بارہ بارہ چوڑیاں ہیں۔ دو تولے کے کنگن علیحدہ ہیں۔ گلے میں بھی زیور ہی زیور۔ وہ تو سونے سے پیلی ہو رہی ہے۔ ٹیکسی یا کار کے بغیر ایک دم نہیں چلتی ——— جس چیز پر اُنگلی رکھتی ہے۔ عاقل دو منٹ میں خرید دیتا ہے ——— مجھے کہہ رہی تھی پارو کی ماں۔ زندگی کا مزہ بس اب ہی ملا ہے۔ پہلے تو صرف خواری تھی۔ وہ تو خالی پیٹ سے اصولوں کے پکڑ دیتا خود جیل میں جا بیٹھا اور میری جوانی کو یہاں زنگ لگتا چھوڑ گیا۔"

عبدالرحمان کا چہرہ اُتر گیا۔ اُسے ایسے لگا جیسے بھرے بازار میں ننگا کر دیا گیا ہو۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"پارو کی ماں۔ تم اُسے چند گھڑی کے لیے مجھ سے ملا سکتی ہو۔"

"بھرا جی۔ وہ تو اب ہم لوگوں سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی۔ کہا اب بے عزتی کرانے جا رہا ہوں۔"

مگر عبدالرحمان نے اصرار کیا تو وہ برقعہ پہن کر چلی اُدھر۔ وہ اُس کے گھر کے سامنے بے چینی سے ٹہلتا ہوا انتظار کرنے لگا۔ اُس کے گھٹنے کانپ رہے تھے اور سارے جسم پر ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ایک ایک گھڑی بھاری ہو رہی تھی اور وہ بہت سوچنے کی کوشش کرتا رہا مگر اُسے پتہ نہ تھا کہ کیا کرے۔ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

اتنے میں پارو کی ماں آئی تو اُس نے سر ہلا کر بالکل ہی حوصلہ توڑ دیا۔ جب عبدالرحمان نے زیادہ پوچھا تو کہنے لگی "وہ تو سو سو بہانے بناتی ہے۔ کبھی کہتی ہے طبیعت ٹھیک نہیں۔ کبھی کہتی ہے ماموں کو پتہ چل جائے گا ——— بھرا جی چھوڑ دو اسے تم۔ وہ تمہارے قابل شے نہیں۔"

عبدالرحمان تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر خاموشی سے چل دیا۔

"اب کیا کرو گے بھرا جی؟" پارو کی ماں کا تجسس عود کر آیا۔

اُس نے ہاتھ ہلایا۔ "کیا پتہ ——— اللہ کو کیا منظور ہے ——— میرے کرنے کے لیے اب رہا ہی کیا ہے۔"

پارو کی ماں عبدالرحمان کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی ——— سر کی پشت سے نیچے جھکی سی گردن جس میں کوئی اعتماد نہیں ——— بلکہ پریشانی اور صدمے سے کپکپاتی ہوئی ——— پیٹھ پر بے چارگی ——— کمر میں تناؤ کا نام نہیں ——— ناہموار قدموں میں پاؤں کی ایڑی اینٹ روڑوں سے ٹکراتی ہوئی اور سیدھا چلنے کی بجائے پاؤں کبھی دائیں پڑتا۔ کبھی بائیں ——— موڑ مڑنے لگا تو کندھا جھول کر کھمبے سے جا ٹکرایا۔

پارو کی ماں کی آنکھیں بھر آئیں اور اندر کو مڑتے ہوئے وہ بڑبڑائی "اللہ کرے بیگماں۔ تجھے بھی وہاں سکون نہ ملے۔" اندر جا کر اُس نے اپنے نواسے کو زور سے سینے پر بھینچا اور اُس کی میلی قمیص اُتار کر خوب مل مل کر دھونے لگی۔

روانگی کے وقت جیسے نے اپنی گہری آنکھوں سے عبدالرحمان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ اب واپس جا کر بُرے کاموں سے بچنا۔ اُس نے بڑی صاف دلی سے وعدہ کیا تھا اور اسی لیے مسجد میں جا کر دُعا بھی مانگی تھی۔ مگر اُس نے چلتے وقت کہا تھا کہ بابو جانتے ہو۔ کمال اس گھر سے جانے والوں کو دُنیا میں سکون نہیں ملتا۔ وہ لوگ ہم لوگوں کو جینے نہیں دیتے۔ عبدالرحمان اُس کی بات کو اہمیت دیے بغیر ہاتھ ملا کر چلا آیا تھا۔ مرشد نے ہاتھ ملاتے ہوئے مغموم آواز میں کہا تھا "بابو میرے لیے تو اب دوبارہ یہاں آ کر ساری زندگی گزارنا مقدر ہو گیا ہے مگر..... تم کبھی نہ آنا ——— پھر وہ اُس سے لپٹ گیا تھا۔

سڑک پر چلتے چلتے عبدالرحمان سوچ رہا تھا کہ کیا میرے پاس اتنی خود مختاری ہے کہ ان میں سے کسی بھی شعبے پر عمل کر سکوں ——— میرے آئندہ پروگرام میں میرے اپنے ارادے کا کیا دخل رہا ہے؟ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میرا اگلا پروگرام ہے کیا؟؟

وہ سارا دن گلیوں اور بازاروں میں بے مقصد گھومتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کرے ——— وہ اُن دکانوں کے سامنے سے گزرا جہاں بیگماں نے سرگوشیوں میں۔ میٹھے میٹھے انداز میں۔ شرماتے ہوئے اُس سے مختلف چیزوں کی فرمائش کی تھی۔ اُس سڑک پر سے گزرا جس پر

وہ بیگماں کے ساتھ گڈو کی پیدائش کے بعد ہسپتال سے واپس آیا تھا ——— چلتے چلتے گھومتے گھومتے اُس نے کتنی ہی حسین یادوں کو اپنے ذہن میں دُہرایا۔ جو بند کمروں میں اُس کے بیگماں کے درمیان محفوظ تھیں اور جن کا کوئی گواہ نہ تھا ——— مسلسل چھ سال وہ اُس کی بیوی رہی تھی۔

باجوں کی آواز سے بازار گونجنے لگا۔ وہ ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کالی پتلونوں اور لال کوٹوں والے اپنی پگڑیوں پر جھالر جھلاتے باجے بجاتے دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے۔ اُن کے پیچھے دُولہا کا گھوڑا۔ ساتھ دوست یار ہنسی مذاق کرتے ہوئے اور اُجلے دُھلے دُھلائے براتی لاپرواہی سے چلتے ہوئے ——— کوٹھوں سے عورتیں دیکھ رہی تھیں۔ گلیوں کے بچے کھیل چھوڑ کر بارات دیکھنے جا رہے تھے۔ دُکاندار ترازو رکھ کر گردنیں اُٹھا اُٹھا کر نظارہ کرنے لگے۔ اور گاہک واپس ملنے والی ریزگاری گننا بھول گئے۔

عبدالرحمان ساکت و جامد دم سادھے دیکھتا رہا۔ ذہن میں یادوں کے دھوئیں بھرنے لگے۔ بارات چلی گئی اور وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا ——— حتیٰ کہ کوئی پکارا "ہٹ کے بابو!!" ٹھیلے پر لکڑیاں لادے جھکے ایک مزدور راستہ مانگ رہا تھا ——— وہ سرد آہ بھر کر آگے چل دیا۔

دن بھر گھومنے کے بعد وہ بھوکا پیاسا کمیٹی کے باغ میں بجلی کے کھمبے کے پاس بنچ پر بیٹھ گیا ——— "او خدا! تو کیوں نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ اگر دُنیا میں ہر طرف بُرے لوگ پھلتے پھولتے ہیں ——— جو کچھ میں نے کیا اُس سے کئی ہزار گنا جرائم اور گناہ عاقل نے کیے ہیں۔ مگر وہ اس وقت میری اپنی بیوی کے ساتھ عیش کر رہا ہے اور میں در بدر خانماں دھکے کھا رہا ہوں ——— کیا تیرا قہر صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو تجھ سے ڈرتے ہیں؟؟ ——— یہ تیرا انتظام کیا ہے؟؟؟"

لیمپ کے گرد بھنورا بھوں بھوں چکر کاٹ رہا تھا۔ کسی وقت دم لینے کو بیٹھتا تو ایک چھپکلی کھمبے پر دبے پاؤں آگے بڑھتی۔ بھنورا پھر اُڑ جاتا اور وہ پھر دبک جاتی۔ ایک دفعہ چکر کاٹنے میں بھنورا بالکل اُس کے پاس سے گزرا۔ چھپکلی نے جھپٹ کر سر اُٹھایا اور اُسے مُنہ میں دبوچ لیا۔ مگر ساتھ ہی اُس کے اپنے قدم اُکھڑ گئے اور وہ فضا میں اُلٹ کر گری۔ نیچے باڑ کی خاردار تاریں لگی تھیں۔ وہ سیدھی ایک کانٹے میں پرو دی گئی اور بھنورا اُس کے مُردہ مُنہ میں تڑپتا ہوا ٹھنڈا ہو گیا۔

اس دُنیا میں کوئی آزاد بھی ہے؟؟ ایک نظم چلنے پر ہر طرف تخریب جاری ہے۔ اُس نے سوچا اور بنچ پر لیٹ گیا ——— ساری رات کروٹیں بدلتے بدلتے اُس نے فیصلہ کیا کہ کل دن کے وقت بیگماں کو گھر جا کر ملے شاید وہ راضی ہو جائے۔

اگلے دن صبح ہی صبح وہ اُس کے گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک محفوظ جگہ میں بیٹھ گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد عاقل نکلا اور دفتر کو چلا گیا۔

"شاید اور بھی کوئی گھر میں ہو" ——— وہ انتظار کرتا رہا۔ پڑوس میں سے ایک لڑکا گھر میں داخل ہوا اور دس پندرہ منٹ کے بعد وہ بھی باہر آ گیا ——— مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ اُس نے سوچا کہ اب وقت ہے اور اُٹھ کر چلا۔ مگر اُس کی نظر ایک بھکشو پر پڑ گئی۔ جو ایک مکان سے نکل کر دُوسرے میں گھس رہی تھی اور وہ ایک دم رُک گیا "ابھی وہ اس گھر میں بھی تو آئے گی" اور وہ دبک گیا۔ بھکشو واقعی کچھ دیر بعد عاقل کے گھر میں گھسی اور عبدالرحمان کو گھنٹہ بھر اور انتظار کرنا پڑا۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی ——— مگر کچھ سوچ کر پھر کھول دی کہ شاید جانا پڑے۔ گھر میں اندھیرا ہو چکا تھا۔

وہ ڈیوڑھی سے آگے بڑھا۔ سامنے کمرے میں ایک عورت کی پیٹھ دکھائی دی۔ جو فریج کھول کر اندر سے کچھ نکال رہی تھی۔ وہ چپکے چپکے آگے بڑھا اور دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

اس نے فریج بند کیا۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں انڈیلی۔ جس میں پہلے ہی شربت بنا تھا اور گلاس ہاتھ میں پکڑے واپس مڑی۔

بیگماں کا منہ ایک دم کھلا رہ گیا۔ گلاس اُس کے ہاتھ سے گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور شربت سارے فرش پر پھیل گیا۔

دونوں بالکل خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

بیگماں کا رنگ سرخ تھا۔ چہرہ اور جسم بھر گیا تھا اور وہ بشاش نظر آتی تھی ——— عبدالرحمان سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ الجھے بال، بڑھی ہوئی داڑھی سے اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

جذبات کے ہجوم اُس کے گلے تک آنے لگے۔ دو چار دفعہ اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر آواز گلے سے نہ نکلی۔ صرف گھونٹ نگل کر رہ گیا۔ بغیر پلک جھپکے وہ سیدھی تیز نظروں سے بیگماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی ٹکٹکی باندھے تھی۔ ایک آدھ دفعہ اُس کے ابرو ہلے۔ چہرے نے فق ہونے کے بعد تھوڑا رنگ بدلا اور پھر پیلا پڑ گیا۔

بالآخر عبدالرحمان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر اس کی مرضی کے خلاف یہ الفاظ نکلے۔

"بیگماں تم نے یہ کیا کر دیا ———"

وہ ہاتھ پھیلا کر ایک قدم آگے بڑھا۔ مگر عورت نے پیچھے ہٹ کر فریج کا سہارا لیا اور عبدالرحمان وہیں زمین پر بے اختیار گر گیا ——— وہ بھی ٹکٹکی باندھے عورت کو دیکھ رہا تھا۔ صبح سے اس نے کتنی ہی باتیں سوچی تھیں۔ ڈرانے دھمکانے کے کئی منصوبے بنائے تھے۔ مگر اس وقت بیگماں کی سیدھی نظر، فق چہرے اور اس کے اپنے اندر کے جذباتی بھونچال سے سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ بھکاریوں کے انداز میں بیٹھے دیکھ کر بیگماں کے چہرے کی پیلاہٹ اُڑتے ہوئے بادل کی طرح غائب ہونے لگی۔ غالباً اس کا ڈر دور ہوا، مگر عبدالرحمان یہ سب کچھ محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ خوشامد سے بولا۔

"آؤ بیگماں ہم ابھی نکل چلیں یہاں سے ——— میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔"

بیگماں کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا ——— یہ آدمی کوئی نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ——— سہمی ہوئی عورت کا نقاب ہٹا اور اندر سے اصل بیگماں برآمد ہونے لگی۔ مگر اس نے ابھی کچھ نہیں کہا۔

"بیگماں!" عبدالرحمان چلایا ——— دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگا۔ ان تمام لمحات کا تناؤ اس کے منتشر اعصاب کی برداشت سے باہر تھا۔

بیگماں آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اس نے عبدالرحمان کے سر پر ہاتھ رکھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی "تم ابھی سے گھبرا گئے،

اب تو جو ہونا تھا، سو ہو چکا۔"

عبدالرحمان نے اُس ہاتھ کو تھاما۔ اپنی گیلی آنکھوں سے لگایا اور نفی میں سر ہلا کر کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔
بیگماں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ عبدالرحمان نے قمیص کے پلو سے آنسو صاف کیے اور سسکی دباتے ہوئے بولا۔

"بیگی!!"

—— عورت کے آنسو مرد کو بے بس کر دیتے ہیں۔ وہ دُنیا کی ہر چیز قبول کرنے سے راضی کرنا چاہتا ہے۔ مگر مرد کے آنسو کا عورت [پر] اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو فاتح سمجھ کر اس کی انا اور پندار مست سانپ کی طرح سر اُٹھانے لگتے ہیں۔ جنس کی دُنیا میں وہ مطلوب ہے۔ جب کے آنسو مطلوب کو اپنی بے پناہ اہمیت کا احساس دلا دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو انمول سمجھنے لگتی ہے۔ اُس وقت جب وہ بھیگی بھیگی [آنکھوں] میں ڈوبی ہوئی مرد کی آنکھیں بیگماں کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں تو اُس پر غرور اور فخر اُبھرنے لگے۔ بیگماں کرسی گھسیٹ کر اُس پر بیٹھ گئی [اور بڑی بے نیازی] سے مرد کو دیکھنے لگی جو اُس کے قدموں کے پاس فرش پر گھٹنے ٹیکے کھڑا تھا۔

"بیگی۔ تم سوچو تو کیا کر رہی ہو؟؟"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی "چھ سال پہلے سوچتی رہی ہوں۔ ڈیڑھ سال اب سوچا ہے۔ اب اور کیا سوچوں" اُس کی [آواز] اب بالکل لرزش نہ تھی بلکہ صاف اور واضح تھی۔ جس میں درشتی کا رنگ غالب تھا۔

"مگر میں نے تمہیں کیا دُکھ دیا تھا" وہ خوشامد سے بولا۔

"اور سکھ کون سا دیا تھا؟" وہ نفرت سے بولی۔

اُس کے گلے میں غصّہ پھانس سا آیا مگر اُس نے ضبط کیا۔

"جو کچھ میں تمہارے لیے کر سکتا تھا۔ میں نے کیا۔"

"کیا ہوگا" وہ طنز سے بولی "مگر اب میرے لیے وہ زندگی دوبارہ اختیار کرنا مشکل ہے۔"

"کیوں؟؟"

جواب دینے کی بجائے بیگماں نے کندھے اُچکائے اور ٹوٹے ہوئے گلاس کے اُس ٹکڑے کو دیکھنے لگی جو پر عبدالرحمان کا گوشت کا [ٹکڑا] اور اس میں سے لہو رس رہا تھا۔ مگر عبدالرحمان کو پتہ بھی نہ تھا۔ وہ بھی کچھ نہ بولی۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر وہ بڑے درد سے بولا۔

"بیگی! تم میرے ساتھ سوئی ہو۔ میں نے بچوں کی طرح تمہیں اپنی گود میں اٹھایا ہے —— مگر اب میں اتنی دیر سے تمہارے قدموں [میں] بیٹھا ہوں اور تم نے مجھے اتنا نہیں کہا کہ اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

فقرہ ختم کرتے کرتے اُس کی آواز غصّے سے کانپنے لگی۔

بیگماں نے اسے غور سے دیکھا "میں نے تمہیں کب کہا تھا آنے کے لیے؟"

اور وہ اُٹھ کر باہر جانے لگی۔

عبدالرحمان کے دل میں جیسے نشتر سا تیر لگا۔ بے عزتی اور شرم کے احساس سے اس کا گلا بند ہونے لگا۔ مگر پھر بھی اس نے لپک کر بازو پکڑا۔

بیگماں بازو چھڑاتے ہوئے ڈپٹ کر بولی "چھوڑو مجھے"۔

اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی ـــــ وہ اس بازو کو پہلے بھی کئی دفعہ پکڑ چکا تھا۔ مگر آج وہ پہلے کی نسبت بہت سڈول اور چکنا لگ رہا تھا۔ اس میں پر اسرار جنسی طاقت تھی اور وہ ایک زندہ سانپ سا تھا۔ اس کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

بیگماں کی ہنسی سنائی دی اور پھر آواز:

"یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔"

اس کے جسم کا تار تار غصے اور نفرت سے جھنجھنا اٹھا۔ ـــــ ایک لڑکی کو قابو کرنے کے لیے اس نے اپنا سب کچھ بیچا، رشوت لی، جیل گیا، زندگی تباہ کی اور اب وہ کہتی ہے کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔

اس نے زخمی درندے کی طرح سر اٹھایا۔۔۔۔

۔۔۔۔ بیگماں طنز بھری مسکراہٹ سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حقارت اور تمسخر تھا۔ جیسے کسی بہت ہی گری ہوئی معمولی اور حقیر شے کو دیکھ رہی ہو۔ عبدالرحمان دیکھتا رہا۔ مگر ان آنکھوں کے تاثرات ویسے ہی رہے۔۔۔۔ غصے سے ایکدم پاگل ہو کر اس نے دونوں ہاتھوں سے بیگماں کا گلا دبوچ لیا۔

"حرام زادی۔۔۔ کمزوری" اس کی غراہٹ کانپی۔

بیگماں نے گلے سے خرخر کرتے ہاتھ پاؤں چلائے تو گلا چھوٹ گیا۔ وہ مڑ کر بھاگنے لگی۔ تو عبدالرحمان غصے سے پھر پکڑا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹھوڑی آئی اور دوسرے میں سر۔ بیگماں نے چھٹنے کے لیے زور لگایا اور اس نے گرفت مضبوط کرنے کے لیے۔ دونوں کی اس کوشش میں گردن کو ایک موڑ آیا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔ بیگماں بے جان ہو کر گر پڑی۔

عبدالرحمان دہشت کھا کر پیچھے ہٹا۔ کچھ دیر فاصلے سے دیکھتا رہا۔ پھر ڈرتا ڈرتا قریب آیا اور جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کی انگلیوں کے نشان گلے پر بنے ہوئے تھے۔ ٹھوڑی ڈھلی تھی۔ گردن دوہری ہو رہی تھی ـــــ اور سانس کا نشان بھی نہ تھا۔

"بیگی"

چلا کر وہ اس کے اوپر گرا۔

عین اسی وقت عاقل دو دوستوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

عبدالرحمان کو پیش کیا گیا تو تھانیدار صاحب اس کے کیس کے کاغذات دیکھ رہے تھے۔ ان کا پھولا پھولا چہرہ اور بڑی بڑی

یں بالکل سنسان تھیں۔ وہ کاغذ اٹھے رہے اور پھر موٹی موٹی آنکھیں اٹھا کر عبدالرحمان کو دیکھا

"بولے" وہ اونچی آواز میں بولے "تم نے قتل کیوں کیا؟"

مگر عبدالرحمان سر ہلاتے ہوئے بولا "قتل میں نے نہیں کیا جی —— بالکل نہیں کیا۔"

"معاملہ کاغذوں میں سب ثبوت ہے —— ہیں؟" وہ آگے کو جھک کر دہاڑے۔

"تھانیدار جی۔ میں نے نہیں کیا —— میں تو صرف ایک کھلونا ہوں۔"

"تو جس نے کیا ہے اوئے" وہ اسی طرح گھورتے ہوئے بولے۔

عبدالرحمان نے ہتھکڑیوں والے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔

تھانیدار جی کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"بکے اوئے —— وہ کیسے؟"

عبدالرحمان بڑے درد سے بولا "اس نے میرے پتے کو پھندا نکالا تھا۔"

تھانیدار نے موٹی سی گالی دی "ادھر آ اوئے —— عمر دین۔" وہ دہاڑا۔

"جی صاحب۔" اردلی اندر آیا۔

"ادھر کو بھی آتا ہے۔ ان کا خصم مست ور ہی ہوتا ہے —— جو لٹکا ہے پیر بن جاتا ہے —— ابے میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔ بلا اس حرامزادے پٹیال والے کو۔"

اردلی کانپ کر بھاگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک یم شحیم سپاہی اندر آیا۔

"شیر بخش لے جاؤ اس حرامی کو اور نکلواؤ اس کا بیان۔"

شیر بخش کا منہ اتر گیا۔ وہ ابھی چھٹی کی درخواست لے کر اندر آنے ہی والا تھا۔ سینما میں بڑی اچھی فلم لگی تھی اور نمبر نے ے خاص طور پر ٹیلیفون کیا تھا۔

"جناب آپ نے کچھ پوچھ گچھ کر لی؟"

"اوئے لے جا جناب کے بچے —— ٹر ٹر کرنے لگ گیا ہے۔"

شیر بخش نے قہر بھری نظروں سے عبدالرحمان کو دیکھا اور ہتھکڑی والے سپاہی کو ساتھ آنے کے لیے کہا۔ کمرے تک پہنچتے پہنچتے شیر بخش نے دو چار تھپڑ عبدالرحمان کو لگائے اور زیر لب بڑبڑایا۔

"ان کے خصم نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا ہے۔"

کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے عبدالرحمان کو زور سے اندر دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اندر آیا۔ جب سنبھل کر گرد دیکھا

تو ....

چھوٹا سا کمرہ —— درمیان میں گول سی میز —— میز کے اوپر کنارے سے پہلے ایک شکستہ —— گلدستہ، گلدستے پر بہت سے بندھی ہوئی دوسیاں لٹک رہی تھیں.........

کچھ عرصہ پہلے اس نے اسی کمرہ میں بیاہ کیا تھا اور بعد میں بیوی سے بحث کی تھی۔ یہ سب ایک شعلے کی طرح اس کے ذہن میں کوندا —— اور وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شیر بخش مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ یہ قیدی سالا تو بالکل ہی بے جان نکلا۔ ابھی کب تک دے گا —— آج کی ختم کہانی ہو گئی۔

جوش صاحب

محمد طفیل

جوش صاحب

محمد طفیل

ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میں نے نیاز فتحپوری پر اپنے "تعصبات" کا اظہار کیا تھا۔ آج جوش صاحب پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں جو بہ شبہ "تعصبات" ہی کی ذیل میں آئیں گے۔

ان دونوں بزرگوں کو پڑھتے ہیں، مجھے ان کی کئی رگیں ایک ہی جگہ جا کر ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ میرے مطالعہ کا قصور ہے یا ان اکرم فرماؤں کا، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اردو کے ان جیالوں کو اپنے اپنے رنگ میں دکھلانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔

دونوں ہی شاہ باز، دونوں ہی مذہباً کافر، دونوں ہی قلندر اور سب سے بڑا عیب دونوں کا یہ کہ تقاضائے انسانیت سے آشنا، نہ صرف آشنا بلکہ پیغمبرانہ حد تک پرچارک!

یہ صرف انسان ہی نہیں، شاعر بھی ہیں۔ دوہری تہری "خوبیاں اور خرابیاں"۔ اس لیے یہ اچھے کام بھی کریں گے اور برے کاموں کی اوسط بھی خراب نہ ہونے دیں گے۔ اس اعتبار سے یہ مجھے مکمل انسان نظر آتے ہیں۔ دونوں رُخ مکمل!

نواب محمد علی خان ان کے چچا تھے۔ آمدنی کوئی لاکھ روپے سالانہ کی ہوگی۔ کچھ اتنی ہی آمدنی ان کے والد بزرگوار (نواب بشیر احمد خان) کی تھی۔ جو ان صاحب حوصلہ بزرگوں نے بد انتظامی، مقدمہ بازی اور دل کے ارمان نکالنے کی نذر کر دی۔ تلچھٹ میں جو کچھ انھیں ملا۔ انھوں نے بھی خاندانی روایات کو شرمسار نہ ہونے دیا۔ خوب خوب عیش کیے۔ خوب خوب جیے۔

ملیح آباد کے پٹھان۔ شبیر حسن خان نام، تخلص جوش، نواب ابن نواب کے بعد صرف جوش، شبیر حسن خان بھی نہیں۔

اجداد میں شعر و شاعری کے چرچے، بلکہ شاعر بھی، وہی علت ہوتے ہوتے ان تک پہنچی۔ مگر ان کے بزرگ رسوا کن حد تک بدنام نہ تھے جتنے کہ یہ ہیں۔ اگر ان کا ذکر ہوا بھی تو اس لحاظ سے کہ گویا اور بشیر، جوش کے اجداد میں اچھے شاعر تھے۔

کئی معاملات میں یہ دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ کبھی اتنے خود غرض کہ آپ بکا بکا رہ جائیں، کبھی اتنے فیاض کہ عقل زمانے۔ ان کے مزاج کی دھوپ چھاؤں، انسانی فطرت ہی کی غماز ہے، ایک رُخ کے اظہار سے بونے، اور دوسرے رُخ کے اظہار سے، عام انسانوں کے قد سے اونچے نظر آئیں گے۔ اس لیے پھر سنیے اس قصے کو!

جوش صاحب نے اپنی شخصیت پر کوئی نقاب نہیں ڈال رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی ستر پوشی کے باوجود ڈھکے چھپے نہیں رہتے۔ وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے قابو میں رکھتے ہوں گے کہ ہمیں دنیا کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ مگر جوش صاحب کو یہ ملمع بازی پسند نہیں۔ یہ مصلحت آمیز قسم کی قیود سے قطعی طور پر ناآشنا ہیں۔

میں کئی ایسی شخصیتوں سے واقف ہوں۔ جنھوں نے اپنے اوپر شرافت کے غلاف چڑھا رکھے ہیں۔ ایسے "اللہ والوں" کو جھانکنا

ـہ مشکل ہے۔ پھر جانیے پڑھ لینا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر اگر ایک غلاف اُتار دیا جائے تو وہ بالکل آدمی کی صورت میں نظر آنے
ـگ جاتے ہیں۔ بعض کے دو غلاف اُتارے جائیں تو، بعض کے تین اُتریں تو —— اور بعض شخصیتیں تو بالکل پیاز ہوتی ہیں
ـاہے جتنے غلاف، اُتار ڈالیں۔ ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا۔

یہ چھوٹے بڑوں کو آپ اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ دوست ہو تو، دشمن ہو تو، وہ آپ بھی ہے اور جناب بھی،
ـس کا مطلب یہ نہیں کہ جوش صاحب بڑے مودب ہیں۔ جناب! یہ بڑے اکھڑ بھی ہیں۔ ان کے نزدیک جو زیادہ محترم نہیں۔ وہ تو آپ اور
ـناب کے کھاتے میں، جو مستحق ہے یار ہے۔ لُہ ہے دُوسرے کھاتے میں، بیچ والا راستہ ان کے یہاں نہیں۔ ابے تبے، توں تراں ان
کے ہاں نہیں چلتا۔

[illegible] یہ پہلو [illegible]۔ وہ ان کے الفاظ میں یوں تھا:

ایک بڑے کڑیل پٹھان، بڑے ہی رُعب داب والے، ہمارے والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ جب وہ آتے تو ہمارے والد
ـنھیں نیچی کر لیتے تھے۔ ہم بڑے پریشان ہوتے تھے کہ ہمارے میاں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ایک دن پوچھ ہی بیٹھے "میاں کیا آپ ان سے
ـرتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا، ہم ان سے ڈرتے ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ یہ صاحب فلاں محلے کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ بڑے بہادر اور مال دار تھے۔ مگر اب کچھ عرصے سے
ان کے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ زندگی کے دن کاٹنے کے لیے اب یہ مجھ سے گزارہ لینے آتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں
تاکہ نہ آنکھیں چار ہوں اور نہ انھیں شرمساری ہو۔"

بچپن کی ایک بات اور بھی سُناتے ہیں:

عہدِ طفلی میں ہم پر بڑی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اُونچا نہ بولیں۔ ننگے سر نہ پھریں۔ کوئی چیز بازار میں نہ کھائیں۔ ہاتھ میں
ہاتھ ڈال کے نہ چلیں۔ ایک دن شامتِ اعمال، ہم دونوں بھائی اپنے ایک ہمجولی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے۔ کسی طرح
اس کا علم والد صاحب کو ہو گیا۔ اُنھوں نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ دریافت کیا۔ کیا تم دونوں آج فلاں لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
گھوم رہے تھے؟ ہم نے اقرار کر لیا۔ کیا کرتے۔

جس وقت والد صاحب یہ پوچھ رہے تھے۔ اس وقت وہ حُقّہ پی رہے تھے۔ اُنھوں نے حُقّہ پر سے چلم اُتاری۔ دہکتے ہوئے
کوئلے ہم دونوں کے ہاتھ پر رکھ دیئے —— خبردار جو آئندہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چلے

اس کے بعد جوش صاحب نے یوں تبصرہ کیا۔ والد صاحب نے بھی ہمیں بچپن ہی سے سنوارنے کی کیا کیا ترکیبیں نہ کیں۔ مگر جو ہونا ہی
ازل سے بدمعاش بھلا وہ کیسے سدھرتے!

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے "نظارہ بازی" ان کے والد کے مزاج میں شامل تھی۔ ایک واقعہ اور بھی میں نے انھی کی زبانی سُنا ہے

سنا تھا دیا تمہارے بعد وہ بھی ہنستا ہوں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ جوش ملیح آبادی کو زبان کی غلطیاں پکڑنے کا بڑا شوق ہے۔ ذرا دیر ان کے پاس بیٹھے ہوتے تو ذرا بھی کہتے ۔ ارے ناواقف! غلطی کی بھی انتہا ہے۔ غلطیاں نہیں (چھوٹے محاوروں کو بھی تو آپ بنا کے رکھ دیں گے۔ یہ جو ایک سلسلے کا جوش نمبر چل رہا ہے۔ وہ ان کے اسی شوق کے مسئلے میں تو نکل رہا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے میرے رسالے کے جتنا مجھ کو کتابوں میں تھی غلطیاں نکالیں تھیں انھیں بھی جوش صاحب کی غلطیاں نکالنے کے لیے پورا ایک نمبر چھاپنا پڑ رہا ہے۔

یہ خوبی جوش صاحب کی اکتسابی نہیں۔ بلکہ انھیں ورثاً ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ کہا —" پان لگاؤں؟"
تو آبا جان نے اسی وقت اُگالدان نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور کہا کہ غلط زبان بولنے پر اسی طرح سزا ملے گی۔ پان بنایا جاتا ہے۔ لگایا نہیں جاتا۔

جوش صاحب سے خط و کتابت تھی۔ تکلف کی سی فضا میں وہیں سے تعلقات تھے۔ میں لاہور سے دلی پہنچا۔

"جی ہاں!"

"زندہ ہوں!"

"بہت اچھا، بہت اچھا —— اچھا ——"

"آہاہا، واہ وا، بھئی خوب آئے۔ بیٹھو بیٹھو!"

"میرے ایک دوست پاکستان سے آئے ہیں۔ ان سے کہہ رہا تھا:"

"کہہ دوں گا۔"

"تم تو اچھی ہو!"

"کہہ تو دیا ہو جائے گا!"

"جی ہاں! میں نے کہہ دیا تھا کہ جب وہ کپڑے پہن لیتی ہیں تو بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں!"

"آہاہا!"

"آداب عرض!"

جوش صاحب سے ملنے جب میں ان کے دفتر میں پہنچا تو وہ ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے جو اور جس قسم کی باتیں ہوئیں وہ آپ نے بھی سن لیں۔

چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی۔ میں نے بنائی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا —" بہت پی ہے۔ خدا کے لیے مجھے نہ پلائیے!

"چائے پیو میاں! خدا اور کوئی نہیں ہے۔ خدا کا تصور تو بزدلی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ جنگلوں میں

رہتے تھے۔ راتوں کو سانپ سونگھ جاتے تھے۔ دن کو شیر کھا جاتے تھے۔ بجلی چمکتی تھی تو لرز جاتے تھے۔ لوگوں نے ان مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دل کو سہارا دیا۔ یقین دلایا کہ کوئی طاقت بالا ہے جو ہمیں ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ اُمید، بزدلی، احتیاط اور ناطاقتی کا نام خدا ہے۔ جب آبا و اجداد غائب ہونے لگے تو سوچا کہ مرنے کے بعد بھی روح باقی رہتی ہے۔ اس سے مجبور لوگوں نے بیوقوفوں کی بے بسی سے فائدہ اُٹھا کر خدا کو حقیقت منوا لیا۔"

اس بحث و مباحثہ کے بعد ان صاحب کو چائے پینی پڑی۔ بلکہ انھوں نے پہلے ہی دو ایک فقروں میں چت ہو کر چائے پینی شروع کر دی تھی۔ یہ تقریر کر رہے تھے وہ چائے پی رہے تھے۔ جب یہ چائے پینے لگے تو انھوں نے ایک سوال اور جھاڑ دیا۔

"جوش صاحب آپ کچھ بھی کہیں۔ مگر آپ لوگوں کے دلوں سے خدا اور مذہب کے تصور کو ختم نہیں کر سکتے۔"

"جناب ایک بات تو ذہن میں رکھیں کہ رسولؐ نے خدا کو پیدا کیا۔ ورنہ اللہ تھا کہاں، کوئی بھی رسولؐ سے پہلے "ان صاحب" سے واقف نہ تھا۔ رسولؐ نے مذہب کی آڑ میں لوگوں کو لالچ بھی دیا۔ ڈرایا بھی، دھمکایا بھی ——— لالچ یہ دیا اگر تم اللہ کے بتائے ہوئے دین پر چلو گے تو مرنے کے بعد جنت میں جاؤ گے۔ جنت میں شراب ملے گی۔ حوریں ملیں گی۔ دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ چونکہ اہل عرب شراب کے رسیا تھے اور عورتیں اُن کی کمزوری تھیں۔ اس لیے وہ رسولؐ کے کہنے سننے میں آ گئے۔ (نقل کفر کفر نباشد) اس لیے کہ رسولؐ نے موت ایسی خوفناک حقیقت کو بھی لذیذ ترین شے بنا دیا تھا۔ محمدؐ واقعی دُنیا کا سب سے بڑا انسان گزرا ہے۔ جس نے عرب ایسی جاہل قوم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔ اسی لیے میں نے کہا ہے ؎

ہم ایسے منکرِ حق کو ثبوتِ حق کے لیے   اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ورنہ مذہب تو فطرتِ انسانی کے ساتھ ایک گستاخی ہے۔

میں نے بھی ذرا چھیڑ دیا۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کے ہاں مذہب کی بنیادیں لرز رہی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو مذہب ہی سب کچھ ہے (یہ باتیں اُن دنوں کی ہیں، جب جوش صاحب بھارت کے شہری تھے۔)

جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بھی کیا ہے۔ آپ کے ہاں کا جو سب سے بڑا مولوی ہے۔ وہ اور میں بھوپال میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت تو وہ بالکل آدمی تھے۔ اب مولوی بن گئے ہیں۔ لیڈر ہو گئے ہیں۔ پیٹ بُری بلا ہے۔ اگر ان کے معاشی حالات اچھے ہوتے تو وہ ہرگز مولوی نہ بنتے۔ بدستور آدمی بنے رہتے۔ مجھے ان سے اور کوئی شکایت نہیں بجز اس کے کہ وہ پڑھے لکھے ہو کر مولوی بن گئے۔ خُوب جانتے ہیں انھوں نے بھی مسلمان قوم کو، مذہب کے نام پر کوئی جتنا چاہے اسے بے وقوف بنا لے۔

باتوں کا کُھرا تھا خود ہو گیا تھا۔ اس لیے حاضرین میں سے کسی نے کہا "جوش صاحب ان باتوں کو چھوڑیے۔ کوئی رُباعی سنائیے۔"

"بہت اچھا" اور "ٹھیک" کہہ کر، سامنے رکھی ہوئی ڈبیا سے پان لے کر شعر و شاعری کا آغاز کیا۔ بہت سی رُباعیاں پڑھیں۔ ان میں سے دو چار آپ بھی سن لیں۔

تحقیق کو جس وقت بصیرت نکلی   پردہ میں ذہانت کے خباثت نکلی

جب عقل کی سیج کر دیا ساگر ٹوٹا　　　اک جو کی مسافت پہ جہالت ٹوٹی

اللہ میں حکمت جو نہیں پاؤں گا　　　میں حشر میں ہنگامے سے ٹھہراؤں گا
ہوگی جو بجائے عدل رحمت مجھ پر　　　تو اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا

چونکہ اس وقت ان کا موڈ مذہب اور علم کے دھارے کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس لیے انھوں نے رباعیاں بھی ویسی ہی پڑھیں۔ یہ بحث بعد میں کریں گے کہ مذہب کے معاملے میں ان کے اصلی خیالات کیا ہیں اور ان کی باتوں میں زیب داستان کے لیے کتنا کچھ ہوتا ہے اور کیوں؟

یہاں ذرا " ذہن کا ذائقہ بدلنا چاہیے"۔ جوش صاحب کے خاص رنگ کی بھی ایک دو رباعیاں سن لینی چاہئیں۔ جو انھوں نے اسی وقت آنکھیں بند کر کے اور لہرا لہرا کر پڑھی تھیں۔

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں　　　گھڑیاں روکیں مگر گزرتی ہی رہیں
امید کا رخسار میں بھرتی رہیں رنگ　　　اور یاس کی جھریاں ابھرتی ہی رہیں

کاکل کھل کر بکھر رہی ہے گویا　　　نرمی سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں تری جھپک رہی ہیں مجھ سے مل کر　　　دیوار سے دھوپ اتر رہی ہے گویا

یہ تھی میری پہلی تفصیلی ملاقات جو ہوئی [illegible]ء !

میں ان کے پاس وہاں کوئی دو گھنٹے بیٹھا ہوں گا۔ ان کی باتیں ایسی مسحور کن تھیں کہ مجھے ان کے تکلم کی سحر آفرینیوں میں گم ہو جانا پڑا۔ یہ ہر بات کو اس انداز میں نہیں سوچتے۔ جس طرح سوچا جاتا ہے بلکہ ان کے سوچنے کا انداز بھی اپنا ہے۔ جو عجیب و غریب ہونے کے باوجود غور و فکر پر آمادہ کر دیتا ہے۔

شام کو پھر جوش صاحب نے اکٹھے مل بیٹھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کھانے کی دعوت دی اور یہ بھی نوید سنائی کہ شعر و شاعری بھی ہوگی۔

اندھا کیا چاہے" دو آنکھیں! میں پہنچا۔ مختصر سی نشست تھی۔ چھپی بوتل سامنے رکھی تھی۔ اس شعلۂ مادرو سے سبھی کو شوق فرمانے کی دعوت دی گئی۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق سبھی نے ہاتھ بڑھائے۔ جو میری طرح کے ازلی بزدل تھے۔ وہ تشنہ لب رہے۔

یہ پیتے جاتے تھے اور شراب پر وعظ فرماتے جاتے تھے اور ہم بزدلوں کو سمجھا رہے تھے کہ اسلام کی رو سے بھی شراب پینا ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں آیا ہے کہ جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز مت پڑھو۔ مگر نشے کی حالت میں شعر کہنے، پڑھنے اور سننے سے تو نہیں روکا گیا۔ میرے نزدیک تو یہ بھی ایک عبادت ہے۔ نماز روزہ تو انسان اپنے لیے پڑھتا اور رکھتا ہے۔ مگر شاعر اپنا خون جگر اللہ کے بندوں کے لیے صرف کرتا ہے۔

یہ ماحول تھا، جس میں جوش صاحب نے اپنی نظم "جھومتی برسات" شروع کی اور ایسے جذب کے ساتھ پڑھی کہ لطف آ گیا۔ اس میں

ایک چونکنے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ نظم ترنم کے ساتھ پڑھی۔ ترنم تو خیر پٹھانی قسم کا تھا۔ لیکن اس ترنم میں بھی ذرا سی ایک بات ضرور تھی۔ میں اس نظم کے کئی مصرعوں پر کھو سا گیا۔ میں شعر بڑے بے ڈھنگے طریقے سے سنتا ہوں۔ وہ یوں کہ شاعر بلکان ہو رہا ہے اور میں چپ بیٹھا ہوں۔ کبھی کسی شعر پر واہ کہہ دیا تو کہہ دیا۔ ورنہ چپ، وہ بھی اتنی مدھم آواز میں کہ شاعر سن نہ سکے۔ لیکن اُس دن نظم سنتے ہوئے میں نے اپنی روایات کو توڑ دیا تھا۔ میں بے خود ہو گیا۔ سرشار ہو گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے دل کھول کر داد دی۔ میرے جاننے والے حیران تھے کہ میں موج میں ہوں۔ حالانکہ میں موج میں نہ تھا۔ بلکہ اُس دن مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی کتنا ہی بدذوق کیوں نہ ہو وہ اچھے شعروں پر وجد میں آ سکتا ہے۔

اس ضمن میں مجھے ایک بات یاد آئی۔ نواب جعفر علی خاں اثر لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ آپ مجھے دُوسرے شعرا کے اچھے شعر سنائیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اُن دنوں فراق گورکھپوری اور اثر لکھنوی میں ٹھنی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دُوسرے کے خلاف لکھنا نقوش ہی سے شروع کیا تھا ——— اور اثر صاحب مجھے فراق پارٹی کا آدمی سمجھتے تھے۔

اثر صاحب نے بڑے بڑے پائے کے شعر سنائے۔ میں بے حد لُطف اندوز ہُوا۔ مگر اُنھوں نے ایک شعر ایسا سنایا کہ میں تڑپ اُٹھا۔ بے اختیار ہو گیا۔

اثر صاحب نے میرا رنگ دیکھا تو فرمایا: "اب تو بے قابو ہونا ہی تھا۔"

میں نے سنبھل کر کہا "جی!"

"میں نے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر سنائے۔ مگر اُچھلے تو فراق کے شعر پر۔"

میں نے عرض کیا۔ "آپ مجھ سے جیسی کی چاہے قسم لے لیں۔ مجھے اس سے پہلے علم نہ تھا کہ یہ شعر فراق کا ہے۔"

معلوم ہُوا کہ اچھا شعر ہو تو وہ پتھر ایسے آدمی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

ہاں تو بات جوش کی نظم "مجوُنتی برسات" کی ہو رہی تھی ——— اس کے بعد میں نے دوبارہ یہی نظم ایک ایسی رنگین محفل میں سُنی کہ جس کا ماحول ہی شاعرانہ تھا۔ متعدد مُبہم شعر اور متعدد مبتسم مصرعے بہ نفسِ نفیس موجود تھے اور راجہ اندر یعنی کہ جوش صاحب لہرا لہرا کے پڑھ رہے تھے:۔

ہاں، دیکھ، ذرا میرے سرو لب جُو
گھنگھور گھٹاؤں کا یہ چلتا ہُوا جادو
ندتار ڈنٹھلوں سے یہ اُڑتے ہوئے جگنو
یہ گنج میں رمان سبہ مست کی یا ہُو

اے دولتِ پہلو
ہاں، آن اُٹھا آن، قرابادہ گُل رُو

اے دولتِ پہلو

ساحل پہ یہ اُٹھتی ہوئی جنّت کے نظارے
افلاک پہ یہ سُرخ و درخشاں سے کنارے
بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشارے
اُٹھتے ہوئے دریا کے اُبلتے ہوئے دھارے
ماحول میں گھبرائے ہوئے کھلتے ہوئے چہرے

اے دولتِ پہلو

ہاں، آن آؤ آن، قربانِ دو گُل رُو

اے دولتِ پہلو

ذرا سوچ، دلہن ہوئی کس ٹھاٹ سے رات
جب ناز سے اُبھرے ہوئے گورے پہ دھرے ہات
دل کو ہو فروزندہ و رقصندہ جواں رات
کیا بات ہے، برکت ہے، برسات ہے، بہتات
مرادوں سادات پہ چل جائے جو تُو

اے دولتِ پہلو

ہاں، آن آؤ آن، قربانِ دو گُل رُو

اے دولتِ پہلو

اس ماحول نے اس نظم کو نشہ آور بنا دیا تھا۔ ہر سر پر جوش صاحب کے اشعار سے اور قہقہوں سے ایک عجب غضب طاری تھی۔ تصور فرمائیے۔ جب زندہ دوشیزاؤں کے ذکر پر، زندہ دوشیزاؤں کی طرف اشارے ہوں، کیونکہ ہم بند سے سُست کر پاس سے کے وقت یا شبہ کے نعرے لگیں۔ بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشاروں پر اشارے ہوں ——— اور پھر ناز سے اُبھرے ہوئے گورے پہ دھرے ہات ——— پر ان کا گھٹنوں پہ ہاتھ دھر کر ایکٹ کرنا، سمجھے وا و سماں نہیں اور یہ سب کچھ مخصوص دوستوں ہی کی محفل میں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ماحول میں برجستہ داد رہا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر آپ کو جوش صاحب کی شاعرانہ سوچوں سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی کہ آپ کو جوش کا مکمل پتہ چل جائے تاکہ آپ کا دل بہلا رہے۔ اس لیے کہ انسان ہوتا تو خدا کے نزدیک ہونے میں خوش رہ سکتا ہے یا پھر ——— یا پھر ———!

اللہ کا شکر کہ بعد میں بھی جوش صاحب سے ملنا جلنا رہا اور نہ میری بھی ان کے بارے میں ذہنی رائے بن جاتی جو اس وقت آپ کی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "بدتمیزی کی حد تک مذہب دشمن ہیں۔"

مذہب کے معاملے میں پختہ عمر تک سبھی ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند، چہرے پہ نورانی داڑھی۔ غرض مجھ جیسے اور آپ جیسے مسلمان تھے۔ جو زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہتے ہوں اور خدا اور رسولؐ کا نام آتے ہی گردن جھک جاتی ہو۔ مگر ہمارا عمل؟ سراسر غیر اسلامی، نماز روزہ بھی دکھاوا، اس لیے کہ جب تک مذہب کی روح کو سمجھا نہ جائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال نہ لیا جائے۔ اُس وقت تک تمام نعرے سیاسی اور کاروباری ہوں گے۔ آج کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کو دھیان میں رکھ لیجیے اور اس کا مقابلہ رسول اللہؐ کے کسی ادنیٰ سے صحابی سے بھی کر کے دیکھیے۔ عقل و ہوش کی ساری سیڑھیاں کھسکتی نظر آئیں گی۔

جوش صاحب جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ میں ان کا ہمنوا نہیں۔ قطعاً نہیں اور میں اُن مولویوں کا بھی ہمنوا نہیں جو خدا اور رسولؐ کا ذکر بھی معاوضے پر کرتے ہوں بلکہ میرے دل میں اُن درویشوں اور بوریہ نشینوں کا احترام ہے جنھوں نے مذہب کی خدمت اس انداز سے کی جس میں نمائش کا کوئی پہلو نہ تھا۔ بلکہ عاجزی ہی عاجزی تھی۔

جوش صاحب آج بظاہر دہریئے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ کٹر شیعہ بھی تو رہے تھے ہی ہیں۔ کیا کوئی شیعہ دہریہ ہو سکتا ہے؟ آپ کہیں گے ہو سکتا ہے۔ جوش صاحب ہی کو دیکھ لیجیے۔ مگر یہ جواب تسلی بخش نہیں۔ اس لیے کہ دہریہ کبھی بھی شیعہ نہیں ہو سکتا۔

یہ حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ رسولؐ کی عظمت کو بھی دل و جان سے مانتے ہیں۔ بس ذرا خدا سے دل میں رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ہم جیسے ہی مسلمان ہیں۔ یہ جو مسلمان نہیں ہیں تو اس قلابازی کی بھی ایک وجہ ہے۔ جب یہ حیدرآباد دکن میں ملازم تھے تو انھیں ایک دن یک لخت یہ آرڈر ملا کہ پندرہ دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیے۔ اُس وقت ان کا ساتھ، کوئی دس بارہ آدمیوں کا تھا، دو بچے تھے۔ بیوی تھی اور اس کے ساتھ عزیز و اقارب، حیدرآباد سے نکلے تو تین برس تک ذہنی اذیتوں میں مبتلا رہے۔ پیٹ کی مار کے ہاتھوں عاجز رہے۔ تن کا رشتہ رُوح سے برقرار رکھنا محال ہو گیا۔ اُس وقت جو ڈگمگائے تو آج تک نہیں سنبھلے۔ کہتے تھے کہ خدا کہتا ہے۔ میں رزاق ہوں اور میں ہوں کہ نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہوں۔ اگر خدا ہوتا تو اپنے بندے کو یوں عاجز نہ بناتا۔ یہ تھے وہ واقعات و حالات جن میں یہ خدا سے ناراض ہو گئے۔ خدا کے منکر تو آج بھی نہیں۔ زبان سے کچھ ہی کہتے رہیں مگر خدا کے وجود کا اقرار قدم قدم پہ کرتے ہیں۔ اُس وقت بھی کیا، جب یہ اُفتاد پڑی تھی ؎

اس طلسم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزد باری

جوش صاحب خدا سے ناراضی کا ایک اور واقعہ بھی سنایا کرتے ہیں:

"میں ایک دن صبح ہی صبح سیر کے لیے نکلا کر دیکھتا ہوں کہ ایک بڑھیا پھٹے حالوں، لاٹھی ٹیکتی چلی آ رہی ہے۔ مجھے ترس آیا، میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کے دیا۔ اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا۔ ابھی میری بہو زندہ ہے وہ مجھے پانچ روپے مہینہ گزارے کے لیے دے دیتی ہے۔ جیسے تیسے کر کے گزارہ کر لیتی ہوں۔ میں دن دو مر گئی شاید اُس دن مانگنے کی نوبت آ جائے۔ مگر ابھی نہ لوں گی۔"

میں نے سوچا کتنی خود داری ہے یہ بڑھیا۔ اس کی حالت پر مجھے ترس آ رہا تھا مگر سب حالات کو اس نے خوشی کے ساتھ
مجھے خدا سے بغاوت پر آمادہ کیا۔ وہ دن اور آج کا دن' اپنی خدا سے نہیں بنی۔

ایک دفعہ خدا کے بارے میں' اپنے ایسے ہی "ارشادات عالیہ" سے حاضرین کو مستفید فرما رہے تھے۔ بہت سی باتیں کر کے خدا کا وجود ختم ہی کر دیا تھا ——— اس پر میں نے کہا۔ "جوش صاحب اگر خدا سچ مچ نکل آئے تو پھر آپ کا کیا بنے گا؟"

کہنے لگے۔ "ایسی صورت میں اللہ میاں مسکراتے ہوئے بغل گیر ہو جائیں گے اور کیا ہوگا۔ خدا جسے ہم سب رحیم اور کریم کہتے ہیں، وہ ظالم نہ ہوگا کہ اپنے بندوں سے انتقام لے۔"

یہ عام لوگوں سے ذرا مختلف طریقوں سے سوچتے ہیں۔ خدا سے نوک جھونک! اگر مندرجہ ذیل واقعہ کسی اور کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو وہ جانے خود کو ولایت کی کونسی منزل پر پہنچا دیتا۔ کہتے ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے ایک نعت لکھی تھی۔ بڑے ہی جذب کے ساتھ۔ اسی رات خواب میں ایک بزرگ شخصیت کو دیکھا۔ احساس ہوا رسول اللہ ہیں۔ کمرا بھی معطر ہو گیا۔ جاگا تو مجھے کمرا ویسا ہی معطر ملا۔ خوشی اور حیرت کے ساتھ بیگم کو آواز دی۔ وہ آئیں تو کہنے لگیں۔ کمرا بڑا معطر ہے۔ اس کے بعد میں نے نوکر کو آواز دی۔ وہ آیا تو وہ بھی کہنے لگا کہ کمرے سے خوشبو آ رہی ہے۔

میں سوچنے لگا کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ یہ سب بہت کچھ ہی نفس کا تصرف تھا اور اس میں کوئی کراماتی پہلو نہ تھا۔

واقعی اگر یہی خواب کسی مولوی کو آجاتا اور یہی کچھ وہ محسوس کرتا تو وہ اپنا بھی دماغ خراب کر بیٹھتا اور اوروں کا بھی!

جوش حیدرآباد سے پہنچے۔ وہاں جانے کا وسیلہ عماد الملک بنے۔ انھوں نے ہی نظام سے انھیں روشناس کرایا تھا۔ عماد الملک نے بڑھ کر ان کی تعریف کی کہ اس وقت جوش ہی ہندوستان کا منفرد شاعر ہے جو اپنے اندر جان رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ میں نے آج تک کسی شاعر کی تعریف نہیں کی۔ مگر مجھے جوش کے کلام نے اتنا متاثر کیا ہے کہ آپ سے عرض کروں کہ انھیں یہاں بطور خاص بلوایا جائے۔ اس وقت عماد الملک کی بڑی پوزیشن تھی اور جوش صاحب اتنے بڑے شاعر نہ تھے۔ بس ستاروں پر کمندیں پھینکنے والے ایک ابھرتے شاعر تھے۔ چنانچہ ان کا تقرر نظام کے حکم سے ہوا۔ کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر انھیں (بقول شاہد احمد دہلوی) انگریزی ادب کے شعبۂ تراجم میں ٹھونس دیا گیا۔

بعد میں تو حیدرآباد میں ان کا خوب طوطی بولا۔ امرا و روسا سے یہ ایسے ملتے تھے جیسے وہ کوئی ان کے دبیل ہوں۔ ماتحت ہوں۔ نظام کے ہاں بھی انھیں درباری ضابطوں کی رعایتیں تھیں۔ مثلاً نظام کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے ایک خاص قسم کے لباس کی ضرورت ہوتی تھی جس سے جوش صاحب مستثنیٰ تھے ——— اور پھر یہ واقعہ بھی اسی حیدرآباد میں پیش آیا کہ جب یہ نظام کے حکم سے پندرہ دن کے اندر حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو وہ لوگ جو انھیں روز گھیرے رہتے تھے اور ان سے سو طرح کے فائدے اٹھاتے تھے۔ وہ سب کے سب پر لگا کر اُڑ گئے۔ جس وقت انھوں نے حیدرآباد کو چھوڑا۔ اس وقت اسٹیشن پر ایک شخص بھی خدا حافظ کہنے والا نہ تھا۔

نظام کے مجھلے لڑکے معظم جاہ سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ پہلے یہ پیتے تو تھے۔ مگر اتنے باقاعدہ نہ تھے۔ وہاں کی روزانہ نشست میں معمولہ چلی اور خوب چلی۔ معظم جاہ بادا جان کے پیتے بیٹھے تھے۔ چنانچہ اس عالم میں ان کے منہ میں جو آتا کہہ گزرتے۔ وہ کہتے بادا جان کنجوس ہیں تو یہ کہتے ارے کنجوس، مہا کنجوس، وہ کہتے بادا جان بڑے تھرڈ کلاس انسان ہیں تو یہ کہتے تھرڈ کلاس، اتنا چھوٹا آدمی تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

نشے ہی کی حالت میں معظم جاہ نے کہا۔ اچھا تو پھر بادا جان پر نظم ہو جائے۔ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اور اسی حالت میں نظم فرما دی۔ وہ زمانہ تھا اس لیے پھوٹ نہ سکا۔ یہ تھے شاعر دھکیل دیے گئے۔

ہاں صاحب! شراب پینے کا تو لطف ہی یہ ہے کہ خود بھی بہکے، اپنے ہم نشیں کو بھی بہکائے۔ انشا نے جو کہا ہے "تو بھی بہک مجھے بھی بہکا" تو کچھ غلط نہیں کہا۔

جوش صاحب نے بھی، حیدر آباد سے بھاگنے کی بات کچھ یوں بتایا تھا۔

"ہم نے نواب صاحب کی ملازمت جتنا بھی عرصہ کی۔ خوش نہ رہے۔ بلکہ اپنی بدبختی پر گھر آکر اپنی بیوی کے سامنے رویا کرتے تھے۔ نواب کی سی تابی۔ ڈیوڑھیوں پر ہوتی تھی۔ کسی نے بات نواب صاحب تک پہنچا دی کہ جوش صاحب آپ کی نوکری کو بدبختی کی علامت سمجھتے ہیں اور گھر جاکر رویا کرتے ہیں۔

دوسرے ہم نے نواب کے خلاف نظم لکھ ڈالی ——— اور سُنے اُمرا اور وُزرا کی محفل میں پڑھ ڈالا۔ سب سناٹے میں آ گئے۔ غصے سے کہا۔ جوش صاحب آپ نے یہ کیا غضب کر دیا۔

مجھے اپنا انجام نظر آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا کہ مجھے نوکری سے سبکدوش کر دیا جائے۔ جنگل کی آگ کی طرح ایک ہی دو گھنٹوں میں میرا استعفیٰ نواب صاحب تک پہنچ گیا۔ نواب صاحب اور بھنائے کہ ایک تو ہمارے خلاف نظم پڑھی۔ اُلٹا استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ یعنی برطرف کرنے کا حق بھی، ان کے استعفیٰ نے باقی نہیں چھوڑا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ لکھ دیجیے۔ استعفیٰ منظور اور نیز ... دن کے اندر خارج البلد کیا جاتا ہے۔ اس پر نواب صاحب خوش ہوئے کہ ہاں یہ بات بن گئی۔

جوش صاحب کہتے ہیں کہ میری اتنی گستاخی پر بھی نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ ہم کسی طرح سے معافی مانگ لیں اور نوکری بحال کر دی جائے مگر میں نہ مانا اور میں نے حیدر آباد کو خیرباد کہہ دیا۔ حالانکہ میرے دوست، میری بیوی کہتی تھی۔ نوکری کا معاملہ ہے۔ معافی مانگ لیجیے۔ مگر میں نے اپنی خودداری کو چند سکوں کے عوض نہ بیچا۔"

اب یہ روزانہ پیتے ہیں۔ باقاعدگی سے پیتے ہیں۔ گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں۔ گھڑی اتنی باقاعدہ نہیں چلتی۔ جتنے یہ باقاعدہ پیتے ہیں۔ ایک بار جب گاندھی جی نے انھیں شام کا وقت ملنے کے لیے دیا تو انھوں نے کہا۔ "گاندھی جی کوئی اور وقت دیجیے یہ وقت تو میرے شراب پینے کا ہے۔"

جوش صاحب کے جو دوست شراب نہیں پیتے۔ اُن پر پھبتیاں کستے ہیں۔ نابالغ قرار دیتے ہیں۔ بچہ پارٹی کہتے ہیں۔ ان باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جوش صاحب پینے کو بُرا نہیں سمجھتے۔ مگر جب بیٹے نے پینی شروع کر دی تو انھیں دلی صدمہ ہوا۔

کہا: "وہ مترس مگر کا حصہ میں اس نابکار کا شکار ہوا تھا۔ مگر میں نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا مگر آپ کا کیا ہوگا؟"

ابھی ابھی بجنور اور بہلانے کے سلسلے میں انشا کا ذکر آیا تھا۔ انشا کے ذکر سے ایک اور بات ذہن میں ابھرتی ہے کہ مکمل شاعر کے ماتھے پہ انشا زندہ ہوتا تو جوش پیدا ہی نہ ہوتے۔ یہ انشا ہی شخص ہیں جیسے ایک الفاظ کو دو ندرتیں گے ہوا۔ نئے نئے الفاظ گھڑنا، نئی تشبیہات تراش لینا، جوش کے ہاں ورثہ ہے انشا کا۔ جوش کی قادر الکلامی مسلم، مگر جوش کے مصرعوں میں انشا جھلکتے ہیں۔ میں جوش کو انشا سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ مگر یہاں ذکر اس ذہنی فضا کا ہے جو انشا کے توسط سے جوش تک پہنچی۔

میں نے یہاں انشا اور جوش کا بلاوجہ موازنہ کر ڈالا۔ ایسا صرف میں نے ایک نکتے کی وضاحت کے لیے کیا ہے۔ ایسے میں میر اور غالب سے کسی دوسرے شاعر کو ملانے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لیے میں آپ سے بھی کہوں گا کہ آپ جوش کو جوش کی حیثیت سے اور انشا کو انشا کی حیثیت سے دیکھیں۔ یہ دونوں صرف ایک پڑاؤ پہ اکٹھے نظر آتے ہیں۔ ورنہ شعری زندگی کے میدان میں دو مختلف اور دور کھڑے ہیں۔

جوش صاحب کو شاعرِ انقلاب مان لیا گیا ہے۔ مگر میں انھیں شاعرِ جمالیات ہی سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ شاعرِ انقلاب اگر کوئی ہوا ہے تو وہ صرف نذر الاسلام ہے۔ ہاں کسی حد تک اقبال کو بھی شاعرِ انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اقبال نے سوچے سمجھے انداز میں انقلابیت سا شعروں کو اپنایا۔ مگر جوش نے جوش میں آکر بھی ایسا نہیں کیا۔ محض گرج اور توڑ پھوڑ والی شاعری تعمیری نوع کی انقلابی شاعری نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے ہاں بھی انقلابی شاعری کا صرف جسم ملتا ہے۔ روح نہیں ملتی۔ انقلابی شاعری کی روح اگر کسی کے ہاں ہے تو وہ صرف نذر الاسلام ہے۔ اقبالؔ بنیادی طور پر صرف شاعرِ ملت ہیں۔ اس میں ان کے ہاں جسم بھی ہے۔ روح بھی ہے۔

انقلاب ذہنوں کو کتنا ہی بھلا لگے۔ مگر وہ کلیتاً تعمیری نہیں ہوتا۔ تعمیری ارتقا تو ایک تدریجی عمل کا نام ہے۔ جس سے فکر و عمل کا ایک مخصوص سانچا تشکیل پاتا ہے اور انقلاب محض رد عمل ہے۔ جس سے بگاڑ کے تو بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔ مگر بناؤ کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ محض داخلی شاعری پوری شاعری نہیں ہوتی۔ خارجی شاعری کی چاشنی کے بغیر پورا شاعر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ جوش کے ہاں یہ دونوں پہلو ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ کبھی ان پر خارجی شاعری کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی داخلی کا۔ دونوں چیزیں بیک وقت اور ایک ہی تخلیق میں ان کے ہاں نہیں ملتیں۔ یا کم ملتی ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ بات اچھی بھی ہے کہ ان کی تخلیقات کا ایک موڈ اور ایک آہنگ ہوتا ہے۔ یہ نظم کو غزل کی طرح ملغوبہ بنانا نہیں چاہتے۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ آج کل ان کی چھوٹی چھوٹی اور پیاری پیاری سی جو نظمیں سامنے آ رہی ہیں۔ وہ کچھ غزلِ مسلسل ہی کے سے انداز کی ہیں۔ جیسے "دعوتِ سفر" اور "مقدم بہار"۔

غزل کے بارے میں ان کے تاثرات تو آپ نے سُنے ہی ہوں گے۔ ایک حکایت یہ بھی ہے۔ الفاظ بھی انہی کے ہیں۔

"ایک مرتبہ دہلی میں جگر، فراق وغیرہ سے غزل کے متعلق بحث ہو گئی۔ انھوں نے پوچھا۔ "آپ غزل کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "یہ بحث اس وقت نہیں۔ کل صبح آپ کے ہوٹل میں آکر بتاؤں گا۔" چنانچہ دوسرے دن صبح پیدل وہاں گیا۔ انھوں نے پوچھا۔ "جوش صاحب اتنی دیر کہاں لگا دی؟" میں نے کہا۔ "قبلہ! کیا عرض کروں۔ کوئی سواری ہی نہیں ملی۔ پیدل چلتے

چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور جو ہر میں کا بیان مجھے بڑا پسند آیا۔ ویسے اسٹالن قابل آدمی تھا اور پکاسو کا آرٹ میری سمجھ سے باہر ہے مگر میرا کلام سراپا الہام ہے۔ کل جو چیز نے قریب گاڑی کا لڑکا ہے۔ اتنا بڑا حادثہ میں نے کبھی نہیں سُنا" ——— ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ جگر نے بیچ میں ٹوک کر کہا: "جوش صاحب آپ کیا اول فول بک رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا: "حضور اول فول نہیں بک رہا ہوں، غزل کہہ رہا ہوں۔"

ملاحؔ میں ایک بات اور بھی عجیب دیکھی کہ آپ غزل کے بڑے دشمن ہیں لیکن شعر و شاعری کے سلسلے میں جب کسی سند کی ضرورت پیش آئے گی تو پڑھیں گے غزل کے شعر۔ آپ خدا کے بھی خلاف ہیں لیکن قدم قدم پر خدا کے وجود کا بھی اقرار کرتے جائیں گے۔ اب ان کے بارے میں رائے فیصلہ کرے تو کیا کرے ——— واقعی یہ ایک چکرا دینے والی شخصیت ہیں۔

جگر کے انتقال کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ان سے استفسار کیا: "جگر کی شاعری کے بارے میں حضور کی رائے کیا ہے؟"

"اپنا مسلک چھوڑ دوں تو بات کروں۔ یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ میں صنفِ غزل کے خلاف ہوں اور جگر غزل کے شاعر تھے۔"

"آپ اپنے مسلک سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹ جائیں۔"

"یہ بات ہے تو جگر غزل کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ بڑا رچا ہوا مذاق پایا تھا۔ ڈوب کر کہتے تھے۔ مگر آخری دنوں میں جذبے کی وہ شدت نہیں رہی تھی۔"

"یہ بات تو نہیں۔ ان کی آخری دور کی شاعری میں زیادہ غور و فکر ملتا ہے۔ زیادہ جان دار غزلیں ملتی ہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ والہانہ پن جاتا رہا جیسے ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں ——— تُو کتاب اُٹھا

دُوسرے جگر کے ساتھ فراق بھی غزل کے شاعر ہیں۔ فراق کے ہاں ۱۲۲ W زیادہ ملتی ہے اور جگر کے ہاں تغزل۔"

میں نے شرارتاً کہا: "جگر کے ساتھ فراق کا نام نہ لیں۔ فراق تو شعر کہتے چلے جاتے ہیں خواہ وہ بحر میں ہوں یا نہ ہوں۔"

"فراق بحر کے نہیں لہر کے آدمی ہیں۔ مگر دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور بڑا اونچا مقام ہے۔ بہر حال جگر کے انتقال سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تنہائی میں اضافہ ہوگیا ہو۔"

میں نے کہا: "آپ کو چاہیے کہ اُن پر ایک بھرپور مضمون لکھیں۔"

"ہاں لکھوں گا۔ میں جو اپنی سوانح (یادوں کی برات) لکھ رہا ہوں۔ اس میں اپنے سارے دوستوں کا ذکر تفصیل سے کروں گا اور اس میں اپنے اٹھارہ معاشقوں کا بھی ذکر کروں گا۔"

"سب کچھ سچ سچ لکھ دیں گے؟"

"فی الحال تو شاعری کروں گا۔ مگر لکھ کے رکھ جاؤں گا۔ کہہ دوں گا کہ میرے مرنے کے بعد وہ حصہ بھی شائع کر دیا جائے۔"

"ہمت ہے تو ابھی چھپوا دیجیے نا؟"

"بھئی میرا تو کچھ نہیں۔ جن کا ذکر کروں گا۔ ان کے لیے مصیبت ہو جائے گی۔ ان کے شوہر پوچھیں گے ___ اچھا تو جوش کے ساتھ پھنسی ہوئی تھی۔"

دوسری مرتبہ جب میں دلی گیا تو جوش صاحب اپنے کمرے میں نہ تھے۔ ایک صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ وہ بار بار گھر پر ٹیلیفون کر کے معلوم کرنا چاہ رہی تھیں کہ جوش صاحب گھر پر ہیں یا نہیں۔

وہیں بیٹھے بیٹھے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھایا۔ آواز آئی: "یہاں کوئی صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں؟"

میں نے کہا: "مجھے تو معلوم نہیں کہ کون ہیں۔ مگر آپ کون بول رہی ہیں؟"

جواب ملا: "جی، بیگم جوش بول رہی ہوں۔"

اس پر میں نے کہا: "بھابی آداب عرض!"

بیگم جوش نے اس وقت نہ جانے مجھے جوش کا کون سا دوست سمجھ کر یہ کہا: "جوش صاحب کے کیریکٹر کا خیال رکھنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ میں تو گھر میں رہتی ہوں۔ مجھے کیا پتہ کہ وہاں کیا گلچھرے اڑاتے ہیں۔"

اب میں ان گلچھروں کا جواب کیا دیتا۔ چپ ہو رہا۔

جوش صاحب نے ایک جگہ اپنے اولین عشق کا حال مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ دلچسپ ہو تو اسے پڑھ لیں۔ ورنہ ویسے بھی تو ایک دو ورق الٹ کر آگے چل دیں۔

"فراغت کی ریل پیل اور تمت رسموں کا دور دورہ تھا۔ اس لیے کیسے ممکن تھا کہ میری "مونچھوں کے کونڈے" کا جشن بڑے دھوم دھڑکے سے نہ منایا جاتا۔

تفصیلات سے قطع نظر کر کے صرف دو مجروں کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔

رات ہوتے ہی جگمگ جگمگ کرنے والے شامیانے میں علی جان کشمیرن نے جب قدم رکھا تو سب کی نگاہیں اس کے چہرے پر یوں گڑ کر رہ گئیں گویا ہر نظر میں ایک زنجیر ڈال دی گئی ہے۔

علی جان بلا کی خوب رو، خوش گلو، شیریں حرکات اور کم سن کشمیری تھی۔ جس کے چہرے کی شکر میں نمک سا نمک بھی گھلا ہوا تھا اور اس وجہ سے جب وہ اپنے چہرے کی مزروق آب و تاب کے ساتھ قناتوں کے حلقے سے نکل کر سامنے آئی تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے شام کی چھاؤں میں صبح بنارس طلوع ہو رہی ہے۔

سامنے آتے ہی پہلا وار اس نے یہ کیا کہ اپنی انگلیوں کی جھنکار بھرتے ہوئے، دھناسری کے ساتھ گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا اور گھٹنے پر ہاتھ کے رکھتے ہی ایسا نظر آیا جیسے کوئی ہوا پر رقص کرنے والا کبوتر چھتری پر آ کر بیٹھ گیا یا دریائے شفاف پر ایک چپل لہر ٹھہر گئی۔ گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہی برق کو انگڑائی آئی اور یکایک علی جان نے اپنی سرمگیں آنکھوں کو آدھا بند کر کے اپنی صراحی دار گردن کے ڈورے کو کچھ ہلانا شروع کر دیا جیسے جس کے عالم میں شنگرفی ہما دفعتاً مٹنے لگتی ہے۔ یا چاند کے ابھرتے ہی دریا کی جنبش چلنے لگتی ہیں۔ گردن کا ڈورا بجتے

ہی سارنگیوں کے گرد ایک مدد آمیز انشاط آفریں جھنجھناہٹ کے ساتھ درخشاں تاروں پر یوں کروٹیں بدلنے لگے۔ جیسے برکھا کی برستی ستی راتوں میں کسی برہا کی ستائی الھڑ کے ارمان مچلنے لگتے ہیں۔

داماں، جھلے کی، دل پر ضرب مارنے والی، کمک، سارنگیوں کی غل میں تیرنے والی چھن چھن، مجیروں کی گرگروں میں چٹکیاں لینے والی گمن گمن دھنوں کی سازوں کی دھلدن پر آڑی تانیوں کی گونج، ان سب نے ہم آہنگ ہو کر ایک ٹلکتا متحرک منظر پیش کر دیا گویا کسی خواب کے جزیرے سے پریوں کی برات گزر رہی ہے۔ دل جان کا مجرا ختم ہوا تو دیر تک سناٹا بجتا رہا۔

اس کے بعد چار طوائفیں مجرے کر گئیں۔ رنگ جما نہ سکیں۔ ہر مجرا پھیکا پھیکا سا رہا۔

البتہ جب پانچویں طوائف جھکتی آئی۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی، کانوں میں بالیاں، گلابی ساری، شہابی مکھڑا، تو دیکھنے والوں کی نگاہیں الٹ ہونے لگیں، بزرگوں نے، خوردوں سے نظر بچا کر انکھیوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اُن کی آنکھوں کے سفتے میں بالوں کی سفیدی کا غم چکر کھانے لگا اور آسمانوں سے یہ صدا آنے لگی کہ:

آنیست کہ دل بُردہ و خوں کردہ بسے را

بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را

اس کافرہ نے ابھی مشکل سے زندگی کی پندرہ سولہ بہاریں دیکھی تھیں اور اس کی چنچل جوانی میں وہ زور تھا جیسے کوئی اس کو پیچھے کی طرف دھکیلے رہا ہو۔

وہ ہری کونپل اور مدھر ادائی مظہر، راگ، نرت اور ناچ میں ابھی خام تھی لیکن اس کی کچی جوانی کا رس، اس کی خامی کو یوں سہارا دیے ہوئے تھا گویا کرشن جی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رادھا مشقِ خرام کر رہی ہے۔

جب نرت کے دوران میں اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تو ایسا دکھائی دیا۔ جیسے کالی زلفوں کے اوپر دھنک نکل آئی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس نے دادرا چھیڑا تو سارے گاؤں کی چلت پھرت اس کے گلے کے کوٹے پر میں یوں گھومنے لگی۔ جیسے تیز ہوا کی رو میں دھان کے کھیت سرسرانے لگتے ہیں اور جب گلنے گاتے، ناچتے ناچتے وہ میرے قریب آئی اور یکایک جھک گئی تو ایسا محسوس ہوا گویا گلاب کی نرم شنی چیت سے لوٹ کر دوہری ہو گئی۔

الغرض کار جب داد کی خاطر وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گئی تو اس کے کم سنی سے مہکتے ہوئے کوٹے نیتھے کی لپٹوں نے میرے تمام وجود کا احاطہ کر لیا اور اسی کے ساتھ ساتھ جب اس کی نشتر پیش دانتوں کے نرم ہیرے نے میرے ہاتھ کو دفعتاً چھو لیا تو اس لمسِ اولین نے ایک ایسا تازیانہ مارا کہ میرا خون تیموں اچھلنے لگا۔

یہ سب سے پہلا عشق، آدھی رات کی شبنم کے مانند گرا اور میرے خوابیدہ وجود میں جذب ہو کر مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر گونگے کی طرح رخصت ہو گیا۔ لیکن جاتے جاتے اس نے ٹہرے گل کھلائے اور میری کشتِ حیات میں عشق کے بہت سے درخت پیدا کر دیے۔ آج بھی جب میں اپنے اس بائیں ہاتھ کی پشت پر نظر ڈالتا ہوں، تو اس کی ماہ و سال کی ابھاری ہوئی موٹی موٹی رگوں اور اس کی درازیٔ عمر کی تنی ہوئی

بخریوں سے نیچے دوشالیاں، وہ جشن، وہ کشوار اور چیشں ادکا داس شیریں یا ب بھی نظر آتا ہے اور دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

رہے نام اللہ کا!

یہ تھا جوش صاحب کے عشقوں کا "ابتدائیہ"۔ میں جوش صاحب کے اس پہلے عشق پر اس لیے یقین لے آیا ہوں کہ بغیر شدید جذبے کے اس قسم کی تحریر ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ واہ وا کیا خوبصورت نثر لکھ گئے۔

یہ دوستوں سے دور دور خدا نہ یا ان کے حاسد ہے یا تقاضوں سے بچنے کے لیے بیوی کی شہ مزاجی کی پناہ بھی لیتے ہیں۔ دو دوستوں میں بیٹھ کر جب بیوی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ عموماً یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کی سب بیویاں، بڑے بڑے جابر بادشاہوں مثلاً فرعون، چنگیز خان، ہلاکو اور نیرو کی بہو ہوتی ہیں۔

یہ واقعہ تو ہے کہ یہ شاعر انقلاب اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں۔ کچھ ان کی کمزوریاں ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں ڈرنا پڑتا ہے۔ کچھ وہ سخت گیر ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی گھگھی بندھی رہتی ہے۔ یہ ہر وہ بات جو بیوی سے چھپانے والی ہوتی ہے۔ چھپاتے ہیں۔ مگر یہ بیوی سے چھپانے والی باتیں اس تواتر سے کرتے ہیں کہ وہ چھپ نہیں سکتیں۔ اس لیے ان کی گتی دبتی رہتی ہے اور وہ شیرنی سے شیرنی تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ان کے بھائیوں میں، اولاد میں، کوئی ایسا نہیں ہے۔ جسے جوش صاحب سے تھوڑی بہت نسبت دی جا سکے۔ ان کا خیال ہے کہ جب کوئی جی۔ نی۔ ایس پیدا ہوتا ہے تو وہ اوپر کی اور نیچے کی دو تین پشتوں کی ذہانت کو نچوڑ لیتا ہے۔

جوش صاحب سگریٹ کبھی کبھار پیتے ہیں۔ مگر سگار اور حقہ برابر پیتے رہتے ہیں۔ پچھلے برس لاہور آئے تو ایک حقہ بھی خرید لیا۔ کہتے تھے کراچی میں یہ حقہ بیس روپے کا ملتا ہے۔ یہاں پانچ روپے کا ملا ہے۔ لاہور والے بڑے شریف لوگ ہیں (پیر مرزا جی) اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ لاہور میں خیال رہتا ہے اور کراچی میں جوش۔

جوش صاحب نے حقہ خرید کر تانگے میں رکھوایا اور خود کو اس زاویے سے رکھا جیسے تصویر کھنچوانے کا ارادہ ہو۔ جس میں سے لگتا تھا کہ اس وقت آپ کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "کوئی آپ کی تصویر لے لے۔"

"ہاں بھئی ہاں، اگر کوئی اس وقت میری تصویر لے لے تو مجھے بڑی خوشی ہو۔ مگر یہ حقہ والی بات تو ہمارا خاندانی ہے میرے والد صاحب بھی جب باہر نکلتے تھے تو وہ بھی گاڑی میں حقہ رکھوا لیتے تھے۔ میں ان سے ذرا مہذب ہوں۔ اس لیے کہ میں حقہ صرف گھر پر پیتا ہوں۔"

راستے میں مجھ سے پوچھا۔ "یہاں پر پران کا بھی ایک ہوٹل ہوتا تھا۔ تقسیم سے پہلے میں اس کے پاس ٹھہرا کرتا تھا۔ اب وہ غریب دلی میں ہے اور برے حال میں ہے۔ اس ہوٹل سے میری بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ فلاں فلاں اور فلاں میرے پاس ہوٹل میں آیا کرتے تھے۔ ان دنوں لاہور میں سیدہ نامی ایک رنڈی تھی۔ بلا کی حسین تھی اور پھر

میں نے عرض کیا" اور پھر آگے بھی کچھ کہیے۔"

معلوم ہوتا ہے۔ تم بڑے کُند ذہن ہو۔

ادبی دُنیا کے سامنے جوش صاحب کا باقاعدہ تعارف سب سے پہلے بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کرایا تھا۔ "رُوحِ ادب" پر "معارف" میں بڑا اچھا تبصرہ لکھا۔ مولانا اُن دنوں اپنے دلکش اور فلسفیانہ مضامین لکھنے کی وجہ سے بڑے ہی ہر دلعزیز تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ مولانا نئے نئے مُسلمان ہوئے تھے۔ یعنی ان کا الحادی دور ختم ہو چکا تھا۔ جب کوئی نیا نیا مُسلمان ہو تو وہ دو ہزار رکعت پڑھنے کو بھی کوئی بڑی بات نہیں سمجھتا۔ پھر ایسے زاہد، جو ہر وقت مثنوی مولانا روم بغل میں دبائے رکھتے ہوں۔ وہ اگر اس رندِ خراباتی کی تعریف کریں تو اپنی جگہ بات کچھ کم اہم بھی نہ تھی۔

بات یہ ہے کہ مولانا ماجد علم اور ادب کے رستے سے مذہب کی طرف لوٹے تھے۔ اس لیے انھوں نے ادیب کو ادیب کی حیثیت سے پہچانا۔ آج مولویوں کا دکاندار طبقہ ادب کو جس طرح مُسلمان بنانے کی فکر میں ہے۔ اُس میں ادیب کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔

مولانا ماجد ہی نے سب سے پہلے انھیں مصورِ جذبات لکھا اور شاعرِ انقلاب مولانا ظفر علی خاں نے کہا۔ شبابیات پر لکھا تو یہ شاعرِ شباب بھی بنے۔ انھیں سب سے پہلے شاعرِ شباب کس نے کہا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

جوش صاحب جلسوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ چند بے تکلف دوست ہوں تاکہ برجستہ اور برملا گفتہ بات کہی جا سکے۔ باتیں کرنے کی حد تک، شعر سنانے کی حد تک، ان کی نگاہیں صرف بے تکلف دوستوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ حاضرین میں غیر مانوس شکلیں ہوں گی تو انھیں شعر سنانے میں ہچکچاہٹ ہوگی۔ بعض اوقات غلط قسم کے ماحول میں کلام سنانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اصرار ہوگا تو ایسے جملے بھی کہہ گزریں گے جو دلآزاری کے ذیل میں آتے ہوں۔

ایک دفعہ یہ اپنے چند بے تکلف دوستوں میں بیٹھے چہک رہے تھے۔ لہک رہے تھے۔ بڑے اچھے موڈ میں تھے اور اپنا کلام ترنم سے سُنا رہے تھے (ان کا کلام گھن گرج والی آواز میں تو سب نے سُنا ہوگا مگر ترنم کے ساتھ سننے کا اتفاق کبھی کبھار ہی ہوتا ہے)

ایسے میں دو تین صاحب آن وارد ہوئے۔ جن سے جوش صاحب واقف نہ تھے۔ پہلے تو انھوں نے عینک میں سے ان حضرات کو بڑے غور سے دیکھا۔ جب انھوں نے السلام علیکم کہا تو انھوں نے بڑے زور سے لاحول ولا قوۃ! کہہ کر اپنی بیاض بند کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ جوش صاحب چپ کیوں ہو گئے؟

پھر کہنے لگے "میں اس وقت تک شعر نہیں سناؤں گا۔ جب تک کہ فاسد مادہ نکل نہیں جاتا۔"

حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ شعر نہ سنائیے مگر اس شعر کا مطلب تو سمجھا دیجیے۔ غالب کے نسخہ حمیدیہ میں ایک شعر ہے۔

جوش صاحب نے پوچھا۔ "کونسا بدمعاش شعر ہے وہ!"

شعر ہے:

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت ایک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

جوش صاحب نے کہا: "یہ شعر غالب کا ہے تو ہوا کرے۔ ہم اس کو شست سے [illegible] ہوں گے۔ مگر یہ شعر دلالت معنی کے لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ یہ دلالت معنی کے اعتبار سے اس شعر کو کمزور کہتا ہوں جس کا مفہوم میرے ذہن میں نہ آ سکے۔ اور آپ کے ذہن میں کچھ آئے۔ یہ شعر مکمل نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ غالب فارسی میں سوچا کرتے تھے اور اردو میں شعر کہا کرتے تھے۔ مگر غالب یہی شعر فارسی میں کہتے تو وہ اپنے مفہوم کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کر جاتے۔ مگر قطار و شمار کچھ نہیں ۔۔ غالب کے اور بھی متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جو نامکمل ہیں۔ جن میں معنا اپنا مفہوم ادا نہ کر سکے اور ہم لوگ خواہ مخواہ ان میں معانی پیدا کر رہے ہیں۔"

جیسا کہ اس کے دوران قیام (۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۵ء) فانی مرحوم نے جوش صاحب کو ایک عجیب سی لت لگا دی تھی کہ یہ گھنٹوں غائبانہ روحوں سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ پہلے کچھ پڑھا۔ درمیان کو عیسوی بخشی تو روحیں موجود ہو جاتی تھیں۔ اب یہ بیٹھے ان سے مختلف سوال کر رہے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا ـــ "آپ نے کسی شاعر کی روح کو بھی بلایا تھا؟"

"ہاں غالب کو بلایا تھا۔"

"پھر کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

"میں نے پوچھا۔ "آپ کا نام؟"

کہنے لگے: "غالب مغلوب!"

"پھر آپ کے مزار پر گیا تھا۔"

"میرا قیام مزار میں نہیں۔"

"بادہ نوشی کا کیا معیار ہے آپ کے نزدیک؟"

"اسے میاں! ظرف لازم"

"آزاد انصاری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میرے پوتے ہوتے ہیں۔ ان میرے شاگرد کے شاگرد جو ہوئے۔"

"ساری عمر آپ وصل کی تمنا کرتے رہے۔ اب تو مقصود مل گیا ہوگا۔"

"اسے جوش! ہم تو یہاں بھی یاد جاناں کے مشغلے میں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے پوچھا ـــــــ "اور کسے بلایا تھا؟"

"ٹیگور کی روح کو بلایا تھا۔ اس نے مجھے سارے جواب ہندی میں دیے۔ حالانکہ میں ہندی نہیں جانتا۔ ایک دن فانی نے رنڈیوں کو بلایا تھا۔ کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ سب کہتی تھیں۔ ہم مزے میں ہیں۔"

پھر اس واقعہ پر تبصرہ یوں کیا: "یہ سب فریب ہی فریب ہے۔ ہر انسان کے اندر خوابیدہ حالت میں سب کچھ موجود ہے۔ دیکھ لینا کچھ عرصے کے بعد اندرونی علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہوں گی۔ استاد بھی اپنے شاگرد کے اندر کی گرہیں کھولتا ہے۔ جس میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے

وہ میرؔ غالبؔ اور انیسؔ بن جاتا ہے۔ جس میں کم صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ نوحؔ ناروی بن جاتا ہے۔

نگار کے صفحات پر، جوشؔ ملیح آبادی کے خلاف کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہا ہے۔ وہ بھی زیادہ تر نیاز صاحب کے قلم سے' میں یہاں جوشؔ صاحب کا ایک خط (جو نگار ہی میں چھپا تھا) اور ایک اخبار کا تراشہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ تاکہ ان دونوں کی ناراضی کا تھوڑا بہت پس منظر سامنے آجائے ——— اور اس کے ساتھ ان دونوں کے کرداروں پر بھی روشنی پڑے۔ بشرطیکہ آپ کا بھی ایمان ہو، کہ تحریریں بھی صاحب مضمون کی باطنی کیفیات کا اظہار ہوتی ہیں۔

خط بھی پڑھیے۔ مگر اس پر جو نوٹ نیاز صاحب کا ہے۔ وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ دیکھیے بڑے آدمی لڑتے بھی ہیں تو کس شائستگی کے ساتھ!:-

○ حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا ایک طنزیہ شاہکار

○ نثر میں جواہر ریزوں کا ایک عدیم المثال نمونہ

یہ تھے عنوان اور ضمنی عنوان! ——— اب نوٹ ملاحظہ ہو:

رُوح وُہی ایک ہے پاک و شرافت مآب
نظم میں زیرِ حجاب' نثر میں بے نقاب

پہلی جولائی ۱۹۵۵ء کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا۔ جس پر میرا پتہ "نیاز محمد خاں فتحپوری دفتر نگار لکھنؤ" درج تھا۔ دیکھ کر حیرانی ہوئی کیونکہ مجھے نیاز محمد کے نام سے پکارنے والوں میں اب میری صرف بڑی بہن باقی رہ گئی ہے۔ جو یہاں نہیں پاکستان میں ہیں۔ لفافہ کھولا تو ایک مضمون نظر آیا۔ جس کے آخر میں جناب جوشؔ کے دستخط ثبت تھے۔ اس کو پڑھ کر حیرت مسرت میں تبدیل ہوگئی کیونکہ مضمون کیا تھا ایک آبشار جواہر تھا اور بے اختیار سعدیؔ کا یہ شعر زبان پر آگیا ؎

لعبت بدیدیم و لعلم بیوفتاد از چشم
سخن بگفتی و قیمت برفت لولو را

لیکن اس کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ ہم اپنی کم مایگی کے باعث شایانِ شان اس کی داد نہ دے سکے ؎

ہیہات کہ چو نوش شبانے'
تشریف دہد در آشیانم

ہمیں امید ہے کہ حضرت جوشؔ آئندہ بھی اپنے "انشائے عالیہ" اور "افکارِ نادرہ" سے اسی طرح نگار کو زیر بارِ کرم فرماتے رہیں گے۔

من چہ در پائے تو ریزم کہ خورائے تو بود
سر نہ چیزے ست کہ شائستۂ پائے تو بود

نیازؔ

"ہمارے سپاہیوں میں' یادش بخیر' ایک تھے۔ ستر بہتر برس کے ناتواں' لیکن جاہ کے تیکھے اور کڑوے مؤسلم ٹھاکر" اللہ بخشے

ہدایت اللہ خان اور ہمارے قرابت داروں میں ایک تھے (ہدایت اللہ خان اور ریاست کے وارث تھے خلیل اللہ خان)

خلیل اللہ خان تو ابھی زندہ ہیں لیکن چونکہ ان کی وہ طاقت باقی نہیں رہی جو پہلے وقتوں کو حاصل ہوا کرتی تھی اور اسی بنا پر وہ سب وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے " کے زمرے میں آ چکے ہیں۔ اس لیے ایک تھے خلیل خان، چنانچہ ایک روز سرِ راہ شتابہ ہدایت اللہ خان کے چند دشمن کا تماشا دیکھنے کی خاطر ان کے بڑے سے ایک سپاہی نے ان سے کہا۔ " ہدایت اللہ خان تمہاری مونچھیں سے تو چیلائیاں ناچ کرتی ہیں۔ مگر تمہیں اپنے پتے کی بھی کچھ خبر ہے۔"

" ہم سے پتے کی کیا بات کہتا ہے " (ہمارے پتے کی کیا بات کرتے ہو) ہدایت اللہ خان نے خوخیا کر جواب دیا۔ اس پر اس سپاہی نے اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھما کر کہا کہ " خلیل خان اللہ تمہارے پتے کو بڑے باغ کی ہوا کھلاتے پھرتے ہیں۔"

" ہم سے پتے کا ؟ (ہمارے پتے کو ؟) ہدایت اللہ خان نے تیوری پر بل ڈال کر کہا اور ان کی سفید داڑھی کے بال سیاہی کے کانٹوں کی طرح یکایک کھڑے ہو گئے۔

ابھی ان کے اعصاب کی کمانیں کم نہیں ہونے پائی تھیں اور ان کے چہرے کی جھریاں آپس میں گتھم گتھا ہو رہی تھیں کہ اتفاق سے خلیل خان محل کے پھاٹک پر نمودار ہوئے اور ہدایت اللہ خان نے، جو انکی کم سنی کے ساتھ، سنا کھڑے ہو کر خلیل خان سے، اپنے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا کہ " خلیل کھان ہم تم سے، یو پوچھت ہیں کہ یو ' تم کا ہمرے کالے پُت میں کا مزا آوت ہے کہ تم اُس سالے کو باگن باگن کی ہوا کھلات پھرت ہو " (خلیل خان ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم کو ہمارے کالے پوتے میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اُس سالے کو باغوں باغوں کی ہوا کھلاتے پھرتے ہو)

اور قبل اس کے کہ مسکراتے ہوئے خلیل خان کچھ جواب دیں۔ ہدایت اللہ خان نے اپنے سوکھے ہاتھ میں لاٹھی بلند کر لی۔ یہ دیکھتے ہی دوسرے سپاہی اور خدمت گار دوڑے اور ایک نے ان کی لاٹھی پکڑ کر کہا۔ " کمانیں کہاں گئے ہو ہدایت اللہ خان، مگر خان صاحب بہادر کو خبر ہو گئی۔ تو جانتے ہو کہ اس بڑھاپے میں تمہاری کیا گت بنا دی جائے گی۔"

غرض کہ اس روز کا یہ ہنگامہ رفت گزشت ہو گیا۔ لیکن ناعاقبت اندیشی و کینہ پرور بڑھا تھا کہ بھول جانے یا معاف کر دینے والا انسان ہی نہیں تھا۔

چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن وہ بڑھا بیٹا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا، بڑے باغ پہنچ کر " کاٹے " پر جا بیٹھا ——— اور جب اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ خلیل خان، حسبِ دستور، ہدایت اللہ خان کے " کالے " پوتے کو لیے ہوئے بڑے باغ میں نمودار ہوئے تو اس پر جلنے ہوئے بڑھے نے ڈپٹ کر آواز دی کہ " خلیل کھان، بڑے ہی ذات ہو تو آؤ، اور دو دو ہاتھ کر لیو " (خلیل خان اگر تم بڑے بہادر ہو تو آؤ اور دو دو ہاتھ کر لو۔)

واہ واہ کیا یہ تھر تھراتا نعرہ جنگ سنتے ہی اُن کا پوتا تو، غزالِ وحشی کی طرح، ہو کر بال بچا بھاگ کھڑا ہوا اور خلیل خان نے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ " ہدایت اللہ خان تم بوڑھے آدمی ہو۔ میں تم پر کیا ہاتھ اٹھاؤں ہاں تم اپنا حوصلہ نکال لو۔"

" اچھا بڑے جوان بنت ہو " (اچھا بڑے جوان بنتے ہو) کہہ کر ہدایت اللہ خان نے اپنی داڑھی دانتوں میں دبائی اور اپنی پوری

جسمانی و رُوحانی طاقت کے ساتھ یہ یقین کر کے بھرپور لاٹھی ماری کہ پہلی ہی ضرب میں خلیل خاں کا بھیجا بہتا نظر آنے لگا۔

اس "بے پناہ" ضرب کو بڑی ہی آسانی کے ساتھ اپنی لاٹھی پر روک کر خلیل خاں نے کہا "فِش!"

اس غیر متوقع حیرت ذلت آمیز سے بل کھا کر ہدایت اللہ خاں نے پھس پھس کیا کرتا ہے اور سے (فش فش کیا کرتا ہے اور سے) کا نعرہ بلند کر کے دوسری لاٹھی ماری۔

خلیل خاں نے اس وار کو بھی روک کر کہا۔ "فِش!"

اے پھس پھس کا کرت ہے اور سے۔ گستاخ، "فِش!"

اے پھس پھس کا کرت ہے اور سے۔ گستاخ "فِش!"

اے پھس پھس کا کرت ہے اور سے۔ گستاخ۔ "فِش!"

الغرض خلیل خاں کی "فِش" اور ہدایت اللہ خاں کی "پھس پھس کا کرت ہے اور سے" نے اس قدر طول کھینچا کہ ہدایت اللہ خاں کا دم پھول گیا۔ اس دم پھولنے میں بھی آخری بار "پھس ــــــ پھس ــــــ کا ــــــ کرت ہے" کہہ کر وہ بے چارے دھڑام سے گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔

سُنتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہرایا کرتی ہے۔ چنانچہ بالکل اُسی طرح ایک فتح پُوری نیاز محمد خاں عُرف "نگار" ایک ملیح آبادی شبیر حسن خاں عُرف "نگار باز" بھی پچیس تیس برس تک یہی فِش اور "پھس پھس کا کرت ہے اور سے" کا کھیل کھیل کر ابھی چند ماہ ہوئے فارغ ہوئے ہیں۔

اور اس وقت صُورتِ حال یہ ہے کہ نئے فتح پُوری ہدایت اللہ خاں، "استاد کے" بھرے باغ" میں چاروں شانے چت بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور نئے ملیح آبادی خاں "شکر خورے کو شکر" اور موذی کو ٹکر کی زندہ مثال بنے ہوئے فتح پوری کی ندرو شہرتِ استاد کو ہدایت اللہ خاں کے کانے پہنتے" کی طرح "ہاتھوں ہاتھوں" کی ہوا کھلاتے پھر رہے تھے۔

جاہلانہ استاد ــــــ مُردہ باد!

غیظ ناتوانی ــــــ مُردہ باد!

احساس کمتری ــــــ مُردہ باد!

بغض للّٰہی ــــــ مُردہ باد!

"پھس پھس کا کرت ہے اور سے" ــــــ مُردہ باد!

والسلام جوش

اس خط میں نیاز صاحب کا بھی کردار واضح ہے اور جوش صاحب کا بھی، نیاز صاحب کا اس لیے کہ انھوں نے اس خط کو ایک ادبی شاہپارہ سمجھ کر اپنے پرچے میں جگہ دی اور یہ نہ سوچا کہ بیٹھی ہوگی۔ جوش صاحب کا کردار یہ کہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں بھی

مولانا [illegible] منقبیات کا سہارا لیا۔

اس خط میں جوش صاحب کا کمال اِتنا ہے کہ انھوں نے اپنی شکایت کو خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ مگر نیاز صاحب کا ظرف دیکھیے کہ انھوں نے اس نگالی نامہ کو اپنے پرچے میں جگہ دی۔

نیاز صاحب نے جس بُرائی کا ثبوت ۱۹۳۸ء میں دیا تھا۔ دیسی ہی بُرائی کا ثبوت جوش صاحب نے ۱۹۵۵ء میں آکر دیا۔ جوش صاحب کی وہ تحریر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا:

"یادش بخیر! یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف "روحِ ادب" شائع ہوئی تھی اور میں اس زمانے میں آگرے گیا ہوا تھا۔ جہاں لطیف علی بیگ احمد صاحب کے دانش کدے پر حضرت نیاز سے مجھ کو پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں بیراگی کی طرف جا رہا تھا اور نیاز صاحب آغازِ پیری کی طرف مُڑنے والے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ نیاز صاحب نے اس ملاقات میں میری اس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم "جنگل کی شاہزادی" کی جی کھول کر داد دی تھی۔ اور "روحِ ادب" پر تبصرہ کا بھی وعدہ کیا تھا جو کبھی ایفا نہ ہو سکا۔

اُس زمانے میں نیاز صاحب داڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے مُنہ پر داڑھی مجھ کو اچھی نہیں لگی تھی اور یہ بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں نیاز صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیاز صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے؟ اس وقت میرے پاس ذہانت کے سوا اور تھا ہی کیا۔

میری جھولی میں تو آج بھی بقدرِ وسعتِ علم و فکر کی پونجی نہیں ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تو مجھ پر علم و فکر کی پرچھائیں تک نہیں پڑی ہوگی۔ نیاز کا سا آدمی مجھ کو منہ کیوں لگاتا۔

اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدرآباد (دکن) میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی اور میں نے ان کو ان کے میزبان جوش صاحب والا کی میت اپنے گھر مدعو کیا۔

ہزار افسوس کہ میری وہ مخلصانہ دعوت میرے ایک قرابت دار دوست کی بے پناہ بدمستی اور شرمناک فحش کلامی کی بنا پر غارت ہو کر رہ گئی۔

وہ میری زندگی کی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ اس دعوت میں میرے دوست کی شرافت سے گری ہوئی فحاشی کی بنا پر نیاز اور جوش دونوں کو میری جانب سے بدگمانی پیدا ہو گئی کہ یہ سب کچھ میرے ایما سے ہوا تھا۔

اس بدگمانی کی شکایت نیاز صاحب سے نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ جس نامراد قوم کے ہم افراد ہیں وہ اس قدر اوچھی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بڑی کمینی بڑھ چڑھ کر کمینگی کا ارتکاب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس رات کے بعد ہمارے تعلقات کی دُنیا میں سویرا ہو گیا۔ نیاز صاحب مجھ سے بگڑ گئے۔

نیاز صاحب پٹھان آدمی ہیں۔ میں بھی خیر سے پٹھان ہوں اور ظاہر ہے کہ مشتعل ہو جانے کے بعد پٹھان کے امکان سے یہ بات خارج ہو جاتی ہے کہ وہ علتِ اشتعال تک پہنچنے کی زحمت گوارا فرمائے"

نیاز صاحب کی بدگمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک نگار کے ہر پرچے میں وہ مجھ پر طنز کرتے رہے اور اس کے بعد ہر چند، ہر پرچے میں تو میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا لیکن جب بھی ان کو موقع ملا۔ اُنھوں نے میرے خلاف لکھنے میں کبھی ایک بار بھی تساہل سے کام نہ لیا۔

ہر چند میں اس وقت جوان اور سریع الاشتعال جوان تھا۔ لیکن نیاز صاحب کے کسی ایک مضمون کا بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی۔ لیکن اپنے دوست اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سنانے کے بعد اس کو بھی شائع نہیں کیا۔ اور چاک کر کے پھینک دیا۔ مضامین کے علاوہ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لوگوں کو میرے خلاف بڑے بڑے مدلل خط لکھے۔ جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس نگر میں دھونی رما کر بیٹھا تھا وہیں دفن کر دیا جاتا۔

پھر بھی نہایت واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیاز صاحب کے اس فرطِ غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں تھی۔ کون معاف کر سکتا ہے کہ ایک ایسے فرومایہ شخص کو جو اپنے دوستوں کو خود اپنے گھر بلا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے مجھ کو ایک ایسا شخص تسلیم کر لیا تھا اور اس لیے اُنھوں نے میرے باب میں جو کچھ بھی کیا۔ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

اب یہ بھی سن لیجیے کہ میں نے کیوں جواب نہیں دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات کا سو فی صد یقین تھا کہ اگر میرے کلام میں جان ہے تو دُنیا کی کوئی قوت اس کو دبا نہیں سکتی اور اگر جان ہی نہیں ہے تو ایسے بے جان کلام کی حفاظت کرنا سراسر تضیعِ اوقات ہے اور اس کی دُوسری وجہ یہ تھی کہ اس اُبلتی جوانی اور اس اُبلتی جوانی کے گرجتے برستے اشتعال میں کس کی مجال تھی کہ گھنیری زلفوں کی چھاؤں سے نکل کر جواب نویسی کی دھوپ میں آ کر بیٹھ جاتا۔

اس فصل میں اس درجہ رہا ہے خود و سرشار
مےخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

اس لیے میرے جواب نہ دینے کو براہ کرم میری شرافت پر محمول نہ فرمایا جائے کہ:

بنیاد تھی اس کی نوجوانی میری

بہر حال اب وہ طوفانی دور باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم دونوں صاحب و حضرت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ناقابلِ برداشت بوڑھے۔ سریع الاشتعال جوانیاں ہم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو چکی ہیں۔ ہمارے سروں کے بال گر چکے ہیں۔ لیکن کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا اکھوا پھوٹ آیا ہے۔

اس منزل میں ہمارے واسطے یہ نازیبا اور شرمناک حد تک نازیبا ہے کہ ہم اپنی پرانی یادوں اور طفلانہ جذبات کی بنا پر امرِ حق پر پردہ ڈالنے کا ارتکاب کریں۔ اس لیے کامل ذہنی سکون اور دیانت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت نیاز چند اُن گنے استثنائی افراد میں سے ہیں۔ جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں یہ دوں پرور آسمان ازل سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آ رہا ہے۔

جب یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے خلاقی کے شہر آباد ہیں، اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور

جوش و نگہ کی تشبیہ شعلہ ہا تیں اُتری ہوئی ہیں تب بے ساختہ یہ چاہتا ہے کہ ان کو گلے سے لگالوں

کاش نیاز فتحپوری کا سا خلاق طرز انشاپرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے

اُسے وہ عشق ہو زنے میں ہو دیوانوں کے "

یہ مضمون کچھ "موازنہ جوش و نیاز" قسم کی چیز بنتا جا رہا ہے۔ میں نے اس نقوش سے بچنے کی کوشش تو کی مگر بچ نہ سکا۔ پیچ پیچیدہ جان بوجھ کر اس "زیادتی" کا مرتکب ہوا۔ مجھے جانے بوجھے سے نیاز اور جوش کی شخصیتوں کو نمایاں واضح کرنے کے لیے ایسا کرنا ہی تھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ نگار میں جوش صاحب کے خلاف خوب خوب لکھا گیا ـــــ یہ سب جانتے ہیں کہ غصہ اور ضد کی بنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ پانی پر تنکے کی دیواروں سے زیادہ زندگی نہیں پا سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز صاحب نے جوش صاحب کے خلاف جتنے بھی حصار باندھے وہ ان کی شہرت کے سیلاب کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

اللہ کا شکر کہ ۴۰ برس کی ناچاقی کے بعد کہیں اب جا کر کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا انکھوا پھوٹا: ـــــــ اور یوں دونوں جو ملے ہے ـــــ

جوش صاحب کی ایک کمزوری لغات بھی ہے۔ ذرا ذکر چھیڑیئے تو پھر دیکھیں کہ کیا کچھ ارشاد نہیں ہوتا۔ کیا کچھ رونا نہیں روتے۔ مثلاً: "بڑا ابا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آکسفورڈ ڈکشنری کی طرز پر لغت تیار ہو۔ پچاس برس میں تو وہ لغت تیار ہوئی تھی۔ پھر اس میں ۲۵۰ اسکالروں نے بلا معاوضہ کام کیا تھا۔

میں چاہتا ہوں، ہر لفظ کا صحیح استعمال بتایا جائے۔ مثلاً رونے کی کئی کیفیتیں ہیں جیسے سسکی، ہشکی، ہچکی۔ جب تک ان کی آواز کے فرق کا پتہ نہ چلے، بات نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ ایک لغت کے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈر مشین بھی ہو جو سسکی، ہشکی اور ہچکی کا فرق بتلائے۔

پھر ابھی بے شمار نئے الفاظ کی ضرورت ہے۔ جو ابھی تک بنے ہی نہیں۔ مثلاً آزار بند ڈالنے والی لکڑی کا کوئی ایک نام نہیں ہے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ آزار بند ڈالنے والی لکڑی دینا۔ اس کے لیے میں نے "کرلی" کا لفظ بنایا ہے یا "آزار کش" بھی ہو سکتا ہے۔

پھر سونے کے لیے ایک لفظ خواب ہے۔ اس ایک لفظ کی مختلف کیفیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے ۲۵ لفظ بنائے ہیں مثلاً پڑھتے ہوئے نیند آ جائے تو اس کے لیے میں نے "خواب مطالعہ" کا لفظ بنایا ہے۔ ریل میں نیند آ جائے تو اس کے لیے "خواب حرکت"۔ مطلب یہ ہے کہ اردو کو اتنے الفاظ دیے جائیں کہ اس کی ہر ہر کیفیت کو ظاہر کریں۔

پھر الفاظ میں بھی خاندان اور قبیلے ہوتے ہیں۔ نہیں الفاظ کو آپس میں ملاپ کرتے ہوئے، اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی لفظ نیچ خاندان کا تو نہیں۔ مگر اس کا خیال نہ رکھا گیا تو خاندانی الفاظ کی نسل تباہ ہو جائے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ بعض الفاظ پردہ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ بڑے پیار سے ساتھ گھونگھٹ اٹھا دیا جائے۔

میرے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ جو بیٹری سے چلتا ہے۔ جوش صاحب ترنگ میں تھے۔ میں نے اسے آن کر دیا اور انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ آواز ملاحظہ ہو:

"مسلمانوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے۔ نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ جنت ملے گی۔ اس تاجرانہ ذہن کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھے کام اس لیے کرنے چاہئیں کہ اس سے اپنا اور دُوسروں کا بھلا ہوتا ہے۔

"اللہ کی معرفت بڑا زہر پایا گیا ہے۔ جہاں تک ہو سکے آدمی کو مذہب سے دُور رہنا چاہیے اور اگر کوئی مذہب قبول کرنا پڑے تو اسلام قبول کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس میں سب سے کم وہم ہیں۔

مادی اور رُوحانی پہیوں کے ساتھ ساتھ جب تک ایک پہیہ نفسیات کا نہ لگے گا۔ اس وقت تک بات کھل کر سامنے نہ آسکے گی۔ ایسے سوال نے جو "کن فیاکون" کہا تو بہت بڑی بات کہی۔ رسول کی بڑائی سے کوئی بھی انسان منکر نہیں ہو سکتا پر رسول نے جو باتیں کہیں۔ وہ اُس وقت کے لوگوں کے ذہن اور اُن کی بساط کے مطابق کہیں۔ مگر وہ باتیں آج بھی اتنی ہی اہم ہیں۔ یہ بڑائی ہوتی ہے ایک پیغمبر کی۔"

کسی نے ٹوکا۔ "جناب قرآن کی باتیں رسول کی باتیں تو نہیں ہیں۔ انہیں آپس میں گڈمڈ نہ کریں۔"

اس پر جوش صاحب نے یہ شعر پڑھا:

کھل کر کہوں تو کفر کے فتوے لگائے خلق

وہ ارتقائے نوعِ بشر دیکھتا ہوں میں

اور اس کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت یوں فرمائی ——— "جانو! کچھ عرصے کے بعد انسان موت پر بھی قابو پالے گا۔ اس لیے کہ جتنی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ وہ اگر بحال رکھی جا سکیں تو موت کا وجود نہ رہے گا۔

"وہ جو آپ کے ایک دوست پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ ادب پڑھاتے ہیں۔ موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ مجھے ایک دن کہنے لگے: جوش صاحب میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے انہیں ڈانٹ دیا کہ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ سوال کیا جاتا ہے۔ پوچھا نہیں جاتا۔"

پھر اُنھوں نے کسی بات پر کہا ——— "پھر؟"

میں نے کہا۔ "پھر کا جواب پھر!"

پھر تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے کسی بات پر کہا: "کیوں؟"

میں نے کہا۔ "کیوں کا کوئی جواب پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ کی نوبت آتی ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد، جوش صاحب نے فرمایا۔ "ایک علامہ یہ ہیں۔ ایک علامہ وہ تھے۔ یعنی علامہ عبداللہ عمادی! جو بات کسی ترازو کا تول، ہر مشکل کا حل موجود! ——— ایک دفعہ ہم علامہ کو رنڈی کے کوٹھے پر لے گئے۔ مولانا سے جیسے موقع بن کر عرض کیا۔ "مولانا! میرے ایک دوست کے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ تشریف لے جائیں گے تو میری اور میرے دوست کی عزت افزائی ہوگی۔"

مولانا نے بڑی معصومیت سے فرمایا۔ "مگر یہ بات ہے تو ضرور چلوں گا۔"

مقررہ وقت پر، میں مولانا کو لے کر چلا۔ رنڈیوں کا بازار آیا تو کہنے لگے۔ "ارے جوش یہ تو رنڈیوں کا بازار معلوم ہوتا ہے۔"

"بھائی جان! مگر میرے دوست ذرا الگ بستے ہیں۔" اس طرح ہم نے کئی بدنام گلیوں کے بند مکانوں میں سے گزارا۔ یہ لمبی لمبی سفید نورانی داڑھی، چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، چلنے میں بھاگنے کی سی کیفیت دیکھ کر سبھی متوجہ تھے۔

ایک جگہ میں نے رُک کر کہا: "مولانا! گیا میرے دوست کا مکان!"

"الحمدللہ"

میں نے ایک مکان کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "چلیے!"

مولانا کو شک گزرا کہ یہ مکان بھی اسی علاقے کا حصہ ہے۔ چونکہ وہ کسی پر بدگمانی کرنی جانتے نہ تھے اس لیے فوراً ہی کے بعد سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ آگے آگے وہ، پیچھے پیچھے میں! پہلی منزل پر پہنچ کر مولانا نے کھنکارا تاکہ صاحبِ خانہ کو علم ہو جائے کہ کوئی آیا ہے۔ اُدھر سے نسوانی آواز آئی: "بے تکلف چلے آئیے۔"

مولانا آگے بڑھے تو نائکہ نے نورانی شکل دیکھ کر طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا: "تشریف لائیے۔"

بوکھلاہٹ میں مولانا نے کہا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"آپ کس کو پوچھ رہے ہیں؟"

اس پر مولانا لاحول پڑھتے ہوئے نیچے اُترے۔ اب میں آگے آگے تھا اور وہ پیچھے پیچھے۔ راستہ بھر کہتے رہے۔ "میں تم سے سمجھوں گا ——— میں تم سے سمجھوں گا ——— رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا ——— رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا!"

ان کے علاوہ ——— جوش صاحب کی اور بھی بہت سی باتیں ٹیپ ریکارڈ میں موجود ہیں۔ مگر وہ ایسی نہیں کہ انھیں لکھا جا سکے۔ جو کچھ یہاں تحریر میں آگیا ہے وہی قدرے زیادتی والی بات ہے۔ اس لیے کہ نشے کی حالت میں ان کی جتنی باتیں ہوتی ہیں۔ انھیں کوئی سنجیدہ صورت تو نہیں دینی چاہیے۔

جوش صاحب اپنے دوستوں کی مدد بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ بلکہ اس سلسلے میں دوست دشمن، اپنے پرائے میں کوئی تمیز نہیں رکھتے۔ یہ شوق اس حد تک ہے کہ ایک اسامی کے لیے متعدد سفارشیں کر گزریں گے۔

متعلقہ صاحب کہیں گے۔ جوش صاحب کل آپ نے ایک اور صاحب کی سفارش کی تھی۔ آج اسی عہدے اور اُسی جگہ کے لیے ایک اور صاحب کے لیے کہہ رہے ہیں۔ جگہ ایک ہے۔ لہٰذا یہ فرما دیجیے کہ دونوں میں سے کسے قابلِ توجہ سمجھا جائے۔"

اس سلسلے میں میرا بھی ایک تجربہ ہے۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ "لکھنؤ میں فلاں ادارے نے ہماری کتابیں بلا اجازت چھاپ رکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کیا جائے۔"

"ہاں ہاں ضرور کرو۔ میں تمھیں کمشنر کے نام خط لکھے دیتا ہوں۔ آج ہی لکھنؤ چلے جاؤ اور واپسی پر بتانا کہ کیا ہوا۔ خلیلِ ربّہ انجی العزیز!

حاملِ رقعہ ہٰذا طفیل صاحب مدیرِ نقوش لاہور کو اگر آپ کی اخلاقی امداد کی ضرورت ہو تو وہ انھیں میسر ہو گی۔ اس یقین کامل کے ساتھ یہ چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں۔

موسمِ برشگال کی دھوم دھام یہاں کم ہو رہی ہے۔ لیکن اولیائے خرابات نے اپنی دریا دلی سے اس بُوند بھر ابر و باراں کو جیرون
قلزم سے بھی بڑھا دیا ہے۔

آپ کا پرستار
جوش

صہباگسار، محبوبِ پاکِ پروردگار، مردود دمِ چاریار"

اس خط کے چھپوانے کی بہ ظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ خط میں کوئی خاص بات بھی نہیں۔ مگر جہاں جوش صاحب نے دستخط فرمائے ہوں
ان کے ساتھ جو لکھا "محبوبِ پاکِ پروردگار ـــــــ مردود دمِ چاریار" یہ دونوں باتیں قابلِ غور ہیں۔

یہ خط لیتے وقت، میں نے جوش صاحب سے عرض کیا تھا۔ اب ایسا نہ کیجیے گا کہ وہ صاحب جن کے خلاف آپ نے مجھے یہ خط
لکھا ہے۔ اگر آپ کے پاس پہنچ جائیں تو انھیں بھی اسی طرح کا خط لکھ دیں کہ اس کی مدد کی جائے۔

اس پر ہنسے، مگر بات بنا گئے ـــــــ "اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پھر میں متعلقہ صاحب سے کہتا ہوں ـــــــ الٰہی
ہے جو زیادہ خوبصورت ہو۔ میری سفارش اُس کے لیے ہے۔"

ہندوستان میں، ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ سبھی سے برابری کا ملنا جلنا تھا۔ جواہر لعل نہرو اور ابوالکلام سے
[illegible] مل سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مرتبہ مولانا آزاد سے ملنے گئے تو وہ جواہر لعل سے باتیں کر رہے تھے۔ انھیں انتظار کرنا پڑا۔ چند منٹ
[illegible] کیا تو ان کو پتا یہ تھا سے وہاں مزید رُکنا گوارا نہ کیا۔ کاغذ کے ایک پُرزے پر یہ شعر لکھ کر واپس آنے لگے ؎

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر اور وقت مولانا

[illegible] اور پنڈت جی کی گفتگو ختم ہو چکی تھی یا کیا کہ وہ دونوں کاغذ کا پُرزہ پڑھتے ہی ہنستے ہوئے باہر آ گئے اور جوش صاحب کو اپنے
[illegible] کمرے میں لے گئے۔

اصول کی خاطر، یہ بڑے بڑے آدمیوں کو ڈانٹ دیتے ہیں۔ تکلف نہیں برتتے، ان کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ اس کی
[illegible] ان کے خطوط میں بھی ملے گی۔ جو انھوں نے وعدہ فراموش اور تغافل شعار افسروں اور بڑے آدمیوں کو لکھے۔ مثلاً لکھنؤ کا
[illegible] کمشنر کسی سے نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے اُسے ڈانٹ کے خط لکھا اور یہ بھی لکھا کہ مجھے بھی آپ سے ملنا تھا۔ چونکہ آپ اوروں سے
[illegible] ملتے اس لیے میں آپ سے کیوں ملوں۔ اس خط کا صاحب بہادر پر اچھا اثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے سب سے ملنا جلنا شروع
[illegible] کیا۔

یہی بڑوں سے ملنا انھیں مہنگا بھی پڑا۔ سکندر مرزا سے ان کے تعلقات تھے۔ چیف کمشنر سے ان کے تعلقات تھے۔ انھوں
[illegible] انھیں سبز باغ دکھائے کہ پاکستان آ جائیے ہم آپ کے لیے یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔ جب یہ اُن کی ترغیب پر پاکستان آ گئے تو یہاں
[illegible] اخبارات نے شور مچایا کہ جوش صاحب جو کچھ کر رہے ہیں۔ غلط کر رہے ہیں اور حاکمانِ وقت بھی جو کچھ سوچ رہے ہیں۔ غلط سوچ

سے تھے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکندر مرزا (اُس وقت کے صدر پاکستان) کچھ کر سکے اور نہ چیف کمشنر اور مجھ تک ان کا جوش پہنچ پا
کر "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" والی بات ہوئی۔ یہ غلطی اُنھوں نے اتنی بڑی کی تھی کہ زندگی بھر بھلا نہ سکیں گے۔

غرض یہ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان کے شہری ہو گئے۔ باقی اور دوستوں کی طرح مجھے بھی تکلیف ہوئی۔ میں کراچی گیا دانستہ ان سے نہ ملا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کراچی گیا تھا اور انھیں ملے بغیر واپس چلا آیا تو اُنھوں نے مجھے بڑے دکھ سے لکھا:

حضرت!

آپ کراچی تشریف لائے اور میرے وجود کی نفی کر کے مجھ سے ملنے تک نہیں آئے۔

آپ جب دلی آتے تھے تو ایک خورد کی حیثیت سے میرے پاس ہمیشہ آتے تھے۔ لیکن اب چونکہ میں پاکستانی ہو چکا ہوں اس بنا پر آپ کی نظروں میں اپنی توقیر کھو چکا ہوں۔

آپ اپنے ذی قدر پرچے میں ایسے شخص کا کلام شائع فرما کر رسوائی کیوں مول لیں۔ جس سے اسلامی دنیا منہ پھیر چکی ہے۔

جاؤ! ابھی سے ہٹو بھی، موت کو آنے تو دو
چین سے جینے نہیں دیتے، مر جانے تو دو

جوش

اس خط سے معلوم ہوا کہ جوش صاحب کے دل میں اپنے ملنے والوں کے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے کتنی جگہ ہے بھی معلوم ہوا کہ وہ پاکستان آ کر کتنے افسردہ ہوئے

ایک بار میرے دل میں جوش صاحب کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی۔ خط لکھ مارا۔ جواب آیا:۔

بندہ نواز!

"آپ کو شاید علم نہیں کہ میری ہستی ایک ایسے شیشے کے مانند ہے۔ جس میں نگاہ آرپار ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس امر
ذاتیے کہ اگر میرے دل میں آپ کی جانب سے ذرہ برابر بھی کدورت ہوتی تو میں اس کو آپ پر ظاہر کیے بغیر چین سے بیٹھتا ہی نہیں
اس منفی گفتگو کے بعد آپ کو مثبت رُخ بھی دکھانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ وحشت کے عوض میں اپنے دل میں آپ
جانب رغبت و انس محسوس کرتا ہوں۔

اب رہی میری کوتاہ قلمی اور "جواب خوری" سو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں مراسلت کے باب میں ہمیشہ سے رہا ہوں۔ جو "مرفوع القلم" کہا جاتا ہے۔

چونکہ اس اُفتادِ طبع کے دوش بدوش میری ہول ناک مصروفیت بھی ایسی جان لیوا ہے کہ میکر سر پر دوستوں کے خطوط میں بیٹھی ہوئی تلواروں کے مانند لٹکے رہتے ہیں۔ لیکن جواب لکھنے کی فرصت ہاتھ نہیں آتی۔

آپ کو کاش معلوم ہوتا کہ اس وقت کس قدر اہم فرائض کا خون کر کے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں اور وہ بھی محض اس خیال سے کہ میری مزید خاموشی کہیں آپ کو مجھ سے مزید بدظن نہ کر دے۔

ہاں ان دنوں ایک خاصی طویل نظم "آدمی" کہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بھیج دوں اور ضرور بھیج دوں گا۔ بشرط فرصت!

میری تمنا ہے کہ یہ خط آپ کو تن درست، مطمئن اور شاد کام پائے۔

نیاز مند

جوش

اپنے نام، جوش صاحب کے خط چھپوانے کا مجھے کچھ شوق نہیں۔ متعدد خطوں میں سے چند خط اس لیے چھانٹے کہ ان میں جوش صاحب بنفس نفیس موجود ہیں۔ اس لیے میں نے انھیں آپ سے چھپانا مناسب نہ جانا۔

جوش صاحب مجلسی اخلاق و آداب میں اونچے نظر آتے ہیں۔ (بشرطیکہ وقت شام کے بعد کا نہ ہو)۔ مثلاً کسی شہر میں جائیں گے تو اپنے دوستوں سے ملنے خود جائیں گے۔ یہ امید نہیں رکھتے کہ وہ خود ملنے آئیں۔ اسی ذاتی ضابطے کی بنا پر ایک بار مجھ سے کہا:

"دیکھو بھئی۔ تم جو کل ہمیں اپنے ہاں بلا رہے ہو تو اس میں فیض اور صوفی تبسم کو ضرور بلانا۔ اس لیے کہ ہم ان سے خود ملنے نہ جائیں گے۔"

آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ دونوں حضرت کراچی گئے تھے اور مجھ سے مل کر نہیں آئے تھے۔ اس لیے ہم ان کے پاس خود نہ جائیں گے۔ مگر ہمارا دل ملنے کو چاہتا ہے۔"

ابھی چند مہینے ہوئے کہ لاہور آئے تھے اور اسی دن یہ اعلان فرما دیا کہ کل واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ان کے آتے ہی چلے جانے کا سن کر افسوس ہوا۔ میں نے جواباً کہا۔ کل کی بجائے آج ہی چلے جائیے۔ بلکہ ابھی چلے جائیے۔"

میرے یہ کہنے پر دو منٹ تک خاموش رہے۔ پھر کہا۔ "اچھا کل نہیں جائیں گے۔ ایک دن تمھاری خاطر سے رک جائیں گے۔"

یہ اس شخص کی باتیں ہیں۔ جس نے بڑے بڑے لاٹ صاحبوں کو جوتی کی نوک پر نہیں لکھا۔

اس سے بھی پہلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ جوش صاحب لاہور آئے تھے۔ قائد اعظم کی برسی کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ کو پتہ چلا کہ جوش صاحب بھی لاہور آئے ہوئے ہیں تو وہ مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے ان کے پاس پہنچے۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دیا ——— "میں شرکت سے معذور ہوں۔"

کسی نے کہا۔ "قائد اعظم کی برسی کے سلسلے میں مشاعرہ ہے۔ انکار نہ کیجیے۔ سو باتیں ہوں گی۔"

"باتیں ہوں گی تو ہوں۔ میں بلا معاوضہ نہ جاؤں گا۔ خود قائد اعظم نے مسجد شہید گنج کا مقدمہ لڑا تھا تو مسلمانوں کے لیڈر ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں سے دس ہزار روپیہ معاوضہ طلب کیا تھا۔ میں بھی تو قائد اعظم کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہوں۔"

بانیانِ مشاعرہ بلا معاوضہ بلانا چاہتے تھے۔ قائد اعظم کا نام لے کر سامنے کی اونچ نیچ سمجھاتے تھے۔ مگر یہ طرح ہی نہیں دے

رہے تھے۔ مگر اس وقت جوش صاحب کے ایک دیرینہ دوست مولانا ابوالخیر مودودی نے مسعود صاحب سے چپکے سے یہ کہہ دیا: آپ وقتِ مقررہ پر آ جائیے گا۔ جوش صاحب مشاعرے میں شرکت کریں گے اور بلامعاوضہ کریں گے۔

مشاعرے کا وقت قریب آیا تو مسعود صاحب آن پہنچے۔ جوش صاحب نے ان کی شکل دیکھتے ہی کہا: بھئی مجھے بچاؤ۔ شاعرے والے تو پیچھے پڑ گئے۔

مولانا ابوالخیر نے فرمایا: بچنے کی ضرورت نہیں۔ انھیں میں نے بلایا ہے۔

"کیسے کہہ رہا ہے؟"

"تاکہ آپ کو مشاعرے میں لے جا سکیں۔"

"دوستی کا امتحان نہ لو۔"

"جو کچھ کہیں، اب تو آپ کو جانا پڑے گا۔"

"ابوالخیر تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی، مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جانا پڑے گا۔"

دیکھا آپ نے اس رندِ خراباتی کا یہ رخ، جو کتنا حسین ہے۔ جس میں دوستوں کے لیے قابلِ رشک جگہ ہے۔

ساری دنیا میں یہ مشہور ہے کہ جوش صاحب لالچی ہیں۔ میں نے بھی یہ باتیں سن رکھی تھیں۔ مگر میرے ساتھ انھیں مخلصانہ تعلقات کا دعویٰ بھی تھا۔

جشنِ نقوش کے سلسلے میں (جو انجمن ادبی مسائل (پاکستان) نے منایا تھا) [illegible] صاحب کے علاوہ میں نے بھی خط لکھا کہ آپ تشریف لائیے گا ضرور بالضرور ——— اور یہ بھی واضح کر دیا کہ انجمن صرف آمد و رفت کا کرایہ پیش کرے گی۔ کوئی معاوضہ پیش نہ کر سکے گی۔

جوش صاحب کا جواب آیا:

عزیزم!

"آپ بار بار کرائے کو کیوں لکھتے ہیں۔ بے شک میں لالچی، بہت لالچی آدمی ہوں۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ اگر آپ کرائے کی حقیر رقم نہ مرحمت فرمائیں تو میں آپ کی تقریب میں شریک ہوں۔

یہ بھی کہہ دوں کہ لاہور آؤں گا تو آپ ہی کی خاطر، لیکن آپ کا مہمان نہیں بنوں گا۔ وہاں ایک روز اپنے پاس سے ہوٹل میں ٹھہروں گا جس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا اور یہ بھی کھول دوں تو کوئی حرج نہ ہوگا کہ میں آپ سے کرایہ بھی نہیں لوں گا۔ بابا میں کرائے کا ٹٹو ہوں؟"

نفس ، جوش

اس خط کے ملنے پر بھی خیال یہ تھا کہ جو جی میں آیا خط تو لکھ دیا ہے۔ مگر اتنی گرمی میں آ نہ پائیں گے۔ جون کا مہینہ، جوش سا نازک مزاج پھر ساٹھ برس یافتہ کا بھی نہ تھا۔ مگر دیکھا کہ تقریب سے ایک دن پہلے جوش صاحب لاہور میں موجود ہیں۔ ٹیلیفون کیا ۔ ۔ ۔ ۔ "مردود: مروا دیا نا اتنی گرمی میں ۔۔۔" میں ان کی آواز سن کر خوش ہو گیا ——— انھوں نے نقوش کی تقریب میں پوری دل جمعی سے دلچسپی لی۔

لاہور سے رخصت ہونے لگے تو میں نے انھیں آمد و رفت کے سلسلے میں روپے دلوائے۔ مگر انھوں نے واپس کر دیئے ———

کہا ——— "اس تقریب میں شامل ہونا تو میرے فرائض میں سے تھا۔ روپے پیسے کا کیا سوال!"

ایک اور مشاعرے کے سلسلے میں ان کے ایک افسر دوست نے، جو اتفاق سے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ پہنچے۔ دیکھا تو ڈپٹی کمشنر صاحب اسٹیشن پر موجود نہیں۔ ان کے نمائندے موجود ہیں۔ انھوں نے پوچھا ——— "بھئی خود کیوں نہیں آئے؟"

"ایک ضروری کام میں اُلجھ گئے ہیں۔"

"اچھا تو اسٹیشن پر آنا، غیر ضروری تھا۔"

یہ کہتے ہی اپنا سامان پھر گاڑی میں رکھوا دیا اور اس مشاعرے میں شرکت نہ کی۔ جہاں سے ایک ہزار روپیہ اور آمد و رفت کا کرایہ ملنا تھا۔

دیکھا آپ نے جوش صاحب روپے کے معاملے میں کتنے اونچے ہیں۔

درختوں کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اونچا ہوگا۔ اتنی ہی گہری جڑیں ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے یہی حال اشخاص کا ہے۔ جو شخص جیسا نظر آتا ہے۔ وہ وُہی کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُسے صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا، شخصیت سے آگاہی کے ذیل میں نہیں آتا۔ شخصیت سے آگاہی صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اُتر جائے۔

اقبال ایک مستقبل شناس سیاستدان

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا۔ وہ تاریخ اسلام کا عظیم ترین المیہ تھا۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمانوں کی قوم ایک بے اثر اقلیت بن کر رہ گئی۔ یہ بھی ایک المیہ تھا۔ پٹی ہوئی اقلیت اپنی جاندار اور مؤثر قیادت سے محروم ہو گئی۔ یہ بھی ایک المناک پہلو تھا۔ بہرحال جو ہو چکا وہ ہو چکا کیونکہ ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی اور اس کا قافلہ ہمیشہ مستقبل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ تاریخ کے طالب علم ہوتے ہیں وہ ماضی کے واقعات کو کرید کر دیکھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور حالات کا جو المناک پہلو ہے۔ کیا اس سے گریز ممکن تھا یا نہیں اور نتیجۃً ہمیں پھر اسی قسم کی ٹریجڈی کے درپے ہونا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت علامہ اقبال برعظیم کی وہ پہلی شخصیت تھے۔ جنہوں نے ایک آل انڈیا سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے برعظیم کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک علیحدہ ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔ اور نہ صرف ایک تجویز سامنے رکھی بلکہ اس آئیڈیالوجی کے بھی خدوخال سامنے رکھے۔ جو اس تصور میں کارفرما تھے۔ گویا بھٹکی ہوئی قوم کو ایک نئی راہ دکھائی جس پر چل کر وہ نہ صرف سیاسی آزادی حاصل کر سکتی تھی بلکہ اپنی آئیڈیالوجی کو عمل میں لانے کے لیے اس سے ایک تجربہ گاہ کا کام بھی لے سکتی تھی۔ اور بے شبہ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس کے لیے آنے والی نسلیں بھی ان کی ممنون احسان رہیں گی۔

لیکن میرے نزدیک علامہ اقبال کے کارنامے کا ایک اور پہلو ایسا ہے جو اس لحاظ سے اس سے بھی عظیم تر ہے کہ ان کی دوربین نگاہ نے مستقبل کے پردوں کو چیر کر ان پہلوؤں کو بھی بھانپ لیا جو اپنے جلو میں المناک حادثات اور واقعات کا ایک طویل سلسلہ لیے ہوئے تھے اور نہ صرف بھانپا بلکہ اس کی طرف واضح اشارے بھی کیے اور نہ صرف اشارے کیے بلکہ ایسے عملی قدم بھی اٹھائے۔ جن کی اہمیت کو اگر لوگ بھانپ لیتے تو شاید خون کی ندیاں نہ بہتیں۔ شاید سرحد کے اس پار دھرتی شہیدوں کے خون سے لالہ رنگ نہ ہوتی اور شاید ہندوستان کی عظیم مسلم اقلیت اتنی بے بس نہ ہوتی۔ جتنی بے بس وہ آج نظر آ رہی ہے۔ مستقبل شناسی قیادت کا حقیقی جوہر ہے اور علامہ اقبال میں یہ جوہر بدرجہ اتم موجود تھا۔

اگر ہم ماضی سے نقاب اٹھائیں اور ذرا غور سے حضرت علامہ اقبال کی زندگی کے آخری آٹھ سالوں کا جائزہ لیں تو یقیناً ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حضرت علامہ کے نزدیک برعظیم کے مسلمانوں کے لیے واحد طریق کار یہ تھا کہ ان کی جدوجہد کے دو رخ ہوتے

اول: مسلم اکثریتی صوبوں کی جدوجہد اس مقصد کے لیے کہ وہ ایک آزاد مملکت کا روپ دھار لیں۔ گویا ان کی تحریک آزادی کی تحریک ہوتی۔

دوم: مسلم اقلیتی صوبوں کی جدوجہد اس مقصد کے لیے کہ باقی ہندوستان میں مسلمانوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں جو ایک مؤثر اقلیت کے شایان شان ہوں۔ گویا یہ تحریک تحفظ حقوق کی تحریک ہوتی۔ لیکن ہوا کیا؟ دو تحریکوں نے ایک ہی رخ لے لیا یعنی آزادی کی تحریک۔ اگر یہ سمجھا جاتا کہ برعظیم کی تمام مسلمان آبادی آزاد پاکستان کے ذریعے سے بچ جاتی تو اس میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ لیکن ہماری قیادت جانتی تھی کہ ایسا ممکن نہیں

اس کے بعد جب مسلم اکثریتی صوبوں کے پہلو بہ پہلو مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے بھی پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور بہت بہادری اور جرأت سے لگایا۔ بلکہ یہ نعرہ اس تسلسل اور تواتر سے جاری رکھا کہ عین تقسیم کے وقت تک بلند ہوتا رہا۔ ظاہر ہے اس کے فوراً بعد ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو گلے سے نہیں لگا سکتے تھے اور ان کا ردعمل وہی تھا جو ایک ایسی بپھری ہوئی قوم کا ہونا چاہیے جو جس ملک کی بلا شرکت غیرے ملکیت کی امید رکھتی تھی۔ اس کے ایک اچھے خاصے حصے سے محروم ہو گئی۔ اگر اقلیتی صوبوں کے مسلمان اپنی تحریک کو ایسے نعروں پر استوار کرتے جو اقلیت کو زیب دیتے تو شاید ۴۷ء کے قتل عام اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی میں وہ شدت نہ ہوتی۔ جو ہم نے دیکھی اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

برعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کے بنیادی تضاد کو حضرت علامہ نے ۱۹۲۸ء ہی میں بھانپ لیا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اقلیتوں کو ویٹیج (weightage ۔ تناسب آبادی سے زیادہ حقوق) دینے سے جہاں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ وہاں اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں بدل جاتی تھی اور وہ اپنے گھر میں ہی بے اثر ہو جاتے تھے۔ تو وہ اس سیاست سے بیزار ہو گئے اور انھوں نے مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش سے چند مضامین "انقلاب" میں لکھوائے۔ جن کا عنوان تھا: "ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن"۔ جن میں تجویز پیش کی گئی کہ شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ جب مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنما بعض شرائط پر مخلوط انتخاب کا اصول قبول کرنے پر راضی ہو گئے تو انھوں نے اس متوازی آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری بننا قبول کیا جس کے صدر سر محمد شفیع تھے اور جو نہ صرف جداگانہ انتخاب کی تائید و حمایت میں پیش پیش تھی بلکہ اس امر کا بھی شدت سے مطالبہ کرتی تھی کہ اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت دستور میں تسلیم کی جائے۔ ۱۹۳۰ء کے وسط میں حضرت علامہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اگر برعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کو صحیح خطوط پر چلانا ہے تو مسلم اکثریتی صوبوں کو اپنے مخصوص مسائل حل کرنے کے لیے الگ تنظیم درکار ہے۔ چنانچہ انھوں نے "مسلم آؤٹ لک"، "سیاست" اور "انقلاب" کے ایڈیٹروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس کی تجویز اپنے اداریہ کالموں میں پیش کریں۔ تاکہ حضرت علامہ کے ہاتھ مضبوط ہوں اور وہ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے عملی قدم اٹھا سکیں۔ چنانچہ ۱۰ نومبر ۳۰ء کے شماروں میں تینوں اخباروں نے مقالاتِ افتتاحیہ لکھے۔ جن میں اس رائے کا اظہار کیا کہ:

"جب تک صوبوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار کمزور نہ ہو گا۔ جب تک سندھ اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کو کامل اصلاحات نہیں ملیں گی اور جب تک پنجاب کے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے ذریعے سے اکثریت حاصل نہ ہو گی۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کی زندگی معرضِ خطر میں رہے گی۔"

ان اخباروں نے دردمندانہ منت سے اپیل کی کہ وہ:

"جلد سے جلد شمالی ہند کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد کر کے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے عملی تدابیر کا فیصلہ کریں۔"

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا تھا۔ ۲۳ نومبر ۳۰ء کو حضرت علامہ کی دعوت پر برکت علی اسلامیہ ہال میں اکابر لاہور کا ایک اجتماع منعقد ہوا جس کی صدارت خود حضرت علامہ نے کی۔ اس اجتماع میں یہ حضرات شریک ہوئے: ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین۔ سید محسن شاہ۔ مولوی غلام محی الدین

قصوری، سید حبیب اللہ شاہ، سید مراتب علی شاہ، مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ، میاں فیروز الدین احمد، مسٹر حمید ملک مدیر "مسلم آؤٹ لک"
سید حبیب مدیر "سیاست"، غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک مدیران "انقلاب"، خان سعادت علی خان، حاجی میر شمس الدین، ڈاکٹر
میاں حق نواز، مولوی فضل الدین، ملک محمد دین، فضل کریم، عبداللہ، حبیب اللہ، میر جی، خان صاحب۔ علامہ اقبال نے
کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ مجوزہ کانفرنس میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے مسلم ارکان مجالس
قانون ساز، میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مسلمان ارکان، مختلف اسلامی جماعتوں کے نمائندوں اور دیگر معززین کو شرکت کے لیے بلایا جائے۔
ایک مجلس استقبالیہ بنائی گئی جس کے صدر حضرت علامہ تھے۔ سیکرٹری کے عہدے پر حمید ملک مقرر ہوئے اور خان سعادت علی خان فنانشل
سیکرٹری بنے۔ ایک ہفتہ بعد حضرت علامہ کی کوٹھی پر ایک اور اجتماع ہوا۔ جہاں کانفرنس کا نام آل انڈیا مسلم کانفرنس قرار پایا۔ اور
مسٹر حمید ملک کے ساتھ مولانا سید حبیب کو بھی سیکرٹری بنا دیا گیا۔

یہ تحریک مقبول ہونے لگی۔ سندھ میں سیٹھ عبداللہ ہارون اس کے حق میں زمین ہموار کرنے لگے اور پنجاب کے مسلمان اخبار زور شور
سے پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اس پروپیگنڈے کے انداز کو سمجھنے کے لیے اس دو کالمی چوکھٹے کا متن ملاحظہ ہو۔ جو "انقلاب" میں ہر دو تین دن
کے وقفے کے بعد چھپتا تھا:

پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اسلامی ملک ہیں

ان میں اسلام کا علم بلند رکھو

شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس عنقریب ہونے والی ہے۔ اس
کانفرنس میں پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچی مسلمان جمع ہو کر ان تدابیر
پر غور کریں گے۔ جن سے ان کے علاقوں میں مسلمانوں کے حقوق اکثریت
محفوظ کیے جا سکتے ہیں اور اسلام کا جھنڈا بلند رکھا جا سکتا ہے۔ اگر
ہندوستان میں اسلام کی بقا چاہتے ہو تو شمالی ہند کی کانفرنس میں آؤ۔

اتنے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا الٰہ آباد سیشن ہوا۔ جہاں حضرت علامہ نے وہی تجویز اپنے تاریخی خطبے میں پیش کی۔ جس کو عمل میں لانے
کے لیے یہاں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چند مہینے یہ ہنگامہ جاری رہا۔ لیکن جب حضرت علامہ نے محسوس کیا کہ علیحدہ اسلامی
مملکت کے حق میں کسی بڑے مسلمان رہنما نے ایک لفظ تک نہ کہا تو وہ خاموش ہو گئے اور کانفرنس کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ
[illegible] کے حالات میں ایسے امکانات موجود تھے کہ علیحدہ اسلامی مملکت کا نعرہ حالات ساز گار ہونے پر دوبارہ بلند کیا جا سکتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں حضرت علامہ نے حضرت قائداعظم کے نام جو خطوط لکھے۔ ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ نے
جو کچھ ۱۹۳۰ء میں کہا۔ وہی زیادہ شد و مد سے کہنے لگے۔ یہاں چند اقتباس پیش کرتا ہوں:

اوّل: اسلامی قانون کے ایک طویل اور گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو صحیح طور پر سمجھا
اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے کم از کم قوت لایموت کا حق محفوظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کا نفاذ اس

وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک کہ یہاں ایک آزاد اسلامی ریاست یا آزاد اسلامی ریاستیں وجود میں نہیں آ جاتیں۔ (۲۸ مئی ۳۷ء)

دوم : ان حالات میں ظاہر ہے کہ ایک پُرامن ہندوستان اسی صورت میں ممکن ہے کہ نسلی، مذہبی اور لسانی بنیادوں پر اس ملک کی تقسیم زوعمل میں لائی جائے۔ (۲۱، جون ۳۷ء)

سوم : پنجاب کے بعض مسلمان پہلے ہی سے یہ تجویز پیش کر رہے ہیں کہ ایک نارتھ ویسٹ انڈین مسلم کانفرنس منعقد کی جائے اور یہ خیال تیزی سے پھیل رہا ہے۔

چہارم : آخر شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو کیوں نہ ایسی قومیں قرار دیا جائے جو ہندوستان کے اندر اور باہر کی قوموں کی طرح حق خود ارادیت کی مستحق ہوں؟

پنجم : میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو اس مرحلے پر مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے یہ قدم مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی ——— دونوں قسم کے صوبوں کے بہترین مفاد میں ہے (۲۱، جون ۳۷ء)

نارتھ ویسٹ انڈین مسلم کانفرنس، شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو قومیں قرار دے کر ان کے لیے حق خود ارادیت کا مطالبہ اور مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کرنے کی تجویز میرے اس موقف کو ثابت کرتے ہیں کہ حضرت علامہ مسلم اکثریتی صوبوں کی جد و جہد کو الگ طور پر چلانا چاہتے تھے۔ میرے اس خیال کو اس وجہ سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ کہ جب اگست ۳۷ء کے وسط میں ہم لوگ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے حضرت علامہ سے ملے۔ تو انہی کے مشورے پر اس جماعت کا نصب العین شمال مغربی ہند میں مسلم نیشنل سٹیٹ کا قیام قرار پایا اور انہی کے کہنے پر ہم نے سرحد اور سندھ کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشنوں کا الحاق قبول کیا۔

حضرت علامہ نے جو کچھ کیا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور کی منظوری کے فوراً بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے دو حصے ہو جاتے۔ ایک اکثریتی صوبوں کی لیگ، دوسری اقلیتی صوبوں کی لیگ، دونوں ایک دوسری کا دست و بازو بنتیں۔ لیکن ان کے مقاصد مختلف ہوتے۔ طریق ہائے کار مختلف ہوتے اور نعرے بھی مختلف ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید بعد کے المناک حادثات سے گریز ممکن ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت علامہ زندہ رہتے۔ تو برِ عظیم کے مسلمانوں کی جد و جہد کے دو رُخ ضرور متعین ہوتے۔

اقبال کی انسان دوستی

ڈاکٹر عبد المغنی

اقبال کی شاعری کا موضوع انسان ہے، اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں، اس میں نہ کوئی امتیاز ہے اور نہ انفرادیت، اقبال کے علاوہ بھی بہت سارے شعرو ادبا کا موضوع انسان ہی رہا ہے، اور آج کل تو ہر شخص یہی ہر حلقے کا موضوع انسانیت ہی قرار دے رہا ہے اور جب بات اتنی عام ہو گئی ہے تب اس میں تخصیص کرنی ہی پڑے گی، چنانچہ جہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ بہت سارے افراد زندگی کے بہت سارے گوشوں میں اپنی کوششوں کا مقصود انسان کو بتلاتے ہیں اور اگر وہ نہیں بتاتے تو بہر حال، بعض اوقات غیر شعوری طور پر ہی سہی، اگر کوئی انسان اپنی حدود سے باہر تو جا سکتا نہیں، کسی نہ کسی طور پر اس نے ہر شخص کا مطمح نظر، آخری تجزیے میں، اس کی اپنی ہی ذات ثابت ہوگی۔ لہذا ہمیں اس عمومیت سے صرف نظر کرنا ہی پڑے گا اور موضوع انسانیت کو چند مخصوص حدود میں باندھنا ہی پڑے گا، اس بندش کے بعد ایک معروف حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں رہ جاتا ہے، اب کی چند عظیم ہستیاں واقعی ایسی ہیں جنہوں نے فطرت انسانی کے سربستہ راز کو اپنے جذبہ و الہام سے فاش کرنے کی کوشش کی اور کچھ نہ کچھ روشنیاں ہمیں وجود انسانی کے متعلق دے گئے، مثلاً رومی، دانتے، شیکسپیئر، گوئٹے اور اقبال ایسوں میں سے ہیں۔ جس بات سے اپنے مضمون کا افتتاح کیا ہے وہ اتنی عام نہیں ہے کہ اس میں ہر اس شخص کا ذکر کر دیا جائے جس نے انسان کے متعلق چند بصیرت افروز نکتے دریافت کیے ہیں، حضرت انسان کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتے کی باتیں تو وہ ہر کسی لوگ ہی کہہ نکلتے ہیں جن کا مقصد کسی بھی شکل سے اپنی مرغوب شخصیت کو آشکار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بات در اصل انسان، پورے انسان کو جیسا کہ وہ ہے اس کی تمام داخلی و خارجی کیفیتوں کے ساتھ، شعوری طور پر موضوع سخن بنانے، اس کی تمام کمزوریوں اور توانائیوں، مشکلوں اور صلاحیتوں کو زیر بحث لانے کی ہے، تاکہ کائنات اور حیات کے ساتھ اس کے رشتوں کو واضح کر کے اس کی حدود اور امکانات پر روشنی ڈالی جا سکے، اس طرح اس کے مقصد وجود اور نصب العین کو اجاگر کیا جائے، پھر اس کے ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لے کر اس کے مسائل کے ساتھ ساتھ حل پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان وسیع معنوں میں اب تک دنیا کے کسی شاعر نے انسان کو موضوع نہیں بنایا، بجز اقبال کے، اور ایسا ہونا قدرتی بھی ہے، اتنی تشریح اور تنظیم کے ساتھ انسان کیا، کسی بھی موضوع سے بحث کرنا کسی شاعر کے بس کا روگ بھی نہیں، یہ کام تو ایک فلسفی اور عالم ہی کر سکتا ہے، اور اقبال جو ایسا کر پائے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ نہ صرف عالم اور فلسفی بھی تھے، بلکہ انہوں نے اپنی عالمانہ اور فلسفیانہ حیثیتوں کو اپنی شاعری میں جذب کر دیا تھا، اتنا ہی نہیں، وہ فکر اور فن دونوں دائروں میں مجتہد تھے، صرف قرآن سے [illegible] لے کر اپنے زمانے تک دریافت شدہ علوم و افکار کی تحقیق و تنقید کر کے انہوں نے اپنا ایک مستقل نظام فکر مرتب کیا، اور اس نظام فکر کا بہترین اظہار انہوں نے اپنی شاعری ہی میں کیا اور اس مقصد کے لیے شاعری کے نقوش و علائم اور اسلوب و آہنگ کی بھی تجدید کی، اس کی مثال دنیا کے ادب میں کہیں اور نہیں ملتی، لہذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کا موضوع انسان ہے تو یہ آ

ہی صرف خاص بلکہ خاص الخاص ہو جاتی ہے، یعنی اب عبارت اس طرح ہوتی ہے کہ پورے صفحے میں انسان سے مراد صرف شخص اقبال بن جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنے وسیع پیمانے پر انسان سے شغف گہری انسان دوستی کا اشاریہ ہے۔ اقبال کی انسانیات کسی ماہرِ حیوانیات یا ماہرِ نفسیات کی طول طویل چھیڑ چھاڑ پر مبنی نہیں، اس میں خشک سائنسی انداز اور اعداد و شمار کے سرد تجزیے کو دخل نہیں، اس میں فلسفیانہ نظریہ بازی اور موشگافی کو بھی کار فرمائی نہیں، اس میں سیاسی نعرہ بازیوں اور اقتصادی الجھنوں کا بھی گزر نہیں ——— اقبال کی انسانیات کا محرک و مقصود صرف ایک جذبہ ہے، بنی نوعِ انسان کی ہمدردی اور یہ چیز سراسر اخلاقی یا زیادہ گہرائیوں میں جائیے تو ایک روحانی جوہر ہے اور اگر اس جوہر کو کوئی مخصوص نام دینا چاہیں یا اسے ایک ضابطے کے تحت لا کر دیکھنا چاہیں تو کہیں گے کہ ہم اس ہمدردی کا سرچشمہ مذہبی ہے، خاص کر اقبال تک پہنچتے ہیں تو مذہب کی تخصیص اسلام کے نام سے بھی کر دی جا سکتی ہے، یعنی آخری تجزیے میں اقبال کی انسان دوستی دراصل ان کے اس اجتماعی شعور کا مظہر ہے جس کے تار و پود اسلام کے نظریۂ زندگی سے مرتب ہوئے ہیں۔ اقبال کا اجتماعی شعور بجائے خود ایک مستقل اور نہایت وسیع موضوع ہے۔ یہاں ہم بہت اختصار کے ساتھ چند نمایاں نکتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک کائنات و حیات کسی حیوانی ارتقا کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ سراسر ایک الٰہی تخلیق ہے، پوری کائنات کا خالق ایک باشعور اور با اختیار ہستی ہے، اور پوری نوعِ انسان ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہے، اور حیاتِ انسانی کا ایک واضح مقصد ہے، جس کی تکمیل کے لیے ہی یہ پورا نگار خانۂ ہستی سجایا گیا ہے اور اس تکمیل کے لیے خالقِ ہستی نے خود ایک ضابطہ، ایک نظامِ فطرت تجویز کیا ہے اور اس کا نام بھی خود اسی نے اسلام رکھا ہے۔ اس طرح اسلام درحقیقت کسی فرقے کا پیدائشی دھرم، یا کسی نسل و قوم و ملک کا سرکاری مذہب نہیں بلکہ یہ نام ہے زندگی کے ایک نظریے اور ایک نظام کا، اس کے کچھ اصول اور کچھ ضابطے ہیں، جو انھیں تسلیم کرے اور بجا لائے وہ مسلم ہے اور جو ان سے انکار کرے وہ غیر مسلم۔ چناں چہ اسلام خالص اصولی بنیاد پر ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کے تحت تمام بنی آدم کی ایک نئی وحدت قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں رنگ، نسل، وطن، رتبہ اور اثاثہ وغیرہ کی تنگ اور غیر فطری بنیادوں پر کسی قسم کی تفریق و تمیز روا نہیں رکھی جائے گی، ہر شخص کی حیثیت صرف اس کے انفرادی عمل و کردار کے مطابق متعین ہوگی، اور اس عمل و کردار کا معیار ہوگا — خدمتِ خلق، یعنی ذاتی خوبیوں کا اعتبار اسی وقت قائم ہوگا جب وہ اجتماعی فلاح و بہبود میں معاون ہوں، اس لیے کہ خالق نے ہر انسان کو انفرادی طور پر، اس زمین پر اپنا نائبِ سلطنت مقرر کیا ہے، لہٰذا ہر فرد کی یہ خلقی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق عالمِ انسانیت کی درستی اور بہتری کے لیے انتہائی حد تک کوشش کرے، اور اگر اس کوشش میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کا خسارہ اس کو برداشت کرنا پڑے گا، یہ دنیا دار العمل ہے، یہاں عمل اور ردِ عمل کی بنیاد پر ایک قانونِ مکافات جاری ہے، اور انسان کی زندگی صرف اسی خاک دان تک محدود نہیں، موت اک زندگی کا وقفہ ہے، اور اس دنیا کی زندگی بس ایک مہلت کا ہے، اس کے بعد ایک دوسری دنیا ہے، جہاں ہر شخص کی حیثیت اس کے ان افکار و اعمال کی بنا پر متعین کی جائے گی جو اس نے اس دنیا میں کیے اور سہے ہیں، اور وہ دنیا ایک پائدار دنیا ہوگی جس کے ایام کی کوئی حد متصور نہیں، چناں چہ جو کچھ غلط یا صحیح ہم یہاں کریں گے اس کے برے یا اچھے نتائج ہمیں ایک لامحدود زمانے تک بھگتنے پڑیں گے۔

اس طرح اقبال کی انسان دوستی اپنے اندر ایک حقیقت اور فریضے کی گرم جوشی اور سرگرمی رکھتی ہے۔ اقبال انسانوں کے دوست اس لیے ہیں کہ وہ خود اپنے دوست ہیں، انسان دوستی ان کا مقصد وجود اور وظیفۂ حیات ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کا فلسفۂ خودی ان کے اپنے افکار کی عملی شکل انسان دوستی ہی میں پاتا ہے اور خودی کا مفہوم یہ تسلیم ہوگا کہ انفرادی شعور کی تربیت اور کامل تہذیب ہے اجتماعی کا، یعنی ایک فرد اپنے دل و دماغ اور دست و بازو کی مدد سے اخلاقی و مادی پرورش اس مقصد سے کرتا ہے کہ اقوام عالم کی ترتیب یافتہ قوتوں سے عام انسانیت کی خدمت جاری رہے۔ ورنہ اقبال نہ تو اس کے قائل ہیں کہ کوئی فرد کسی خانقاہ میں چلّے پر چلّے کھینچ کر اپنے نفس کو زیادہ سے زیادہ فرشتہ اشباہ کرتا چلا جائے، اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ کوئی فرد اپنی قوتوں کو ابھار کر دوسروں پر غالب آجائے اور ان پر مطلق ہو بیٹھے۔ اقبال کی خودی کی معراج ہے خلافت فی الارض، اور اس خلافت کا جو معیار اقبال نے تجویز کیا ہے وہ فقر ہے نہ کہ شہنشاہی اور اس فقر کے نمونے اقبال نے اسلامی تاریخ کے مقدس ترین عہد خلافت راشدہ سے پیش کیے ہیں ـــــ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ ـــــ وہ سب کے سب جس اصول پر عمل پیرا تھے وہ یہ تھا: "سید القوم خادمھم" (قوم کا حاکم، قوم کا خادم)۔ اس طرح انسان دوستی اقبال کے تصور میں فقط درد مندی کا ایک انداز نہیں بلکہ درحقیقت انسانیت کا معیار کمال ہے، جو انسان جتنا زیادہ صاحب قوت اور صاحب اختیار ہوتا جائے گا اتنا ہی زیادہ اس پر انسان دوستی کا فرض عاید ہوتا ہے، اور اس فرض کی کماحقہ ادائیگی اسی وقت ہوگی جب انسان کو ذہنی و مادی وسائل کے مطابق لامحدود درجے کی قوت حاصل ہو جائے اور اس قوت سے صحیح استعمال اور صاحب قدرت کی کامیابی یا ناکامی کی جانچ بھی اس کسوٹی پر ہوگی کہ اس نے انسان دوستی کا حق کہاں تک ادا کیا۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالم گیر ہے مردانِ غازی کا

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

جس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

انسان دوستی کے اس بلند معیار سے جب اقبال نے اپنے زمانے کے عالمِ انسانیت پر نگاہ ڈالی تو انھیں بہت صدمہ اور بڑی تشویش ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ سترھویں صدی سے بیسویں صدی تک، صرف دو ڈھائی سو سال کے اس عرصے میں، جب دنیا کا انتظام اہلِ [illegible] سے نکل کر ملاحدہ کے پنجے میں آگیا، انسانیت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی، مشرق سے مغرب تک پورا انسانی معاشرہ ایک سڑی ہوئی لاش کی طرح پھٹنے لگا، انسان اور انسان کے درمیان سارے اخلاقی رشتے ٹوٹ گئے، اصولوں کی جگہ اغراض نے لے لی، مفادات کو مقاصد کا درجہ دے دیا گیا، سائنس کی ترقی اور مشین کے فروغ نے تمام انسانی قدروں کو تباہ کر دیا۔ ناقص فلسفوں اور استبدادی نظاموں نے آدمی کو حیوانی جبلتوں میں گرا دیا ـــــــ ڈیماکریسی، کیپٹلزم، نازی ازم، فاشزم، کمیونزم، سبھوں نے مل کر اپنے اپنے طور پر ایک آدمیت کو متعدد قومیتوں میں تقسیم کر دیا، اور ایک طرف تو اپنی قومی ریاستوں کے دائرے میں انھوں نے خلقِ خدا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور دوسری طرف عالمی سطح پر ایک قوم کو دوسری قوم سے درندوں کی طرح لڑا دیا۔ اس طرح فکر و عمل کے ان خود ساختہ نظاموں نے خدا کی زمین کو ظلم و ستم سے بھر دیا۔ کہیں انسان کو رنگ و نسل کے اعتبار سے گورے اور کالے میں بانٹ دیا گیا، کہیں معیشت کے اعتبار سے سرمایہ دار اور مزدور، اوسط، ادنیٰ اور اعلیٰ کے الگ الگ خانوں میں بند کر دیا گیا، کہیں عورت اور مرد کو ایک میدانِ جنگ میں لا کر دونوں کو ایک دوسرے سے وحشیوں کی طرح بھڑا دیا گیا اور اقبال نہ صرف سطح کے ان احوال و واقعات کو دیکھ دیکھ کر کبیدہ تھے، بلکہ ان کی نگاہیں تہوں کو چیر رہی تھیں اور خرابی کے ان سرچشموں کا سراغ لگا رہی تھیں جہاں سے ہلاکت کے زہریلے دھارے پھوٹ پھوٹ کر انسانیت کو مسموم کر رہے تھے، چنانچہ اقبال اپنے زمانے کے حالات کو محض عارضی و ہنگامی حوادث نہیں سمجھ رہے تھے جو وقت کے ساتھ گزر جانے والے ہوں، بلکہ یہ حالات ان کے نزدیک ایسے امراض کی علامات تھیں جن کی گرفت جسمِ انسانی پر وقت کے ساتھ ساتھ اور سخت ہونے والی تھی اور اسی لیے اقبال انسانیت کے مستقبل ہی کی طرف سے پُرتشویش تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان فکری نظاموں اور عملی اداروں پر سخت تنقید کی جو ان کی نگاہ میں خرابیٔ احوال کے ذمے دار تھے اور اپنی حد تک [illegible] کر چشمۂ انسانیت کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نگاہ میں ڈارون، ہیگل، مارکس، فرائڈ، نطشے سب کے سب انسانیت کے مجرم تھے، اس لیے کہ جدید تمدن اور تہذیب کی بنیاد ان ہی جیسے دوسرے مفکروں کے نظریات پر ہے اور وہ تمام تحریکیں جنھوں نے عالمِ انسانیت میں ظلم و ستم کا بازار گرم کیا اور وہ تمام اشخاص جو ان تحریکوں کے رہنما تھے، سب کے سب ان ہی نظریات کے پروردہ تھے۔ اقبال کے نزدیک وہ علتیں جو انسانی معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جا [illegible] ان میں سرِفہرست یہ ہیں: الحاد، شکم پرستی، وطنیت، لادین سیاست، جنسی انتشار۔

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(طلوعِ اسلام)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(خضرِ راہ)

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا؟
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا

نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

بلے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

"خضرِ راہ" "طلوعِ اسلام" "وطنیت" (بانگِ درا)

"ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" "فلسفہ" "مکہ اور جنیوا" "مقصود" "زمانۂ حاضر کا انسان" "مغربی تہذیب" "عصرِ حاضر" "حکیم نطشہ" "مردِ فرنگ" "عورت کی حفاظت" "فنونِ لطیفہ" "جمہوریت" "مسولینی" "انتداب" "لادینی سیاست" "دامِ تہذیب" (ضربِ کلیم)

"آزادیِ افکار" "[illegible]" "فلسفی" "ابلیس کی عرضداشت" "سینما" "فلسفہ و مذہب" "دین و سیاست"

"لینن خدا کے حضور میں" (بالِ جبریل)

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز)

حالیہ انسانیت کے موجودہ حالات سے یہ بے زاری، مستقبل کے متعلق یہ تشویش اور تہذیبِ حاضر اور اس کے تمام اداروں اور وہ نا رسیدہ ـــــ یہ ساری باتیں قنوطیت یا کلبیت کے احساس سے نہیں، اور نہ ایسی بات ہے کہ اقبال جدید سائنس کے تمام انکشافات و ایجادات سے منکر ہیں۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جدید علوم سے انسانیت کے جو امکانات روشن ہوئے ہیں اور انسانی ارتقا کی جو امیدیں ابھری ہیں ان کا استقبال و اعتراف اقبال سے زیادہ شان دار طریقے پر دنیا کے کسی شاعر نے نہیں کیا، حقیقت تو یہ ہے کہ عالمی سطح پر اقبال عصرِ حاضر کے وہ یکتا شاعر ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کے تہلکہ خیز اور نہایت درخشاں افکار و علوم کو اپنے کلام میں اس درجہ جذب کر لیا (یہاں تک کہ ان ہی حقائق سے رموز و استعارات تراشے) کہ وہ جزوِ شاعری بن گئے، سائنسی، سیاسی، معاشی افکار کو انھوں نے اپنے آہنگ میں سمو دیا اور مسائلِ وقت پر اس وضاحت اور شدت سے گفتگو کی کہ وہی ان کی شاعری کے تار و پود بن گئے۔ بعض وقت تو ان کے طرزِ گفتار کی شوخیاں اس نقطے کی طرف پرواز کرتی نظر آتی ہیں جس پر پہنچ کر فطرت کی جناب میں گستاخیوں کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ بلکہ بہت سارے اشعار تو فطرت کو للکارتے نظر آتے ہیں اور وہ کسی کم ظرف کی خیرہ سری کا انداز نہیں رکھتے، اس میں ایک وقار سے راز کا یقین ہے، شاعر اپنے دور کے انسانی کمالات کے غرور میں سرشار نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے تھوڑی دیر کے لیے وہ ان کمزوریوں کو بھول گیا ہو جن کا نہایت بھیانک نقشہ وہ بارہا پیش کر چکا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ۔۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن ۔۔۔ ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے ۔۔۔ وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں ۔۔۔ انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا ۔۔۔ مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ۔۔۔ اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

"روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"

لیکن یہ سارا نشہ اور نشاط محض ہمارے نشاط و انبساط نہیں ہے اور یہ رجائیت کا سرچشمہ جسم و دانشِ حاضرہ کی تابانیاں نہیں۔ انسانیت کے مستقبل کے متعلق تشویش یا اس کے امکانات کی توقع، تنہائی کی انسان دوستی ہے، ان دونوں رخوں کو میں نے یہ دکھانے

کے لیے پیش کیا ہے کہ ان کی جمعیت کس طرح تاریکی اور روشنی کے درمیان تمیز اور توازن کر سکتی ہے اور یہ کہ ان کی شائستگی ایک حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ وہ جدید انسان کی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ اس کی قوتوں سے بھی واقف ہیں کہ اگر آدمی بھٹک کر توازن باقی جو اُس کی جڑوں سے اپنا گلا آپ پاش سے سکتا ہے اور تاریخ کے طویل ادوار میں وہ ایسا کرتا رہا ہے۔ اس لیے بھی جدید علوم نے جو طاقتیں انسان کے ہاتھوں میں دے دی ہیں۔ وہ بہت ہی خطرناک ہیں۔ ان کے برتاؤ میں ذرا بھی چوک اور لغزش ہے ایک ذرا سی چوک سطحِ زمین پر آدمیت کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام　　وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام!

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو　　اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

اقبال کے تصورِ انسانیت کی یہ جامعیت اور ان کے کلام کی شائستگی و عمومیت دراصل نتیجہ ہے ان کے اس نظریۂ حیات اور اجتماعی نصب العین کا،[1] جس کا تذکرہ ابتدائی صفحوں میں کیا جا چکا ہے۔ اقبال نہ صرف یہ کہ ایک صاحبِ پیغام شاعر ہیں، بلکہ وہ ایک اسلامی شاعر بھی ہیں، یعنی ان کا فلسفہ محض کتاب خوانی اور ذہنی ریاضت کا ثمر نہیں۔ اس کے پیچھے قوت فکر کے ایک اور ہی جذبہ ہے۔ اقبال نے اپنے وقت کے فلسفوں پر جو تنقید کی ہے اور ان فلسفوں کے متضاد اور مقابل جو ایک نظامِ فکر پیش کیا ہے وہ اسی اسلامی موقف کا ہے۔ انھوں نے اسلام کو شعوری طور پر انسان اور انسان اور انسان اور کائنات کے درمیان ارتباط کا سب سے فطری، معقول اور مکمل طریقہ سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک جدید انسان علم و عقل کی فراوانی کے باوجود جو اس درجہ پریشان اور نازار ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اسلام کے اصولِ فطرت اور طریقِ حکمت سے بہت دور ہٹ گیا ہے۔ اور اگر آج بھی وہ اپنے عقل و علم کی قیادت کی باگ اسلام کے ہاتھ میں دے دے تو عقل و علم کی لغزشیں اور زیادتیاں ختم ہو جائیں اور ان کی جگہ ان کی برکتیں اور رحمتیں دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیں۔ دراصل یہی وہ مقامِ معرفت ہے جہاں پہنچ کر اقبال اوصافِ آدم کے اس درجہ شیدا و گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ بار بار خالقِ آدم سے مخاطب ہو کے کبھی تو شکوہ سنج ہوتے ہیں اور کبھی مناجات سرا، اور یہی وہ مقامِ حق ہے جس میں اقبال کا دردِ انسانیت، ان کی مجبوریاں اور آرزومندیاں اچھے طور پر آشکار ہوتی ہیں، اور انسان دوستی خدا پرستی سے مل کر اس اونچائی پر پہنچ جاتی ہے اور اس میں اتنی گہرائیاں اور پہنائیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ ان کا تصور بھی ایک نرا انسان پرست نہیں کر سکتا۔ مجرد انسان پرستی تو بس ایک خلا کی چیز ہے اور اس کا رُخ ہمیشہ پستیوں کی طرف ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ فرقے اور قوم اور وطن اور نسل، حد خود اپنی ذات کی تنگ حدود ہی میں سمٹ جاتی

---

[1] وہ معیاری طور پر انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی آفاقی حیثیت سے بھی واقف ہیں۔

ہے۔ اس لیے کہ اس انسان پرستی کا کوئی ٹھوس معیار اور کوئی واضح موقف اور کوئی معین اصول نہیں ہوتا، یہ ایک سیال کی طرح موقع و محل کے اعتبار سے کبھی ذات، کبھی قوم اور کبھی وطن کے مختلف ظروف میں ڈھلتی رہتی ہے۔ اس کے برخلاف خدا پرست انسان دوستی ایک دین اور ایک شریعت کی ٹھوس بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور اگر وہ دین اور شریعت آفاقی ہے، جیسا کہ اسلام ہے، تو اس پر مبنی انسان دوستی بھی آفاقی ہے، یعنی یہ بہترین انسان دوستی واضح طور پر چند معین قواعد و ضوابط کے ساتھ ایک عالمی اخوت کا قیام عمل میں لاتی ہے۔ ایسی مضبوط اور مستحکم اخوت جس کے سامنے رنگ و خون اور زمین و زر کی ساری حدیں گرد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ اخوت کسی بھی حالت میں کسی بھی قیمت پر انسانیت کو نہ تو مذہبی و سیاسی فرقوں اور جماعتوں میں بانٹتی ہے اور نہ نسلی و معاشی قبیلوں اور طبقوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہ اخوت پورے معنے میں عام انسانی حریت اور مساوات کو بروئے کار لاتی ہے اور قانونِ قدرت کے مطابق انسانی معاشرے میں عزت و امتیاز کا صرف ایک معیار قائم کرتی ہے، یعنی حسنِ عمل۔ ایسے انسانی معاشرے میں ہر فرد صرف اپنے ذاتی کردار کی بنا پر پست یا بلند ہوتا ہے: ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اقبال اسی معنے میں انسان دوست تھے، انسان پرست نہیں تھے، اور اسی معنے میں وہ ایک آفاقی شاعر تھے، نہ کہ وطنی و قومی شاعر اور یہی انسانی آفاقیت اقبال کی شاعری کا مشن اور پیغام تھا۔ اس مشن کو بروئے عمل لانے کے لیے اقبال کے ذہن میں ایک پورا نقشہ، ٹھوس اور عملی نقشہ، مرتب تھا، وہ ایک تدریج کے ساتھ سب سے پہلے مسلمان، پھر مشرق اور پھر پوری دنیا کو مخاطب کرتے ہیں، یہاں تک کہ وطنیت کے مخالف ہونے کے باوجود وہ اس تدریجی نقشۂ عمل میں ایک نمایاں مقام اپنے وطن ہندوستان کو بھی دیتے ہیں، اس لیے کہ اپنے دور کے مشرق میں وہ غیر منقسم برصغیر ہندوستان کو ایک اونچے مقام پر فائز دیکھتے ہیں۔

(روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے)

آدم کو ثبات کی طلب ہے — دستورِ حیات کی طلب ہے

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم — دیں سرِّ محمد و براہیم

———— (ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام)

نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی — بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

————

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں — کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

———— (شبِ معراج)

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

———— (احکامِ الٰہی)

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

————

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ!
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ ہے اقبال کی انسان دوستی کا وہ ایورسٹ جہاں سے وہ تمام عالمِ انسانیت پر ایک وسیع نگاہ ڈالتے ہیں اور خالص اخلاقی سطح پر فروغِ آدم کے لیے چند اصول و عقاید اور ضابطہ تجویز کرتے ہیں جن کی رو سے انسان خلافتِ ارضی کے اس مقام کا اپنے آپ کو ثابت کر سکتا ہے جس سے بڑھ کے کسی مقام کا تصور کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ چناں چہ اس مقامِ بلند پر فائز ہونے کے لیے اقبال نے مردِ کامل کا ایک آئیڈیل پیش کیا ہے جس کو اپنے کلام میں انھوں نے "بشر" "مومن" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور اس مردِ مومن کی خصوصیات انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے اشعار میں پیش کی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ دراصل یہی انسانِ مومن اقبال کا مرکزی نقطہ ہے اور خدا کے بعد یہی وہ ذات ہے جس کی شان میں شاعر نے اپنے دل کا پورا سرمایہ صرف کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس کی مثال خود حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر آپ کے اصحاب اور اسلام کے نقشِ قدم پر چلنے والے تاریخ کے مختلف ادوار کے متعدد رجال و اشخاص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک مردِ مومن کسی نسل یا خون کے روایتی فرد کا نام نہیں، بلکہ یہ سر تا سر ایک مثالی شخصیت ہے، جس کے چند عام اوصاف ہیں، جس شخص کا بھی جی چاہے وہ ان اوصاف کا اتباع کر کے مردِ مومن بننے کی کوشش

کرسکتا ہے، اس لیے کہ یہ شخصیت ہر دور اور ہر مقام کے لیے یکساں اپیل رکھتی ہے، اور یہی شخصیت انسانیت کا نقطۂ کمال ہے، خالقِ انسان نے جتنی بھی قوتیں انسان کو عطا کی ہیں، وہ سب اسی کی ذات میں مرتکز ہوتی ہیں، چنانچہ یہی شخص روئے زمین پر خالق کے تخلیقی منصوبے کو پورا کرنے والا ہے اور اس طرح خالق کا معتمد علیہ ہے، اور یہی شخص عصرِ حاضر کا وہ مہدی و ناجی ہے جس کا اقبال کو انتظار رہا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

(مردِ مسلمان)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(مومن)

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

(مہدیٔ برحق)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(کافر و مومن)

تو بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

(تو بہ تقدیر)

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

(مردِ مسلمان)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

(مسجدِ قرطبہ)

اپنی انسانیت دوستی کا یہ مرکزِ تعلق قائم کرلینے کے بعد اقبال نے اپنی ہمدردیاں پورے عالمِ انسانیت میں بکھیر دیں، بڑی وسیع نظری کے ساتھ انھوں نے جدید و قدیم، مشرق و مغرب، یہاں تک کہ اسلام اور غیر اسلام کے تمام اداروں اور اشخاص سے دل چسپی لی

ان کے اعمال کا تجسس کیا، ان کے اوصاف کو پرکھا، انسان کی اقدار کو زیرِ بحث لائے، اپنے معیار کی روشنی میں پسند کیا اور پھر ان کو قبول یعنی حکمت و دانائیت کو مومن کی متاعِ گم شدہ سمجھ کر بلا امتیاز فرقہ و مذہب ہر جگہ سے اٹھا لیا۔ اس میں دوسروں کا فرق تھا، کی اور نہ مشرق و مغرب کی، بلکہ اسلام کے علاوہ قدیم مذاہب —— عیسائیت، ہندو دھرم، بدھ مت —— اور جدید نظام ہائے فکر —— جمہوریت اور روسی اشتراکیت، سبھی کی بعض خوبیوں کا اعتراف کیا، ان کو اپنا کے سمجھا اور اپنایا۔ فلسفہ، ادب اور سائنس کی بے شمار شخصیتوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح اقبال نے اسلام کو ایک کیمیا اور ایک جوڑنے والی طاقت کے طور پر دیکھا اور دنیا کو ایک سنہری کلیسا بنا کر اس کے گرد عالم کے تمام اجزائے پریشاں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے چند اہم پہلوؤں کی طرف ہم ذیل میں کچھ اشارے کیے دیتے ہیں۔

اقبال دوسرے مذاہب کی مقدس شخصیتوں کا بے حد احترام اور تکریم کرتے ہیں، بلکہ عقیدت مندانہ انداز میں ان کے پیغام و نصائح کو اس طرح پیش کرتے اور ان کی تحسین کرتے ہیں جیسے یہ پیغام اور نصائح ان کے دل کی آواز اور ان کے لیے جزوِ ایمان ہوں، اس طرح وہ اپنے قاریوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان پیغام و نصائح کا اتباع بھی انہیں اسی طرح نجات کا رستہ دکھائے گا جس طرح اقبال کا وہ محبوب پیغام جسے وہ اسلام کہتے ہیں۔ یہ واقعہ جہاں اقبال کی عام انسان دوستی اور رواداری کا ثبوت مہیا کرتا ہے وہیں ان کی اصول پسندی کو بھی شہادت دیتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے پیش نظر کسی قوم اور فرقے کی مصلحت اندیشی نہیں، بلکہ ایک آفاقی نصب العین کا فروغ ہے، اور وہ اس نصب العین سے موافق مواد کو جہاں بھی ملے، اختیار کر لینے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں اور اس طرح ایک عالمی برادری کے لیے فضا ہموار کرتے ہیں، جس میں تحسین و تردید خالص اوصاف کی بنا پر ہوگی اور کسی گروہ و حلقے کے خلاف تعصب کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ اسی اصول پسند وسیع القلبی کی ایک علامت اقبال کی گہری وطن دوستی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی تڑپ ہے۔ بعض سیاست داں اور بعض شاعر و ادیب تحریکِ پاکستان کے بعد اقبال کو فقط ایک فرقے کا شاعر سمجھنے اور کہنے لگے ہیں، لیکن کلامِ اقبال کی پوری اسکیم اور اسپرٹ اس مغالطے کی زندہ تردید ہے۔ "رام"، "گوتم"، "نانک" وغیرہ شخصیتوں کے متعلق اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور "صدائے درد"، "تصویرِ درد" اور "نیا شوالہ" وغیرہ نظموں میں جو جذبات انھوں نے ظاہر کیے ہیں، پھر ان کا عام اصول، وحدت جو ان کی بعد کی شاعری کا محور ہے، یہ سارے حقائق اقبال کو ایک ایسا وسیع النظر مفکر ثابت کرتے ہیں جس کا خطاب بلا لحاظ فرقہ و جنس تمام انسانوں سے یکساں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ تمام انسانوں کو ساری سطح پر ایک اصولِ وحدت کی طرف بلاتے ہیں اور اگر اس اصولِ وحدت ہی کو بنائے تفریق سمجھا جائے، تو پھر اس غیر اصولی انداز میں سوچنے والوں کو انسانی ضمیروں میں سمجھانا محال ہے۔

اقبال کی نہایت گہری ہمدردی پس ماندہ طبقے کے ساتھ بھی ہے۔ انہیں تمام دنیا کے محنت کشوں سے الفت ہے، وہ ان کی بے بسی پر سخت رنجیدہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی انقلاب ایسا رونما ہو جو مزدوروں کو سماج میں ان کی حقیقی جگہ دلائے۔ اقبال انسانی شرف و مساوات کے شدت کے ساتھ قائل ہیں اور معاشی بلندیوں اور پستیوں کو ایک فطری چیز سمجھتے ہیں لیکن ان کی بنا پر سماجی بلندی و پستی کو قطعی ضد اور مصنوعی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اقبال کے نزدیک پیشے اور طبقے وغیرہ سے قطع نظر ہر فرد کی اپنی ایک انفرادی قدر و قیمت

ہے جو سراسر اس کے کردار پر منحصر ہے اور کردار کو وہ معاش کی بجائے اخلاق پر مبنی سمجھتے ہیں' لہٰذا اقبال کا مقصود یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ایسی اخلاقی بنیادوں پر قائم ہو کہ مزدور کو بھی اپنی شخصیت کے ارتقا کے ویسے ہی مواقع حاصل ہوں جیسے سرمایہ دار کو ہوں' دولت مواقع کو کم اور بیش کرنے والی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بڑے حد پر اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ مساوات اسی وقت ممکن ہے جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا استحصال (اکسپلائٹیشن) کرنے کی اجازت نہ ہو' سرمایہ کو غلط راہوں میں جانے کی رخصت نہ ہو' اور کم سے کم ضروریات ہر شخص کی بہ آسانی پوری ہو سکتی ہوں یعنی بہ حیثیت مجموعی معاشی نظام انصاف پر مبنی ہو۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے اہم موضوعات میں ایک "سرمایہ و محنت" بھی ہے۔ "خضرِ راہ" "فرمانِ خدا (فرشتوں کے نام)" وغیرہ مستقل نظموں یا ان کے مستقل حصّوں کے علاوہ بھی بے شمار مقامات پر متعدد عنوانوں سے اقبال نے اس موضوع کو چھیڑا ہے۔

یہ معاملہ محض پس ماندہ عوام اور مزدوروں کا نہیں تھا' بلکہ پوری انسانیت ہی مبتلائے عذاب تھی' صرف سرمایہ دار مزدور کو استعمال نہیں کر رہا تھا' بلکہ ہر انسان دوسرے انسان کو استعمال کرنے کی تاک میں تھا' ایک خدا کو چھوڑ کر انسان کی پیشانی بے شمار آستانوں پر جھکی ہوئی تھی' انسان ہی انسان کا خدا بنا ہوا تھا' نتیجۃً انسانوں ہی کے درمیان ایک طبقہ اتنا بلند ہو گیا تھا کہ اپنی خدائی کا ڈنکا بجا رہا تھا اور دوسرا طبقہ اتنا پست ہو گیا تھا کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کر رہا تھا۔ اقبال انسان کی اس تذلیل پر سخت مضطر تھے' چنانچہ جہاں کہیں بھی اس تاریکی کے پردے کو چاک کرتی ہوئی کوئی ہلکی سی کرن بھی نظر آ جاتی تو وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اقبال نے وسیع مطالعے اور راست اور گہرے تجزیے سے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ دنیا کی کل اس لیے بگڑی ہوئی ہے کہ مغربی استعمار' فرنگی الحاد اور کلیسائی اخلاق دنیا کی اجتماعیت پر مسلط ہو گیا ہے اور اپنی ہوس رانیوں اور جفاکاریوں سے تہذیبِ انسانی کے پورے سرمائے کو غارت کیے دے رہا ہے' اس طرح اقبال کے سامنے نقشہ یہ تھا کہ ایک طرف اہلِ کلیسا کا استعمار پوری انسانیت پر ظلم کر رہا تھا اور دوسری طرف تمام بنی آدم مظلوم تھے ——— اس صورتِ حال میں روس کے افق سے اشتراکیت ابھری' اس نے ایک طرف کلیسا کی غارتگری کو چیلنج کیا' تو دوسری طرف عام حریت اور مساواتِ انسانی کا دعویٰ کیا' اقبال جو ایسی ایک تحریک کے منتظر تھے اور خود اپنی حدود میں ایک انقلاب کا راستہ ہموار کرنے میں لگے ہوئے تھے' انھوں نے نہایت پُرجوش طریقے پر اور بڑی توقعات کے ساتھ اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم کیا' "کارل مارکس کی آواز" "اشتراکیت" "فرمانِ خدا" "سرمایہ و محنت" (خضرِ راہ)' "بلشویک روس" جیسی نظمیں لکھیں' یہاں تک کہ "جاوید نامہ" میں جمال الدین افغانی سے ملّتِ روسیہ کو ایک پیغام دلوایا۔ لیکن اشتراکی روس کی دہریت اور مارکس کی تحریک لادینی نے اقبال کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا' یہاں تک کہ بنیادی طور پر انھیں مغربی جمہوریت اور مارکسی اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں معلوم ہونے لگا۔ اقبال کی اشتراکیت سے ابتدائی توقع اور اس توقع کی شکست کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے' جاوید نامہ میں ملّتِ روسیہ کے نام افغانی کا پیغام تو سراسر اسی احساسِ شکست پر مبنی ہے' اس کے علاوہ بعض شذرے حضور میں' اشتراکیت کے فرودی محاسن اور بنیادی نقص کا بھرپور جائزہ ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" بھی اسی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے۔

اقبال کے پیشِ نظر انسان کی درستی و بہبودی کا جو آئیڈیل تھا اس نے ان کی نگاہ میں اپنے وقت کی تمام اجتماعی قوتوں کو ترازو دیا' وہ ایک طرف ہم عصر سیاسی لیڈروں اور جنگلی مینوں سے بیزار ہو گئے' تو دوسری طرف ملاؤں اور صوفیوں کو بھی انھوں نے ہدفِ تنقید بنایا تھا۔

کے مسئلوں کی روشنی میں مشرقی جماعتوں کی آواز گونجتا تھا، تو مغرب خدا شناسی کا مرکز بنا ہوا تھا جو شیطانی عقل سے محروم ہو کر مادہ پرستی کا
اور یورپ روحانی بصیرتوں سے خالی ہونے کے سبب فساد انگیزی کا مرکز بنا ہوا تھا، اس طرح گویا کلیسا اور کلیسا کا تانا بانا اور مدرسہ دونوں
ہی اپنے اپنے انداز میں اسلام کے اصولی فطرت سے باغی ہو گئے تھے اور ان کے انسانیت کی قدریں فنا ہو چکی تھیں، وہ خود کج فکر اور
غلط کار ہو گئے تھے، دوسروں کے فکر و عمل کی اصلاح ان سے کیا ہوتی؟ علامہ اقبال عالم انسانیت کی اصلاح کے لیے فکر و نظر میں ایک ہمہ گیر
اور ہمہ گیر انقلاب کے داعی تھے، انھوں نے اس بات کی پوری وضاحت اپنے کلام میں کی ہے کہ وہ انسانی معاشرے کے تمام دائروں میں اسلام
اور اس کی کتاب قرآن کی بنیاد پر ایک کلی انقلاب چاہتے ہیں، ان کے نزدیک انسان اپنی غلط اندیشیوں اور بداعمالیوں کی بدولت جو تباہ
ہو گیا ہے اور اس سے رہائی اسی وقت ممکن ہے جب تمدن کی عنان اور اس کے مشرقی و مغربی علمبرداروں سے چھین کر اسلام کے حقیقی علمبرداروں
کے ہاتھ میں دے دی جائے، تب ہی انسان کی آئندہ نسلوں کی بقا اور ترقی ممکن ہے، ورنہ انسانی تمدن کی گاڑی جس رُخ پر جا رہی ہے وہ بلا شبہ
کسی مکمل تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی انسان دوستی کسی تعصب اور جذباتیت پر مبنی نہیں، بلکہ یہ ایک خاص اصول اور فکری
نصب العین سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں افراط و تفریط نہیں، کامل توازن اور اعتدال ہے، یہاں عشق کی بھی اہمیت ہے اور عشق کا پہلو
یہاں جلال بھی اسی حقیقت کا ایک رخ ہے جس کا دوسرا رخ جمال ہے، یہاں لطافت اور صلابت دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی وہ توازن
ہے جو اقبال نے فلسفہ قوت اور فلسفہ خودی کی حقیقت کو اُجاگر کرتا ہے۔ بعض مستشرقین نے اقبال کے فلسفے کو نیٹشے کے تصورات سے
ماخوذ قرار دے کر اس میں فقط جبر و قہر کے عناصر دریافت کیے ہیں، یہاں تک کہ اس کو فاشزم سے ملوث کر دیا ہے۔ اس غلط فہمی
کی شروعات اقبال کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی، چنانچہ اس موضوع پر ان کا ایک وضاحتی خط "مکاتیب اقبال" میں موجود ہے، جس میں انھوں نے
مسٹر نکلسن کی اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ خودی کی ترتیب اُس وقت کی تھی جب نیٹشے کے افکار کی بھنک بھی
ہوا نہیں لگی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے کلام میں انھوں نے متعدد مقامات پر نیٹشے کی سخت تردید کی ہے، وہ اسے "مجذوب فرنگی" کہتے
ہیں اور اپنی ایک غزل میں اس کے بارے میں یہ تصریح کر دیتے ہیں کہ نطشے اپنے قلبی واردات کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا اور اس لیے صحیح حکیمانہ
نتیجہ دریافت کرنے کے بجائے گمراہ ہو کر بھٹک گیا۔ اسی طرح اقبال کا تصورِ شاہین خود اس نظم سے آشکار ہے جو اس عنوان
سے "بال جبریل" میں موجود ہے، اس کے علاوہ بھی شاہین کی تصریحات کلام اقبال میں جا بجا ملتی ہیں، پھر "مکاتیب اقبال" میں ان کا وہ
مشہور خط ہے جس میں انھوں نے شاہین کی صفات ——— درویشی، غیرت، خودداری، بے نیازی وغیرہ ——— گنائی ہیں اور
ان اوصاف کی بنا پر اس پرندے کے ساتھ اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔ خودی اور شاہین کے متعلق اقبال کے تصورات کا حاصل صرف یہ
ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ درشتی کو بھی انسانیت کا ایک ضروری عنصر قرار دیتے ہیں، کیونکہ کائنات کی ترتیب جس نظام پر ہوئی ہے اور
فطرت کا جو اصول ہے، اس کی روشنی میں افراد و اقوام دونوں کی زندگی میں رحمت و شفقت کے ساتھ قوت و طاقت کا وجود بھی اگر نہ ہے
تو انسانیت عدم توازن کا شکار ہو جائے گی۔ چنانچہ اقبال کی انسان دوستی میں عدم تشدد برائے عدم تشدد نام کی کوئی چیز نہیں، تاہم
کی نگاہ میں یہ چیز انسانوں کے حق میں نادان دوستی ہو گی، وہ اس چیز کو کمزوری اور بزدلی کی علامت سمجھتے ہیں، ہیں اور گوسفندی ور وباہی

سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ ایک مکمل فرد اور معاشرے کے اندر سختی اور نرمی دونوں اوصاف برابر برابر موجود ہونے چاہئیں اور موقعے کے مطابق ایک مناسب اعتدال میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے کا استعمال ہونا چاہیے، اور یہ کہ نرمی بھی اسی کی معتبر اور مفید ہے جو سختی کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن　　تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

—— (شعاعِ امید)

مسکینی و محکومی و نومیدیِ جاوید　　جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

—— (ہندی اسلام)

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال　　ملا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار

—— (مستیِ کردار)

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار　　جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

—— (فلسفہ)

دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت　　ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

—— (مہدیِ برحق)

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

——

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر　　یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

—— (اقوامِ مشرق)

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں　　پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

—— (مسلمینِ مشرق)

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

—— (مغربی تہذیب)

مردہ لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق　　عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

—— (عصرِ حاضر)

اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی　　ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لیے
(حکیم نطشہ)

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

(جلال و جمال)

جو حرفِ "قُلِ العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(اشتراکیت)

عالمِ مغرب کے عشرت کدوں میں بھی کلیساؤں میں مدرسوں میں — ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

(کارل مارکس کی آواز)

یہ وحیِ دہریتِ روس پر ہوئی نازل — کہ توڑ ڈال کلیساؤں کے لات و منات

(بلشویک روس)

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی — کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

(مشرق)

نہ شرق اس سے بری ہے نہ غرب اس سے بری — جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

(مشرق و مغرب)

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے — فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

نہ فلسفی سے نہ مُلا سے ہے غرض مجھ کو — یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

(صدائے درد)

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو — جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

(تصویرِ درد)

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے — اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

(خضرِ راہ)

دراصل، اقبال کی انسان دوستی چند مبہم خواہشات اور آوارہ جذبات کا مظاہرہ نہیں، یہ ایک واضح مقصد اور معین اصول کا اظہار ہے، اس کا تعلق زندگی کے ایک نصب العین سے ہے، یقیناً اس کا محرک ایک فطری اور بے اختیار درد دل ہی ہوگا، مگر اس کا مقصود عالم انسانیت کی منظم اصلاح ہے۔ اقبال شاعر اور فن کار ضرور تھے اور پورے طور پر تھے، لیکن وہ ایک باشعور اور حقیقت پسند فن کار اور شاعر تھے، اور فن شعر ان کے کلام کی ثانوی حیثیت ہے۔ زیر موضوع، موضوع ان کا انسان ہے، اپنی تمام عصری وسعتوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ، اقبال کے مطالعہ و تفکر نے انہیں مجبور کیا کہ اپنی انسان دوستی کے تصور و روحانی تقاضے کو محض چند خوابوں اور تصوروں میں تحلیل کر کے نہ اڑا دیں، بلکہ اسے ایک ٹھوس فکری و عملی شکل دیں، تاکہ فی الواقع انسان کی نجات اور فروغ کے امکانات پیدا ہوں۔ اقبال نے اپنے عہد کی انسانیت کے جو امراض تشخیص کیے ہیں وہ بنیادی طور پر تین ہیں: بے یقینی، بے عملی، باہمی تنافر، اور ان امراض کا جو علاج انھوں نے تجویز کیا ہے وہ یہ ہے: محکم یقین، پیہم عمل، باہمی محبت ——— اور یہ باتیں محض مجرد اور مبہم اوصاف نہیں، بلکہ ایک معین اجتماعی نصب العین یعنی اسلام کے واضح اصول و اقدار ہیں۔ ——— اور یہ امراض اور ان کا علاج کسی ہنگامی آفت کا وقتی دفیہ نہیں، بلکہ دراصل یہ انسان کی ان بنیادی و آفاقی کمزوریوں کا، جو تاریخ کے ہر دور میں شکلیں بدل بدل کر ابھرتی رہی ہیں، وہ اساسی و دائمی تدارک ہے جو ابتدائے انسانیت سے مختلف شکلوں میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز / چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

(ارتقا)

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی / علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا / بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مذہب سے ہمارے نوجوانوں کی بے رُخی

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

یورپ کے ایک صاحب دل آر۔ ڈبلیو۔ ٹرائن کا قول ہے:

"Religion, in true sense, is the most joyous thing the human soul can know. The real religion is an agent of peace, of joy and happiness. Let our places of worship grasp these truths and then such crowds will flock to them that their very walls will seem almost to burst." **(In tune with the Infinite P. 208.)**

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب ہے کیا چیز؟ اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہدایت، قوت، مدد، فیض و ایک بے پناہ خزانہ ہے۔ خدا نے فرمایا ہے جس سے ما بعد پیدا کرنے کی خواہش کا نام ایمان ہے۔ اس خواہش کی تکمیل عمل کہلاتی ہے اور ایمان و عمل کے مجموعہ کا مذہب کہا جاتا ہے۔ مذہب کا یہ جذبہ بہت بڑا انقلاب پیدا کرتا اور روح پر وہ مسرتوں کے پٹ کھول دیتا ہے۔ یہ کائنات ایک ساز ہے جس سے شاہد کائنات کی تجلیات برس رہی ہیں کہ ہر چار سو پھیل رہی ہیں۔ جب مسلم حجاب ظاہر سے پرے جا نکلتا ہے تو اس کی نس نس میں جذبۂ شوق کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ حرم دل میں بیانوں کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ نظر میں وسعت آتی ہے۔ ہر منظر پیکر نور اور ہر ذرہ نخل طور بن جاتا ہے اور اس عالم کیف و سرور کے سامنے زمان و مکان کی ہر قدر نہایت حقیر معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حکیم مشرق نے فرمایا تھا:

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے، مرحلۂ شوق نہ ہو طے

قوت کے بے شمار منبع ہیں۔ کائنات اور دل۔ کائنات کی مختلف توانائیوں کے نام ہیں: سٹیم، بجلی، فولاد، روشنی، مقناطیس وغیرہ، جن کی تسخیر صرف علم سے ہو سکتی ہے اور دل کا سرچشمہ عشق ہے جو بڑے بڑے عزم کو دوام عطا کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہے اور یہ طلب ہو یا یقین کہ یہی جان فروشوں سے عرب کے ایک نہایت چھوٹے اور بے سرو سامان گروہ نے جنگ جیتی اور ساری دنیا کو جو نہایت پرجوش ہو سیاہی ہو وہ تاریکی کے پیچھے دور کر سکتا ہے۔ یہ توانائی عشق سے حاصل ہوتی ہے اور یہ عشق ملتا ہے حقیقی مذہب سے جو علم و عشق ہر دو کا حسین امتزاج ہو۔

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے   تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے   چوں جوئے در کنارِ کوہسارے

اہلِ مغرب کے پاس علم تو ہے لیکن عشق موجود نہیں، نتیجۃً اُن کا علم کائنات کے لیے لعنت بنا ہوا ہے۔

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب اے انقلاب

۱۸ جنوری ۱۹۶۱ء کو رہبرِ انقلاب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان کی قومی سائنس کانگرس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا اور بالخصوص فرمایا:

"I believe that real fullness of life can be achieved only by bringing about a workable and effective balance and co-ordination between the forces of religion, philosophy and science. If the first two (religion and philosophy) fail to assert their full weight, the chances are that the uncontrolable monster of science will submerge mankind under stark materialism attended by complete moral and spiritual anarchy leading perhaps to total destruction. It is only religion, backed by a rational and pragmatic philosophy, that can save the world from such a harrowing destiny."

انسانی روح ایک پُراسرار تخلیق ہے۔ جس کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا پورا علم ابھی تک نہیں ہو سکا۔ جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روح ایک لامکانی عنصر ہے جو قیودِ زمان و مکان کو پسند نہیں کرتی۔ اگر ہم اسے خواب و خور کی عارضی لذتوں میں اُلجھانا چاہیں تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عیش پسند، جنہیں تمام مادی وسائلِ طرب تو حاصل ہیں لیکن اُن کا رشتہ روح و کیفیت سے کی نسبت یعنی مقصد سے ٹوٹا ہوا ہے، اُن کی روح میں اضطراب کی آگ سدا سُلگتی رہتی ہے۔ موت ہرگز روح کی ناپائداری یا اختتام نہیں بلکہ موت سے روح کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو لامتناہی، لامحدود اور دائمی ہے۔ روح دراصل ایک مسافر ہے جو اس خاکدان سے گزر کر منزل بہ منزل روحانی بلندیوں کی طرف جا رہی ہے۔ اور:

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی (نجم)
(تمہاری آخری منزل اللہ ہے)

یورپ کا ایک صاحبِ نظر کیا پتے کی بات کہتا ہے:

"The individual existence begins on the physical plane and then rises through successive gradations of othereal and celestial spheres to a destiny of unspeakable grandeur and glory."

یہ اقتباس بھی آیت کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے:

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا
اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۝ (۸۴ : ۱۶-۱۹)

(شفق شام کی قسم، رات کی اور ان ستاروں کی قسم جنہیں رات فراہم کرتی ہے نیز چاند کی قسم
جب وہ بدر کامل ہو جاتا ہے کہ تم زینہ بزینہ اور منزل بہ منزل اوپر کو جاؤ گے۔)

اس آیات میں ایک عجیب انکشاف [illegible] کیا ہے۔ [illegible] ہیں۔ [illegible] میں مضطرب اور شتاب
[illegible] آیات [illegible] صحیح و سالم [illegible] پہنچا دیا تھا جس نے [illegible] کا حیرت
انگیز [illegible] وقت [illegible] ہیں۔ جو لوگ [illegible] کر اس [illegible] کو تھام لیتے ہیں۔ [illegible] کی جو حکمت کر لیتے
ہیں وہاں تک پہنچنے کی [illegible] ہو جاتا ہے

بقول ڈاکٹر [illegible]:

"By yielding to Nature we can conquer it" (The projection of the Astral self.)

[illegible] قوت ہے کہ بقول اقبال:

دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

[illegible] سعد بن ابی وقاص کو [illegible] ایران کی فوج [illegible]
ہے ان کے پاس [illegible] بہت زیادہ ہے [illegible] کر قوت [illegible] دی:

[illegible]

کہ اگر ہم ان پر تقدیر کے ذریعے غالب نہ آتے تو اپنی قوت سے انہیں شکست نہ دے
سکیں گے۔

اس قوت کا ایک مظاہرہ [illegible] ہمارے صدر امریکہ کی بعض حرکات سے ناراض ہو کر واشنگٹن پہنچے۔ [illegible]
قوم علم، دولت اور سائنس اور فوجی طاقت کے لحاظ سے اتنی عظیم ہے کہ ساری کائنات اس کی [illegible]
[illegible] قوت کا اثر دیکھیے کہ ہمارے صدر کی [illegible] قوم [illegible] ایک اخبار نے لکھا:

"Ayub was like a tiger in a village and no body knew where he would strike next."

میرا یہ خیال ہے کہ کشمیر کا مسئلہ نہ تو امریکہ کی مدد سے حل ہو گا اور نہ [illegible] اقوام کی مداخلت سے [illegible] کا فیصلہ [illegible]

اس تلوار سے ہوگا جو بندۂ مومن کے ہاتھ میں ہوگی۔ ایران اور روم کی مہیب قوت کو عربوں کی تلوار نے نہیں بلکہ ان کے ایمان نے شکست دی تھی۔ گذشتہ جنگ میں پاکستان کے مجاہد ایمان کی بے پناہ قوت سے مسلح ہو گئے تھے، ان کی عقابی جھپٹ کے سامنے ہندوستان کے کبوتر کبھی نہیں ٹھہر سکے:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لیے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری (اقبال)

پاکستان عالمِ اسلام کی سب سے بڑی سلطنت ہے جو ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کی تھی اور دنیا کے لئے بار بار اعلان کیا تھا کہ ہم صحیح معنوں میں عملی طور پر اسلامی اقدار و تصورات کو وہ رنگ چڑھائیں گے کہ دنیا کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور کیپٹلزم، کمیونزم اور دیگر "ازموں" سے تنگ آئی ہوئی انسانیت ہم سے نور و ہدایت کی طالب ہوگی۔ اس حسین خواب کے پورا ہونے کی صورت ایسی ہی تھی کہ جیسے جیسے ہم خود مسلمان ہوتے، سینے میں جذب و شوق کی تند بجلیاں جلاتے، کائنات پر عمل کی کمند پھینکتے اور مشتری کے پر لگا کر ربِ کائنات تک پہنچتے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے سرمایہ دار زر اندوزی میں منہمک ہو گئے۔ کارندوں حکومت کی ایک خاص تعداد رشوت میں ڈوب گئی۔ ہمارے اکثر ادیب و شاعر دجالِ مارکس کے فتنے کا شکار ہو گئے اور ہمارے نوجوان طلبہ یعنی ہمارے کل کے رہنما الحاد و عیش کوشی جس کی بدترین صورت بیٹنک ازم ہے کی طرف نکل گئے۔

یوں تو معاشرہ کا کوئی حصہ بگڑ جائے تو قومی ترقی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ لیکن نوجوانوں کا بگاڑ قوم کی ہستی ہی کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اس لیے ہمارے مفکرین کا فرض ہے کہ وہ ان کی گمراہی کے اسباب کا سراغ لگائیں اور علاج بتائیں۔ میری ناقص رائے میں چند اسباب یہ ہیں:

اوّل: ہمارے نظامِ تعلیم میں تہذیب و اصلاحِ نفس کا کوئی شعبہ موجود نہیں۔ گو اب ابتدائی مکتبوں میں چند فقہی مسائل بتلانے اور ارکانِ اسلام سکھانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ لیکن نوجوان دماغ میں اسلامی اقدار کا نقش راسخ کرنے، اللہ کی محبت پیدا کرنے اور تمام نظامہائے حیات میں سے اسلام کو برتر و بلند تر ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ از اوّل تا آخر نصابِ تعلیم میں کوئی ایسی کتاب نظر نہیں آتی، جو ہمارے اسلاف کے علمی، سیاسی اور ثقافتی کارناموں پر روشنی ڈالے، ہمیں ان کے ایثار، تسلیم و رضا، نیاز اور ذوق و شوق کی داستانیں سنائے، دنیائے غیب و شہود میں تعلق قائم کرے اور ہمارے آبا کے شاندار علمی اکتشافات سے روشناس کرائے۔ الحاد ایک صاحبِ عقل فتنہ ہے۔ جو فلسفیانہ دلائل ہی سے قابو میں آتا ہے۔ دنیائے اسلام میں ایسے سینکڑوں فلسفی و مفکر تھے اور کچھ اب بھی موجود ہیں، جنکی تحریرات نے ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ شبلی، رومی، غزالی، ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم، شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی، علامہ جوہری طنطاوی، فرید وجدی، علامہ اقبال و حسن البنا۔ جب تک ان حضرات کے فلسفے کو جزوِ نصاب نہیں

بنایا جائے گا ذہنوں کی آزادی و ادراک کی پرستش جانے گی ۔ مگر ایک کارل مارکس اور ایک آئن سٹائن دنیا کے سوچنے کا انداز بدل سکتے ہیں تو زمانہ طالب علمی کا اگر ہم اپنے چند ایک عظیم مفکرین کے افکار کو اپنے طلبا تک پہنچانے کا انتظام کریں تو نتائج کس قدر خوشگوار ہو سکتے ہیں۔

اس وقت تک ہماری تمام تر توجہ کلرک اور دفتری افسر پیدا کرنے تک محدود رہی ہے' ہمارے ارباب تعلیم اور فکر کی تحقیق میں اُن میں سے بیشتر کو یہ معلوم ہی نہیں کہ انسان جسم و روح کا مجموعہ ہے اور روح کے تقاضے جسمانی ضروریات سے جدا ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم مادی ضروریات کے گرد ہی چکر کاٹ رہا ہے اور دیکھنے والے' جو حقیقی عظمت و توانائی کا منبع ہے بے خبر ہے' ہماری یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر تو بے شمار نکلے۔ لیکن ایک بھی صاحب شعور پیدا نہ ہوا۔ بجا کہا تھا حکیم مشرق نے :

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحب سرور نہیں

ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے اہل دل و ارباب جذب و جنون نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ آج برصغیر ہند و پاک میں ان کا ذخیرہ کم و بیش ہر جگہ موجود ہے۔ اور یہ فیض ہے تقریباً درجن بھر اہل دل کا' جن میں سے حضرت خواجہ اجمیری' نظام الدین اولیا' بختیار کاکی' داتا گنج بخش' فرید الدین گنج شکر اور دیگر ملتانی صوفیائے عظام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جن کے مزاروں پر ہر وقت کہیں بڑے بڑے قافلے نظر آتے ہیں اور کہیں پانچ اور دس قندیلیں پاس کے جھونپڑے ہیں۔ اگر ہم اپنی یونیورسٹیوں سے رومی و غزالی جیسے بڑے بڑے دماغ پیدا نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم چھوٹے چھوٹے قافلے ہی سہی لیکن یہ امر ملحوظ ہے کہ پہلے اساتذہ کے دل میں عشق و محبت کے چراغ روشن ہوں اور پھر یہ روشنی طلبا کے سینوں میں منتقل ہو۔ ساٹھ برس کی عمر میں ایک ہی حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی ہے کہ سوز ساز حیات ہے اور اگر یہ چیز نہیں تو پھر :

ع مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔

دوم نوجوانوں کی گمراہی کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ہماری درسگاہوں میں ہماری ثقافت اور فکر و فلسفہ کا تذکرہ بے حد کم ہے اور مغربی ادب پر بے شمار لٹریچر کا سیلاب ہے۔ ہماری اخلاقی و روحانی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کے یورپ کا مذہب عیاشی اور پیشہ رہزنی و سفاکی ہے۔ اس کے ادب اور قلم سے ہم عفت و پاکیزہ ادب کی توقع کر ہی نہیں سکتے۔ ہماری درسگاہوں میں یہی لٹریچر زیر مطالعہ ہوتا ہے اور وہ راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

انگریزی ادب کا حصہ تاریخ ہمارے لیے خصوصیت سے توجہ طلب ہے۔ وہ لوگ ہمارے بادشاہوں کو عیاش' ہمارے اولیا کو مکار' ہمارے علما کو تنگ نظر اور ہمارے غازیوں کو ڈاکو کہتے اور لکھتے ہیں۔ اسلام کو عیاشوں اور رہزنوں کا مذہب قرار دیتے ہیں اور ہمارے نوجوان کا سامنا اسی تاریخ سے پڑتا ہے۔ ہماری لائبریریوں میں شبلی کی سیرت النبی تو شاید ہی کہیں نظر آئے لیکن ولیم میور' سر ولیم سکاٹ' ملر' ڈکنز اور ٹالسٹائی کی ہر ایک تحریر ہر جگہ ملیں گی۔ اس وقت پیش کے دو بڑے بڑے آدمی' جن کی اشاعت کروڑوں تک پہنچ چکی ہے ۔ ٹائم اور ریڈرز ڈائجسٹ ہیں۔ یہ رسائل ہماری ثقافت و تہذیب' ہمارے ماضی

وصال اور ہمارے اسلاف پہ تابڑ توڑ حملے کرتے ہیں۔ اور ہمارے نوجوان انھیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

متناسب طور پر فضائل و اقع ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے والدین پھر اساتذہ اور اس کے بعد دیگر لوگوں کی نقل کرتا ہے۔ جو والدین خدا پرست اور خدائی ہدایات پر کاربند ہوں۔ ان کے بچے عموماً اثر بد سے محفوظ رہتے ہیں۔ استاد کی زندگی سے بھی شاگرد گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ مقام تاسف ہے کہ اکثر والدین اور خصوصاً وہ جن کی آمدنی ایک ہزار ماہانہ سے بڑھ جاتی ہے، اور بیشتر اساتذہ اسلامی انداز فکر و نظر سے نا آشنا ہیں۔ جذب و شوق کی مستیاں تو رہیں ایک طرف، رب قدوس کے سامنے ایک سجدہ تک ان پہ گراں گزرتا ہے۔ ایسے والدین و اساتذہ سے متاثر ہونے والے بچے کچھ ہوں تو اور کیا ہوں۔ جب شام کے وقت کسی تفریح گاہ میں کوئی جوڑا ایک خوبصورت کار سے نکل کر کسی قمار خانہ یا سینما کا رخ کرتا ہے تو بعض دیکھنے والے کہتے ہیں: "یہ ہے زندگی" اور اس سچ زندگی تک پہنچنے کے لیے وہ جائز و ناجائز وسائل استعمال کرتے ہیں۔ اگر یہی جوڑا کار سے نکل کر پارک میں جائے نماز بچھاتا اور کئی آنکھوں کے سامنے نماز عصر یا مغرب ادا کرتا تو اس کے نتائج کتنے ہی دور رس اور خوشگوار ہوتے۔

یہ ایک سجدہ جو تجھ پہ گراں گزرتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات (اقبال)

سوم: نوجوانوں کی بے راہ روی کا ایک سبب ہمارا سینما ہے۔ جہاں ناجائز معاشقے، دنگہ فساد، چوری چکاری اور رشوت خوری کے [illegible] طریقے سکھائے جاتے ہیں اور عریاں رقص و نغمہ سے جوانی جذبات میں ہیجان پیدا کیا جاتا ہے۔ فلم تعلیم و تدریس کا ایک [illegible] ذریعہ ہے۔ اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جو فلمیں ہماری تہذیب، روایات اور اقدار کی آئینہ دار نہ ہوں۔ انھیں ممنوع قرار دیا جائے۔ اگر ہمارے پونے نو کروڑ دیہاتی سینما کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو ہم شہری بھی ان بدآموز فلموں کے بغیر [illegible] لیں گے۔

بالآخر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ نوجوانوں کی راہ راست پر لانے اور ثابت قدم رکھنے کی ذمہ داری والدین، اساتذہ، ارباب تعلیم، ڈاکٹرز، جرنلسٹس، علماء، شعراء، ادباء سب پہ عاید ہوتی ہے اور اس کا راستہ صرف ایک ہے کہ ان کا رابطہ اللہ سے قائم کیجیے۔ ان کے تاریک سینوں میں ایمان کی شمعیں جلائیے۔ انھیں عظیم بنانے کے لیے ان کے سر رب عظیم کے سامنے جھکائیے اور انھیں علم و عرفان کے ایسے دیا بنا دیجیے کہ ان کی روشنی سے شاہراہ حیات جگمگا اٹھے اور ہر چار سو [illegible] انسانیت کی جلیاں اسلام کے رفیع و روشن نظام کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے ہمارے قائد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان [illegible] بھی یقیناً روشن ہوگی۔ جو شمع اب بھی آپ کے سینے میں جاگزیں ہے اور جس کا اظہار گزشتہ عیدالاضحیٰ کی تقریب پر آپ نے یوں فرمایا تھا۔

'Dear Countrymen!

.........The secret of real progress is that we should comprehend the basic principles of Islam, hold fast to them and under the search-light of the past discover fresh avenues for their application in the present

and the future. If we fail to do this, there is no doubt that Islam will certainly live but the Muslims as such will probably languish away. ....Our Country was founded in the name of Islam and it can subsist only on this name. There is no other basis for our national cohesion and solidarity except Islam. This basis cannot be sustained by vociferous professions of our idealism alone. We must translate our idealism into action for our sheer survival. The greater the harmony between our faith and practice, the greater will be the strength of Pakistan.......... unless we rise to the occasion and make an honest search to discover صراط مستقیم, I am afraid, our spiritual, moral, material and national existence will be seriously imperilled."

(Pakistan Times 26/5/61)

آپ نے علامہ اقبال کے الفاظ میں حضرت باری سے دعا کی ہے:

جوانوں کو مری آہ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نور بصیرت عام کر دے

فنِ تحقیق

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ہماری بہت سی تاریخی کتابیں ایسی بھی ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے شروع کی جاتی تھیں۔ یعنی حمد و نعت کے بعد سب انبیاء علیہم السلام کے مختصر حالات بیان کرتے تھے۔ پھر تمام خلفائے اسلام اور مختلف سلاطین کا تذکرہ ہوتا تھا اور جب مؤرخ اچھی طرح تھک کر چور ہو جاتا تو وہ بیشتر اپنے زمانے کے حالات تک پہنچتا تھا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے معاصرین کا سرسری جائزہ ہی لے سکتا تھا اور اکثر پھر ہوش کے لیے رک جاتا تھا۔ قریب قریب یہی انداز آج کل کے اکثر تحقیقی مقالات کا ہو گیا ہے جن میں اصل موضوع سے متعلق بہت کم مواد ہوتا ہے اور غیر ضروری مباحث کے لیے کوئی ایک دو نہیں بلکہ متعدد ابواب مختص کرتے ہیں اور غیر متعلق اقتباسات سے مقالات کا حجم بڑھایا جاتا ہے۔ بعض مقالے ایسے بھی ہیں کہ ان میں نثر و نظم کی پوری داستان تو موجود ہے لیکن موضوع سے متعلق صفحات بہت کم ہیں۔ گویا وہ اپنی وسعت اور بینائی میں داستانِ امیر حمزہ ہیں لیکن تحقیق اور جانچ پڑتال سے ان کا بہت کم واسطہ ہے۔ ایسی سرسری تحقیق عام ہے۔ اسی طرح ہماری تنقید بھی سرسری اور ہوائی ہوا کرتی ہے یعنی تنقید کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ پہلے کتاب کے موضوع سے متعلق چند تمہیدی جملے لکھے جاتے ہیں پھر کتاب کے ابواب کی تفصیل دے دی جاتی ہے۔ اور اگر زیادہ کرم فرمایا تو یہ بھی کہہ دیا کہ فلاں باب زیادہ اچھا یا زیادہ کمزور ہے۔ پھر اس کتاب کی چند اوپری خوبیاں یا خامیاں جو سرسری مطالعے ہی سے نظر آ جاتی ہیں، بیان کر دی جاتی ہیں۔ لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ خوبیوں کا مختصر تذکرہ کر کے خامیوں کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ:

> "امید ہے کہ یہ خامیاں آئندہ ایڈیشن میں دور کر دی جائیں گی۔ نیز یہ کہ کتاب بہرحال اچھی ہے اور مصنف کے حسنِ ذوق کی شاہد ہے۔"

ہمارے ہاں عملی تنقید کا عام انداز یہی ہے۔ اسی طرح بعض تنقید نگار جب کسی "فرمائشی" تنقید کے لیے مجبور کیے جاتے ہیں تو ان کی ایسی تنقید میں مدح و تعریف کی طرح مبالغے کے رنگ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً انگریزی کے ایک "اردو" نقاد ایک منتہائے صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> "وہ نظم و نثر دونوں میں کافی (یعنی ناقابلِ یقین) شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا انشا پردازی کی طرف رجحان بہت نمایاں ہے افسانے کے طرز میں ایک انفرادیت ہے جو ان کی دلکشی بڑھاتی ہے

٭ یہ توسیعی لیکچر سندھ یونیورسٹی میں ۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے کل پاکستان اردو تدریس کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۶۰ء) میں اجمالاً پیش کیا گیا تھا۔

> گا رہا ہے۔ انھوں نے شاعری کو صرف اثر سے زیادہ توجہ دی ہے اور نیا دور اُن کا شعار رہا ہے
> شاعروں میں ہوتا ہے جو قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک نیا رنگ لا چکے ہیں...... ان کے
> یہاں پرانے اثرات کا وجود ضروری تھا مگر شدت سے زیادہ ان کی شاعری میں فطرت نمایاں ہے اور
> کہیں کا احساس ہوا، ان کی شاعری پر خصوصی طور پر گہرا اثر پڑتا ہے...... اُردو ادب پر اُن کے
> اہم احسانات ہیں۔[۱]

یہ ایک محدود مثبت تنقیدی مروّت ہے۔ زیرِ بحث نقاد نے ایک ادیب اور پریس دونوں کو خوش کرنے کے لیے تنقید لکھی ہے جو شاید پہلے بھی کسی کمال یا کسی پہچان کی محتاج تھی اور صرف دستخط کی متلاشی تھی بقول جگر "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" ——— ایسا تنقیدی اور تحقیقی کے ذکر سے مقصود صرف یہ ہے کہ ہم یہ تو سمجھ لیں کہ ہم کہاں ہیں۔

تحقیق بظاہر تنقید سے مختلف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فن ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے پچھلے سالوں کے پیچ ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کر دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے "تحقیق و تنقید کے مقاماتِ اتصال" کے سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ

> "تاریخی تنقید میں کسی ادیب کے احوال کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر تاریخ ہی کی طرح بیان کیا جاتا ہے
> اور یہ انداز سائنسی تنقید کا بھی ہے کیونکہ ایسی تنقید میں ادب کی پہچان، عقل اور تجربے کے معیار
> سے ہوا کرتی ہے۔ اشتراکی تنقید میں بھی مزاج، ذوق اور انفرادی تجربہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ اس کی
> راہ میں ایسے مقامات بھی آجاتے ہیں جہاں جماعتی پسند یا اپنے کا عمل دخل ہوتا ہے۔ بہر حال
> تنقید کسی طرح کی ہو، اُسے تاریخ، عمرانیات، اجتماعیات یا ضمنیات سے قریب تر ہونا پڑتا ہے اور
> جب تنقید کے یہ رشتے قائم ہو جاتے ہیں تو پھر تحقیق اور تنقید کے درمیان بہت کم تفریق رہ جاتی ہے۔"[۲]

اس جائزے کے ساتھ ہی دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے کیا کچھ کر لیا ہے اور اس مقصد کے لیے اب کیا کرنا ضروری ہے۔

اسلامی طرزِ تحقیق

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے علمِ حدیث کے بارے میں روایت اور درایت کے لیے جو اصول منضبط کیے ہیں اُن پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ روایت کے بارے میں ان کے حزم و احتیاط کا عالم یہ تھا کہ سیر و مغازی تو بہت بڑی چیز ہے، وہ عام خلفا اور سلاطین کے حالات اس وقت تک بیان نہیں کرتے جب تک کہ اُن کے پاس آخری راوی سے لے کر پہلے راوی تک مسلسل سلسلۂ روایت موجود نہ ہو۔ یعنی جو واقعہ بیان کیا جائے وہ اس شخص کی زبانی ہو جو خود شریکِ واقعہ ہو اور اگر وہ خود شریکِ واقعہ نہیں تھا تو اس سے لے کر آخر تک تمام درمیانی راویوں کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی تحقیق کی جائے کہ وہ لوگ کون تھے؟ کیسے تھے؟ اُن کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا کردار کیسا تھا؟ اُن کی سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ کہاں تک تھے؟ سطحی الذہن تھے یا نکتہ رس تھے؟ عالم تھے یا جاہل؟ اور

---

۱ رسالہ "نگار"، حیدرآباد۔ جون ۱۹۶۵ء

۲ رسالہ "اُردو نامہ" کراچی۔ اپریل تا جون ۱۹۶۰ء

تمام جزئی باتوں کا پتا لگانا بے حد مشکل تھا لیکن بزرگانِ محدثین نے اس کام کے لیے اپنی عمریں وقف کر دیں۔ اور ان تحقیقات سے اسماء الرجال کا ایک بے مثل فن ایجاد کیا گیا جس کی بدولت کم از کم ایک لاکھ شخصیتوں کے صحیح حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی راوی پر کذب، تہمت، بدعت، فسق، ثقات کی مخالفت یا حافظے کی کمزوری وغیرہ کا الزام ہے تو محدثین نے جا بجا اس کو مجروح اور اس کی روایت کو مردود قرار دیا ہے۔ مرفوع، موقوف، قولی و فعلی و تقریری، نیز آحاد و متواتر، مشہور و عزیز و غریب۔ اسی طرح صحیح و حسن اور مقبول و مردود وغیرہ مختلف اقسامِ حدیث[1] کی تقسیم خود اپنی جگہ اس امر کی شاہد ہے کہ علمائے اسلام کی نظر کس قدر گہری تھی اور ان کا معیارِ تحقیق کس قدر بلند تھا۔ فنِ روایت کے بعد درایت کا نمبر آتا ہے۔ یعنی ایک حدیث کے تمام راوی (شروع سے آخر تک) ثقہ اور مستند تو ضرور ہیں لیکن ممکن ہے کہ عقلاً اس روایت میں کوئی خامی موجود ہو۔ چنانچہ ایسی روایت بھی غیر معتبر قرار دی جائے گی۔ محدثین نے درایت یعنی عقلی حیثیت سے روایتوں کو پرکھنے کے لیے یہ اصول قائم کیے ہیں۔

۱۔ واقعۂ مذکورہ کیا اصولِ عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا عام میلان کیا واقعے کے خلاف تھا یا موافق؟

۳۔ اگر واقعہ کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش ضروری ہے کہ واقعے کے متعلق راوی کے قیاس اور رائے کو کہاں تک دخل حاصل ہے؟

۵۔ راوی نے واقعے کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے وہ واقعے کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس واقعے کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا۔ اور اس کی تمام خصوصیات کا جائزہ نہیں لے سکا؟

۶۔ اس امر کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقۂ ادا نے واقعے میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیے ہیں۔[2]

۱۔ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا وہ حدیث قولی ہے، جو کچھ خود کیا ہے وہ حدیث فعلی ہے اور جو کچھ آپ کے سامنے ہوا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا تو وہ حدیث تقریری ہے۔ جس حدیث کو ہر زمانے میں کثرت لوگوں نے روایت کیا ہو کہ احتمالِ کذب نہ رہا ہو اسے متواتر کہتے ہیں اور آحاد وہ ہیں جن کی روایت میں اتنی کثرت نہ ہو۔ پھر آحاد کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ مشہور جس کو ہر زمانے میں تین یا زائد راویوں نے روایت کیا ہو۔ ۲۔ عزیز جس کو ہر زمانے میں دو راویوں نے روایت کیا ہو اور ۳۔ غریب جس کو کسی زمانے میں ایک ہی راوی نے روایت کیا ہو۔ آحاد کی وہ روایت جس کے راوی کی سچائی مسلّم ہو وہ مقبول کہلاتی ہے ورنہ مردود۔ پھر آحاد مقبول میں سے وہ حدیث جس کو ہر زمانے میں خوب یاد رکھنے والوں نے روایت کیا ہو اور اس میں کوئی عیب پوشیدہ نہ ہو اور معتبر لوگوں کی مخالفت بھی نہ ہو اسے صحیح کہتے ہیں اور اگر ایسی آحاد مقبول جس کے راویوں کا حافظہ کم ہو تو اسے حسن کہتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ مرفوع وہ حدیث ہے جو حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو۔ اور موقوف وہ حدیث ہے جو کسی صحابی کا قول یا فعل ہو۔

۲۔ مولانا شبلی نے بھی سیرۃ النبی اور الفاروق کے مقدموں میں درایت کے ان اصولوں کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ کوئی حدیث اگر عقل کے خلاف
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

روایت کو عقلی حیثیت سے واقعات کو جانچنے کے یہ اصول [illegible] کے ساتھ [illegible]
جو بالعموم [illegible] منافقین کی طرف [illegible] کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ [illegible]
حالات [illegible] روایات کتب احادیث میں منقول ہیں [illegible] سب سے زیادہ معتبر ہیں۔ چنانچہ [illegible]
کے بارے میں راوی [illegible] روایت کو پرکھا ہے اور حزم و احتیاط کے سلسلے میں کسی [illegible] روایت کو جگہ نہیں دی۔ امام وکیع کا مشہور واقعہ ہے کہ
[illegible] کی تائید میں کسی دوسرے راوی کو [illegible] لیتے ہیں کیونکہ ان کے علاوہ [illegible] تھے۔
حافظ [illegible] سعدی کا واقعہ ہے کہ [illegible] میں امام معاذ بن [illegible] جب ان کے نسیان کا اندازہ کیا تو [illegible] ان کے حافظے سے
اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی۔ لیکن یہ حالات دیر تک ایک [illegible] پر قائم نہ رہ سکے اور خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کے مصداق
معاشرے کے [illegible] حال [illegible] میں فرق آگیا۔ چنانچہ جب علامہ ابن خلدون ([illegible]) نے تصنیف تاریخ پر بحث کی تو انہیں یہ اعتراف
کرنا پڑا کہ [illegible] ضعیف [illegible] پایا جاتا ہے کیونکہ انسان [illegible] سننے والی چیزوں کو بغیر جانچے
قبول کر لیتا ہے اور [illegible] پہنچانے والوں کی روایات کو حالات کے تقاضے کے مطابق جانچنے کی کوشش نہیں کرتا کہ [illegible] حالات کے تحت
ایسا واقعہ [illegible] ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔ اصول عادت، قواعد سیاست، طبیعت تمدن اور اجتماع انسانی کے حالات پر نظر رکھنی [illegible]
ہے کیونکہ [illegible] سے جو [illegible] ان کے بغیر کوئی صحیح تاریخ نہیں ہو سکتی۔

مغربی فکر تحقیق

مسلمانوں کے اصول تحقیق اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ قریب قریب یہی اصول اب مغرب کی کتابوں میں بھی بیان ہونے لگے ہیں۔
The methodology of Education [illegible] کی کتاب Carter V. Good
[illegible] Research میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:[2]

> کسی واقعے کو پرکھنے کے لیے خارجی اور داخلی شہادتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مواد کہاں سے
> حاصل ہوا، راوی کون تھا؟ اس کے ذاتی حالات یعنی مزاج، مذاق، کردار و گفتار کی نوعیت
> کیا تھی؟ اس کا تعلق ان واقعات سے کیا تھا؟ واقعہ نگاری کی نوعیت کیا ہے؟ پھر اس خاص
> واقعے کے کتنے عرصے بعد راوی نے اسے نقل کیا؟ وہ روایت محض حافظے کی بنا پر بیان
> کی گئی ہے یا کسی اور راوی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؟ اصل واقعہ کتنا ہے اور تحریف یا
> اضافہ کس حد تک ہے؟

اصل [illegible] یا منسوب الیہ کی عادت کے خلاف ہو یا کسی ایسے شخص کی روایت ہو جس سے کسی اور نے
روایت نہ کی ہو [illegible] روایت میں راوی کی ذاتی رائے شامل ہو یا جس کے سمجھنے میں راوی سے غلطی کا احتمال ہے تو ایسی روایت پایہ اعتبار
سے ساقط ہو جاتی ہے۔

۱؎ مقالات [illegible] ندوی [illegible] تاریخ [illegible] ؎ مقدمہ ابن خلدون [illegible]
۲؎ [illegible] صفحہ ۲۵۰-۲۵۹

[illegible] نے پیش کر دیئے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سب کے سب اور قطعی طور پر مسلمانوں کے اصول حدیث سے ماخوذ ہیں اور ایسے ہیں کہ اُن پر خود مغربی مستشرقین کا حرفِ گیر عمل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ اصول "فکری تحقیق" یا "نظریاتی تحقیق" کے ذیل میں لائے جا سکتے ہیں لیکن "عملی تحقیق" کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں اور یہ محض اس لیے ہے کہ اُن کے یہاں بلکہ اب ذہن کے یہاں بھی وہ احتیاط برتی نہیں جاتی جو مسلمانوں کے قرونِ اولیٰ میں تھی۔ موجودہ دور کا محقق صرف اس بات سے خوش ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے موضوع سے متعلق کوئی معاصر شہادت ڈھونڈ نکالی۔ اب اسے مزید تحقیق و تنقیح سے سروکار نہیں۔ اور اس کے لیے اُس کے پاس کوئی گنجائش بھی تو نہیں۔ وہ کہاں سے اور کس طرح معلوم کر سکتا ہے کہ معاصر راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ؟ نکتہ رس ہے یا سطحی الذہن؟ حافظہ میں پختہ ہے یا نسیان کا شکار؟ بے جا عقیدت رکھتا ہے یا بغض پروری ہے؟ ملازمت یا خدمت گزاری کی وجہ سے خوشامدی اور ذہنی پستی کا شکار ہے یا حق گو اور بے غرض ہے؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات اگر اٹھائے بھی جائیں تو اُن کا حل کہاں اور کیونکر مل سکے گا؟ دور [illegible] ات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے کہ جس شخصیت پر کام کیا جائے اُس کے ماحول اور معاشرے کا جائزہ لے لیا جائے اور اُس کی "باقیات" کا مطالعہ کیا جائے۔ مجھے یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ ہم لوگوں نے اس انداز سے بھی بہت کم کام کیا ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ اس نقص کا احساس بھی بہت کم ہے۔ ایک موٹی مثال "عالمگیریات" کی ہے۔ یعنی اورنگ زیب عالمگیر سے متعلق جو ہمارے فضلا کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے برصغیر میں اس پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے تو کیا وہ انصاف سے بتا سکیں گے کہ عالمگیر کی مذہبی پالیسی کے پیچھے اُن اسباب و عوامل پر بھی غور کیا گیا ہے جو اخلاقی اور روحانی طور پر اُن کو متاثر کیے ہوئے تھے؟ میری مُراد ہے حضرت مجدد الف ثانی [illegible] کے صاحبزادگان [illegible] افسوس [illegible] کے پوتے یعنی حضرت خواجہ محمد نقشبند ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ کی مساعیٔ جمیلہ سے۔ انھوں نے اپنے بکثرت مکتوبات سے اور خود اپنی صحبت بابرکت سے اُس کو متاثر کیا تھا۔ افسوس کہ ہم نے عموماً اُن خانقاہوں سے ہنوز رجوع نہیں کیا جہاں اس قسم کے بکثرت جواہر پارے موجود ہیں۔ ان بزرگانِ دین کے بارے میں وقائع نعمت خان عالی کا یہ شعر بہت بار پڑھا ہوگا:

افزاید و نقد و بہتان، فال و خواب خواجگان — شیدہ [illegible] شیخان سرہند [illegible]

لیکن کبھی اس شعر پر ہم نے غور بھی کیا ہوتا کہ وہ حقیقت نگار ہے یا حقیقت سوز؟

پھر عالمگیر کے مقربین میں سے قاضی شیخ الاسلام، شایستہ خان، عاقل خان، سیف خان، بختاور خان، مکرم خان، مصطفیٰ خان، [illegible] میر گرز بردار وغیرہ بکثرت لوگ ایسے ہیں جن کے نام اُن بزرگوں کے متعدد مکتوبات موجود ہیں۔ کیا یہ مکتوبات تصوف کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بیش بہا خزینہ نہیں؟ ان بزرگوں کے اعزّا اور خلفا میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کی تصانیف موجود ہیں اور اُن سے بھی اُس دور کے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی حالات کے لیے بہت کچھ مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ خود سرہند کے مختلف بزرگانِ دین کے ملفوظات اور منقولات بھی اس لحاظ سے بہت اہم ہیں اور ان جواہرات کی قدر کے لیے کسی شاہ کی نہیں بلکہ کسی جوہری کی ضرورت ہے۔

[illegible] : Towards improving Ph.D programme

خارجی شہادت

غیرات کہاں سے کہاں جا پہنچی! یہی وجہ ہے کہ ہمارا تمام مغرب کے مہیا کیے ہوئے علمی تحقیق، زیادہ تر بلکہ تحقیقی سلسلہ کے اصول سے ماخوذ ہیں۔ لیکن چونکہ اس دور میں ان کا چلانا سخت دشوار ہے اس لیے چند نئے چند موٹی موٹی باتیں پیش کی ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ موضوع ایسا ہو جس میں پھیلاؤ ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ بیچ کام جو ایک سرسری جاننے سے زیادہ وقت نہیں رکھتا اور وقتِ نظر کے فقدان کی وجہ سے کسی لحاظ سے بھی تحقیقی سرمایہ نہیں کہے جا سکتے۔

بعض حضرات کسی خاندان یا کسی مدت کی تاریخ لکھواتے ہیں تو وہ تاریخ بھی گہرے مطالعے سے محروم رہتی ہے اور بنیادی طور پر مکمل نہیں ہوتی۔ بہرحال کام کسی نوعیت کا ہو، سب سے پہلے ایک عارضی خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور کتابیات کی ایک جامع فہرست بھی مرتب کی جاتی ہے تاکہ موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم ہو سکیں۔ امریکا والوں نے Documentation Centre بنا لیے ہیں جو بے حد مفید اور مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ تاہم اگر ہمارے ملک میں ایسے مراکز نہیں ہیں تب بھی آپ جیسے فضلا کی گراں قدر جماعت بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے اور ان کی مختلف صلاحیتوں کے پیشِ نظر ان کے لیے مختلف اہم موضوعات منتخب کیے جا سکتے ہیں۔ —— مثلاً ہمارے کسی طالب علم کو اگر شعر و شاعری سے زیادہ شغف ہے تو اس سے ہم یہ کہیں گے کہ کسی لمبے چوڑے موضوع کے بجائے اپنا کام کسی ایک شاعر تک محدود رکھ کر خارجی مواد سب سے پہلے تلاش کرو۔ یعنی اس شاعر کے متعلق تمام ضروری تذکرے اور تاریخیں دیکھ لی جائیں اور حالات میں جہاں کہیں اختلاف نظر آئے گا خاص طور پر نوٹ کر لیا جائے تاکہ دیگر معلوم یا داخلی شہادتوں کے ذریعے اس کی تحقیق و تنقیح کی جا سکے۔ شاعر کے اساتذہ اور تلامذہ کے حالات اور تصانیف کا بھی پورا پورا مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس نے اپنے اساتذہ نیز معاصرین سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کیا ہے اور کیوں؟ اگر فنی اختلاف ہے تو اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کا پس منظر اور پیش منظر واضح ہو سکے۔ اسی طرح اس شاعر کے مختلف تلامذہ کی تصانیف اور مختلف صلاحیتوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے تاکہ استاد اور شاگردوں کی امتیازی خصوصیات ابھر سکیں۔ یعنی جس طرح یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ شاعر یا مصنف اپنے اساتذہ یا معاصرین سے کہاں تک متاثر ہے اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے تلامذہ یا معاصرین کو متاثر کرنے کی کس حد تک صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر اس شاعر کے ماحول کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کی ذہنی تخلیق اس کے ماحول کی پروردہ ہوتی ہے۔ معاشی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی حالات بھی بہت کچھ متاثر کرتے ہیں۔ پھر اس کے والدین، اعزا اور احباب کے مزاج اور مذاق کا اندازہ لگانا بھی بہت مفید ہوگا۔ کیونکہ شخصیت بہت زیادہ ان سے بنتی ہے اور فنکار کی تخلیقات کے ایسے گوشوں تک پہنچے جاتے ہیں جن کا واضح نشان بظاہر ملتا نہیں۔ بلکہ خارجی شواہد کا داخلی شواہد سے صحیح مقابلہ ہی سرخروئی بخش سکتا ہے۔ پھر اگر وہ کوئی "صاحبِ دیوان" فنکار ہے تو اس کے زمانے کے متعلق اس کے اہم ترین کیفیات کا مطالعہ اور بھی ضروری ہے جو کسی نہ کسی طرح اسے متاثر کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے مطالعہ کے سلسلے میں اسی طرح کا تاریخی رد رکھنا سخت ظلم ہے۔ کیونکہ ؏ خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات بلکہ بقول غالب کے زمانے کا یہ واقعہ آپ کو یاد ہے کہ کس طرح قبلہ ڈاکٹر محمد شفیع صاحب مرحوم[1] نے غالب شناسی کے سلسلے میں ایک دیوان اور تیسری کتاب کے مطالعے کا مشورہ

---

[1] افسوس کہ اس فاضل اجل نے ۵۰ سال کی عمر میں ۱۹۶۳ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا [illegible]

دیا جس کا ایک نسخہ جرمنی میں تھا۔ میں نے اُس کے حصول میں اپنی معذوری ظاہر کی تو انھوں نے فرمایا کہ حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا کے میسر نہ ہونے پر کوئی دوسری دوا تجویز کر سکتا ہے لیکن ریسرچ کے سلسلے میں جو کتاب تجویز کی جائے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنی ہوگی کیونکہ اُس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔

خارجی شواہد کے لیے تذکروں اور تاریخوں کے علاوہ بعض مرتبہ معمولی معمولی رسائل بلکہ اخبار بھی بہت اہم ثابت ہوتے ہیں یعنی اُن میں کسی شخصیت کے متعلق کوئی اشارہ بھی مل جاتا ہے تو اُس سے اتنا تو ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں وقت تک اُس نے کیا کیا لکھ دیا تھا۔ اکثر معاصر تذکروں یا کلام کے مجموعوں میں تھوڑے بہت حالات کے ساتھ کسی شاعر کے جو اشعار بطور نمونہ پائے جاتے ہیں اُن سے اُن کی غزلوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو ویسے مجموعوں کی ترتیب کے وقت تک تیار ہو چکی تھیں۔ پھر داخلی شواہد سے ایسے کلام کی تعیین میں بڑی مدد ملتی ہے اور شاعر کے ذہنی ارتقا کے سمجھنے کے لیے یہ کام بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ معاصرانہ چشمک اور محبت سے متعلق چھپے ہوئے بکھرے اشعار یا حوالے بھی کسی شخصیت کے سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے انضمام و تفہیم کے لیے لازم اجتہاد کی یقیناً ضرورت ہے اور آپ جیسے فضلا کی رہبری میں یہ بات کچھ مشکل نہیں۔

خارجی مواد کی خاطر اگر ممکن ہو تو شاعر یا مصنف یا جس شخصیت پر کام کیا جائے اُس کے وطن اور مقامات قیام کو بھی دیکھا جائے۔ کیونکہ گرد و پیش کے حالات اور واقعات کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے سفر سے بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی طرح اُس شخص کی استعداد کے متعلق مختلف علوم و فنون سے بھی متعارف ہونا ضروری ہے، کیونکہ جو چیز بلا واسطہ حاصل ہو سکتی ہے وہ زیادہ اہم ہوا کرتی ہے۔ مزید یہ کہ مختلف ماخذوں کے لیے ترجموں سے کام لینا صحیح نہیں، کیونکہ ترجمے کا اصل نہیں ہو سکتے اور تحقیقی نکتہ شناسی اور ژرف رسی کے اہم مقصد کو پورا نہیں کر سکتے۔

داخلی شہادت

داخلی شہادت سے متعلق پہلی چیز تو یہ ہے کہ اُس شخصیت کی تمام تخلیقات کا جائزہ تاریخی ترتیب و توقیت کے ساتھ لیا جائے تاکہ اُس کے ذہن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ دیکھیے زبان، انداز بیان اور خیالات ایسی چیزیں ہیں جو کسی شخصیت کے عجیب و غریب گوشے کی پہیلی کھولتی ہیں۔ ایک زمانے میں وہ شخص کس طرح کی زبان بولتا تھا؟ کیا کیا تشبیہات و استعارات استعمال کرتا تھا؟ کون سے جذبات و خیالات اُس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے؟ زمانے کی پسند یا ناپسند سے اُس کا تعلق کس حد تک تھا؟ کون سے اصناف سخن اُسے پسند تھے؟ کون سے موضوعات سے اُس کا تعلق تھا؟ یہ تمام باتیں خود اُس کے کارنامے یا شہ پارے میں مل سکتی ہیں۔ اگر ان باتوں کے ساتھ ہی ان کے اسباب پر بھی غور کر لیا جائے تو اُس شخصیت کی نفسیات کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔ قصیدہ گو شاعر کی مدح سرائی جسے خوشامد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مادح اور ممدوح دونوں کی نفسیات کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ اسی طرح ایک ہجو نگار اکثر بیباکی سے اپنے معاصرین کی دکھتی ہوئی رگ کو اس طرح پکڑتا ہے کہ معاشرے کے بہت سے ناسور بہتے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مذہبی رنگ میں مثنویاں لکھنے والا اپنے اُس ماحول کی ترجمانی کرتا ہے جس میں جنگ و جدل کا چرچا تھا، خواہ وہ میدان کارزار ہو، خواہ مجلس۔ مرثیہ نگار اسی طرح صنف حرب کو گرما دینے والی مثنویاں اور ناٹک وغیرہ بھی اپنے اپنے احوال کی عکاسی کرتے ہیں۔ گویا ایسے محرکات سے فنکار اور تخلیق کار دونوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ مختلف اصناف فنی ایک

یہ زندگی ہے جو قومی تہذیب یعنی تصوف سے ایک ایسے مختصر دیوان صاحب سخن کی شناخت بھی کی جا سکتی ہے جس نے مذہب ایمان کو ایک
اور وحدت افکار کے بجائے کثرت افکار کو دعوت دی۔

داخلی شہادت کے لیے سب سے پہلے مواد کسی مصنف یا شاعر کی تخلیقات ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے کلام سے سوانح یا کلام کے ایسے مطالب نکل آتے ہیں کہ اجمال کے باوجود تفصیل بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ شاہ ولی (م ۱۱۱۹ھ) کے دیوان کی پہلی غزل میں سے یہ چار اشعار ماخوذ ہیں:

کہتا ہوں ترے ناؤں کریں ورد زباں کا — کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا
جس گرد اپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں — اس گرد کوں میں کحل کروں دیدۂ جاں کا
ہم صدق کی حرف عمل سوں لے اہل جیا دیکھ — تجھ قلب کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا
ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی — یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

ان اشعار سے حسب ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ اشعار کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ ان کا کہنے والا کوئی ڈھائی سو سال پہلے کا ہے۔

۲۔ دوسرے شعر (نعتیہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے فارسی شعرا کی تقلید کو اپنا شیوہ بنایا ہوگا جیسے اس شعر میں حضرت جامی کا یہ مضمون ملتا ہے:

بزمینے کہ نشان کف پائے تو بود — سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

۳۔ شاعر نے تیسرے شعر میں چاروں خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کی منقبت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ منقبت کے ایسے لطیف نکتے ہماری شاعری میں شاذ ہی نظر آئیں گے۔

۴۔ شاعر نے چوتھے شعر میں وحدت الوجود کے عقیدے کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت شیخ علی رضا سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۳۳ھ) سے بیعت تھا۔

۵۔ اس چوتھے شعر کے دوسرے مصرع سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا کہنے والا غزل کا شاعر ہے۔

ان پانچ باتوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے کہ یہ حمد و نعت والی غزل جو محض خانہ پری کے لیے دیوان کے شروع میں رکھی جاتی ہے ـــــ ظاہر ہے کہ شاعر کے آخری عہد میں لکھی گئی ہوگی۔ چنانچہ اس غزل میں وہ رنگ نہیں ہے جو ولی نے دلی آکر حضرت شاہ گلشن علیہ الرحمہ کے مشورے پر شعرائے متاخرین فارسی کی تقلید میں اختیار کیا تھا۔ اور وہ رفتہ رفتہ کم ہو گئے۔

اشعار کا یہ تجزیہ ایک حیرت انگیز شے ہے۔ آپ حضرات اس سے بہتر طریقے پر اپنے طلبہ کو بہم پہنچاتے ہوں گے۔ داخلی شہادت

۱؎ یہ بزرگ بقول شاہ احمدی (ناظر سعید) نقشبندیہ بھی تھے اور چشتیہ بھی۔ چشتیہ ہونے کا اشارہ ولی نے اس شعر میں کیا ہے جس میں اپنا نام بھی دیا ہے:

بعد شاہ نجف ولی اللہ — پیر کامل علی رسا پایا

کے سلسلے میں آپ نے اپنے طلبہ کو ان کے نصاب کے شعرا کا مطالعہ کراتے وقت کلام کی توقیت اور ترتیب بھی سکھائی ہوگی۔ شعر کے دواوین میں مختلف اصناف سخن کی تاریخ تصنیف شاذ ہی ملتی ہے اور غزلیات میں تو معدوم ہی ہے۔ (سوائے حاتم یا حسرت جیسے دوچار شعرا کے) لیکن طلبہ کے لیے اس کی شناخت از بس ضروری ہے۔ چنانچہ عرض ہے کہ اگر کسی ظاہری شہادت سے یہ تعین نہ ہو سکے شاید اس طرح ضرور کامیابی ہو سکتی ہے کہ شاعر کے ایک مخصوص ضرب سے متعلق تمام اشعار یک جا کر لیے جائیں، پھر ان کے اسالیب کی باہمی مناسبت پر غور کیا جائے۔ اگر یہ مناسبت قریب ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اشعار بلکہ ان اشعار والی غزلیں قریب العہد ہوں گی۔ اسی طرح ہر جز سے متعلق شاعر یا مصنف کے الفاظ، محاورات، تلمیحات، مصطلحات، تشبیہات و استعارات، نیز مختلف خیالات وغیرہ اگر یک جا کر لیے جائیں تو جس شخص کے کلام (و ہجو) سے ان کا اظہار ہوا ہے اس کی گفتار و کردار دونوں کی قلمی تصویر کھینچی جا سکتی ہے اور اس خود گفتہ تاریخ سے بڑھ کر اس شخصیت کے حالات کے لیے اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے اس قسم کی سبک شناسی یقیناً مشکل چیز ہے لیکن اگر ہم میں سے کوئی شخص ایک سال میں صرف ایک طالب علم بھی اس طرح کا تیار کر سکے تو وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ : شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

طلبہ میں جب اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ آسانی سے اصلی اور الحاقی کلام کے درمیان حد فاصل قائم کر سکتا اور یہ تمیز نہایت ضروری ہے کیونکہ ہم نام اور ہم تخلص شعرا کا کلام اکثر آپس میں خلط ملط ہو جاتا ہے۔ کیا ہمارے لیے یہ امر موجب افسوس نہیں کہ ہم نے ابھی تک فارسی میں حضرت ابو سعید ابو الخیر، حضرت احمد جام، ژندہ پیل، عمر خیام، عثمان ہارونی، ظہیر فاریابی، عمادی، حضرت عبد القادر جیلانی، حضرت معین الدین چشتی، حضرت قطب الدین بختیار کاکی، زیب النساء وغیرہ کے الحاقی اور اصلی کلام کا تجزیہ اسی طرح اردو میں سودا، قائم اور میر نیز جرأت و یقین وغیرہ کے کلام میں ہم نے ابھی تک حد فاصل کا کوئی خط نہیں کھینچا۔ اگر ہمارے طلبہ میں یہ ملکہ پیدا ہو جائے تو پھر داخلی شہادت کا صحیح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

داخلی شہادت کے سلسلے میں ایک اور چیز بہت اہم ہے اور وہ کثرت اہنگ۔ ایک غزل یا ایک تحریر کا آہنگ شروع سے آخر تک ایک ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ بقول اقبال

دادم نقشہائے تازہ ریزد · بیک صورت قرار زندگی نیست

بات یہ ہے کہ لکھنے والا لکھتے لکھتے ہی مختلف حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ شادی، غمی، بیماری اور پریشانی سبھی کے سانحے ہوتی ہیں۔ پھر مختلف نوع کی مصروفیات بھی درپیش ہوتی ہیں۔ اسی لیے بڑے سے بڑا ادیب بھی تحریر کے معمولات پاک نہیں۔ پہلے کے اساتذہ زیادہ تر اور آج کل کے اساتذہ کم تر اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ فلاں شعر بلند ہے یا فلاں شعر بو دا ہے اور ایسا کیوں ہے؟ اسی طرح نثر کی جملہ پختگی اور کم پختگی کی شناخت کرنے سے بھی ہم لوگ گریز کرتے ہیں اور اگر اس انداز سے کوئی استاد تعلیم دیتا تو اس کی مذمت کر کے ہم "ادب برائے ادب" کہہ کر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ نتیجہ کیا موجودہ دور کے فاضل نقادوں میں سے کم ہی ایسے ہیں جو شعر کی بلندی، پستی یا نثر کے جھول اور اس کے اسباب کی صحیح تفہیم کر سکے۔ اگر اس نثر کی بلندی و پستی کے اسباب کی تلاش کرنا مشکل ہے تو کم از کم صوتی زیر و بم کی ناموزونیت اور شکست نارسائی کی شناخت کرا دی جائے ورنہ صحیح بندش اور صحیح صوت

جیسے اصطلاحات کا اصل پہلے معنی ہوکر وہ باتیں کہ اصلیت ابھر کر آتا ہے۔

ایک معتبر چیز و داخلی شہادت کے ذیل میں منسوب ہے وہ قطعاتِ تاریخ ہیں جو ہمارے اکثر دواوین میں ہیں مصنف بھی ہے لیکن فن کے لحاظ سے قطعات چند نہیں جس سے اس لیے ان کا ذکر بھی شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ تاریخی اور معاشرتی معلومات کے لحاظ سے ان کی افادیت مسلّم ہے ایک ماہر، جس کے دیوان کا ہر جزو، ادبِ عالیہ کا شاہکار ہو۔

چند مشورے

اب میں اپنی ناقص تجربے کے مطابق اپنے طلبہ کے لیے چند مفید کام تجویز کرنا چاہتا ہوں۔[۱] شعبۂ اردو میں جو بیک وقت ہیں وہ انھیں مفید طلبہ سے کام دیے جا سکتے ہیں۔ الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، اصطلاحات، تلمیحات، تشبیہات و استعارات پر مستقل مقالے لکھے جا سکتے ہیں؛ جن میں ان کی اصل اور اشتقاق پر مفصل بحث کرائی جائے۔ پھر نظم و نثر سے ان کی مثالیں تلاش کرائی جائیں اور مختلف زمانوں میں لفظی اور معنوی حیثیت سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کو مثالوں کے ساتھ ساتھ ان کے اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ ہم نے کتاب آصفیہ اور لغت کے نسخوں میں الفاظ و محاورات پر بھی مستقل مقالے تیار نہیں کرائے جن کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ سنسکرت، پراکرتوں اور علاقائی زبانوں سے اردو زبان کے صرفی و نحوی روابط پر بھی کام کیا جا سکتا ہے تاکہ خود اردو زبان اور دیگر علاقائی زبانوں کی اصل اور ابتدا کو متعین کرنے میں سہولت ہو۔ صرف و نحو کے علاوہ عروض و قافیہ، بیان و بدیع، املا و انشا، تذکیر و تانیث وغیرہ متعدد علوم ہیں جن کے قدیم اور ابتدائی نمونوں کی مدد سے بھی اردو کی عمر اور اس کی اصل کو متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ صوتیات اور لسانیات سے متعلق بھی بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں اور طلبہ کو بتایا جا سکتا ہے کہ اب و ہوا اور مختلف مذاہب کے اختلاف کی وجہ سے ایک ہی خاندان کے الفاظ کس طرح تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور خاص شعرا اور خاص مصنفین کے مشاہیر کے قلم سے ہونے والی صوتی تبدیلیاں بھی آسانی سے ذہن نشین کرائی جا سکتی ہیں۔ فرہنگ بنانے کا کام بھی طلبہ کو دیا جا سکتا ہے تاکہ ایک نظر میں یہ معلوم ہو سکے کہ ایک مصنف نے کہاں کہاں سے الفاظ، محاورات اور اصطلاحات وغیرہ کہاں کہاں استعمال کیے ہیں۔ نیز افراد و مقامات اور مختلف تصانیف اور اقوال وغیرہ کا ذکر اس مصنف نے کہاں کہاں کیا ہے؟ افسوس کہ ہم نے اپنے ادبی شاہ پاروں سے بھی ہنوز ایسا کام نہیں کیا۔ یہی حال فارسی کا ہے کہ سبکِ خراسانی، سبکِ عراقی اور سبکِ ہندی کے اب تک ہم نے اچھی طرح کوئی کام نہیں کیا۔ عربی زبان و ادب پر مختلف حیثیات سے متعلق بھی مستقل مقالات کی ضرورت ہے۔ پھر خود ہمارے ملک میں بکثرت عربی فارسی مخطوطات ہیں، ان کی ترتیب و تہذیب کی بھی بڑی ضرورت ہے اور یہ کام اگر ہم نے اب بھی نہ کیا تو ان کا ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جانا ہے۔ خود ہمارے کتب خانوں میں بکثرت اور مخطوطات خراب و خستہ ہوتے جا رہے ہیں اور ان پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

بعض ذہین طلبہ سے نثر و نظم کی اہم کتابیں ایڈٹ (مرتب) کرائی جا سکتی ہیں اور مفید حواشی و تعلیقات بھی لکھوائے جا سکتے ہیں۔ کام بظاہر سہل معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصحیح و ترتیب میں بڑی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ کسی کسی لفظ کی تعیین سے اختلافِ قرأت

۱؎ محترم ڈاکٹر عبد الستار صدیقی نے کل ہند اورینٹل کانفرنس کے گیارھویں اجلاس منعقدہ حیدرآباد (دکن) کے خطبۂ صدارت میں تحقیق کے لیے جو مشورے دیے ہیں ان سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے۔

کام مرتب کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ بعض کرم خوردہ نسخوں کے کٹے پھٹے الفاظ کو ان کی کشید کے لحاظ سے درست کرنا اور خط شکستہ کو پڑھ کر صحیح کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اکابر مصنفین کے کاموں کو پیش نظر رکھ کر یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ متن کی درستی اور حواشی کی فراہمی کے سلسلے میں کسی نایاب اور جامع و نافع مواد سے استفادہ کرنا بھی بڑی سلیقہ مندی ہے۔ ایسے کاموں کے لیے صرف انہی اساتذہ سے رجوع کرنا چاہیے جنہیں اس فن کا خاص تجربہ ہو کیونکہ ع : ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں ؟

پھر رجوع کرنے میں کسی طرح کا تکلف یا اظہار تشکر میں کسی طرح کا بخل بھی روا نہیں۔ کئی موقعوں پر دیکھا ہے کہ بعض صاحبان کی پوری پوری کتابیں درست کر دی گئیں اور انہوں نے اظہار تشکر میں صرف اتنا کہہ دیا کہ فلاں صاحب سے بہت کچھ مشورہ لیا گیا ہے اور بس۔ اسی طرح ایک صاحب نے بڑی محنت سے حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کو مرتب کیا لیکن اس کے عربی ماخذوں کے سلسلے میں اساتذہ سے رجوع کرنے میں اپنی توہین سمجھی۔ چنانچہ ان کا بلند پایہ کام ادھورا رہ گیا ہے۔ پھر ایک خامی عام ہے جس کا ذکر شروع میں بھی کیا گیا ہے کہ تحقیقی مقالات کو بھی خواہ مخواہ طویل اقتباسات سے پُر کیا جاتا ہے اور کتاب کے حجم کا رعب جمایا جاتا ہے۔ ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جو پانچ پانچ چھ چھ سو صفحات پر محیط ہیں لیکن اگر ان کا خلاصہ کیا جائے تو وہ صرف ۲۰۔۲۵ صفحات میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ ایسی کتابیں مصنف کے فوت ہونے سے پہلے ہی فوت ہو جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو ایجاز و اختصار کی مشق کرائیں تاکہ ضمنی طور پر بے ہودہ فضول بحثوں میں پڑنے کے عادی نہ بنیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات بھی کم سے کم الفاظ میں کہی جا سکتی ہے۔ لیکن شاید راقم الحروف بھی تطویل کلام کے جرم میں قابل مواخذہ ہے۔ ع

صلاح کار کجا و من خراب کجا

شعور کی رو اور ناول نگاری

ڈاکٹر احسن فاروقی

انگلستان کی پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان کی ناول نگاری میں ایک بالکل نیا طریقۂ قصہ گوئی نظر آتا ہے جس کو Stream of Consciousness یا شعور کی رو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ایک مدت سے ہمارے یہاں بھی تقسیمِ ہند کے بعد برتا جانے لگا ہے۔ ناول نگاری کے لیے یہ طریقہ عجیب ابہام، عجیب پیچیدگی، عجیب مرموزیت رکھتا ہے۔ انگلستان کے نقاد اور مبصرین اب بھی اس کی کمزوریاں مانتے ہیں؟ مستعمل کیا۔ ہمارے نقاد و سارے کے سارے مبصرین و ہیں اس کو افسانے ناولوں میں نوٹ کی طرح پر بیشتر سمجھتے ہیں۔ اس کی با گہرائی میں داخلی اور کم فہمی اٹھتی آتی ہے اس کو ایک اہم چیز کہہ کر ٹال دینا وہ بہتر سمجھتے ہیں۔ بہرحال کافی حضرات نے جو اس سے دلچسپی لیتے ہیں مجھ سے سوال کیے: آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کو کیسے کہا جائے؟ آخر یہ ہے کیا؟ آخر یہ دلچسپ کیوں نہیں ہوتا؟ اس سے بالآخر کیا فائدہ؟ اور میرے دل میں بھی یہ سوال اٹھا کہ اردو ادب میں جہاں اب تک ناول نگاری کے سلسلے میں پہلے قدم ہی سے آگے نہیں بڑھا گیا، اتنے زیادہ مشکل تجربوں کی کیا ضرورت ہے جو انیسویں صدی کی ناول نگاری کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں؟ اس قسم کے تمام سوالات کا جواب پانے کے لیے میں یہاں اس نئے تکنیک کا ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں

Stream of Consciousness کا فقرہ جس کا ہم نے شعور کی رو ترجمہ کیا ہے، امریکی ماہرِ نفسیات اور فلسفی ولیم جیمس کی ایجاد ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی شعور ایک سیال چیز ہے جو بغیر کسی منطقی ربط کے زندگی بھر برابر چلتا رہتا ہے۔ شعور سے مطلب یہاں محض حافظہ، ذہن، منطقی قوت، ادراکی طاقت، تخیل یا اسی قسم کی وہ تمام دماغی قوتیں نہیں جو پرانے علمِ نفسیات میں الگ الگ سمجھی جاتی تھیں بلکہ ان تمام قوتوں کا اور وجدانی قوتوں کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کے دماغ کا ہر وقت ایک پیچیدہ طریقہ پر چلتا رہتا ہے۔ شعور اس کو اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کو اس کے وجود اور اس کی رفتار کا علم ضرور ہوتا ہے مگر اس کو اپنے اندر یا کسی دوسرے کے سامنے پیش کرنا آسان نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ بات چیت یعنی زبان کے ذریعہ صرف اس کا کچھ حصہ ادا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں زبان بڑی محدود چیز ہے۔ زبان کے قاعدے اور روایات محض ذہنی یا تخیلی ہیں۔ شعور کے ایسی زبان اختیار کرنے سے پہلے جو تمام رنگ بکھر سکیں اس کی کچھ کیفیات ہوتی ہیں جن کی طرف نفسیات نگاروں نے خاص توجہ کی۔ یہ کیفیات ہی شعور کا ... خاص حصہ ہیں

ناول نگاری قصہ گوئی کا ارتقا ہے جب قصہ گو نے محض تخیل کو جس کے ماتحت وہ دیو پری اور مافوق البشر چیزوں کے قصے سناتا تھا یا محض اخلاقیات کو جس کے ماتحت وہ اخلاقی قدروں کو اپنے قصے کے کردار بناتا تھا چھوڑ کر نفسیاتِ انسانی پر تکیہ کیا۔ انیسویں صدی سے انفرادی نفسیات کا جو علم رائج تھا وہی ناول نگار کے لیے بنیادی ٹھہرا۔ اب بیسویں صدی میں شعور کی رو کو انسانی نفسیات ...

سب سے اہم بحث ثابت کیا گیا تو ناول نگار کے لیے یہ ضروری ہوا کہ وہ اپنے کردار کی انفرادیت دکھانے کے بجائے اس کے شعور کی رو کے نقشے کھینچے اور اس سلسلے میں ڈورتھی رچرڈسن Dorothy Richardson نے پہل کر دی۔ پہلے اُس نے ایک ناول "پوائنٹڈ روفز" Pointed Roofs لکھی جو بڑھتے بڑھتے بارہ جلدوں تک چلی گئی اور سب جلدوں کا ایک نام اس نے "پلگریمیج" Pilgrimage رکھا۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتی ہے:

> "اس ناول کی تصنیف کے دوران میں مصنفہ کو یہ تجربہ ہوا کہ تصنیف کے ذریعہ حقائق کا اظہار کرنے میں کتنی دشواریاں ہیں کیونکہ جب کسی حقیقت کو ایک صورت دی گئی تو محسوس ہوا کہ اس کی سیکڑوں اور بھی صورتیں ہو سکتی ہیں۔"

ان الفاظ سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس کا مقصد نفسیاتی تجزیہ ہے۔ نفسیاتی زندگی کے پُر اسرار محلوں میں وہ گم ہو جانا چاہتی ہے۔ ناول کا نام "پلگریمیج" بھی اس بات کا اشارہ ہے کہ مذہبی سفر پر یا ذہنی تلاش میں روانہ ہونے کا معاملہ یہاں درپیش ہے۔ حق کا متلاشی تمام نفسیاتی پیچوں میں گم ہے اور اس تک پہنچ جانا مطلب و منزل ہے۔ یہ ایک نئی راہ ضرور ہے حالانکہ اسے ابھی تک فنی کامیابی کے دائرے میں نہیں لایا جا سکتا ہے۔ ہیروئن مریم کے جو جو نفسیاتی تجربے ایک طویل تصنیف میں عجیب بے ربطی کے ساتھ لائے گئے ہیں وہ کسی طرح قاری کے لیے دلچسپ نہیں ہوتے۔ شعور کی رو کو نمایاں کرنے کی بنیاد تو پڑ جاتی ہے مگر ضرورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ اس کو فنی درجہ پر لایا جائے۔ اس کام کو ایک مرد جیمس جوائس James Joyce اور ایک عورت ورجینیا وولف Virginia Woolf نے پورا کیا۔ ان دونوں کے فنوں کو سمجھانے کے سلسلے میں بڑی بڑی کتابیں لکھ دی گئی ہیں۔ یہاں ان کو پورے طور پر واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ سوال ان اصولوں، طریقوں اور تکنیک کا ہے جو ان کے اور ان کے پیروؤں کے ذریعہ وجود میں آئے اور جن کو برتنے سے اُردو ناول نگاری میں نئے شگوفے کھلے۔

شعور کی رو والی ناول کا عام طریقہ یہ ہے کہ اس میں قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے جیسے کہ کسی فرد کے دماغ میں تاثرات کی بے ہنگم قطار چل رہی ہے۔ یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ انسانی شعور میں جو کچھ آتا ہے وہ نہایت درجہ بے ربط ہوتا ہے مگر جب کوئی شخص اپنے خیالات دوسرے کے سامنے ادا کرتا ہے تو زبان کے قواعد کا ربط اور منطقی ترتیب کا بعد اس پر حاوی کر لیتا ہے اور اسی بنا پر ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں آتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی شخص اپنے ذہن میں منڈلاتے تمام خیالات کو جوں کا توں رقم کرتا چلا جائے تو ایسا گڑبڑ جھالا سامنے آئے گا جو کوئی سمجھ نہ سکے گا۔ مگر شعور کی رو والے ناول نگار اسی گڑبڑ جھالے کو پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال جیمس جوائس کی "یولیسس" کا آخری باب ہے جس میں میرین بلوم کے خیالات کی رو اس طرح ختم ہوئی ہے کہ ایک لفظ بغیر کاما یا فل اسٹاپ کے پینتالیس صفحوں تک چلتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ کون کیا سوچ رہا ہے اور وہ کہاں اور کس وقت اور کس حالت میں ہے۔ شعور کی رو سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ میرین بلوم سوچ رہی ہے۔ وہ اپنے میاں کے پاس بیٹھی ہے جو اس پر زندگی میں پہلی دفعہ عرصہ چاک کر سو گیا ہے۔ اس عمل نے اس کے خیالات کو ایک جذباتی رنگ دے دیا ہے اور وہ گزشتہ چلے جا رہے ہیں حالانکہ ان کی بابت میاں بیوی کے تمام زندگی کے تعلقات کے واقعات سامنے آتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قاری اور فرد کے شعور کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے اور خیالات کا وہ عالم سامنے آ رہا ہے جو ان کے زبان کے ذریعہ ادا ہونے سے پہلے کا

ہوتا ہے۔ یہ عالم ہی شعور کی رو کے طریقے کی بنیاد ہے۔ یہی عالم ایک اور طریقے پر یوں سامنے آ سکتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف بھی موجود ہے اور اس عالم کو قاری کے سامنے لا رہا ہے۔ ایک آدھ فقرہ جو یہ واضح کر دیتا ہے کہ شعور کی رو تو سامنے ہے مگر اس کے اوپر سے کوئی شخص بار بار پردہ اٹھاتا جا رہا ہے۔ اس کی بہترین مثال ورجینیا وولف کا ناول "مسز ڈالووے" کا آغاز ہے۔ مصنف شروع یوں کرتی ہے کہ،

"مسز ڈالووے نے کہا کہ وہ خود پھول خریدے گی کیونکہ لوسی کے سب کام سپرد ہو گئے ہیں۔ وہ خالی نہیں ہے۔ دروازے چوکھٹوں سے نکالے جائیں گے۔ رمپلمیئر کے آدمی آرہے ہیں۔ پھر کلیریسا ڈالووے نے سوچا کیا صبح ہے۔ ایسی تازی جیسے کہ بچوں کے لیے سمندر کے کنارے کھیلنے کے لیے بنائی گئی ......"

اس طرح ناول چلتا چلا جاتا ہے۔ اس طریقے میں پہلے طریقے سے زیادہ ربط نظر آتا ہے۔ جملے بھی پورے پورے ہیں اور ترتیب بھی ایسی بے ربط نہیں مگر پھر بھی بنیادی طور پر اس میں بھی ذہنی ربط کا فقدان اور خیالات کے دھارے کا تسلسل ہے جو پہلے طریقے میں۔ یہ دونوں طریقے سب سے اہم ہیں حالانکہ ان کے استعمال کے مدارج رہتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر پرانے بیانیہ یا منطقی طریقوں پر بھی آ گیا مگر ان مقامات پر بھی سوال زیادتی یا کمی ہی کا رہتا ہے کیونکہ ربط اور بے ربطگی کا امتزاج ایک حد تک لازمی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس وقت بھی جبکہ اس طریقے میں کامل بے ربطی ہوتی ہے، ربط کا وجود ضرور رہتا ہے۔ ناول نگار کے سامنے شعور کی بے ربطی اور منطقی ذہن کے ربط کو اپنی مرضی اور اپنے مقصد کے مطابق برتنے کا سوال ہوتا ہے۔

(۳) سارے عمل کا مقصد "رو" "دھارے" یا بے تکان حرکت کا تاثر قائم کرنا ہے۔ اس دور میں زندگی کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ زیادہ تر ہم کو رفتار ہی رفتار دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے فلسفہ میں بھی مکان سے زیادہ زمان اہم ہو گیا ہے اور آخری نقطہ کوئی ازلی اور قائم حقیقت نہیں رہی بلکہ تبدیلی یا becoming ہو گئی ہے۔ کائنات تیزی کے ساتھ ارتقا کرتی بتائی جاتی ہے اور خالق بھی ہر لمحہ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے ناول میں بھی ذہنی نفسیات نہیں بلکہ ذہنی رفتار کی طرف توجہ لازمی تھا۔ کیونکہ ناول نگار رفتار کو دیکھنے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ انسان کا ذہن بھی انہیں چکر کھاتی ہوئی چیز ہی دکھائی دیا۔ لہذا لندن اور ڈبلن کے رہنے والوں کے لیے شعور کی رو ہی کو دکھانا قدرتی تھا مگر لکھنؤ جیسے پرسکون شہر کے رہنے والے اپنے گھنٹے پر تاروں اور لمس عیش اور دکھاوے سے زیادہ نہ تھا۔ ان کا بھی کی زندگی میں گھل مل جانے کے بعد شعور کی رو کی طرف توجہ ضروری ہو جاتی ہے۔ شعور کی رو کا تسلسل دکھانا اس دور کے ناول نگاروں کے لئے اتنا ہی قدرتی تھا جتنا کہ اٹھارویں صدی کے ناول نگاروں کے لیے مستقل شخصیتوں سے الگ ہو کر انفرادی نفسیات پیش کرنا۔ زیادہ تر لوگ ہمیشہ صدی سے پیچھے ہی رہتے ہیں اس لیے فیلڈنگ پر بد اخلاقی کا الزام لگایا گیا اور اب جوائس پر "کنفیوژن" کا۔ بہرحال بدلے شعور کی رو کا احساس دلانا سب سے اہم فرض ٹھہرا۔ اس کے لیے جو طریقہ DEVICE خاص طور پر استعمال کیا گیا وہ FREE ASSOCIATION تھا۔ نفسیات کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انسان کا ذہن کبھی ایک مقام پر نہیں ٹھہر سکتا مگر اس کا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف جانا بے ربط آزاد تلازمے کے ماتحت ہوتا ہے جو تین اصولوں سے جاری نظر آتا ہے۔ پہلا حافظہ، دوسرا حسیات اور تیسرا تخیل ...

ے دماغ کو کچھ چیزیں یاد آتی ہیں کچھ محسوس ہوتی ہیں اور کچھ ہونے والی چیزوں کا وہ تصور کرتا ہے۔ دُوسری قسم کی چیزیں موجود ہیں۔ پہلی ر کی ماضی میں اور تیسری قسم کی مستقبل میں ہیں۔ یہ سب ایک دُوسرے سے وابستہ ضرور ہوتی ہیں حالانکہ منطقی طور پر یہ حد سے زیادہ ے ربط ہوتی ہیں۔ ناول نگار ان میں سے ہر ایک کو ایک دُوسری سے وابستہ کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس کی مثال میں بیریں بوم ہی کے سور کی تصویر کو لیجیے۔ اس کے آخری حصّہ کو غور سے دیکھیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے گھڑی بجتی سنی اور اس کے تصور میں چینی لوگ ے اور ویگلیس کی تصویر یاد آئی۔ اس نے خزاں کو سوچا تصور کیا اور پڑوسیوں کی گھڑی کے الارم کا خیال کیا۔ وہ گھڑی کے بجنے کو گننے لگی س کی نگاہ دیوار کے کاغذ پر پڑی اور عیاں تاروں کی سمت کے پھولوں کی طرف گیا اور اس کے ساتھ لمبارڈ اسٹریٹ پر گھر یاد آیا اور وہ کمرے دے جو اس کے میاں نے اسے دیے تھے۔ اب اس کی نگاہ اپنے میاں کی طرف گئی جو پاس ہی سو رہا ہے اس نے لیمپ بجھایا اور سے دیا کہ اسے جلدی اُٹھنا ہے اور اس نے آنے والے دن کے کاموں کا تصور کیا۔ بازار میں خرید و فروخت، روٹی کی دوکان کا نقشہ سامنے ا اور خرید و فروخت کی طرف خیال گیا۔ ڈنڈا اس کا تصور ہوا گھر کو صاف کرنے کا خیال آیا اور ڈنڈا اس کو کھانا کھلانے کا۔ پیانو کو صاف کرنے ، میز پر پھول لگانے کا اسباب اسے محسوس ہوا کہ پورا کمرہ پھولوں میں تیرنے لگا۔ اس نے قدرت پر سوچنا شروع کیا اور مناظرِ قدرت سامنے ئے۔ وہ منکروں کو خدا کے وجود کا ثبوت سورج کی رفتار سے دینے کی سوچنے لگی۔ اسے بیمر پالڈ کے سورج پر خیالات اپنی محبت ے عہد میں یاد آئے۔ جبرالٹر یاد آیا اور جنت کی باتیں یاد آئیں اور اس کے بعد وہ سو گئی۔ غرض اس پورے نقشہ میں اہم بات کوئی بھی ہیں ہے۔ باتوں کی ایک سے دُوسری کی طرف حرکت اور پورے شعور کی حرکت اہم ہے۔ حرکت ہی دکھانا مقصود ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار سینما کے تیکنیک سے طریقے مستعار لے رہا ہے۔ قصہ گویوں نے ہمیشہ عام تفریحات نظر رکھی۔ ناول کو پاکٹ ڈراما بھی کہا گیا ہے اور ڈرامے کے ٹیکنیک کا اس پر بہت گہرا اثر ہے۔ اب عام تفریحات میں ڈرامے کی ہ سینما نے لے لی ہے اور اس کے ٹیکنیک کا بھی ناول میں آ موجود ہو جاتا ہے۔ فلم کی ڈرامے پر برتری اسی بات میں ہے کہ وہ زندگی ، رواں دواں اور تیزی سے مقام اور زمانہ بدلتی ہوئی دکھا سکتی ہے۔ اسی میں فلم کے قصہ کا بھی خصوصی مقصد رفتار کا دکھانا ہوتا ہے۔ اگر ی فلم کو ٹیکنیکل نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اس میں بھی مختلف قسم کے ٹکڑے IDEAS OR ASSOCIATIONS ے حساب سے جڑتے ہوئے نظر آئیں گے بس تیزی کے ساتھ ایک تصویر دُوسری کے بعد آتی ہوئی کہیں ایک تصویر ایک دم دُوسری ، بدل جاتی ہوئی۔ اور کہیں ایک مرکزی تصویر سے وابستہ تصویریں جمع ہوتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ ایک موضوع کی تصویر بیسیوں پہلوؤں سے بھی کھائی جاتی ہے۔ واقعات کی رو دکھانے کے لیے بھی بہت سی نئی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں۔ فلم بنانے والوں نے ان تمام ترکیبوں کے نام رکھ ے ہیں جیسے FLASH - BACK . CLOSE - UP . CUTS . FADE OUT . SLOW - MOTION . MEDIUM - SHOT وغیرہ وغیرہ۔ تمام ترکیبیں شعور کی رو والے ناولوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ورجینیا وولف کی ناول MRS. DALLOWAY میں شروع ہی سے احساس ہوتا ہے کہ شعور کی رو سینما کے ٹیکنیک پر چل رہی ہے۔ پہلے کلیریسا ایک پارٹی میں شرکت کے لیے تیاری کا خیال کرتی ہے پھر اس کا دھیان حال کی طرف آتا ہے اور وہ دیکھتی ہے صبح بڑی خوشگوار ہے۔ اب ایک FLASH - BACK ہوتا ہے جو بیس برس پیچھے لے جاتا ہے اور بورٹن کے دن سامنے آتا ہے۔ اسی میں ایک (CLOSE - UP) ہوتا ہے جس میں اس کی پیٹر والش سے بات چیت دکھائی گئی ہے۔ پھر پیٹر والش

ملا مختلف طرف دھیان جاتا ہے۔ جب MULTIPLE VIEW کی ترکیب استعمال ہوتی ہے اور کلیریسا کے شعور کو چھوڑ کر ایک طرف دھیان جاتا ہے جو سڑک پر کھڑا ہوا کلیریسا کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اس کے شعور کی رو سامنے آجاتی ہے اس کے بعد شفٹر سے جست برگ معلوم ہوتی ہے۔ اب پھر ایک FADE - OUT ہوتا ہے اور اس کی یاد میں کل شام کی جگہ کی بات چیت آتی ہے FADE - OUT ہوتا ہے اور وہ شہر کی موجودہ حالت کا اپنے طور پر جائزہ لیتی نظر آتی ہے۔ یہاں ایک CUT ہوتا ہے اور پر جب وہ بہت بڑے مال کے دروازے کی طرف آتی نظر آتی ہے۔ پھر FADE - OUT ہوتا ہے اور کلیریسا کے شعور کی رو سامنے آتی ہے اور وہ بہت بڑے زمانے کے دنوں پر غور کرتی ہے۔ وقت تیزی سے بیتتا ہوا نظر آتا ہے۔ ماضی حال مستقبل FLASH میں اور کلیریسا اپنی بیٹی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ پھر CUT ہوتا ہے اور وہ حال میں آ کر مسز کی طرف متوجہ نظر آتی ہے۔ پھر FADE OUT ہوتا ہے اور وہ ماضی میں اپنی قوت کا احساس کرتی ہے۔ اس طرح زیادہ تر شعور کی رو والی ناولیں وہ سب استعمال کرتی ہیں جن کو ہم فلم بنانے والے MONTAGE کے نام سے جانتے ہیں اور اگر فلم ٹیکنیک سے واقفیت ہو تو شعور کی ناول کو سمجھنے میں ویسی ہی مدد ملتی ہے جیسی پرانی ناولوں کو سمجھنے میں تخیل سے ملتی ہے۔

مگر فلم زندگی کی ظاہری رفتار یا رد و کشا نہیں ہے اور یہی حال شعور کی رو والی ناول میں دکھایا جاتا ہے اس حد تک فلم ٹیکنیک ساتھ دیتا ہے مگر ناول نگار کو شعور کا پوشیدہ اور پیچیدہ پہلو بھی دکھانا ہوتا ہے نہیں تو اس کی تصویر فلم کی طرح محض حسی چیز بنے گی۔ شعور کی رو کے ذریعہ ناول نگار کو اپنا شعور نہیں بلکہ کسی دوسرے فرد کا شعور سامنے لانا ہوتا ہے۔ ہر شعور کچھ انفرادیت رکھتا ہے مگر یہ اس قدر پراسرار ہوتی ہے کہ دوسرا اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ شعور کی رو دکھانا کوئی بے معنی اور بیکار کا کھیل نہیں ہے بلکہ فنی مقصد ہے یعنی وہ نفسیاتی نقشہ دکھاتا ہے جو معنی خیز ہوتا ہے۔ شعور کی رو والی ناولوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ایسی چیزیں سامنے لائی جا رہی ہیں جو زیادہ سے زیادہ مبہم ہوتی جا رہی ہیں۔ آخر ان کے معنی کیسے سمجھے جائیں۔ کیا ان کے کوئی معنی ہیں بھی؟ کیا وہ محض اتفاق قرار دے کر ترک ہی کیوں نہ کر دیا جائے؟ اس میں شعور کی رو والی ناول مبہم مزید ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ جدید دور میں ہر چیز مبہم ہے اور بہت زیادہ لوگوں کی تفریح بھی اسے حل کرنا ہے مگر ہر تفریح کی مبہم کی طرح یہ حل بھی کی جا سکتی ہے اور حل کرنے کے بعد اشارے بھی ملتے ہیں۔ یعنی خاص شعور میں ہی جو اسے مبہم بناتی ہیں اور جن کی مدد سے ہی اس کا حل ہو سکتا ہے۔

(۱) ذہنی مواد کا آزادانہ تلازمہ کے مطابق اترنا جس سے بے ربطی کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شعور کی رو بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے اور ایسے امور سامنے لاتی ہے جو کردار کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو اگر ہم یاد نہ رکھیں تو آگے چل کر ابہام پیدا ہو سکتا ہے اور بے ربطی کا تاثر بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً یولیسس میں بیوپارڈ بلوم ڈبلن میں گھومتا ہوا ایک اشتہار دیکھتا ہے جس میں "لیہ" نام کا ڈرامہ مسز بینڈ مین پامر کی اداکاری کے ساتھ پیش ہونے کی اطلاع ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے "میں اسے پھر اس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کل رات اس نے ہیملٹ کا پارٹ کیا تھا۔ شاید ہیملٹ عورت تھا۔ اوفیلیا نے خودکشی کیوں کی؟ بیچارے پاپا! کیسے بیٹھے ہوئے اس کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ ایڈلفی کے ایبرنتھ میں پوری شام انتظار کرتے رہے تا کہ ختم ہو جائے میری پیدائش سے برسوں پہلے کا قصہ ہے ستاسٹھ۔" یہاں پاپا کا اوفیلیا سے تعلق بالکل ذاتی بات ہے مگر یہ تعلق کیا ہے؟ سادہ

ہے وہ لڑکی بھی اوفیلیا کی طرح خودکشی کر لیتی ہے۔ اس کی یاد بلوم کے ذہن پر طاری دکھائی گئی ہے۔ یہ ناول کے موضوعات
کی پیچیدگی سے متعلق جو فنی رہتی ہے۔ مندرجہ بالا ٹکڑے میں اس کی طرف پہلا اشارہ ہے۔
بھی کا آغاز جو صنائع اور بدائع کے استعمال سے سامنے آتا ہے۔ مثلاً یولیسس میں اسٹیفن سمندر کے کنارے سوچتا
ہے۔ اس سلسلے کے حوالے بیان میں کم از کم چھبیس قسم کے صنائع استعمال ہوئے ہیں جن کے ذریعہ شعور کی بے ربطی کا عالم
ہے۔ اسٹیفن کا ذہنی عالم ایک معمہ ہو جاتا ہے جو آگے چل کر حل ہونے لگتا ہے۔
سے زیادہ استعارے کا استعمال ہوتا ہے جو اشاراتی یا رمزی سطح پر آ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اس اصول کو سامنے رکھا
سانی ذہن کا زیادہ اشاراتی ہے اور اشارے [illegible] ہر قسم کے ادب کی روح رواں ہیں ہر
اور ذاتی اشارے استعمال کرتا ہے۔ شعور کی رو والے ناول نگار بھی کثرت سے اشارے لاتے ہیں جو بار بار دہرائے جاتے ہیں
استعمالات سے تکرار کرنے سے ایک مکمل اور مربوط تصویر یا قصہ بنتا ہے۔ یولیسس میں اسٹیفن کی ماں کی موت اور
کی موت کے قصے مختلف مقامات پر اشاروں سے مل کر بنتے ہیں۔
ناول نگار شعور کی بے ربطی کا تاثر بھی قائم کرتے ہیں اور اس پر ایک پوشیدہ ربط بھی عاید کرتے ہیں جس تک پہنچنے کے
ہے جیسے متحرک تصویروں میں افسوس کہ پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتیں مگر ایک دفعہ غور کر لینے کے بعد پھر جب
سامنے آتی ہیں۔

ہم نے کہا وہ ناول کے بیانات یا ٹکڑوں سے متعلق رکھتا ہے مگر ناول اور ڈرامہ کا فن خاص طور پر کل تصنیف والی ہیئت
ہے سب سے اہم یہ انکار ہے۔ اس سلسلے میں شعور کی رو والے ناول نگاروں کا فن سب سے زیادہ پریشانی کن نظر آتا
میں پہلے خیال عام قاری کی طرف جاتا ہے جس کی ناول میں دلچسپی قصے سے ہوتی ہے اور جو یہ چاہتا ہے کہ قصہ
ہوتا رہا ہے اور بغیر کسی خلا اور تنوع کے چلتا رہے۔ ایسے قاری کو شعور کی رو والے ناول میں کچھ نہیں ملتا۔
میں کئی بیرے بھی سمجھانے کو پڑھنے سے بعد کہا یہ ناول نہیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ ایک اور صاحب نے
میں دو سو صفحے پڑھ گیا کوئی قصہ تو شروع ہوتا ہی نہیں۔ ناول میں قصہ یا پلاٹ ہی ہر چیز کا اہم ترین بنیاد ہوتا
ناول نگار اس سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ مگر وہ فارم یا چیز بنانے سے بری الذمہ نہیں ہوتے ہیں۔ وہ مختلف طریقوں
کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً زمان و مکاں کی وحدت اور مرکزی موضوعات کے ثبات سے زندہ انسانات کی نقل سے
حصوں کی ترتیب سے۔ منظر قدرت میں تبدیلیوں سے تاریخ کے تسلسل سے یا موسیقی کے انداز سے یا کسی قسم کے اور
قائم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ناول یولیسس کی مثال ہے جس کو تعمیر کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ شاید اس سے
نگاری کی پوری تاریخ میں کوئی نہ ہو۔ اس ناول میں تین افراد کے شعور کی رو کے مناظر پیش کیے گئے ہیں اسٹیفن ڈیڈلس
مسز بلوم۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا مواد [illegible] بے ربط ہے اس لیے ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں
پیش کرنے کے لیے دیا ہیئت بنانا ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہیئت کا مسئلہ اہم ہو گیا ہے۔ اس ہیئت کی

۔ولیس میں دیکھا یہ ہے کہ سارا قصہ ایک شہر میں اور ایک دن (اٹھارہ گھنٹے) میں ہوتا ہے۔ قصہ ایک ہی وقت میں دو جگہوں پر
ا ہے اور کرداروں کے ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اسٹیفن کے مارٹیلو ٹاور میں اور دوسری بلوم کے گھر میں۔ اس کے بعد قصہ
شروع ہوتا ہے اور کرداروں کے ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا واقعہ اسٹیفن کے مدرسے پڑھانے کا ہے جو دس بجے ہوتا ہے
تیسرے میں گیارہ بجے اسٹیفن سمندر کے کنارے سوچتا ہوا نظر آتا ہے۔ پانچواں واقعہ بلوم سے تعلق رکھتا ہے جو دس بجے
ہوتا ہے۔ چھٹا ایک جنازے کا سین ہے جو گیارہ بجے دکھایا جاتا ہے۔ ساتویں میں اسٹیفن اور بلوم دونوں ایک اخبار کے دفتر میں
ہیں۔ وقت بارہ بجے کا ہے۔ آٹھویں میں بلوم ایک بجے کھانا کھاتا ہے۔ نویں میں اسٹیفن اور بلوم دونوں دو بجے لائبریری میں
ہوتے ہیں۔ دسویں میں تین بجے ڈبلن کی گلیوں کی دو داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں بلوم کے
تعلقات سے تعلق رکھتے ہیں جو چار بجے سے لے کر آٹھ بجے کے درمیان ہوتے ہیں۔ چودھویں میں اسٹیفن اور بلوم ایک اسپتال
میں۔ پندرھویں میں دونوں [illegible] میں نظر آتے ہیں۔ یہاں بلوم اسٹیفن کو غنڈوں کے پھندے سے بچاتا ہے اور اب
ایک دوسرے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ سولہویں میں دونوں رات کے قریب کافی کے اڈے پر پہنچتے ہیں۔ سترھویں میں دونوں
[illegible] جاتے ہیں۔ وقت صبح دو بجے کا ہے۔ آخری قصہ [illegible] بلوم کی بیوی کے شعور کی رو ہے جو اس کے اپنے بیان سے زندگی بھر کے تعلقات کا
[illegible] ہے۔ اس طرح تمام ناول ایک دائرے میں گھومتا ہے حالانکہ اس کے اندر وہ چیزیں ہیں جو زمان و مکان کے تقاضوں کے منافی
[illegible] ہیں کہ تمام [illegible] گرد ہیں۔ [illegible] اشاراتی تراکیب کا استعمال کی گئی ہیں جن کا [illegible]
[illegible] ہے۔ یہ [illegible] کہ اول سے آخر تک یہی نہیں بلکہ ہر ہر واقعہ سے یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ یہ ایک عظیم تصنیف ہے جو ہومر کے
[illegible] سے مشابہ ہو جاتی ہے اور اس عظیم ایپک کی پیروڈی ہے۔ مگر یہ محض پیروڈی ہی نہیں بلکہ تمام انسانی تاریخ کا نچوڑ ہے جس
[illegible] ایک سی ہے۔ سیدھا سادہ ایک عام آدمی اور ایک عورت کے ہیں کہ ترکیب اور شکلیں سے ہوتے ہیں۔ ناول کا کا
مقصد یہاں بھی فیلڈنگ کی طرح بلکہ فیلڈنگ سے بھی زیادہ معنی خیز طور پر پورا ہوتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے
کہ ناول کا طریقہ محض تجربہ نہیں رہا بلکہ فنی کامیابی تک پہنچ گیا۔

[illegible] نے اس طریقے کو کامیاب ہیئت تک پہنچانے کے لیے موسیقی اور شاعری کے پیرایہ سے ہم آہنگ کر دیا اور
[illegible] فاکنر نے دونوں کے طریقوں کا امتزاج کرنے کی کوشش کی۔ یہاں ان کے طریقوں کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے اس
[illegible] زمانے میں الزبتھ بوین E. BOWAN گراہم گرین GRAHAM GREEN کیتھرین این
پورٹر KATHRINE ANNE PORTER رابرٹ پین وارن ROBERT PENN WARREN ڈی لامور سیوار DELAMORE SAWAR اور
یوڈورا ویلٹی EUDORA WELTY ہیں۔ ہمارے یہاں قرۃ العین حیدر
نے اس تکنیک میں قدم اٹھایا۔ مگر ان کے ناولوں کے حصے تو شعور کی رو سے ملتے ہیں مگر کسی ناول میں کوئی ہیئت وجود میں نہیں آتی۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ہیئت کو [illegible] کے لیے تیار نہیں ہیں جس نے جوائس اور ورجینیا وولف دونوں کی جان کے کر رکھ چھوڑا۔ فن
[illegible] سے زیادہ توجہ اور محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں شعور کی رو کو استعمال کرنے والے پڑھنے

منطقی ربط سے فرار کرکے اس کی بے ربطی میں پناہ لینے سے آگے جانے کی کوشش نہیں کرتے اور ان کے اول فول کو بھی آنکھ بند نقاد سر دھننے کے لیے موجود ہی ہیں۔ اس لیے ہر بے ربطی اور بے تکی کو فن کہہ کر عام پڑھنے والوں پر دھونس ڈال دی جاتی ہے۔ یورپ میں ۱۹۴۵ء کے بعد کے ناول نگار اس طریقے کو ترک کرکے پھر پرانے طریقوں پر واپس جا رہے ہیں۔ اس لیے اس کو پسند نہ کرنے والوں کی مانے ہوئے ہیں کہ یہ ایک وقتی ابال تھا۔ مگر جو لوگ ادب کو توجہ اور غور سے پڑھنے کے عادی ہیں وہ اس میں اسی وقت کے ادب کی طرف پہلا قدم دیکھتے ہیں جبکہ زیادہ تر پڑھنے والے جیمس اور برگساں کے فلسفہ سے اسی طرح مانوس ہو جائیں گے جیسے کہ وہ ارسطو اور افلاطون سے شعوری یا لاشعوری طور پر اس وقت واقف ہیں۔

مدارالدولہ نواب علی نقی خاں

نادم سیتاپوری

ڈاکٹر اقبال کا ایک مشہور شعر ہے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

اودھ کی دو سو برس کی تاریخ بھی ایسی تھی جو غداروں کی وہ طویل فہرست کہاں کی جاتی جس میں "زینت محل" کا نام بھی آتا ہے اور "مرزا الٰہی بخش" کا بھی، "حکیم احسن اللہ خاں" بھی جس کی ذریت رستی ہیں اور "مدارالدولہ نواب علی نقی خاں" بھی ہے ـــ غیر منقسم ہندوستان کی داخلی وحشت کی تاریخ کتنی بھیانک ہے؟ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی سرگرمیوں سے ملک و وطن کا دامن کبھی پاک نہیں رہا۔ غدار پیدا ہوتے رہے اور تاریخ ان کی پردہ پوشی کرتی رہی۔ کبھی کبھی ان کی غداری کا راز فاش ہونے پر ان واقعات کے ساتھ غداروں کی طرف بھی موڑ دیا گیا۔ "فورٹ ولیم" کی بنیاد پڑتے ہی اس کے چاروں طرف دشمن "جینی بنیوں" کا جو سنہرا جال بچھایا گیا تھا وہ کم ہی لوگوں کو معلوم ہو گا ـــ ان تین سو سال کے اندر ملک و قوم کا جتنا بڑا نقصان ہوا "ان جینی بنیوں" کے ہاتھوں ہوا اس کی مثال نہ بنگال کے "جعفر" کے یہاں ملے گی نہ دکن کے "صادق" کے یہاں! ان جینی بنیوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کی دکان چلانے کے لیے اوّل دن سے جو کردار ادا کیا تھا اسے سامراج کے "مورخ" تاریخ سازی نے اس کا خاطر خواہ صلہ دیا ـــ اور آج کی تاریخ ان غداروں کے نام سے پاک صاف نظر آتی ہے ـــ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں "لارڈ کلائیو" وغیرہ کے خلاف مقدمات نہ چلائے جاتے تو آج یہ کتابیں بھی دھوکا دیتیں یہ جینی بنیے اور پچھلے غدار ہیں جو (غیر منقسم) ہندوستان میں برطانوی سامراج کے قدم جمانے کی غداری کی ذمہ داری سب سے زیادہ عاید ہوتی ہے۔ اودھ کے غداروں میں "نواب علی نقی خاں مدارالدولہ" کا نام تقریباً ایک صدی سے اودھ کے بچے بچے کی زبان پر ہے اور عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ فروری ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کا الحاق انھیں کی غداری اور سازش کا رہین منت ہے ـــ لیکن اس کی تائید تاریخ کے اوراق سے ہوتی ہے نہ انگریزوں کے رویہ عمل سے ـــ جو غدر سن ستاون کے بعد "نواب علی نقی خاں" کے ساتھ رہا ـــ اور انعام و اکرام کا تو ذکر ہی کیا، سلطان عالم واجد علی شاہ کے مٹیا برج سدھارنے کے بعد لکھنؤ میں نواب علی نقی خاں کی جو درگت بنی وہ یقیناً اس بات کی غماز ہے کہ ان کے اعلیٰ کردار "انگریز دوستی" سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا ـــ

مدارالدولہ وزیر ثانی علی نقی خاں (امین الدولہ) نواب امداد حسین خاں کی معزولی وزارت کے بعد اگست ۱۲۶۳ھ میں اودھ کے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ واجد علی شاہ بہادر نے انتیس پارچہ کا خلعت اور دستور زمانہ کے مطابق ایک طویل خطاب سے سرفراز فرمایا ـــ

"دولت رکن رکین، خلوص و جاں نثاری، اعتماد سلطنت و شہریاری، امیر الامرا مدار المہام ـــ

وزیر الملک۔ معتمد السلطنت۔ تمکین السلطان سیف مسلول بازوئے شاہنشاہی۔ رمح مصقول معرکۂ دشمن کاہی۔ مادہ صفا دیرینگی و صفا ناہج مناہج صداقت و وفا۔ مرید مرشد پرست اخلاص گزین خانہ زاد عقیدت سرشت صفوت آئین مختار ذوی الاقتدار یار وفادار سپہ سالار رستم بند مدار الدولہ منتظم الملک علی نقی خان بہادر سہراب جنگ فدوی خاص جان نثار ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زمان سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ۔ ش

وزیر الملک مقرر ہونے کے بعد جتنا جتنا تقرب سلطانی علی نقی خاں کو حاصل ہوتا گیا اتنی اتنی مخالفت بھی بڑھتی گئی یہاں تک کہ درباری سازشوں کا شکار ہو گئے۔ بادشاہ کی نگاہیں بدل گئیں ـــــ مگر جلد ہی صلح و صفائی ہوگئی اور وہ بھی کچھ نئے اکرام و اعزاز کے اضافے کے ساتھ۔ یعنی وزیر الملک۔ مدار الدولہ ثانی کے ساتھ سلطان عالم سے شفیق کرنے حضور عالم کے خطاب سے بھی سرفراز کیے گئے؛

علی نقی خاں کا خاندان دو سو برس ادھر ہندوستان کے ممتاز گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے دادا مدار الدولہ اول نواب یوسف علی خان، خواجہ بہاء الدین نقش بندی کی اولاد سے تھے۔ مدار الدولہ اول نواب یوسف علی خان کے والد خواجہ محمد موسیٰ کے باپ اور بھائی خواجہ محمد یعقوب بھی تھے۔ انھیں دونوں بھائیوں نے اس عظیم خاندان کی بنیاد ڈالی۔ "بیگمات اودھ" کے مصنف شیخ تصدق حسین ایڈووکیٹ نے تاریخی حوالوں کے ساتھ اس خاندان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

"خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ محمد موسیٰ دو حقیقی بھائی خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں تھے۔ خواجہ محمد یعقوب کو شہزادہ مراد بخش ابن شاہجہان شہنشاہ دہلی کی بیٹی منسوب تھی اور خواجہ محمد موسیٰ شہزادہ روشن گہر المخاطب بہ نواب سربلند خان کی شادی سلطان معز الدین جہاندار شاہ بادشاہ دہلی کی صاحبزادی جہاں آرا سے ہوئی تھی۔ یہ لوگ ایران سے ہوتے ہوئے چلے کر نواب سعادت خان برہان الملک کے خطابات سے سربلند ہوئے۔ ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں ایران سے ہندوستان آئے جہیں نواب سربلند خان کی سرکار میں ... پر فراشوں میں ملازمت کی تھی۔"

مدار الدولہ اول انھیں خواجہ محمد موسیٰ کے بیٹے تھے (بعض لوگ ...) چنانچہ سید غلام علی نقوی اپنی تصنیف "عماد السعادت" میں تحریر کرتے ہیں۔

"مدار الدولہ اول کے والد خواجہ موسیٰ خان نے ہندوستان آ کر معز الدین جہاندار شاہ کی شاہزادی[5] سے شادی کی۔ مگر نواب موصوف شہزادی سے نہیں ہیں شہزادی کی اولاد ہمیشہ قلعہ میں رہتی تھی اور وہ لوگ خواجہ زادہ کہلاتے تھے لیکن غلام قادر خان کی شورش کے بعد یہ لوگ قلعہ سے

نکل کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ کچھ بیسواڑہ پہنچے۔ بعض راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ چلے گئے
اور دو یا تین لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ مختصر یہ کہ اولاد و شہزادوں کے علاوہ خواجہ مُرتضیٰ خان کے چند
لڑکے اور لڑکیاں اور بیں ان میں سے ایک مدار الدولہ (اوّل) اور دوسرے عظیم الدولہ
اور بہاء الدین ہیں:- (ترجمہ فارسی)

خواجہ محمد مُرتضیٰ کا آبائی مذہب اہل سنت تھا مگر نواب سعادت خان برہان الملک کی صحبت میں مذہب قدیم ترک کر کے امامیہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ برہان الملک نے موسوم کو علاقہ "کچھرپٹہ"۱ متعلقہ خیرآباد (ضلع سیتاپور۔ یو پی) جس کی سالانہ ہزار روپیہ سالانہ بجور جاگیر اور "وکیل سلطنت مختار الدولہ بہادر، صمصام جنگ" خطاب بھی عطا کیا۔ .... نواب مدار الدولہ (یوسف علی خان) کی کل بیویوں سے بارہ بیٹے اور دو بیٹیاں حسب ذیل تھیں۔

(۱) اسد الدولہ نواب ابد علی خان (۲) حسین علی خان (۳) حسن علی خان جن کے بیٹے زین العابدین خان اور پوتے اکبر علی خان تھے (۴) عباس علی خان (۵) احتشام الدولہ رئیس الملک محمد علی خان جن کے ایک بیٹے "علی نقی خان" واجد علی شاہ کے زمانہ حکومت میں مدار الدولہ ثانی کے خطاب سے سرفراز ہو کر وزیر اعظم سلطنت اودھ ہو گئے تھے (۶) شریف الدولہ احمد علی خان جن کے دو بیٹے نواب علی خان اور نظام الدولہ حسین رضا خان کرم الملک اور ایک دختر گوہر آرا بیگم تھیں، جو نواب علی نقی خان (مدار الدولہ ثانی) کو منسوب تھیں (۷) جعفر علی خان (۸) علی رضا خان (۹) قاسم علی خان (۱۰) مہدی علی خان ...... (۱۱) علی محمد خان (۱۲) میر علی خان۔

مذکورہ بیٹیوں کے ایک کی شادی زین العابدین خان کے بیٹے میر نقی خان سے ہوئی اور چھوٹی بیٹی افضل بیگم بعد وفات نواب شجاع الدولہ کے بیٹے نواب سعادت علی خان (۱۷۹۸ - ۱۸۱۴ء) کو بمقام بنارس بیاہی گئیں۔"

(تجلیات ۱۱۹۵ھ مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ صفحات ۴۹ - ۵۲)

نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ - ۱۷۹۷ء) کے عہد میں اس خاندان کو پہلی بار شدید زوال اور انحطاط سے دوچار ہونا پڑا اس کے حقیقی وجوہ کیا تھے؟ تاریخوں میں اس کا صحیح جواب نہیں ملتا۔ صرف "احسن التواریخ" میں ایک واقعہ ملتا ہے جس کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید "آصف الدولہ" اور مختار الدولہ خواجہ محمد مُرتضیٰ کے درمیان یہی بنائے نزاع بنا ہو۔ مصنف احسن التواریخ کا بیان ہے:

"عمدۃ الملک مدار المہام وزیر الممالک اعتماد الدولہ آصف جاہ برہان الملک ابو المنصور
خان صفدر جنگ شجاع الدولہ یحییٰ خان "آصف الدولہ" بزرگ جنگ یادگار سپہ سالار
رستم ہند، فدوی شاہ عالم بادشاہ فرزند نواب شجاع الدولہ بہادر عرش منزل نے

---

۱ قصبہ کچھرپٹہ تحصیل مرکز ضلع سیتاپور کا ایک مشہور تاریخی مقام ہے جسے مغل دور حکومت اور شاہان اودھ کے زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ اب ایک معمولی سا قصبہ ہے۔

"۱۱۸۸ ہجری میں بہ عمر بست و ہفت سالگی کے مسند ریاست اودھ کو زینت بخشی اور لکھنؤ کو ریاست گاہ بنایا۔ اور بطیب خاطر اپنے سرکار کمپنی کے گورنر کو جو لوازم ریاست اودھ تھے برطرف کیا اور بجائے اقرار حفاظت اپنی ملک اودھ کے کل علاقات متعلقہ راجہ چیت سنگھ صوبہ بنارس جونپور اور متعلقات اس کے کہ ایک ملک وسیع معہ ال و سائر کے کمپنی کر دئے و یا نسبت اس ملک کے بعض مؤرخین کا قول ہے کہ نواب سے اس ملک کو "مختارالدولہ" نے جو نائب تھا اپنی کارسازی سے نکلوا دیا خوشی یہ امر ظہور میں نہیں آیا تھا۔"

(احسن التواریخ مطبوعہ مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۸۷۹ء صفحہ ۲۴)

یعنی مختارالدولہ کی زندگی میں آصف الدولہ اس خاندان کے جبروت و اقتدار پر ہاتھ نہ ڈال سکے شاید اس کا سبب یہی ہو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ان کی پشت پناہی کر رہی ہو؟ لیکن مختار الدولہ کی وفات کے بعد آصف الدولہ نے ان کے بھتیجے مدارالدولہ یوسف علی خان کو چین نہیں لینے دیا۔ اعزازہ مناصب سے بھی محروم کیا "مچھریٹہ" کی جاگیر بھی ضبط کر لی۔ ہو سکتا ہے کہ آصف الدولہ کی اس ناراضگی اور خفگی کا سبب یہ بھی ہو کہ مدارالدولہ کی صاحبزادی نواب فضل بیگم کی شادی ان کے مختلف البطن بھائی نواب سعادت علی خان کے ساتھ ہوئی تھی جن سے آصف الدولہ کے تعلقات تمام عمر ناخوشگوار رہے۔ "بیگمات اودھ" کے مصنف نے لکھا ہے:

"نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خان میں بوجوہ چند در چند صفائی نہ تھی۔ اس لیے آصف الدولہ نے مدارالدولہ کی جاگیر "مچھریٹہ" ضبط کر لی جس پر انہوں نے بندیروں کی مدد سے فتنہ و فساد برپا کیا چنانچہ فوج شاہی و انگریزی تنبیہ کو روانہ ہوئی اور اسی معرکہ کارزار میں مدارالدولہ کام آگئے۔"

(بیگمات اودھ صفحہ ۲۵)

آصف الدولہ کی وفات کے بعد جب نواب سعادت علی خان اورنگ آرائے صوبہ اودھ ہوئے تو انہوں نے بوجہ قرابت ماضی کی تلخیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ خدمت آبداری نواب سید علی خان (فرزند مدارالدولہ) کے سپرد ہوئی اور پرگنہ "مچھریٹہ" کی آمدنی مدارالدولہ کی اولاد میں بحصہ شرعی تقسیم ہونے لگی۔

"مچھریٹہ" (ضلع سیتاپور) سے اس خاندان کا تعلق برہان الملک کے عہد سے لے کر آصف الدولہ کے زمانے تک مسلسل قائم رہا۔ آصف الدولہ کے عہد میں جب یہ جاگیر ضبط ہو گئی تو "مچھریٹہ" سے اس خاندان کا بہت کچھ تعلق ختم ہو گیا۔ مختارالدولہ کے زمانے کے بنوائے ہوئے قلعہ کے آثار "قصبہ مچھریٹہ" کے پچھم طرف اب بھی پائے جاتے ہیں اور اسی خاندان کا بنوایا ہوا ایک شکستہ امام باڑہ "مچھریٹہ" میں آج بھی موجود ہے۔

اودھ کے شاہی خزانے سے تو قبل اس خاندان کو حاصل جاگیر ملتے رہے لیکن سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں جب "علی نقی خان مدارالدولہ ثانی" مرتبہ آرائے مسند وزارت ہوئے تو "مچھریٹہ" کی جاگیر سے دوبارہ ان کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا۔ یہ

کہا جا سکتا ہے کہ جاگیر کی بحالی کا معاملہ اسی لیے سے طے پایا جیسا کہ جمہوریہ ہند نے ملک میں ... یا کسی قدر محض وقتی ضرورت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ کیونکہ "مچھر ہٹہ" کے بہت سے مواضعات (راجہ پور وغیرہ) اس خاندان کے قبضہ و تصرف میں تھے "مستاجری معاہدوں" کے تحت حاصل کیے گئے تھے ۔

منقلب سن شناس سے پہلے علی نقی خان کے خلاف جب خاندانی جاگیرداری نے زور پکڑا تو سرکار انگریزی ان کے جرم پاک رکھنے کے لیے انہیں "محض جز مغشوش" قرار دیا گیا بلکہ ان کا وطنی رشتہ "مچھر ہٹہ" سے جوڑ دیا گیا جو قطعاً خلاف واقعہ "مچھر ہٹہ" کو ان کی وطنیت سے دور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔

محمود آباد کے خاندان اور نوابین وسلاطین اودھ کے مابین قرابتداری کا آغاز نواب سعادت علی خان ابن شجاع الدولہ (۱۷۹۸ - ۱۸۱۴ء) سے ہوا۔ محمودآباد اول نواب یوسف علی خان کی صاحبزادی افضل بیگم (یعنی محمودآباد ثانی علی نقی خان کی پھوپھی) کا نکاح نواب سعادت علی خان "وزیرالملک" کے ساتھ ہوا اس کے بعد قبل یہ کسی خاص قرابت کا پتہ نہیں چلتا ۔

قرابتداری کا دوسرا دور "سلطان عالم واجد علی شاہ" کی اس کتخدائی سے شروع ہوا جو محمودآباد اول کے پوتے نواب علی خان کی صاحبزادی نواب عالم آرا بیگم کے ساتھ شہزادگی کے زمانے میں ہوئی۔ یہ شادی تقریباً فروری ۱۸۳۷ء میں بعہد نصیرالدین حیدر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی۔ دولہن کو سسرال سے "نواب اعظم مہترا" خطاب ملا۔ لیکن مشہور ہوئیں "نواب خاص محل صاحبہ" کے نام سے ! نواب عالم آرا بیگم ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ عالم تخلص کرتی تھیں۔ ایک دیوان موسوم "بیاض عشاق" اور ایک مثنوی بنام "مثنوی عالم" ان کی یادگار ہے ۔

واجد علی شاہ بہادر نے مسند آرائے حکومت ہونے کے بعد نواب عالم آرا بیگم کی موجودگی ہی میں ان کی حقیقی چچازاد بہن "نواب رونق آرا بیگم" سے رشتہ مناکحت کی خواہش کی جو محمودآباد ثانی علی نقی خان کی بیٹی تھیں — مشرقی تہذیب اور ہندوستانی رسم و رواج کے لحاظ سے ایک بہن کی موجودگی میں دوسری بہن کے ساتھ عقد مناکحت بہت ہی مکروہ بات سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ بادشاہ کی اس خواہش پر علی نقی خان پس و پیش میں پڑ گئے۔ نواب عالم آرا بیگم پر بھی اس کا بہت ہی اثر ہوا۔ مگر راج ہٹ کے سامنے نہ بیگم کی کچھ چلی اور نہ علی نقی خان کی۔ جون ۱۸۵۰ء میں رونق آرا بیگم کے ساتھ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ نئی دولہن کو "اختر محل" کا خطاب عطا ہوا۔ پچیس لاکھ مہر قرار پایا۔ صاحب "قیصر التواریخ" کا بیان ہے۔

"ہر چند کہ حضور عالم (علی نقی خان) کو پاس خاطر نواب مخدرۂ عظمیٰ (عالم آرا بیگم) اور بنا بر شاہ ہندوستان زائی بھی یہ کثرت ازدواج محرمات بہت ناگوار تھی مگر اطاعت و فرمانبرداری بادشاہ و قیام عہدہ وزارت ... تھا خلاصہ سوائے مخدرۂ عظمیٰ سب متعلقین اور جناب عالیہ (ملکہ کشور صاحبہ والدہ واجد علی شاہ بہادر) شریک ہوئی تھیں صاحبات محل برائے خوشنودی بادشاہ مثل خواصی کام کرتی تھیں۔ بعد چند روز کے نواب مخدرۂ عظمیٰ کا ملال بھی حضور عالم (علی نقی خان) سے رفع ہو گیا۔ (قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ...)

علی نقی خان اپنے وسیع اخلاق، فطری رحم دلی، فروتنی، فراخ دلی، مروت، سیر چشمی کی وجہ سے لکھنؤ بھر میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ مذہب کی روایتی قدریں اور دینداری کے لوازم بھی پوری آب و تاب کے ساتھ ان کے یہاں پائے جاتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ "نرے مولوی" نہیں تھے۔ ان کے خاندان میں اس دورِ عیش و نشاط کی وہ تمام باتیں اپنی بھرپور امنگوں کے ساتھ رقصاں و جنباں تھیں جن کی جلوہ سامانیوں سے کسی نواب یا رئیس کا گھر اس زمانے میں خالی نہیں تھا۔ اس خاندان کی خداداد خوبصورتی اور حسن اس زمانے کے لکھنؤ میں مثالی سمجھا جاتا تھا اور ترنم تو اس بلا کا تھا کہ اس کے دامن میں سیکڑوں حکایات اور افسانے جنم پا گئے۔ "بیگمات اودھ" کے مصنف جناب شیخ تصدق حسین ایڈوکیٹ تحریر فرماتے ہیں:

> "مشہور ہے کہ نواب علی نقی خان کا خاندان خوش گلوئی اور خوبصورتی کے لیے شہرہ آفاق تھا
> خود موصوف (علی نقی خان) کو موسیقی میں بہت دخل تھا۔ اسی ہم مذاقی کی وجہ سے واجد علی
> شاہ کو ان سے بہت موافقت اور مؤانست ہو گئی تھی۔"
>
> (بیگمات اودھ صفحہ ۲۲۶-۲۲۷)

موسیقی تو اس خاندان کے مزاج میں رچ بس چکی تھی۔ اس کے علاوہ شعر و ادب کی اعلیٰ قدروں سے بھی اس گھر کا بچہ بچہ بہرہ یاب تھا۔ خود علی نقی خان "سید" تخلص فرماتے تھے اور لکھنؤ کے خاص رنگ میں اچھا خاصا لکھتے تھے۔ جب "قیصر باغ" کی ادبی صحبتوں کے اوراق ہی سے تاریخ و تذکرے خالی نظر آتے ہیں تو علی نقی خان کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کہاں؟ اس تاریخی خاندان کے نوادر انقلاب سن ستاون کے بعد ہی گمنامی میں پہنچ چکے تھے اب ایک صدی بعد تو شاید کچھ بھی صفحۂ عالم پر موجود نہ ہو۔ ایک چھوٹی سی کتاب "حرم الطبیٰ" حصہ سوم مرتبہ عزیز الرحمن میر منشی قلعہ معلیٰ دہلی (شائع کردہ مجیدیہ کتب خانہ کلاں دہلی) میں علی نقی خان کا صرف ایک شعر ملتا ہے ۔

قربان سادگی کے نگہ لطف غیر سے
کیا جانے آج کیا تھا کہ سید خفا گیا

"الحاق اودھ" (فروری ۱۸۵۶ء) کے بعد نواب علی نقی خان کے خلاف غداری اور انگریز دشمنی کی جو داستانیں عوام میں مشہور ہوئیں، تاریخ کے واضح نقوش اس سے متفق نظر نہیں آتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "الحاق اودھ" کی جبریہ کاروائی سے نمٹنے کی ان میں ہمت نہ تھی اور نہ بحیثیت وزیر اعظم اودھ انھوں نے اس سے اتفاق کیا کہ موجودہ حالات میں انگریزوں سے نپٹنے کے لیے اودھ کی مزدور اور غیر منظم فوجی طاقت کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا جائے۔ وہ جنھیں اپنی منتشر اور کمزور فوجوں کی جنگی طاقت کا بھی اندازہ تھا اور ان سازشی کارروائیوں سے بھی بے خبر نہیں تھے جو بیلی گارد سے لے کر قیصر باغ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنگ کا انجام بھی ان کی نگاہوں میں تھا اور ٹیپو کا زوال بھی، جھانسی کی انقلابی جنگ اور رانی لکشمی بائی کی شکست ان کے سامنے تھی اور شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کی وہ بے بسی بھی جس نے معاہدۂ لیک (۱۸۰۳ء) کے بعد انھیں لال قلعہ دہلی میں محصور کر رکھا تھا۔ علی نقی خان یقیناً یہ جانتے تھے کہ اودھ کی فوجی طاقت میں اتنی جان نہیں ہے کہ وہ جم کر سینہ در سینہ بھی انگریزوں کا مقابلہ کر سکے۔

تاریخی حیثیت سے تو اتنا ضرور ثابت ہے کہ علی نقی خاں نے اس معاملے میں بجز معمولی دلچسپی لی تھی کہ بادشاہ "الحاق نامہ" پر دستخط کر دیں۔ ہو سکتا ہے اس کے اسباب وہی ہوں جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے یا پھر اس کا تعلق ان کی خود غرضی اور سیاسی سے ہو۔ لیکن کسی مستند تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انگریزوں سے اس سلسلے میں انھوں نے کوئی ساز باز کی تھی کیونکہ واجد علی شاہ کے کلکتہ روانہ ہونے کے بعد انگریزوں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ انھیں بادشاہ کے ساتھ کلکتہ جانے سے مجبور کر کے روک دیا ۔ کیا یہی ان کی وفاداری کا صلہ ہو سکتا ہے؟

یہ تاریخی حقائق ایسے نہیں ہیں جنھیں سامنے رکھے بغیر ان کے مفروضہ غدارانہ کردار پر مہر تصدیق ثبت کرنا درست ہے؟ پھر بھی ان تاریخی حقائق کی چھان بین کے دروازے اب تحقیق و تدبر پر بند نہیں ہوئے ہیں جو علی نقی خاں کے صحیح کردار تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ الحاق اودھ کے بعد جب معزول بادشاہ انگریزوں کے پہرے میں کلکتہ روانہ کیے گئے تو "وابستگان دولت" میں سے کچھ لوگوں کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ جو لکھنؤ سے باہر نہ جا سکے انھیں دشمن نئے حکمرانوں کے جبر و تشدد کا شکار ہونا پڑا، بدنامیوں کی بے انتہائیاں بھی برداشت کرنا پڑیں ——— لیکن جو ذلت علی نقی خاں کی تھی شاید ایسی ذلتوں کا سامنا کسی اور کو نہ کرنا پڑا ہوگا۔ کل تک جس کے در دولت کی شان اس خاص اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے پلک جھپکتے ہی عوام ان کے منہ پر گالیاں دینے لگے ——— وہ گالیاں بھی اتنی غلیظ و گندی کہ لکھنؤ کی روایتی تہذیب سر بگریباں تھی۔ عوام اور "شہدوں" کا تو ذکر ہی کیا؟ ہجو کی گئی اور اس طرح پر کہ نہ معزول بادشاہ کے ناموس کا خیال کیا گیا نہ علی نقی خاں کے اس وسیع اخلاق کا جو چند روز پہلے خواص سے لے کر عوام تک سب کا ورد زبان بنا ہوا تھا۔ غلط ہو یا صحیح؟ یہ رنگینؒ شعر "جان صاحب" کے نام سے مشہور کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے زبان زد خاص و عام ہو گیا۔

"اختر محل کو ماس دی نقی نے صال
ایام کی خرابی سے گدی ہی نکل گئی"

علی نقی خاں کی ذلت و خواری کے کئی واقعات سید کمال الدین حیدر مصنف "قیصر التواریخ" نے لکھے ہیں۔ بادشاہ کی روانگی کلکتہ کے بعد کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

> "چار دن کے بعد ایک اشتہار شہر میں لگایا گیا کہ فلاں تاریخ و فلاں دن کو تماشائے عجیب رعایائے شہر کو دکھایا جائے گا کہ کبھی کسی نے آنکھ سے نہ دیکھا ہو۔ ہر شخص کو ایک تردد تھا ——— آخر روز سہ شنبہ ۵ اپریل کو دولت سرائے شاہی سے پہلے سواری جناب اختر محل صاحبہ نکلی اور اس کے بعد حضور عالم (علی نقی خاں) کی گاڑی دو اسپہ نواب

۱؎ یہ شعر جناب شیخ تصدق حسین ایڈووکیٹ لکھنؤ مصنف "بیگمات اودھ" نے سنایا تھا۔ شیخ صاحب تاریخ اودھ کے ماہرین میں ہیں۔ ان کا خیال بھی یہی ہے کہ الحاق اودھ کی کارروائی میں جناب علی نقی خاں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ (ناظم سیتاپوری)

اثنائے قطع راہ میں منزل وزارت زیب سر بر طرف سے بگھی گاڑی بند' چوبدار چیف کمشنر
کمپنی بخش (یکس) پر برآمد ہوئی کہ کسی کو بھی مجال کشائی پیچھے . کچھ خاص بردار بے احتیاط اس
کثیف سے گرد و رشاہی سے تحسین کی تک زبان طعن و تشنیع بیاباں شہر ہر طرف سے بارش
بے وقت برسا رہے تھے اگرچہ چوبدار چیف صاحب ہوتا غالب ہے کہ ڈھیلے اور پتھر بھی بجائے
ہوئے برستے ۔ العیاذ باللہ !"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۶۸)

اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ علی نقی خان اور نواب اختر محل " کی روانگی کلکتہ سے متعلق بھی " قیصر التواریخ " نے بیان کیا ہے :

" حضور عالم (علی نقی خان) نے چیف کمشنر سے کئی مرتبہ رخصت طلب کی اور شقہ خاص بادشاہی دکھایا منظور نہ کیا ۔ آخر نواب (علی نقی خان) نے نواب گورنر جنرل کو عرضی ارسال کی جس کا حکم باب عدم مزاحمت سفر صادر ہوا ۔ بعد اجازت پھر جانے سفر باستخارہ ایمانی پر کی گئی ۔ خلاصہ تاریخ شہر ذی قعدہ روز سہ شنبہ ۲۷ ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۵ جولائی حضور عالم مع عیال و لواحقین و ملازمین و رفیقان سفر (دس ۔ انیس گاڑی ڈاک اسپی و بیس کرانچی بیل واسطے اسباب ضروری نقد و جنس قسم طلا و نقرہ و پشمینہ وغیرہ ۔ خزانہ معروف و خادمان ناشتہ بعد نصف شب روانہ ہوئے ۔

وقت روانگی یہ صورت ہوئی کہ شام سے رفقاء و ملازمین در دولت پر حاضر ہوئے حضور خود مع ننھی سواری پر وگیاں عصمت ہوئے . ایک گاڑی میں چار سواریاں زنانی جب سوار ہو چکی تھیں ایک رفیق گاڑی کی چھت پر باسلحہ بیٹھا تھا بعد اس کے خود بدولت گاڑی چار اسپہ پر سوار ہوئے ۔ نواب محسن الدولہ خان بہادر فرزند اللہ دولہ بہادر بمقتضائے قرابت قریبہ تاکہ " چار باغ " ہم پہلو تھے .

شہر کے " شہدوں " نے شام سے دروازے پر ہجوم کیا تھا ۔ پچاس روپیہ مرحمت ہوئے کہ آپس میں تقسیم کر لو ۔ وقت وقت سواری کے شور و غل نہ مچانا ۔ کچھ منہ سے کلمات بیہودہ نہ کہنا لیکن یہ موذی کب مانتے تھے ۔ تاکہ شہر تک باندھے مشعل و ینگ پھیلے ہوئے تھے اور شہر کے بنگلے تماشبین سر راہ کوٹھوں پر منتظر تشریف آوری تھے ۔ جب سواری نکلی شہدے کب اپنی زبان طعن و تشنیع سے باز رہ سکتے تھے ۔ غرض جو ہو نہ سننا تھا سب نے سنا ۔ !"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۸۹)

" انقلاب لکھنؤ " پر نہ نظم لکھی گئی ہیں نہ نثری تصانیف ۔ صرف ایک " مثنوی شکستہ ناتمام " ایسی ہے تا اقرات کی نیند دست

ے " مثنوی شکستہ ناتمام " پر میرا مضمون (انقلاب لکھنؤ کی ایک گمنام مثنوی) ماہنامہ نیا دور لکھنؤ (اسپیشل نمبر) اگست ۱۹۷۵ء میں طبع ہو چکا ہے ۔ " مثنوی شکستہ ناتمام " کا اصل مخطوطہ خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے ۔ (ادارہ سیتاپوری)

جس میں علی نقی خان کے خلاف اسی انداز سے اظہار بیزاری کیا گیا ہے اور "اخلاق عدوم" کی خصوصی علی نقی خان کے سر منڈھا گیا ہے
یہ مثنوی ایک غیر معروف شاعر "محمد رضا خان عاشق" کی ہے جو کے دار حضور جہانیت کے شاگرد تھے۔ مثنوی کا سن تصنیف ۱۲۷۰ھ
میں شروع اور اختتام ۱۲۷۲ھ میں۔

مثنوی نگار نے علی نقی خان کو "عقل کل" کا خطاب دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دیا کچھ نہ سلطان نے اس کا جواب　　　دیا "عقل کل" کو جو یہ شتاب
معتقد جو تھے میں ان سے کہا　　　کہا کیا تھا تم نے جواب یہ کیا؟
دیا محکمہ تھا میرا شکر تو　　　یونہی چاہیے۔ مرحبا مرحبا
شمار نہیں اس میں صاحب خطا　　　فقط کا میرے فقط بھید تھا
دیا عقل کل نے یہ سن کر جواب　　　خطا اس میں کیا ہے عالی جناب
نہیں اس میں کوئی ہے میرا قصور　　　یقین آپ جانیں اسے اے حضور
میں بندہ تھا مجھ کو کیا آفتاب　　　میں قطرہ تھا مجھ کو بنایا سحاب
کروں عقدہ عرض گر چپ ہے حضور　　　کہ ارشاد میری شاہا قبول
کرو اب ذرا "اورنگ" کا سوال　　　مناسب نہیں اس میں کچھ قیل و قال
یہی ہے مناسب سمجھتا ہوں غور　　　نظر آتے ہیں اس میں اچھے کا طور
اگرچہ بظاہر ہیں صورت بری　　　کرو "غور" اس میں بھلے ہیں سبھی

یعنی "محضر اخلاق" پر مہر ثبت کرنے کی ذمہ داری واجد علی شاہ نے علی نقی خان پر عاید نہیں کی ہے بلکہ انھیں مجبور ہے جس کو قرار دیا ہے۔
مثنوی "حزن اختر" میں واجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

جو وہ "اشراف" اور "اہل دولت" تھے　　　منافق انھوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے　　　تمہاری ریاست بے نام ہے
رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ　　　فقط ہم کے تم رہو بادشاہ
میں ہر اک اک شاہ کا　　　ہے کا تمہیں کچھ نہیں شک ذرا

علی نقی خان جو تھے وزیر　　　وہی میرے ہر حال میں تھے مشیر
مرے دل میں آتا تھا ہر دم خیال　　　جو ہونا تھا وہ ہو چکا یا ملال
کرو "غور" کم رہا منی عمر پر اب　　　گئی سلطنت تو گئی بے سبب
مگر سلطنت کرنے نہ چھوڑا ہے　　　دیا یا دیا جمشید سا بے

رعایا یہ سب کتنی تھی واہ واہ کیا ہم کو اس بادشہ نے تباہ
یہ چاہتے جو فریاد کو خوب ہے یہ آقا جو راضی ہو محبوب ہے
علی نقی خاں کو دھسلا دیا کہ سب آب طعنہ میں نہلا دیا
(مثنوی "حزن اختر" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۰۷)

لیکن ـــــــــ؟

علی نقی خاں کے خلاف اودھ کی رعایا کے اس شدید ہیجان منافرت کا تعلق نہ تو اودھ کا مسئلہ الحاق تھا اور نہ شاہ اودھ کے ساتھ علی نقی خاں کی غداری ـــــــ اس کا صحیح "پس منظر" حقیقتاً کچھ اور ہی تھا جسے "عہد و زمان" کی قربت نے کچھ اس طرح سے ملا کر دیا کہ علی نقی خاں کی مخالفت کے اصل سبب کو تو عوام نے بھلا دیا اور "افسانوی پروپیگنڈہ" ان کے سارے کردار پر چھا گیا۔

علی نقی خاں کے خلاف منافرت کا جذبہ دراصل "الحاق اودھ" سے چند ماہ پیشتر اس وقت پیدا ہوا تھا جب "بعنوان گڑھی جودھیا" کی "بابری مسجد" کا ہنگامہ اودھ میں پہلے "ہندو مسلمان تنازعے" کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ ہنگامہ اوّل سے آخر تک انگریز سازش کاروں کی سامراجی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا جو بنگال اور میسور میں اپنے قدم جما چکے بعد للچائی ہوئی نگاہوں سے لال قلعہ اور قیصر باغ کو دیکھ رہے تھے۔ اس شرمناک سازش کو پروان چڑھانے کے لیے انگریزوں نے کس طرح جال پھیلائے تھے؟ اس کی تفصیلات اس عہد کی تاریخوں میں نہیں ملتیں۔ تاریخ ہمیں صرف اسی قدر بتا سکی کہ "بابری مسجد" میں نماز جمعہ کے وقت ہندو بیراگیوں کے ایک ہجوم غفیر نے نمازیوں پر حملہ کر دیا اور "کپتان آر" اور "جان ہرسی" کی نگاہوں کے سامنے ۲۶۹ مسلمان نہایت بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کر دیا حالانکہ یہ دونوں انگریز اس ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے اجودھیا بھیجے گئے تھے۔ مسلمانوں کے اس قتل عام کے ساتھ کلام مجید کی بے حرمتی ہوئی اور مسجد مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی ــــ

یہ قتل عام معمولی ایسا نہیں تھا جس پر مسلمانوں میں ہیجان پیدا نہ ہوتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا ایجی ٹیشن شروع ہو گیا جس کی سربراہی کے "سید امیر علی شاہ" کر رہے تھے جو ایک ذی اثر بزرگ تھے۔ کچھ لوگوں نے آئینی راستہ اختیار کیا۔ بادشاہ کے باب انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کچھ لوگوں نے "جہاد" کا نعرہ بلند کیا۔ جہادی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی ایک اجتماعی طاقت حکومت کی مدد کے بغیر بابری مسجد واپس لے لے۔ اس جہادی جماعت کے میر قافلہ یہی سید امیر علی شاہ تھے جن کا نام بعض لوگوں نے سید امیر الدین علی شاہ بھی لکھا ہے۔

ایک طرف تو آئینی اور دستوری تحقیقات ہو رہی تھیں دوسری طرف امیر علی شاہ کے نعرۂ جہاد نے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی جماعت ان کے جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا۔ بادشاہ اودھ کی بے بسی کا حال یہ تھا کہ وہ کوئی فیصلہ "ریذیڈنسی" کے ایما کے خلاف کر نہیں سکتے تھے جب بادشاہ کی یہ بے بسی تھی تو ظاہر ہے کہ علی نقی خاں ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت کس طرح کر سکتے تھے؟

"قیصر التواریخ" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے دربار میں انگریزوں کے سازش کار ایجنٹوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ بادشاہ اور وزیر اعظم (علی نقی خاں) تو بس برائے نام ہی تھے۔ یہ لوگ جو کچھ چاہتے تھے ہو تا وہی تھا۔ چنانچہ "قیصر التواریخ" کے یہ چند سطور اسی احوال کی ترجمانی کرتی ہیں۔

"ادھر جب یہ جھگڑا اسی ہنگامہ میں تھا ایک دن کپتان جیمز صاحب نے معتمد و متوسط شاہی
سے کہا کہ تم ہمارا پیام بادشاہ وزیر سے جا کر کہو۔ اہل بروشاہی سید جب یہ تبلیغ رسالت
کرا دیا ہمیں دھمکاتے ہیں حسب الحکم شاہی بعض مولوی لوگ اس مذکور ماجرا میں منجملہ کپتان
بادلو صاحب کی ضمانت سے در دولت پر حاضر ہوئے۔ حضور عالم (علی نقی خاں) نے
انھیں اپنا مہمان کیا۔ آخر یہ خبر اہل گروہ اذیشن نے "یہ اہل دنیا" اپنا کام کیا اور انھیں
بسلامت سرکار سے رخصت کر دیا اور بنا بر اپنے بگاڑ کی باتیں اہل ذہن تراشیں کہ
بادشاہ سے یہ اتفاق ہم زبان ہو کر وعدہ کیا اور پرچہ پیام مشروحہ عاریہ پڑنٹ کو بھیج کر بنانے سبب
منہ ان لوگوں میں کسی طرح ثابت و تحقیق نہیں ہوتی .... حسب الحکم سوار
پانچ ضرب توپ فوج تلنگہ و نجیب مع افسران اہل اسلام و کپتان بادلو صاحب و حاجی منہاجین
علی گنج ان شاہی (شاہی) گاڑی پر سب روانہ ہوئے جب ملا جو اللہ کا حکم ہوا کہ زنہار مولوی صاحب (سید
امیر علی شاہ) کو آگے بڑھنے نہ دیا اور ریذیڈنٹ سے متواتر پرچہ و پیام آتے تھے کہ جلد انسداد اس
فتنہ کا کرو اور مرضی اور چاشت خوروں نے بادشاہ سے نسبت خلاف مولوی صاحب (سید
امیر علی شاہ) کی باتیں اپنے بگاڑ کی بنا بنا کے کہنی شروع کیں۔ ادھر حضور عالم (علی نقی خاں) سے
خائف تھے اور متفق تھے اور "جیب ملا" بھر چکے تھے پھر کیونکر صاف صاف خدا سے ڈر کر
عرض کرتے۔ غرض چند روز تک مولوی صاحب (سید امیر علی شاہ) دیں (شاہی مکان) کے
اس حصہ میں مولوی جو سنیہ ہیں گو کہ جہاد خفا ہوئے تھے حسب الحکم "حضور عالم" متفق ہو کر
فہمائش کرتے تھے کہ علما دین کو مرتد کریں اور مسجد عیدگاہ میں گول مول باتیں خوف حاکم
وقت اور خوف جان و آبرو و از راہ موعظہ بیان کیں ——— جاہل یہ سن کر سب کے سب چلے گئے
کہ واہ مولوی تم سب اہل دنیا ہو۔ کل تم نے ہم کو آمادہ جہاد کیا تھا اب حاکم وقت کے
بہکانے سے ہمیں مرتد کرتے ہو اب ہمیں فریب نہ دو۔ یہ فضیلت اہل دنیا جاہلوں کے
ہاتھ سے جاتی رہے گی ——— یہ سن کر عوام سے ڈر کر چپکے چلے آئے۔"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحات ۱۲۲-۱۲۳)

مجاہدین کا جذبۂ جہاد بجائے سرد ہونے کے ان باتوں سے تیز تر ہوتا گیا اور مجاہدین کی ایک بڑی تعداد سید امیر علی شاہ کی سرکردگی میں ہنومان گڑھی کی طرف بڑھنے لگی۔

فتنہ و فساد کی روک تھام کے بہانے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرحدی حفاظت مجاہدین کے قتل عام پر کمربستہ تھی جن کے ساتھ شاہ اودھ کی فوجیں بھی "کپتان بادلو" کے حکم کی منتظر تھیں چنانچہ جب نخشی جہادی "چھاٹ گنج" سے "رودولی" کی طرف بڑھے تو شاہی افواج اور

ریزوں کی کئی کمپنیاں "کپتان بارو" کی سیتت میں ان پر ٹوٹ پڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں مسلمان خاک و خون میں لوٹنے لگے۔
ید امیر علی شاہ بھی ساتھ جماعت پر شہید کیے گئے اور مقتول مجاہدین کی تعداد تو ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ لاتعداد معاہدے "سلیمن"
ے دور سے کی وہ پہلی ہٹ اور شاہ اودھ کے خلاف بدنظمی کی طویل فہرست کے بعد۔ انگریزوں کے سیاسی ترکش کا یہ آخری تیر تھا جو ٹھک
انے پر جا کر بیٹھا۔ شروع تو اس کا بہاؤ راست سلطنت اودھ کے خلاف تھا لیکن سازش کاروں اور مفاد پرستوں نے دھر دیا علی نقی خاں
. جن پر بحیثیت وزیر اعظم بہرحال کچھ نہ کچھ ذمہ داری تو عاید ہوتی ہی تھی ——

اور یہی تھی اصل "بنائے مخاصمت" علی نقی خاں کے خلاف! چنانچہ چھ مہینے کے بعد، ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو جب الحاق
ودھ" کی کارروائی کا حکم ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری علی نقی خاں کے سر عاید کر کے انھیں ہدفِ ملامت بنایا گیا۔

اجودھیا کا دردناک المیہ اور سید امیر علی شاہ کی شہادت کا واقعہ جولائی ۱۸۵۵ء میں ظہور پذیر ہوا اور الحاق اودھ
ے معنر پر شاہی مہر، ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو ثبت کی گئی۔ چھ مہینے کے اس مختصر عرصے میں علی نقی خاں کے خلاف مسلمانوں کا متحدہ
اذ برابر کام کرتا رہا۔ عام مسلمانوں کے دل و دماغ ان سانحات سے اتنا متاثر تھے کہ ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف جنگ
زادی کا آغاز ہوا اور مولوی احمد اللہ شاہ لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے مسلم عوام میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے انھیں دردناک واقعات
ہارا لے کر فضا بنانے کی کوشش کی۔ لکھنؤ کی جنگ آزادی کے سلسلے میں کسی مورخ نے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کا اشارہ
ں عہد کے ایک اخبار "طلسم" لکھنؤ میں ملتا ہے۔

"وہ جو احمد اللہ شاہ گھسیاری منڈی میں مقیم ہیں جو چاہتے ہیں زبان پر لاتے ہیں۔ بے خوف و بیم
ہیں۔ بہت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ نکمی باتوں کی ہمیشہ چرچا رہتی ہے۔ اکثر "مولوی امیر الدین
علی صاحب" مغفور کا ماجرا یاد کرتے ہیں۔ ہوتا کچھ نہیں زبانی جمع جہاد کرتے ہیں۔۔۔"

(بحوالہ نیا دور لکھنؤ اسپیشل نمبر اگست ۱۹۵۷ء)

علی نقی خاں کی اس مخالفت کا سبب حقیقتاً "اجودھیا" کا المیہ اور سید امیر علی شاہ کا سانحۂ قتل تھا اور ان کا مفروضہ غدارانہ کردا
ر ——— اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ مطبوعہ ہجویہ مثنوی ہے جو حال ہی میں مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ سید امیر علی شاہ کے المیہ کے بعد اس سانحہ
کے متعلق بہت سی نظمیں اور قطعات کہے گئے تھے جن کا مجملاً ذکر "قیصر التواریخ" نے بھی کیا ہے ——

"مادۂ تاریخ اور قصاید منظوم اس مدے (معرکۂ اجودھیا) کے بہت سے کہے گئے تھے
جلد سارے ہندوستان میں مشتہر ہوئے۔"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۲۸)

مثنوی "توضیح الشقی فی احوال النقی" انھیں میں سے ایک ہے جس میں علی نقی خاں پر یہی الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے انگریزوں
سے سازباز کر کے سید امیر علی شاہ کو قتل کرا دیا۔ اٹھارہ صفحات کی یہ مثنوی "مطبع اسلامی محمد اسلام خاں" میں چھپی تھی لیکن اس سے
یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ مثنوی کس کی کہی ہوئی ہے؟ کس سن میں چھپی؟ اور یہ "مطبع اسلامی" لکھنؤ میں تھا یا لکھنؤ سے باہر؟

ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا سکا ہوں کہ اس مطبوعہ مثنوی کا یہ منفرد نسخہ ہے۔ البتہ اس مثنوی کی ایک نقل محب محترم پروفیسر سید مسعود حسن ادیب کے کتب خانے میں ضرور موجود ہے جس میں کچھ ایسی تفصیلات بھی درج ہیں جو اس سے قبل میری نظر سے نہیں گذری ہیں۔ مثنوی کی یہ نقل نواب ذکی علی خاں ناقد لکھنوی[۱۵] کے توسط سے پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب تک پہنچی ہے۔ یہ مثنوی کوئی قدیم مخطوطہ نہیں ہے بلکہ کسی مطبوعہ نسخے سے ۱۹۳۰ء میں نقل کی گئی ہے۔ ابتدا میں ناقد مرحوم کی ایک قلمی یادداشت بھی شامل ہے جس کا متن درج ذیل کیا جاتا ہے:

"یہ نقل ہم نے مرزا محمد عسکری تخلص بہ تمکین شاگرد فصاحت صاحب (ساکن رستم نگر) سے کی ہے۔ معلوم ہوا مرزا محمد عسکری صاحب سے کہ یہ مثنوی مرزا نصرت اللہ صاحب لکھنوی کی تصنیف ہے اس کی تصدیق فرزند علی خاں ایڈیٹر "اودھ پنچ"[۱۶] ساکن ... غلام حسین لکھنؤ نے کی تھی۔ فرزند علی خاں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ مثنوی چھاپنے والے مطبع کا اصلی نام نہ تھا بلکہ یہ لکھا تھا کہ "در مطبع گمنام طبع شد"۔ چنانچہ علی نقی خاں نے بہت کوشش کی لیکن کسی طرح بھی اس کے طبع ہونے کا پتہ نہ لگا۔ یہ بھی فرزند علی خاں نے لکھا تھا کہ مطبوعہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ مطبوعہ نسخہ جا بجا سے ایک نسخہ حضرت واجد علی شاہ کے سرہانے اور ایک نسخہ علی نقی خاں کے قلم دان میں ——— اور ایک نسخہ علی نقی خاں کی زوجہ کے پاندان کے نیچے کسی نے کسی طرح پہنچوا دیا تھا تاکہ یہ لوگ خود بھی پڑھ لیں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ سبھی نے اس کو خود پڑھا یا کسی سے پڑھوایا۔ بہرحال اس تصنیف کے حالات سے وہ لوگ کافی طور پر مطلع ہو گئے تھے۔ اسی بنا پر علی نقی خاں نے مجبوراً تحقیقات کرائی تھی۔ جس کتاب سے تمکین صاحب نے نقل کی تھی، وہ قلمی نسخہ تھا اور صرف اسی قدر لکھا تھا کہ یہ تحریر جس نے لکھا صحت سے لکھا ہے اور چھاپنا بھی قابل اعتنا نہیں ہے۔ لفظ لفظ مطابق ہے اور ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ تقریباً اصل کتاب قلمی میں موجود تھی جو نقل سے ہم نے لکھی ہے۔"

ناقد حفی عنہ — ۳۰ اپریل ۱۹۳۰ء

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرزند علی خاں کے پاس جو مطبوعہ نسخہ تھا اس پر "در مطبع گمنام طبع شد" چھپا ہوا تھا۔ میرے پاس جو مطبوعہ نسخہ ہے اس پر "مطبع اسلامی" چھپا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس مثنوی کے کوئی دو ایڈیشن بھی چھپے ہوں۔ "مطبع اسلامی" نام کے کسی پریس کا عہد شاہی میں پتہ نہیں چلتا۔

اس مثنوی کے سن تصنیف یا سن اشاعت کا پتہ نہیں چلتا لیکن یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مثنوی "الحاق اودھ" (فروری ۱۸۵۶ء) سے پہلے اور مرکز جاوا (؟) جو وابستہ کے بعد (جولائی ۱۸۵۵ء) چھپ ... کے اندر شائع ہو چکی تھی۔ اس بات کی تصدیق

---

۱۵ نواب ذکی علی خاں ناقد لکھنؤ کے نامور رئیس تھے۔ ایک مذہبی ماہنامہ "تہذیب" کے نام سے نکالتے تھے۔ جس میں پچیس سال ہم نے جب ... کیا

۱۶ یکم مئی ۱۸۸۸ء کو یہ ہفتہ وار اخبار فرزند علی خاں کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلا تھا۔ (غلام سیتا پوری)

واقف کی ان تفصیلات سے بھی ہوتی ہے کہ مطبوعہ نسخے واجد علی شاہ، علی نقی خان اور ان کی بیگم تک پہنچا دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ خود مثنوی الحاق اودھ کے بعد چھپی ہوتی تو اس میں "الحاق اودھ" کے واقعہ کو کسی طرح پر نظر انداز نہ کیا جاتا ——— بلکہ علی نقی خاں کے خلاف وہ تمام پروپیگنڈہ اس مثنوی میں ضرور موجود ہوتا جس کا ذکر مجملاً کیا جا چکا ہے۔

مثنوی نگار مولوی نعمت اللہ لکھنوی کا بحیثیت شاعر کیا درجہ تھا؟ کس کے شاگرد تھے؟ ان تمام تفصیلات سے لاعلمی کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنی اعتبار سے اس ہجویہ مثنوی میں کوئی خاص سقم نظر نہیں آتا۔ ہجو میں ابتذال اور صد درجہ سوقیانہ پن ہی اس زمانے کی ہجویہ شاعری کا وہ نقطۂ کمال سمجھا جاتا تھا پھر جیسا کہ مثنوی کے نام سے ظاہر ہے یہ ہجویہ مثنوی کہی بھی اسی لیے گئی تھی کہ علی نقی خاں کے خلاف جی بھر کے دل کا بخار نکالا جائے اور ان کی عزت و ناموس کو رسوا اور ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔

مثنوی اچھی خاصی طویل ہے لیکن کچھ زیادہ اختصار و انتخاب اس لیے ممکن نہیں کہ اس سے صحیح پس منظر کی پردہ کشائی نہ ہو سکے گی اور یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ شاید ان اجزا کو نظر انداز کر دیا گیا جو اصل موضوع کے خلاف ایسے حقائق پر روشنی ڈالتی جو ایودھیا کے سانحے اور امیر علی شاہ کے المیہ کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں۔

صرف حمد و نعت کے چند اشعار حذف کر دیے گئے ہیں جس سے نفس مقصد پر کوئی حرف نہیں آتا
مثنوی مندرجہ ذیل چھ ابواب پر تقسیم ہے۔

۱۔ حمد۔

۲۔ نعت سرورِ کائنات۔

۳۔ آغاز مثنوی و شرح خطاب بہ نواب شفق۔

۴۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند

۵۔ بیان شہادت امیر الشہید بسبب شقاوت الوزیر البلید۔

۶۔ تقریظ

کل اشعار کی تعداد دو سو بیالیس ۲۴۲ ہے جن میں بہت سے اشعار فارسی کے ہیں۔ حمد و نعت تمام تر فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ بھی بیچ میں تسلسل کے ساتھ فارسی کے بہت سے اشعار کھپائے گئے ہیں۔

حمد و نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بنام خداوند فیض المعید — پدید آورد ہر چہ شد ناپدید
گہے نو زمینے پدید آورد — حسینے پئے آں یزید آورد
گہے تازہ فرعون پیدا کند — بہ موسیٰ نو ہویدا کند
خدائے کہ در عرصۂ امتحان — بر و تیغ حکمش سر دوستان
. . . . — . . . .

خدائے توانا خدائے قدیر خدائے سمیع و خدائے بصیر
خداوند جسم و خداوند جاں خداوند فرماندہ حکمراں

پس از حمد حق است نعت رسولؐ شود تا کلامم قرین قبول
امام رسل · خاتم الانبیاءؐ شہ ہر دو عالم وزیر خدا
رسول امم پیشوائے سبل حبیب خدا باعث جزو کل
زہے عبد مقبول خاص خدا کزاں بندگی شد خداوندا
رسولیکہ قرآں اعجاز اوست امینیکہ جبریل ہمراز اوست

. . . .

پس از حمد و نعت خدا و نبی سرود چند شعر است ایں مثنوی
پئے نذر نواب صاحب حشم من ایں نامہ نغز کردم رقم
بود تا بود آسماں برقرار مر ایں نامہ نواب را یادگار
من ایں نظم کردم بہ اردو زباں کہ حظش برد اہل ہندستاں
ہر آنکس کہ وردش کند صبح و شام شود بر تنش نار دوزخ حرام

"آغاز مثنوی و شروع خطاب بہ نواب شفق" کا عنوان دراصل اس کے نام "علی نقی" سے تعلق رکھتا ہے جس میں مثنوی نگار نے بصد معذرت کے ساتھ اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ "علی اور نقی" کے پاک ناموں کا کوئی اثر علی نقی خان کے کردار پر نہیں تھا۔ بلکہ اس نے انکار کیا ہے کہ ایسے شخص کا نام "علی نقی" ہو ہی نہیں سکتا۔

ارے او جنوں سرشتہ شفق ترا نام کب ہے علی نقی
جنوں ان کے نطفۂ اسلام علی اور نقی سے تجھے کیا ہے کام
سگ نام پر ہو ان کے وہ اپنا نام کہ ہے نام بھی موجب احترام
یہ لائق ہے اس کو کہ دینا لقب وہ ایسے لقب کا سزاوار ہے
مگر تجھ کو اے کافر بے حیا ائمہ کے اسماء سے ہے کام کیا؟
خدا کا تو دشمن ہے تو لعیں ائمہ کا کب تجھ کو ہے کچھ یقیں
ارے تو تو مردود شیطان ہے بڑا دشمن دین و ایمان ہے
شقاوت سے تیری مگر اے شفق کتاب خدا کی اہانت ہوئی
ہوا غلبۂ کفر جو کچھ میاں کہ آگاہ ہے اس سے سارا جہاں

دعا کسی نے سُنا تھا کبھی ‏ ‏ ہوا تھا نہ ایسا نہ ہوگا کبھی
کہاں حضرت اہلبیت نبیؐ ‏ ‏ یہ وہ عز و ایماں تھے کل اے شقی
بجز جفا اے قوم جہول ‏ ‏ ہوئی اولاً قتل آلِ رسولؐ
بجز کس نے تیرے پئے حُبِ جاہ ‏ ‏ کیا قتل آلِ رسالت پناہ
فقط ایک باقی جو قرآن تھا ‏ ‏ اہانت کا اوس کی تو باعث ہوا

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

اے یادگار یزید پلید ‏ ‏ ارے ابن ملجم کے خلف الرشید
ارے او حرامی ارے او شقی ‏ ‏ ارے او منافق ارے لعنتی
ذرا کچھ تو شرما تو اے نابکار ‏ ‏ خدا کی ہے لعنت دن تجھ کو مار
یہ ہے شرم کی جا کہ ہندو نے یوں ‏ ‏ ہمارا یہ اور ان سے سمجھ لیں
کریں گئو کی اپنے تائید سب ‏ ‏ نہ ہو پاس دیں تجھ کو کچھ بے غضب
کہ ہندوؤں سے جو شوکت ہی خوار ‏ ‏ حمیت نے تجھے کر دیا کور و کر
اے عبد دُنیا۔ ارے بے حیا ‏ ‏ نہ آیا تجھے کچھ بھی خوفِ خدا
بااعلان کہتے ہیں سب اہل کین ‏ ‏ لیا مول نواب کا ہم نے دیں
ارے بے خبر تو نے یہ کیا کیا ‏ ‏ کہ دُنیا کے بدلے میں دیں کھو دیا
ارے گول احمق۔ اے کور خر ‏ ‏ ارے دشمن دیں۔ اے بے خبر
ارے نطفۂ ہندوی بت پرست ‏ ‏ بنا کی بہت دیں کی تو نے پست
حنفیوں نے شے کر نہ بے تیغ ‏ ‏ کیا رام تجھ کو کارے بد شعار
ہوئی جبکہ توہین دیں اس قدر ‏ ‏ اور اوس پر بھی تو نے نہ لی کچھ خبر
مسلمانوں کو تب ہوا ناگزیر ‏ ‏ کہ ہوں متفق سب صغیر و کبیر
زبس ظلم کرنا تھا اون کو شاق ‏ ‏ کیا اہل اسلام نے اتفاق

لہ ۱ حاشیہ مثنوی نسخہ دیوان رام پور ص ۲۱ - ۱۲

بیان شہادت امیر الشہید بسبب شقاوت الوزیر المرید

امیر علی سنیوں کے امام — حمیت غیرتِ دیں اُن پہ تمام
عجب مرد جرار و کرار تھے — شہامت میں عالم کے سردار تھے
خیال اُن کو آیا نہ کچھ جان کا — فقط پاس تھا اپنے ایمان کا
ہوئے مستعد آکر میں انتقام — کریں جا کے ثبت غازیوں کا نام
بنا مسجد منہدم کو کریں — مٹا کفر و کفار کو اس سے دیں
اذان اور تکبیر جو بند ہو — بجے خوب ڈنکا وہاں دین کا
سروں کو ہنودوں کے پامال کر — بھریں خوب سارا وہ مستقر
ارادے یہ اُن کے ہزار آفریں — خدا نے کیا اُن کو سردارِ دیں
نہ کی کوتاہی دین کے کام میں — کہ خود مر مٹے اس سرانجام میں
مگر تھا جو تقدیر کا یہ لکھا — شہادت وہ نیکی تجھ کو منت ملا
ہزاروں مسلمانوں کے قتل پر — کمر باندھ لی تو نے اے بدگہر
نہ کی جنگ جب تک تھے سب یکجا — دغا کی دغا کی۔ دغا کی دغا
مسافر وہاں پر سرِ راہ تھے — تری اس دغا سے سب آگاہ تھے
وہ دو وال تیسرا جو تھے یارو — کرانی کا بچہ حسینا کا عدو
جدا راہ میں اس نے دھوکا کیا — کہ غفلت میں توپوں سے اڑوا دیا
نہ تھا ایک جا لشکرِ اہلِ دیں — کوئی تھا کہیں اور کوئی کہیں
فقط چند تھے گرد و پیش امام — صفِ جنگ میں صرف آئے وہ کام
جو ہوتے وہ سب مجتمع ایک جا — تو پھر "یارو" کہ کھیلتے ہوا
فقط سات سو تھے یہ سب لوگ — کہ سب برق سان توپ پہ جا چڑھے
مقابل ہوئے جب وہ کفار سے — لیا چھین توپوں کو تلوار سے
دلیرانِ دیں مست آور ہوئے — وہ یکبار سب دعاوار ہوئے
ہوا دست فوج مقہور کا — مقابل ہوا ظلمت و نور کا

چلے وار توپوں پہ تلوار کے   اڑائے دھوئیں فوج کفار نے
وہ تھا غلغلہ جب کہ تکبیر کا   تو منہ پھر گیا قوم بے پیر کا
جدھر رخ چھٹ گئے فوج کفار کے   نہ ٹھہرا کوئی منہ پہ تلوار کے
سنو جس طرف شور تھا بھاگ بھاگ   نہ سیلاب ٹھہرا چلی جب یہ آگ
جلے وہ چلے تھے جو تیغوں کی باگ   ہوئی آب تلوار کی ان کو آگ
وہ دریا سے اٹھی تھی فوج جو لہا   یہ تیغیں بنیں ماہی بحر گون
وہ نیزے وہ شمشیریں اور وہ خدنگ   یہ سب بن گئے بحرِ خوں کے نہنگ
چمکتی تھیں واں جتنی تیغ و سناں   گراتی تھیں کفار پر بجلیاں
کیا غازیوں نے جو دھاوا وہاں   فلک نے کہا الاماں الاماں
یہ تھا دبدبہ فوج اسلام کا   کہ دم بند تھا رستم و سام کا
تتے چند ط سے گو ہوئی کارزار   مگر سب معینوں کا تھا کارزار
جو تھے کافروں میں نجیب شاہ جنگ   ہوا عرصہ زندگی ان پہ تنگ
ز شمشیر و خنجر بہ تیر و تبر   شد از کار بسیار را پا و سر
بسہم جگر دوز و گرز گراں   یکے کشتہ بیجاں یکے نیم جاں
چہ چار آئینہ پوش کلاہ یکقلم   بہ تیغ دو دم رفتہ سوئے عدم
بسے پہلواں لشکر شکن   گریزاں شدہ از نہیب بنہ ن
چو دادند جنبش گراں گرز را   بجاں لرزہ افتاد البرز را
بہ تیغ صفاہاں صف شگاف   کہ از فرق بشگافتہ تا ناف
بسا زخم دادہ بکمند دست   کہ از دست او رفت بسیار دست
ز دود سیہ شد نمودار تیغ   چو برق درخشندہ از تیرہ میغ
بہ تیغ دلیراں بہنگام جنگ   شدہ ماہیاں جملہ توپ و تفنگ
ز غلغلہ کب چناں نعرہ ہا   کہ گوش فلک کر شدہ بی برسا
بپا کشتہ ہنگامہ رستخیز   نہ جائے فرار و نہ پائے گریز
ہوئے اس قدر کشتہ پیر و جواں   کہ بہنے لگیں خون کی ندیاں

ط ۔ تیر چند ۔

جو ادھر بھسم محض پہ گیا بارود — جہاں وحش بکنے لگا ڈھیر ڈھیر
زمیں جوش زن تھا وہ طوفان خون — بہت سے غرق سب کافر زبوں
فرس سیکڑوں وہاں پہ تیرتے تھے — بہے واصل جہنم و اسفل السافلین
لیا چھین توپوں کو اک وار میں — پڑا تہلکہ فوج کفار میں
وہ لشکر وہاں سے فراری ہوا — جب خوف اسلام طاری ہوا
وہ سب بھاگ نکلے ذرا دیر میں — پڑا فرق بے حد و بے شمیر میں
وہ توپیں رہیں اور ذرا کے رہے — وہ بندوق تلوار ترسے رہے
نیا مرد و گر کس در رزمگاہ — کرتا یہ پیشیں پیادہ اد
امام زماں سید امیر علی — کہ تھے شیخ اناس حق کا ولی
دلیران عالم کے سردار تھے — وہ کھینچے ہوئے رہ میں تلوار تھے
کئی کٹنے تھے ان بڑے بہادر — یہ تھے صرف احسان بجائیر
اگر چاہتے جو بچا نہ رہتے — نہ موڑ دیا یہاں منہ کو کفار سے
کھلے تھے یہ در اس لئے جنت تمام — ہے تحت السیوف کی دار السلام
دلیروں نے جس وقت حملہ کیا — تلنگوں نے ہیبت سے بھگ بھگ دیا
تلنگوں نے لی جب کہ راہ فرار — تو پھر بار انہیں نے پائی گمار
بہت بھیج تب ہزاروں گروہ — لگی جنے ہر سمت سے مار مار
کمینوں نے چل کر کے زغہ کیا — انہیں زور پر باڑھ سے دھرلیا
عقب سے لگی توپیں لا کر وہاں — لگے چھپے برسانے پھر ابر سیاں
بپا آخرکار دوں کو شہید — مظفر پھر اک دوست علی یزید
ترے ظلم سے ظالم رو سیاہ — ہوئے قتل کیا سیکڑوں بیگناہ
ہوا بار و شمر اور تو یزید — امیر علی چوں حسین شہید
سہا تو تو اے کافر بدیقین — مسلماں کہت تھا اپنے تئیں
یہ کیسا مسلماں ہے تو اے شقی — کہ اسلام کی تجھ سے ذلت ہوئی
یہ ہمسایہ کفر اور یہ دعوائے دین — ہزار آفریں صد ہزار آفریں
مگر ۔ ۔ ۔ واقعی ہے تو نے جیسا — کہ ہے اپنی ہی قوم کو مارتا
یزید تھا گر اسلام کا معتقد نا — یزید لعیں بھی مسلماں تھا

اے دشمنِ دین اے بدنہاد   بلا شک ہے تو ابنِ ابنِ زیاد
نہیں تجھ کو ہرگز اگر پاسِ دین   تو کچھ دل میں خوفِ خدا بھی نہیں
عداوت اسی کو تھی کیا مقتضی   کہ ہو مستحقوں کی گردن زنی
وہ بے دین و غافل ترا بادشاہ   تو اُس کا وزیرِ ضلالت پناہ
وزیرے چنیں شہریارے چناں   جہاں چُوں نگیرد قرارے چناں
وزارت کے لائق تو ہرگز نہ تھا   مگر تو نے جورو کو بھجوا دے دُعا
کہ اس سال زادی نے او بشعا   زنا سے جنیں بیٹیاں بے شمار
بہت آپ کو گُو کہ رُسوا کیا   ولیکن ترے حق میں اچھا کیا
وہ سب بیٹیاں کام آئیں ترے   رئیسوں امیروں کو ڈولے دیے
کئی اودھ میں بھی نذرِ شاہ اودھ   وزارت ملی تجھ کو بے جد و کد
بدولت . . . کے اے بے ہنر   کیا تُو نے حاصل یہ سب مال و زر
دین آخرت میں جب منظورِ شاہ   ستارہ ترقی پہ ہے سال و ماہ
تکبر تجھے کیوں نہ ہو جاہ کا   کہ سسرا ہے واجد علی شاہ کا
میں قرباں اس جاہ و جرأت کے   وزارت تصدق میں ہے . . . کے
بہت تُو نے تدبیر معقول کی   کہ بیٹی کو دے کر وزارت یہ لی
اب اک اور شے ریزیا جس کو   کہ جس میں وزارت کو جنبش نہ ہو
ہُوئی جب سے تجھ کو وزارت نصیب   ترا حال ہے کچھ عجیب و غریب
دیا یا تجھے ایک دم ہوش میں   بہ ہر رات دن خوابِ خرگوش میں
نہ خوفِ خدا ہے نہ پروائے دین   نہ دُنیا کی ذلت کا پاس اے لعین
مگر تو ہے سرگرم صبح و مسا   اطاعت میں جورو کی اس سے سوا
اور اُس کا بیاں کیا ہو جو حال ہے   کہ سارے جہاں کی بدافعال ہے
کسی سے نہیں اس کا بچتا ہے جی   نہ تسکین ہو اتیری گر اردلی
کہیں فیل و خر بھی اسے یاد ہیں   تو تجھے وہ اُن سب کو مانند خس
مگر کیا دلیری و جرأت ہے واہ   کہ اُن سب . . . نکلی نہ آہ
کسی طرح اس میں نہیں ریب و شک   کہ ہے اُس کو بیماریٔ آتشک
فرنگی کا شاید ہوا تھا گزر   کہ باقی ہے اس کا ابھی تک اثر

کہیں بکنار سفر کی ٹھنی — کہ لاحق ہے ناگہ سفر کی بنی
زمانے میں جانے یہ مشہور ہے — کہ اک ... میں اس سے ناصبور ہے
جب اُٹھتی ہے ناشُدنی سے کچل — وہ جب چھپ ہو کر جاتی ہے جنگل
جب سے ڈاکٹر بیاں حماقت حسین — علاج اوس سے کیا تب یا یقین
ہوا ڈاکٹر کا یہ احسان بڑا — کہ مرہم نہ زخم پنہاں بھرا
وہ بیتاب ہونے سے بس بچ گئی — جو ناسور میں اوس کے تپ تھی گئی
سر اوس کی شرم دیدہ تقبان — کہ قائم ہمیشہ رہے یہ نگاہ
ہیں آگاہ اس سے سبھی خلق عام — کہ ہے گھر میں تیرا وہ قائم مقام
خود اک روز اس نے تب اے بادشاہ — تشفی سے اس طرح کی گفتگو
شہا تجھ کو دنیا میں دائم رکھے — سدا تیری جورو کو قائم رکھے
اسے او جیا دشمن بد شعار — تو ساتی وو یو شبہ نک ما
نہ اوس پر بھی نازل تجھے کچھ حیا — سمجھ کر کے تو نے تب ان کیا
نہیں تجھ کو پوشیدہ ہرگز یہ راز — کہ جورو کہے تیری ڈھال کی ساز
کہا کرتی ہے تجھ سے ہر دم سدا — کہ قائم ہے کیا سا [illegible] خدا
اسے بے خبر تجھ کو نہیں کیا تمیز — کہ قائم ہے کیوں اس کو اتنا عزیز
یہ تعریف خوبی پہلے تو ہم ہے — نہ ورع و تقویٰ سے کیا کام ہے
نہ کچھ وصف قائم ہے حد خوب ہے — فقط فسق قائم ہے مرغوب ہے
لئے اس لئے اس طرف [illegible] — کہ اوس کا (یہی) اکر قائم اصیل ہے
کہاں تک سکوں تیری جورو کا حال — کہ قبہ زمانے کی ہے وہ چھنال
کسی سے نہیں اس کو خوف و ہراس — سمجھتی ہے میں بادشاہ کی ہوں پاس
رعایائے سلطان ہیں سب ان کو ریش — جو بیگانہ ہیں وہ ہیں اپنوں سے بیش
جمعیت جو ہوئی اوس کی نازل ہوئی — تو تازے دل خوب حاصل ہوئی
جو عیاشی کی اوس نے کی جستجو — ملا ایک سے اک جوان خوبرو
جب ملنے لگے اوس کو خوش رو جوان — تو نیز منور تجھ سے بھی پھیری [illegible]

---

۱ لکھنؤ کا مشہور بھانڈ

الٰہی پنہ دیں سے عیش مدام تجھے یاس حسرت سے ابتا ہے کام
رہیں جو تیرے کافر اسے نابکار ترے سر پہ رہتا ہے ہر دم سوار
اطاعت میں اوس کی تو سرگرم ہے جو وہ تند ہے تو بھی تو نرم ہے
تماشے فتنے نکلتا ہے گز کہ بھڑکے نہ وہ آتش حسد سوز
غرض انتہا کی وہ بے باک ہے بڑی بیسوا اور چالاک ہے
الٰہی مت دو فعل بد سے بکار شب و روز ہے اوس پشیمان کار
بدآئین و بد وضع و منقلب ہے وہ سارے زمانے کی عیار ہے
یہ سب کچھ ہے لیکن جو ضامن ہیں بجاں حقیقت میں سب صاف ہیں
وہ گو را عجب فعل معیوب ہے مگر پھر بھی تجھ سے کہیں خوب ہے
اگر فعل بد کرد آن بد نہاد دل بندگان خدا کرد شاد
خود آن فعل بد ہم نچندان بد است کہ باید دل بندگان زان بجاست
دکھیں اوس نے وہ مردم آزاریاں کہ جن سے کریں مردم آزاریاں
چہ ارباب کفر و چہ اصحاب دین کسو کو ضرر اس سے پہنچا نہیں
شریفہ و خوش اطوار سنڈ و خراب ہوئے ذات سے اوس کے سب فیض یاب
نہیں کچھ تری طرح سے وہ لئیم کہ ہے بیشک وہ بنت کریم
نہیں اوس کو امساک ہرگز ذرا کہ ہے چشمۂ فیض جاری سدا
وہ خلق و سخاوت پہ باندھی کمر کہ شاہ و گدا سب گئے اوس کے گھر
بنے درگاہ اوس کی ہو بیت الحرام کہ جھکتے ہیں جا کر جہاں خاص و عام
کسی سے نہیں اوس کو انکار و عار وہاں سب کا ہوتا ہے احوال کار
ہمہ بہر مردم زین بارگاہ چہ روئے سفید و چہ بخت سیاہ
ہر آن اہل حاجت کہ خواہد... ! کند از درش خواہش دل حصول
زمیں کو اوس نے دیا بخشا تخت پیادوں کو بھی کر دیا ہے سوار
وہ باغرض بدکار و قحبہ سہی مگر حق تو یہ ہے کہ سب ہے بھلی
سخاوت سے ہے عیب اکسیات سخاوت ہمہ دردہا را دوا ست
وہ ہر چند بد وضع و جاہل ہے مگر دشمن دین نہ زنہار ہے
مگر یہ عجب وہ زنا کی چوٹی گنہگار پنے خدا کی ہوئی

محمد شہ نے ظلم پر شکر ہو — کیا سیکڑوں بیگناہوں کا خون
کیا اوس نے فخر اپنے ظلم پر — ہوا تجھ سے خلق خدا کا حذر
کیا اوس نے صرف بیکس کا گلا — ہوا کار اسلام تجھ سے تباہ
خدا تجھ کو غارت کرے اے لعین — کر تو ہے تنہا گبر بدخواہ دین
جو دیندار ہو تو فنا مت کرے — تجھے بلد خدمت کرے
بحق تو اسے دشمن مومنان — مرا قول سے بیت حد و زبان
سبحان دل آویختہ ای شاہ — کر از مہر گیناہ دو دیں بیاد
الٰہی کیا جس نے دین کو تباہ — ہے وہ کہ کر زمیں میں دھنسیا
ہے جب تلک کہ زمیں پایدار — ہے جب تلک کہ مہر و منیر کا
جہنم ہے جب تلک شعلہ ور — کشادہ ہو جب تلک کہ باب سقر
وہ کفر خدا میں گرفتار ہو — خدا کی لعنت اوس پر ہزار ہو
شب روز دوزخ میں جلتا رہے — کف یاس و حسرت میں ملتا رہے
سرش مطرح قہر جانکاہ باد — دلش مورد لعنت اللہ باد

تقریظ

ہیں ایک بزرگ بیاں یگانہ — بے مثل ہیں اوحد زمانہ
شاعر ہیں بڑے سخنور — مالک ہیں نظم و نثر کے وہ
کامل ہیں وہ بلکہ اکمل — سب شاعروں سے جہاں کے افضل
ہے طبع کلام اون کا کیا وہ — اقلیم سخن کے ہیں وہ شاہ
ذی مرتبہ ذی صفات وہ — مقبول جناب حق تعالیٰ
ممکن نہیں ہو سے اون کی تعریف — جو کچھ نہیں ہے مجھ سے تعریف
کیا خوب یہ مثنوی لکھی ہے — اور ہجو کی وہ خوب دی ہے
ہے جو کسی کی حاجت تصنیع — اور حال شقی کی خوب تشنیع
ہر کچھ کر بیان واقعی ہے — کچھ اپنا مبالغہ نہیں ہے
پر ایک بے ادب ہو گیا ہے — تقریر اوس میں نہیں ہوا ہے
قبول اس کے نقش ہے امارت — بینش کے مرض میں وزارت

اس پر بھی جب نہ اس کو آیا		رشوت کا مال خوب کمایا
دنیا کے عوض میں دین کو کھویا		اس غم سے تو دونوں کو ڈبویا
جا کر کوئی پوچھے اس شقی سے		یعنی نواب علی نقی سے
بتلا تو خدا لگے اے خر		کیا تجھ کو بھلا تھی حاجت زر
واجبی پر بھی ہو نہ قانع		نیکی بھی ہوا تو اس کو مانع
ہر چند کہ تھی نہ حاجت اس کو		نکلے کے اوپر کیا کرے وہ

دینار و درم بہم فراواں
رکھتا تھا وہ نطفۂ شیطاں

لکھنؤ کا عروج و زوال

ڈاکٹر مسعود نیّر رضوی

۱۸۵۷ء سے پہلے کی جس تہذیب کو ہم اودھ کی تہذیب کا نام دیتے ہیں وہ دراصل بیت السلطنت لکھنؤ کی تہذیب تھی۔ لکھنؤ کے قریب قریب کے چھوٹے تہذیبی مراکز بھی اس تہذیب کے لحاظ سے لکھنؤ سے بہت مختلف تھے۔ شجاع الدولہ کے عہد تک اودھ کے حکمرانوں کا مستقر فیض آباد تھا اور لکھنؤ دوسرے شہروں کی مانند صرف ایک صوبائی شہر تھا لیکن شجاع الدولہ کے فرزند آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو دارالحکومت بنا لیا۔ اس وقت سے لکھنؤ کی ترقی اور خوش حالی کا دور شروع ہوا۔ دہلی میں مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی اور اس عظیم شہر کا مستقبل بہت تاریک اور خطرناک نظر آ رہا تھا۔ لکھنؤ کو دولت میں بڑھتے دیکھ کر دہلی اور دوسرے مقامات کے اہلِ کمال اور معزز لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس شہر کو مختلف حیثیتوں سے مالا مال کر دیا۔

اسّی برس تک لکھنؤ کے چراغ کی لو تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔ آخر واجد علی شاہ کے عہد میں انتزاعِ سلطنت (۱۸۵۶ء) کے بعد سے اس کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ اور اب کمال لکھنؤ چھوڑ کر دوسرے شہروں کو کوچ کر گئے اور دیکھتے دیکھتے لکھنؤ پر زوال آ گیا۔ عروج و زوال کی یہ داستان کچھ اس طرح ہے:

(ا)

آصف الدولہ اور ان کے جانشین سعادت علی خاں کے زمانے تک اودھ مغل سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ یہاں کے حکمران سلطنتِ مغلیہ کی طرف سے اس پر حکومت کرتے تھے اور مغل بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے ان کا لقب "نواب وزیر" تھا۔ اصولاً انھیں مغل بادشاہ کی چشم و ابرو کے اشارے پر چلنا چاہیے تھا لیکن اب یہ نیابت فقط برائے نام تھی۔ حقیقتاً اودھ کے حکمران خود کو دہلی سے آنے والے احکام اور ہدایات کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ اس صورت حال کے ذمہ دار ایک حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عہدہ دار تھے جو نواب وزیر اور بادشاہ دہلی کے درمیان حائل ہو گئے تھے اور پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خاموش تہیہ کر چکے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ نہایت منظم اور مکمل منصوبہ بندی اور ہوشیاری کے ساتھ عمل کر رہے تھے۔ بادشاہ اور نواب کے درمیان بڑھتی ہوئی بے تعلقی انھیں منصوبوں کا ایک جزو تھی۔

دہلی اب بھی ہندوستان کا دارالسلطنت اور مغل بادشاہ اب بھی ہندوستان کا شہنشاہ تھا لیکن اب اس کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ دہلی کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور مغلوں کی بادشاہت ختم ہو رہی تھی۔ اس تنزل کا سبب انگریزوں کے دخل در معقولات کے علاوہ یہ بھی تھا کہ خود مغل حکمرانوں میں وہ خون کم ہو چکا تھا جو تیمور گورگان سے لے کر بابر سے اکبر اور عالمگیر کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

لے "سوانحات سلاطین اودھ" میں سید کمال حیدر ... [illegible] کا واقعہ بتاتے ہیں لیکن دوسری تاریخوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ آصف الدولہ ۱۷۷۵ء میں مسند نشین ہوئے اور بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی مسند نشینی کے پہلے ہی سال انھوں نے لکھنؤ قیام منتقل کر لیا۔

سلطنت مغلیہ کے جانشین بزم پر رزم کو قربان کر چکے تھے۔ ان کی فعالیت ختم ہو چکی تھی۔ اور ان کی جنبشیں کٹھ پتلیوں کی طرح تھیں جن کی ڈوریاں انگریزوں، سیدوں، مرہٹوں اور جاٹوں، روہیلوں، سبھی کے ہاتھوں میں آتی رہتی تھیں اور ان کے بازیگروں میں اپنے فن کے سب سے زیادہ ماہر انگریز تھے جو دھیرے دھیرے پورے ملک کی سیاست پر چھاتے جا رہے تھے۔

آصف الدولہ کے عہد تک اودھ پر بھی انگریزوں کی نظریں پڑنے لگی تھیں۔ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نواب وزیر کو اپنے قابو میں لائیں۔ یہ مقصد تین طریقوں سے حاصل ہو سکتا تھا۔ نواب کو اپنا ممنون کر کے، اپنا محتاج بنا کر یا اپنے سے مرعوب کر کے۔ انھوں نے پہلی صورت کو مصلحتِ وقت سمجھ کر آصف الدولہ کو ان کی ماں بہو بیگم صاحبہ کی تھیلیوں سے دولت دلوا دی۔ آصف الدولہ انگریزوں کے ممنونِ احسان ہو گئے اور اخلاقاً ان سے دوستی نبھانے اور مختلف طریقوں سے ان کی مدد کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں پر بھی یہی حربہ کامیابی کے ساتھ آزمایا گیا۔ آصف الدولہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے وزیر علی نے مسندِ نیابت پر بیٹھنے کا قصد کیا۔ لیکن انگریزوں نے ان کو ہٹا کر شجاع الدولہ کے بیٹے سعادت علی خاں کو مسند نشین کیا۔ یوں سعادت علی خاں کا اقتدار بھی انگریزوں کی بدولت قرار پایا اور خود ایک جوہر قابل ہونے کے باوجود انھیں انگریزوں کی مرضی کا پابند ہونا پڑا۔

سعادت علی خاں کے بیٹے غازی الدین حیدر نے نیابت ختم کر کے ۱۸۱۹ء میں "ابوالمظفر معز الدین، شاہ زمن، غازی الدین حیدر، بادشاہ غازی" کا خطاب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اب اودھ صوبے سے ملک ہو گیا اور مغلیہ سلطنت سے اس کا برائے نام تعلق بھی ختم ہو گیا۔ اس انقلاب کے پس پردہ بھی انگریزوں کی حکمتِ عملی تھی۔ اور یہ اقدام انھیں کے تعاون سے کامیاب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اودھ کا ہر بادشاہ شطرنج کا شاہ تھا۔ ملکِ اودھ میں انگریزوں کی حیثیت شریکِ غالب کی ہو گئی اور اب سیاسی اور ملکی معاملات کا کیا ذکر، بڑی حد تک اپنے نجی معاملات میں بھی اودھ کا بادشاہ ان کی دخل اندازیاں روکنے پر قادر نہ رہا۔

انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے قطع نظر اودھ کے نظامِ سلطنت میں خود بھی کمزوریاں تھیں۔ وقتاً فوقتاً ایسے عمال برسرِ اقتدار آ جاتے تھے جو اپنے منصب کے اہل نہیں ہوتے تھے اور محض سفارشوں اور تعلقات کے بل پر منصب حاصل کر کے نظم و نسق کو زیر و زبر کرتے رہتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے امجد علی شاہ کے عہدِ سلطنت کی تصویر یوں کھینچی ہے:

"حکومت خلقی، نیا طور ہوا۔ اس دور میں رنڈیوں کا دور ہوا ..... قوتِ میزہ شہر سے اڑ گئی۔ کسی کو اس نے مسالہ چھوڑا، بٹیا رسالدار تھا؛ کسی کی بہو نے پشم سے منہ موڑا۔"

۱؎ وزیر علی کو گرفتار کر کے کلکتے میں قید کر دیا گیا جہاں چھتیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا اور سلطان شہید ٹیپو کے بیٹے کے قریب دفن کیے گئے۔ (سوانحات ص ۱۳۶) وزیر علی شاعر بھی تھے۔ ان کا یہ شعر ان کے حسبِ حال ہے ۔

جوں سبزہ زمیں سے اُگتے تہِ پیروں کے گئے ہم
اس گلشنِ شاداب میں پھولے نہ پھلے ہم

۲؎ سبیلِ لفظ عصمت فروش عورتوں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے لیکن پہلے یہ عام عورتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

[illegible] تھا...... غیرت نے منہ پھیر لیا۔ ایک کنڈے سے سیکڑوں ہو......
[illegible] پرستی میں کا جو حصہ تھا دُنی پاتا تھا، شیخ کا ناز مردہ اٹھاتا تھا...... اب
تو بے غیرت ہوا۔ جہاں کہیں زرہ انداز کا سلسلہ کیا، نیم ذکر کر ہر حصہ پریشانی بھاری کیا - جو
پچھنڈے بہ شنے میں ہی چھوڑ دیتے تھے، جیالوں کے جگت سے منہ موڑتے تھے، اب جو
ایک دم پھچڑی[۱] کا پہناتا تیار کر کے الٹی میں پھیلا دی (جیسے کوئی میلہ والا) بادشاہ کے وہ سے اپنی
کی) آتش خانہ کے مدد ذہرے..... مگر یشکوہ ندست تشبیہ ہے تو بادشاہ و وزیر حضرت
بادشاہ کا اثر ہے۔ خالی خدمت میں پانچ نشینی، بہالا جرات میں مسند اپنے۔ اخت سرکار میں،
ان اخبار میں اور جس کی اندر جواہر کی ہے اس کی ابر سرد کی بوچھاڑ سے بوجوکی ہے۔ وگر حضور رس
نافی ہے تو کا تنہا والا کی گھوڑی زیر ران ہے، زمین کی گلیوں میں کرم فرمائی ہے......
اور جس کی رشتہ دار گستانی ہے وہ سب پر بھی رتے گیا..... جہاں کے فیصلے کرتے بیٹھے ہوتے
ہیں..... ہر دم یہ زبان پہ سخن ہے، "الملک للہ" دو سیاہ کی سبب ہے!..... ۱

آگے بڑھ کے لکھتے ہیں:

"سلطنت سلطانی کا یہ حال ہے، بدعملی سے مسافروں کو راہ چلنا محال ہے۔ دن دیئے بستیوں میں
ڈاکے پڑتے ہیں، ملک اجاڑ ہوتا ہے...... چلو دوار اپنا گھر بھرتے ہیں۔ گاؤں خالی ہو گئے
جنگل میں زمیندار رہتے ہیں۔ قبولیت میں کچھ لکھا، پٹے میں کچھ اور ہے..... مزدور غریب
بیگار پڑی ہے، اہلکار کا ایک بھاؤ ہے...... رعیت کا گلا ہے اور چھری کا گلا ہے۔ بد معاش
دلیر اور ظلم و جبر انصاف حسب ہے۔" ۲

عدالتوں کا حال یوں دکھایا ہے:

"عدالتوں میں..... سب سے زیادہ اندھیر ہے..... دارو غہ تو شوخی ہے کہ کری ساکھ
دار و ماشی ہے۔ بہتر جو ہر اشرت کا پیام ہوتا ہے۔ اس امید پر فرشی سلام ہوتا ہے...
کچہری کا یہ دستور العمل ہے، جا دیتے ہے تو جڑ اسی قدر کئی ہے۔" ۳

اس انداز میں حکومت کے مختلف شعبوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مبالغہ اور عبارت آرائی سے قطع نظر سرور کے ان بیانات سے نظم حکومت میں بدعنوانیوں کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس دور کی تاریخوں کا غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جو حال سرور نے کیا ہے ذکر

---

۱ پچھڑی: آتش بازی کی ایک قسم

ص ۲۰۳ - فسانۂ عبرت، مرزا رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، کتاب نگر لکھنؤ (احوال واجد علی شاہ)

ہے اُن میں سے بیشتر کا وہی وجود تھا اور وہ بڑی حد تک ویسے ہی تھے جیسا سرور نے اُن کو پیش کیا ہے۔ غرض اس امر میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ دیسی حکمرانوں اور اُن کے اہل کاروں میں خود غرضی کی بہت کمی تھی۔ نا اہلوں کو کلیدی عہدے مل جانا، ملکی سیاست میں انہماک اور اپنے دم سے زیادہ دُوسرے محکمہ داروں کے کاموں میں حریصانہ دلچسپی، دُوسروں کو نیچا دکھانے اور خود زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کر لینے کی کوششیں، تفرقہ اور بد سازشیں، خالص سیاسی داؤں پیچ، یہ سب وہ عوامل تھے جو اودھ کی سلطنت کو آہستہ آہستہ فنا کی طرف لیے جا رہے تھے اور آخر کار انھیں تمام بدانتظامیوں کو حجت بنا کر ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے "انتظامی نقصان" کے ادعا کے ساتھ اودھ کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

انتزاعِ سلطنت کے وقت واجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا میں نہایت مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی۔ آصف الدولہ کے بعد وُہی ایسے حکمران تھے جن سے عوام دلی محبت کرتے اور اُن کو اپنا سمجھتے تھے۔ اُن کی شرافت، نرم مزاجی اور سب سے بڑھ کر رعایا دوستی نے اُن کو عوام کا ہیرو بنا دیا تھا۔ اُن کی معزولی پر ایک سناٹا سا چھا گیا اور لکھنؤ سے اُن کی روانگی پر شہر میں کہرام مچ گیا۔ لیکن عوام کو نہ تو اپنی قوت کا احساس تھا نہ اُن میں کوئی تنظیم تھی، اس لیے بادشاہ کے ساتھ اس بے انصافی اور انتزاعِ سلطنت پر آنسو تو بہت بہائے گئے لیکن صورتِ حال کو بدلنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی گئی! غزلوں، نظموں اور لوک گیتوں میں نوحہ خوانی تو بہت کی گئی لیکن انگریزوں کے جبر سے ٹکرانے کے لیے کچھ نہ کیا گیا۔

سلطنتِ اودھ انگریزوں کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح آ گئی۔ انھیں اس پر قابض ہوتے وقت معمولی مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ البتہ اس کے دُوسرے سال ۱۸۵۷ء میں جب ملک کے دُوسرے حصّوں میں جنگ اور انقلاب کے شعلے بھڑک اُٹھے تو لکھنؤ بھی اُن کی لپیٹ میں آ کر ایک بڑے محاذِ جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ بیلی گارد (ریذیڈنسی)، عالم باغ اور سکندر باغ وغیرہ کے معرکوں میں مقامی سپاہیوں نے شجاعت اور جاں بازی کے کارنامے دکھائے اور دشمن تک سے داد وصول کی۔ لیکن انگریزوں کی منظم فوجوں اور جواب حربی یافتہ کے سامنے اور کبھی اپنے ہی غدار ساتھیوں کی بدولت جیت نہ سکے۔ اس طرح آزادی کی یہ پہلی جدوجہد پورے ہندوستان کی طرح لکھنؤ میں بھی ناکامی پر ختم ہوئی۔

(۲)

بڑی تحریک ۱۸۵۷ء کا معروف نام "غدر" ہے۔ لکھنؤ میں آج بھی بڑے بوڑھوں میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اسے "ہنگامہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دونوں نام اس تحریک کو ایک بڑی بدامنی اور زبردست ہنگامے کی حیثیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ عوام کی اکثریت کو اس کا احساس نہیں تھا کہ انگریزوں کی حکومت ہو جانے کا مطلب کیا ہے اور اس کے دور رس نتائج کیا ہوں گے۔ صرف چند افراد ایسے تھے جو اس کو جنگِ آزادی سمجھ کر جذبِ دل میں سر بکف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ باقی جن لوگوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا وہ اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کی خاطر میدان میں آئے تھے۔ مطلق العنانی کے اس دور میں عام طور پر بادشاہوں اور حکومتوں کے ردّ و بدل سے متعلق عوام کا رویہ "ما را چہ ازیں قصہ کہ گاو آمد و خر رفت" کا مصداق ہوتا تھا۔ حکومت کے انقلاب کے سلسلے میں انھیں اپنی قوت اور اہمیت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ صدیوں اور پشتوں سے ان کا اعتقاد اور تجربہ انھیں یہ بتاتا چلا آ رہا تھا کہ اُن پر کوئی نہ کوئی مسلط رہے گا، وہ

کوئی فرد واحد ہو خواہ کوئی قوم۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اس قوم کی حکومت کو تسلیم کر لیا جس کے افراد کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں۔[1]

صاحب عالم نے کہا کہ سیتا رام کا انتظام سلطنت چست ہے اور وہ دیسی حکمرانوں سے زیادہ وفادار ثابت ہوئے ہیں تو وہ مطمئن ہو گئے اور مان گئے کہ حکومت کا انگریزوں ہی کا حق ہے۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کے نتیجے میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار ختم کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ہندوستان کے ساتھ صوبہ اودھ اور بیت السلطنت لکھنؤ بھی برطانوی سامراج کا جزو ہو گیا۔

لکھنؤ کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے برابر زوال پذیر یہ شہر اپنی تہذیبی اور ثقافت کے لحاظ سے بھی پس ماندہ ہو گا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔

"سبحان اللہ! چہ شہرے ست دل پذیر و چہ مقامے ست بے مثل و نظیر!! جائے ست دل فریب و مکانے ست عجیب، منزہ از نقص و عیب۔ جنتے ست بس دلچسپ و خوش سواد، دکان ہا بس معمور و آباد، و معمورہ ایست از اقسام و انواع چیزہا!"

[نجات حسین خان عظیم آبادی کا روزنامچہ "سوانح لکھنؤ"][2]

"...... لکھنؤ کا کیا کہنا! اللہ اللہ، وہ سرکار امیر گر تھی! وہ ہندوستان کا بغداد تھا جو سر و پا وہاں پہنچا امیر ہو گیا۔"

[غالب بنام میاں داد خان سیاحؔ][3]

۱۔ "سپاہی سے صوبہ دار" (خود نوشت سرگزشت سیتا رام)، مترجم لیفٹیننٹ کرنل ڈی سی فلاٹ اور خان بہادر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی۔ سیتا رام لکھتا ہے:

"یہ بات مشہور تھی کہ صاحب لوگوں (انگریزوں) کی پیدائش ایک انڈے سے ہوئی ہے جو کسی درخت سے نکلا تھا اور یہی خیال اب تک اس ملک کے دور دراز مقامات میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی جوان میم ہمارے گاؤں میں آ پڑتی تو لوگ دوڑ کر اسے دیکھنے جاتے تھے۔ لیکن اگر کوئی بڈھی میم ہوتی تو اس کو جادوگرنی سمجھ کر جنگلوں میں بھاگ جاتے" (صفحہ ۳) سیتا رام نے ایک جگہ وحشت کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: "یہ فتنہ انگیز لوگ انڈوں سے کسی درخت پر ایک جزیرے میں پیدا ہوتے ہیں جو یہاں سے بہت دور ہے۔" (صفحہ ۳)

(سیتا رام ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا ایک سپاہی تھا جو ترقی کر کے صوبہ دار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی سرگزشت ہندی زبان میں لکھی تھی جس کا انگریزی ترجمہ لیفٹیننٹ کرنل نارگیٹ نے کیا تھا۔ زیر نظر اردو ترجمہ اسی انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے۔ [illegible])

۲۔ "یادگار سیر لکھنؤ" ۱۸۰۰ء ... پروفیسر سید مسعود حسن، ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ، ۱۹۶۰ء

۳۔ "مرزا غالب: میاں داد خان سیاح اور ان کا کلام"، ڈاکٹر سید معین الدین عقیل، مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد (دکن) ۱۹۷۰ء صفحہ

"جب سے دہلی کا عروج و اقبال مٹا ہے اور دہلی میں اس کے جاہ و جلال کا صرف ایک خاکہ رہ گیا ہے، اس وقت سے ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں جو لکھنؤ سے تمول اور شان و شکوہ کے لحاظ سے دعویٰ ہمسری کر سکے۔"

[ولیم نائیٹن[۱]]

"بعد خرابی شاہجہان آباد (دہلی) یہ زمین (لکھنؤ) بسی۔ سب طرح کی خلقت کا یہاں قیام ہوا۔ ذرہ ذرہ اس شہر کا شہرۂ آفاق ہوا۔" [رجب علی بیگ سرور[۲]]

"...... یہ شہر لکھنؤ نواب آصف الدولہ بہادر کا آباد کیا ہوا ہے جس کی بے مثالی کا ہر شہر و دیار میں چرچا ہے۔ کم و بیش سو برس کا زمانہ گزرا ہے کہ اتنی مدت میں آباد بھی ہوا اجڑ بھی گیا..... جب تک عہد شاہی رہا وہ زمانہ اس کے اوج عروج کا تھا۔ دور دور سے لوگ دیکھنے کو آتے تھے۔ دل پر یہاں کی تصویر جنت نظیر کھنچے جاتے تھے۔ لکھنؤ ہر چیز کا مرکز تھا۔ ہر علم و فن کا یہاں کامل استاد تھا...." [فدا علی عیش[۳]]

آصف الدولہ نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنی سلطنت کا مستقر بنایا اور رفتہ رفتہ لکھنؤ شمالی ہند کا مرکز نظر بن گیا۔ آصف الدولہ کی دلآویز شخصیت، بے اندازہ فیاضی، علم دوستی اور اہل ہنر کی قدردانی نے بہت جلد لکھنؤ کو مرجع خلائق بنا دیا۔ جس وقت دہلی کی سلطنت کا چراغ گل ہو رہا تھا لکھنؤ کے چراغ کی لو اونچی ہو رہی تھی۔ تاریخ اور ادبیات کے واقف خوب جانتے ہیں کہ کس زمانے میں دہلی کے کتنے خاندانوں نے لکھنؤ کو بسایا۔ گردش زمانہ نے دہلی کے چراغ کا جھلملاتا دھواں لکھنؤ کے کنول میں انڈیل دیا۔ اور دہلی ہی نہیں ہندوستان بھر سے قدردانی اور معاش کے طلبگاروں نے کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آنا شروع کر دیا۔ یوں لکھنؤ کی تہذیب کی تشکیل ہوئی۔ اس تشکیل کی رفتار نہایت تیز تھی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب تقریباً ایک وقت معرض وجود میں آگئی۔ اس کے پس پشت صدیوں اور قرنوں کے تجربات و حوادث کارفرما نہیں تھے۔ چند سال کے اندر اس تہذیب نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کر لیں اور بہت تیزی کے ساتھ ثقافت اور معاشرت کے لحاظ سے ایک واضح اور منفرد شکل اختیار کر کے اپنے عروج کی انتہائی منزل تک پہنچ گئی۔ یہ ارتقائی منزلیں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے دور نیابت میں طے ہوئیں۔ غازی الدین حیدر

۱۔ شباب لکھنؤ [ترجمہ پرائیویٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ، مصنفہ ولیم نائیٹن] مترجم محمد علی، ناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ء، ص ۵

۲۔ گل کدۂ سرور، افضل المطابع محمدی لاہور، (سن طباعت درج نہیں)، دیباچہ

۳۔ فسانۂ دل فریب، منشی فدا علی عرف للو صاحب عیش لکھنوی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۰ء، ص ۲

(۱۸۱۲ء تا ۱۸۲۲ء) اور شاہ نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) کے عہد میں شاہانِ اودھ کی سلطنت میں لکھنؤ کی تہذیب اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس عہد کا ایک شاعر جو اسی ماحول میں پلا بڑھا، جان صاحب یا میر یار علی جان تھے۔ فسانۂ عجائب کے دیباچے میں پیش کیا ہے جس کی تصدیق کے لیے دوسروں کا بیان بھی ہمیں ملتا ہے :

سید فضل علی دہلوی جو صاحبِ قلم تھے، نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ پہنچے تھے اپنی کتاب "فسانۂ عجیب" میں لکھتے ہیں کہ

...... جب میں اس شہر لکھنؤ میں پہنچا تو سیر کا شوق تھا۔ چوک کو جو دیکھا تو راستہ دیوانہ وار بنا ہوا تھا، خوب تماشے منتظر تھے۔ ہر جا پر اسباب نشاط و طرب رکھے ہیں۔ بازاروں کا عجب سماں ہے :

احوالِ بازار

کوئی کہتا ہے "کیا نگیں بنے ہیں" / کوئی کہتا ہے "موتیوں کے چنے ہیں"
"سے [illegible] کی [illegible] ہیں" / "کٹورے کی کلائی [illegible] ہیں"
بیلے پھرتے ہیں شُشّے روشیوں کو / کہ نے کہاری پہ [illegible]
سماں کتابے کوئی ہاتھ اٹھا کے / "[illegible] ہیں موتیا کے"
یہ [illegible] کا عالم / کہ گویا چاند اور تارے ہیں باہم
وہ شربت کو جو اس کو بنا کے / شب مہ کا سماں پیالے میں پلے
[illegible] دریا سے / کہ گویا چاند اور تارے ہیں بہتے

۱؎ یہ اسباب ابھی موجود ہے، پہلے اس کا سلسلہ دریائے گومتی کے کنارے تک پھیلا تھا لیکن اب اس کا طول اکبری کی گلی سے دروازے تک رہ گیا ہے۔ اور یہاں اس کی فضا میں ایک بہت ہی خوبصورت کیفیت ہے جو اس کو دوسرے بازاروں سے جدا بنا دیتی ہے۔

۲؎ شُشّے : عام طور پر شُشّہ کا لفظ آرائش اور سنگار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک پیشہ ور فرقے کا نام تھا جس کا اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شُشّوں کا اندیشہ روشنیاں بیچنا تھا :

بیلے پھرتے ہیں شُشّے روشیوں کو / کہ نے کہاری پہ [illegible]

شُشّے بیت کا قافیہ اٹھانے اور اس کا شامیانہ سنبھالنے کا کام کیا کرتے تھے اور خوشی کی تقریبوں میں جو بکا ہوتے کو خدمت پیش کرتے وغیرہ کی تقریبوں میں بازار اٹھانے والے شُشّوں کا ایک خاص گروہ ہوتا تھا گویا ایک متعلق پیشہ تھا۔ انسانی کو خوشیوں کے ہجوم میں سے فائدہ ہوا چاہیے۔ لکھنؤ میں اب بھی چند شُشّے باقی ہیں لیکن پیشہ ور کی حیثیت سے ان کا وجود تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ (بقیہ فٹ نوٹ)
(بقیہ ملاحظہ کیجیے)

نہ دیکھا ہم نے ایسا جلسہ اس جا کہ جو دیکھے سے جس کے شیریں تن ہو

حلوائی وہ کہ ہے دیکھو تو گویا

اسی میں مال حلوائی نے کھویا

غرض سارے بازار کا حال لکھتا تو جب [کذا ..... لکھتا تو جب ؟] طول کتاب کا اور،

اس مقام کا ثانی نقش

اگر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

ہر ایک کوچہ فرحت افزا اور ہر ایک راہ دل کشا۔ شہر ہے یا یہ طلسمات ہے!!"

نصیر الدین حیدر ہی کے عہد میں ایک انگریز سیاح ولیم نائیٹن بھی لکھنؤ آیا تھا۔ اس نے لکھنؤ میں اپنے قیام کے حالات اپنی کتاب 'ایک مشرقی بادشاہ کی نجی زندگی' میں درج کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"...... صرف ایک عظیم الشان شہر جسے میں نے دیکھا ہے ... میرے نزدیک لکھنؤ کے نشیبی حصے سے اپنی تنگی و تاریکیوں، بے ڈھنگے اونٹوں اور گنجان بازاروں سے مشابہ ہے اور وہ شہر قاہرہ دار السلطنت مصر ہے۔

"قسطنطنیہ، ماسکو، قاہرہ، جس سے چاہیے آپ لکھنؤ کو مشابہ قرار دیجیے۔ مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار چیزیں ان مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔ اولاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں نہ دکھائی دیں گے۔ ماسکو کے باشندے صرف چھری باندھتے ہیں اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے بالعموم ہتھیار بنے نظر آئیں گے۔ ان کے پاس ڈھال، تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہو گی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں، وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں اور کوچہ گرد حضرات جب سیر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر تیغے کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہوں گے۔ بھینسے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال جس میں پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں، اکثر انہیں بائیں شانے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس تنے ہوئے چلتے

لے ہندوستان "سرفروش تحریک" میں شہروں کے رعب و داب انداز نظر کی تقریباً جدت دلیپ یہ تصویر کشی کی ہے)

ے "فسانۂ عجائب": مطبوعہ کارخانہ نثار علی، لکھنؤ۔ حسب الحکم سلطان المطابع ۱۲۹۰ھ صفحہ ۲۰۰

نظر آتے ہیں عبدالحلیم شرر کے چند فقروں سے خود پسندی اور جو قومی برتری کا [illegible] ظاہر ہوتی ہیں

یہ درست ہے کہ بعض اہل لکھنؤ بالعموم بڑا پایہ ذہن رکھتے ہیں تعجب خیز نہیں ہو سکتا اس لیے کہ کمپنی سے اودھ میں جتنے بھی ہیں سب کچھ بڑی شائستہ بظاہر ہوتے ہیں اور امانت و بہادری کی زوہ تمام تر یہیں کے باشندوں سے ملی ہے۔

باشندگان لکھنؤ میں [illegible] کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تیرہ چودہ برس کے لڑکوں کے معمولی کھیل ہیں اور جس طرح پر انگریز دانیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دے دیتی ہیں اسی طرح یہاں بہت چھوٹے بچے اور لڑکوں کی گودیں کھیلنے کو بٹیر پکڑا دی جاتی ہیں۔ [illegible]

[illegible] کا مذاق عام ہونے کی وجہ سے [illegible] بڑی بڑی [illegible] پیدا کرکے اس کو بہت [illegible] کی تھی [illegible] کے [illegible] ولایت [illegible] دیئے گئے۔ اس کے علاوہ کشتی، بانک، بنوٹ وغیرہ کو ترقی دی گئی کہ ان کو ایک فن کی حیثیت حاصل ہوئی۔ لکھنؤ کا قریب قریب ہر ایک باشندہ [illegible] میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور رکھتا تھا لیکن جس نے اس میں خصوصی مہارت بہم پہنچا کر اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا وہ بانکوں کا طبقہ تھا۔ بانکے اپنے [illegible] اور [illegible] کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھے۔ مظلوم کی حمایت میں [illegible] پڑنا، حریفوں کی [illegible] تعداد کا لحاظ کیے بغیر بے دھڑک سر [illegible] دینا، کسی سے مدد طلب کرنے اس کے لیے [illegible] سے دریغ نہ کرنا، ایک وضع مقرر کرکے مرتے دم تک اور ہر حالت میں اسی پر قائم رہنا، جرأت اور خودداری پر قربان ہونے کے لیے [illegible]:
[illegible] سب ایسی خصوصیتیں تھیں جنہوں نے ان کو ایک [illegible] افسانوی حیثیت دے دی۔ واقعات گواہ ہیں کہ ان کے [illegible] ارادوں کو جنبش نہیں دے سکتے تھے۔ [illegible] کی طرح وہ مقصد کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ ان کی بہادری و شجاعت [illegible] میں داخل ہو گئی تھی۔ ان کی وجہ سے شہر میں [illegible] اور معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں اور [illegible] کے دنوں میں [illegible] کی جھنکار، [illegible] کے دھماکوں اور جنگی نعروں سے گونجا کرتا تھا۔ ولیم ناشیں لکھتا ہے:

"اس شہر کے گلی کوچے میں یہ نظر آتا ہے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا [illegible] دنیا میں [illegible] کسی ایسے عجیب ملک میں آ گیا ہے جہاں کے خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جو [illegible] سے جنگجو دکھائی دیتے ہیں اور جن کا تذکرہ ہم نے لڑکپن میں قصوں اور کہانیوں کی کتابوں میں پڑھا تھا۔" [illegible]

ایک اور سفرنامہ ولیم [illegible] لکھنؤ کو دیکھ کر اپنے تاثرات یوں بیان کرتا ہے:

"شام [illegible] کے ایک خاموش منظر سے جو سمندر میں سے ابھرتے ہوئے [illegible]

[illegible] ۔ شہاب لکھنؤ، [illegible]

> قلعے، محلات، گنبد، مندر، برج، کھمبے، کہ قطاروں جیسے متناسب ستونوں والے طویل معماروں اور سایہ دار چھتوں کا ایک منظر! میلوں میل نگاہ دوڑاتے چلے جاؤ، یہ منظر پھیلتا جا رہا ہے اور اس کے درمیان اس پرستانی شہر کے مینار چمکتے نظر آتے ہیں۔ سنہری گنبد جیسے دھوپ میں جگمگاتے ہیں اور بلند بالا ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جھلملاتے ہیں۔ کہیں بھی بدنمائی اور بے زیبی دیکھنے میں نہیں آتی۔ ہمارے سامنے ایک شہر ہے جو پیرس سے زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ بارونق ہے۔ کیا یہ شہر اودھ کا ہی ہے؟ کیا اسے ایک بد اعمال، ازکار رفتہ اور انحطاط زدہ [شاہی] خاندان نے تعمیر کیا ہے؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھ کو تو اتنا حسن و آفرین نہ روم میں محسوس ہوا، نہ ایتھنز میں، نہ قسطنطنیہ میں؛ نہ اپنے دیکھے ہوئے کسی بھی دوسرے شہر میں اور اس [شہر] کو میں جس قدر زیادہ غور سے دیکھتا ہوں، اسی قدر اس کی خوبیاں مجھ پر کھلتی جاتی ہیں۔"[۱] (ترجمہ)

ایک طرف رسل لکھنؤ کی عمارتوں کی نفاست اور نزاکت دیکھ کر اس کو پرستانی شہر کہہ رہا ہے دوسری طرف ولیم نائیٹن یہاں کی سیاہ بیانہ فساد دیکھ کر دنگ ہے۔ دراصل جگمگاہٹ کے ساتھ ہی لکھنؤ کی فضاؤں نے ایک خاص لطافت کو بھی پروان چڑھایا جو بظاہر متضاد سی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کا سبب صوبۂ اودھ کی زرخیزی تھی۔ دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے پوری عملداری کی دولت کھنچ کھنچ کر لکھنؤ میں آتی تھی اور اس زمانے میں لکھنؤ کی فی کس آمدنی یا بہ اصطلاح میں قوت خرید کا اوسط آج سے کہیں زیادہ تھا۔ شہر سے باہر جو لوگ یہ دولت پیدا کرتے تھے ان پر جو گزرتی ہو لیکن لکھنؤ میں یقیناً مینہ برستا رہتا تھا۔ اور یہاں بھی دولت کی تقسیم مساوی نہ تھی۔ بہت سے گھر ایسے بھی تھے جہاں دو وقت چولھا اور شام کو چراغ مشکل سے جل پاتا تھا لیکن امرا کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ یہ گروہ بالعموم اسراف کی طرف مائل رہتے تھے اور بے محابا دولت خرچ کرتے تھے، اپنی صنعت بیچتے اور اس پر نازاں رہتے تھے۔ یہ کمال کے قدردان اور جدت کے شوقین تھے اور خاص طور پر انہیں کی بدولت لکھنؤ کی ہر ہر ادا میں ایک نکھار پیدا ہو گیا۔

علم، فن اور زندگی کے مختلف شعبوں میں لکھنؤ نے جو امتیازات حاصل کیے ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ لکھنؤ کی فضا میں ایسی تاثیر پیدا ہو گئی تھی کہ ہر چیز میں اس شہر کا اپنا ایک سانچہ بن گیا تھا جو بیرونی اثرات کو اپنی مخصوص شکل میں ڈھال لیتا تھا۔ باہر کے رہنے والے جب لکھنؤ کر آ کر بستے تھے تو اسی کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ بہت سے اپنی وضع کے پابند رہے ہوں گے جو پرانے سانچوں کے جنس بجنس بچا سکے، باوجود اپنی جگہ شامل رہے۔ علاوہ بریں وہ آصف الدولہ کا عہد تھا اور لکھنؤ کی تہذیب اس وقت تک اپنے عروج کو نہیں پہنچی تھی۔ ورنہ بسنے والوں کے لیے لکھنؤ کے اثر سے بچنا محال تھا اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہو کے رہتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

۱؎ "LUCKNOW PAST AND PRESENT" از نگارشات مطبوعہ ... لکھنؤ ۱۹۰۱ء ص

• لکھنؤ میں جو تلاش معاش میں آئے، بہت سے اہل کمال آ کر جمع ہو گئے
کمال، ہر علم، ہنر، و اہل تلاش و معاش وہاں سے آ ابتک وہیں کے ہو رہے
وضع دار ہو گئے۔ ۱؎

فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ لکھنؤ میں پھلنے پھولنے لگی۔ شاعری میں ایک طرف غزل نے لکھنؤ میں آ کر خود کو رسم و رنگ سے اتنا سجایا کہ اس آرائش کے پیچھے اس کی اصل صورت ہی چھپ گئی، دوسری طرف مرثیہ پانچویں ہی جلدوں سے بیس ہو کر اس شان سے نمایاں ہوا کہ مذہب و ادب سے ٹکرا گیا اور پھر بھی اپنی صنف میں منفرد رہا۔ موسیقی میں ایک طرف ٹھمری اور غزل کا نیا اسلوب قائم ہوا، دوسری طرف میر علی نے سوز خوانی کے ذریعے ان شاعروں کو ایک عجیب سا اوج پر لا دیا۔ یہ سوز خاص کلاسیکی راگوں کی بنیاد پر استوار ہونے کے باوجود نثر و سادہ سے اصل میں چیز معلوم ہوتے تھے۔ ۲؎ موسیقی کے ساتھ رقص کو بھی فراموش نہیں کیا گیا۔ وہ کوششوں کے علاوہ تنہا اہل شاہ نے رقص کے پیسیوں اور زیادہ کر دیے۔ مصوری میں لکھنؤ کا قلم اپنے جزئیات اور سبز رنگ کی کثرت استعمال کی وجہ سے آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اگرچہ شاہی نا پسند تھا اور پہاڑی قلم اس سے بہت بہتر تھے۔ فن تعمیر میں لکھنؤ وہ شان و شکوہ پیدا نہیں کر سکا جو مغلوں کی عمارتوں کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے لیے پتھر کا استعمال ناگزیر ہے۔ لکھنؤ کی عمارتوں میں پتھر کم لگایا جاتا تھا لیکن اس کمی کو یہاں معماروں کی مہارت اور حسن تناسب سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ خصوصاً آصف الدولہ کا امام باڑہ فن تعمیر کا ایک اعجاز کی شان رکھتا ہے اور اس کو آج بھی غیر ملکی سیاح اور سند یافتہ معمار حیرت سے ، حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ امام باڑہ خاص قسم کی صنعت، فن اور کاریگری کا نادر نمونہ ہے جس کے بنانے میں عام مزدوروں کے ساتھ خاندانی شرفا کا طبقہ بھی [illegible] شامل ہوا جس کے لیے قحط کے زمانے میں راتوں کو جب پہلے اور اپنی شکلیں چھپائے رکھنے کی خاطر اس کی تعمیر راتوں کی تاریکی میں بھی جاری رہتی تھی۔

اس عظیم الشان تعمیر کا نقشہ دہلی کے معمار کفایت اللہ نے بنایا تھا لیکن اس کا انداز دہلی کی عمارتوں سے مختلف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کو لکھنؤ بنانے میں دوسرے شہروں کے اہل کمال نے بھی بڑا حصہ لیا تھا لیکن لکھنؤ پہنچ کر ان کے فن میں نمایاں تبدیلی آ جاتی تھی۔ اس تبدیلی کا سبب لکھنؤ کا وہ عام مذاق تھا جو ان کے فن پر اثر انداز ہوتا تھا۔

انگریزوں نے لکھنؤ کو "باغوں کا شہر" کہا اور یہ بہت موزوں نام تھا۔ یہاں باغات بے شمار تھے۔ ان باغوں کے پھل اپنے رنگ روپ اور مزے کے لحاظ سے دوسری جگہ کے عام پھلوں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ باغبانی اور پیوند بندی کے فن میں نئے نئے تجربے کیے گئے اور یہاں کے باغوں میں جاپانی بونسائی کے نمونے مل جاتے تھے۔ ۴؎

۱؎ دیباچہ فسانۂ عجائب ۔ ۲؎ سوز خوانی پر حاشیہ نمبر دیکھیے ۔ ۳؎ سوانحات سلاطین اودھ: ص [illegible]

۴؎ بونسائی (Bonsai) ایک جاپانی فن باغبانی جس کے ذریعے تناور قسم کے درختوں کی پرورش اس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ چند بالشت سے زیادہ اونچے نہیں ہو پاتے۔ اس تناسب سے ان درختوں کی پتیاں بھی چھوٹی کر دی جاتی ہیں۔ مگر پھلنے کے ساتھ قد و قامت چھوٹا اور [illegible] درختوں کی طرح ہوا ہوتے ہیں۔ درختوں کے تنوں اور چھال میں کہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ [illegible]
(اگلے صفحے پر)

لکھنؤ نے بھی طوائفوں کو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا۔ شعر، نغمہ اور پھبتی وغیرہ میں لوگ کوشش کرکے مہارت حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ادب، مجلس، نشست و برخاست کے انداز اور اعلیٰ طرزِ گفتگو سیکھنے کے لیے باضابطہ تربیت ہوتی تھی اور اس کے لیے طوائفوں کے بالاخانے بہترین تربیت گاہ تھے۔ سرور ان طوائفوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"...... خوش مزاج، مردم شناس، روزمرہ شستہ، دمِ تقریر مزہ کا یہ۔ اس کوچے کے فیض سے صاحب تربیت بہم پہنچاتا ہے۔ تاش خوش، اثرِ صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔" (۱)

یہ طوائفیں محض عصمت فروشی یا خود فروشی کرتی نہیں تھیں بلکہ معاشرے کے اعلیٰ افراد کی طرح تعلیم و تربیت حاصل کرتی تھیں اور اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ان میں متعدد صاحبِ دیوان شاعرات بھی تھیں۔

طوائفوں کی طرح بھانڈوں کا طبقہ بھی لکھنؤ میں ایک خاص شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ آداب و اطوار میں نہایت مہذب اور بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ بھانڈ اپنی مضحک نقلوں سے محض لوگوں کو صرف ہنساتے ہی نہیں تھے بلکہ اکثر ان کے پردے میں معاشرے کی خرابیوں اور اپنے طبقے کے افراد، بلکہ بادشاہوں تک کی ذاتی کمزوریوں ——— اور کبھی کبھی سیاسی غلطیوں کی بھی بے دھڑک نشان دہی کر دیتے تھے۔ یہ بھانڈ معاشرے کے سب سے بے باک نقاد تھے۔

معاشرے کی وہ خرابیاں جو زیادہ دولت اور تمدنی ترقی کا لازمہ ہوتی ہیں لکھنؤ میں بھی موجود تھیں۔ فضول خرچیاں، مختلف قسم کی بازیاں، حسرت، وصال، شوق، جھوٹی نمائش، یہ سب چیزیں ایک طرف معاشرے کو گھن کی طرح لگی ہوئی تھیں دوسری طرف تکلف و تصنعات سے

(بقیہ ص ...) قسموں سے متعلق ہوتی ہیں، چنانچہ جاپان میں بعض درخت چار چار سو برس سے زیادہ کی عمر کے موجود ہیں جن کا قد دو ڈھائی فٹ سے زیادہ نہیں بڑھنے پایا ہے حالانکہ عکسی تصویروں میں وہ کہنہ پیڑ درخت معلوم ہوتے ہیں۔

نواب آصف الدولہ کے لگائے ہوئے دیسی و ولایتی باغ میں ایسے ہی بونے درخت تھے وہ ایک ایک دو دو ہاتھ سے زیادہ اونچے نہ تھے اور اس کے باوجود یہ سب درخت باقاعدہ پھلتے تھے۔ واجد علی شاہ نے بھی ولیعہدی کے زمانے میں نواب علی نقی خاں کی معرفت جو قیصر باغ لگوایا تھا اس میں ایسے ہی بونے پودوں کے کئی چمن تھے۔ واجد علی شاہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک چمن میں بالکل ناشپاتی کے درخت لگائے تھے۔ ایک میں بالکل سیب کے درخت لگائے تھے.... ایک چمن مختلف شفتالو کے درختوں کا تھا..... ایک چمن امرود کا اور ایک نارنگی و لیموں کا تھا، ایک نارنگی ولایتی ... ایک شہد کا تھا..... تعجب یہ ہے کہ جو درخت باوجود ثمر [illegible] قد آدمی سے نہ تھا کم ایک گز سے زیادہ بلند نہ تھے۔" (اختر نگر شاہی، ... پریس لکھنؤ ۱۹۱۰ء، ص ۸)

(۱) دیباچہ "فسانۂ عجائب"۔

جلد گئے تھے اور جنھوں نے حقیقت پر کسی کا بات نہ کیا تھا۔ غریب کاری نے اخلاق محبت نے مختلف اخلاقی بندشوں نے اپنے
کام ہتھیار کر لیا تھا اور معیشت نے رسم و رواج کے پہلے ہی ترقی عمل کو مستحق کر دیا تھا۔ اسی لیے لکھنؤ کی تہذیب میں جذبات
تو بہت تھی لیکن عظمت اور سنجیدگی بہت کم تھی۔

لکھنؤ کی تہذیب پر کوئی گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں کی جا سکتی جب تک اس ضمن میں اودھ کے حکمرانوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ بعض
کے کسی دور میں ہم بادشاہ اور رعایا میں اتنا ذہنی قرب اور دونوں کے مزاج میں اس سے زیادہ ہم آہنگی نہیں دیکھتے جتنی اودھ کے
دور میں دیکھتے ہیں۔ ان حکمرانوں میں آصف الدولہ اور واجد علی شاہ کو خاص طور پر اپنی رعایا میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آصف الدولہ
شاہانہ پر لکھنؤ کی گلی کوچوں سے۔ دنے کی صدائیں بلند ہوتیں تو واجد علی شاہ کی لکھنؤ سے رخصت پر شہر بھر میں کہرام مچ گیا اور یہ واقعہ اودھ
کی لوک گیتوں کا موضوع بن گیا۔

اودھ کے سب ہی حکمران شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آصف الدولہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ سعادت علی خاں خود
دیتے لیکن بہت سے شاعر ان کے دامن سے وابستہ تھے۔ غازی الدین حیدر کو لغت سے خاص دلچسپی تھی، انھوں نے ایک بہت
عظیم اور جامع لغت "تاج اللغات" کے نام سے تالیف کرایا۔ نصیر الدین حیدر کو بھی لغت سے دلچسپی تھی، اس کے علاوہ وہ شاعر
بھی تھے اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کی ادبی سرگرمیوں کا زیادہ ذکر نہیں ملتا لیکن ان دونوں کی تلافی واجد علی شاہ
نے کر دی۔ بادشاہوں کا کیا ذکر، کسی بھی ادیب کی تاریخ میں ایسے کثیر التصانیف لوگ کم ہی نکلیں گے اور اتنے متنوع موضوعات پر
ہی کسی شخص نے قلم اٹھایا ہو۔ شاعری میں ان کے مجموعے اپنے دامن میں غزل، قصیدے، مثنوی، مرثیے، نوحے، سلام، رباعی، قطعہ
وغیرہ سے لے کر ٹھمری، گیت اور دوہے تک رکھتے ہیں۔ اردو ڈراما میں اولیت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ان کی تصنیفیں اور بیاض
خود نوشت، تاریخ، مذہبیات، علمیات، جنسیات، ملفوظات، صنعت و حرفت، فلسفہ و اخلاق وغیرہ نہ معلوم کتنے موضوعوں کو محیط ہیں۔
شاعروں، ادیبوں اور عالموں کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے خوان سے وظائف اور تنخواہیں پاتی تھی۔

اودھ کے حکمرانوں کے حسن ذوق اور قدر دانی نے ریاست میں ہر قسم کے ہنر مندوں کا ایک بڑا اچھا لشکر تیار کر دیا تھا۔
عام طور پر یہ حکمران اہل فن کی قدر دانی میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اکثر ان کی گستاخیاں بھی سہہ لیتے تھے۔ ایسے متعدد
واقعات ہم کو تاریخ اور روایت میں ملتے ہیں جہاں اودھ کے حکمران کم حیثیت اور غریب کاریگروں تک کی ناز برداریاں کرتے دکھائی دیتے
ہیں۔ تقریباً یہی حال دوسرے امرا اور اکابر کا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں کوئی بھی فن یا ہنر تھا، قدر دانی اور قدر دانوں
کی تلاش میں کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آتے اور لکھنؤ ان سے چھلکنے لگا۔ چونکہ انھیں اپنے فن کی پوری قیمت ملتی تھی اس لیے انھوں نے اپنی بہترین
صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایسے تخلیقات پیش کیے کہ ان کا ذکر ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے اور اگر اب تک ان کے آثار موجود نہ
باقی رہ گئے ہوتے تو ان کی حقیقت پر یقین کرنا مشکل ہوتا۔

اودھ کے حکمرانوں کے مختلف النوع شاغل کو عوام نے بھی اپنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق اختیار کر لیا تھا۔ اگر وہ دریا کے کنارے

بادشاہ ہاتھیوں کی جنگ کرواتے تھے تو سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر مرغ، بٹیر اور بلبلیں لڑاتے تھے، یہ بھی نہ ہو تو مرغیوں کے انڈے ہی دیکھ کر خوش ہو لیتے تھے۔ اگر واجد علی شاہ لاکھوں سے بھی زیادہ صرف کرکے اپنے رہس کے جلسے ترتیب دیتے اور ان کو اسٹیج کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ عمارتیں بنواتے تھے تو یہ بھی کھلی ہوئی جگہوں پر تخت بچھا کر اور پردے باندھ کر اندر سبھا کے کھیل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ غرض بادشاہوں کے تقریباً تمام مشاغل سے چھوٹے پیمانے پر عوام بھی دل بہلایا کرتے تھے۔

سلطنتِ اودھ کے بانی نواب سعادت خاں برہان الملک کا وطن ایران تھا۔ اسی وجہ سے اودھ کی تہذیب پر ایرانیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ یوں تو مغل حکمرانوں کے عہد میں پورے ہندوستان کی تہذیب ایران سے متاثر ہوئی لیکن اودھ پر ایرانیت کا نقش بہت نمایاں تھا۔ لباس کی وضع قطع، بالوں کی تراش خراش، مکانوں کی اندرونی آرائش ایران کے انداز پر ہوتی تھی۔ فارسی سرکاری زبان تھی اور تحریر و تقریر دونوں پر اس کی حکومت تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اردو اس پر حاوی ہوتی گئی۔ دوسری طرف اہلِ لکھنؤ کی جدت پسندی ہر شعبے میں نئی نئی تبدیلیاں پیدا کرنے لگی، اس طرح ایرانیت کا وہ رنگ جو ابتدا میں بہت گہرا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہلکا پڑتا گیا اور دوسرے بہت سے رنگوں کی آمیزش کے باعث اتنا نمایاں نہ رہا جتنا شروع میں تھا۔ لکھنؤ کی تہذیب پر ایرانیت کے اثر کے بارے میں پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "جب اٹھارویں صدی میں دہلی کی مغل حکومت 'شمشیر و سناں' کی منزل سے نکل کر 'طاؤس و رباب' کی منزل میں داخل ہوئی تو اودھ میں بھی ایک نیم خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے قائم کرنے والے محمد امین برہان الملک سعادت خاں تھے جن کی رگوں میں ایرانی خون گردش کر رہا تھا۔۔۔۔۔ یہیں اس پہلی خصوصیت کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے جسے لکھنؤ کی تہذیب میں ایرانیت یا عجمیت کے عنصر سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ گو دہلی کی درباری اور جاگیردارانہ فضا اس اثر سے محفوظ نہیں تھی لیکن یہاں اس کا اثر زیادہ گہرا اور نمایاں تھا کیونکہ اس دفعہ اس میں مذہبیت بھی شامل تھی۔ اس کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا اظہار لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں فرقہ پرستی، تنگ نظری یا عجمیت کی شکل میں نہیں، ایک عقیدے سے جذباتی وابستگی کی شکل میں ہوا اور چونکہ حکومت اور عوام دونوں نے اس سے گہرے شغف کا اظہار کیا اس لیے اس کا اثر یہاں کی علمی اور ادبی زندگی، موسیقی، تعمیر اور دوسرے چھوٹے فنونِ لطیفہ پر پڑا۔" [1]

اودھ کے شاہی خاندان کا مذہب شیعہ تھا اور ان حکمرانوں کو اپنے مذہب، ماتم، عزاداری وغیرہ میں خاص انہماک تھا۔ الناس علیٰ دینِ ملوکہم کے مصداق اودھ کی تہذیب اور ثقافت پر بھی شیعیت کا رنگ چڑھا۔ ایامِ عزا میں عام طور پر لوگ لہو و لعب سے گریز کرتے تھے۔ تعزیہ داری، مجالسِ عزا اور جلوس کے مراسم جو عموماً شیعوں سے مخصوص تھے ہندو اور اہلِ سنت حضرات بھی دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔

۱۔ "افکار و مسائل" نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۴۳ (مضمون "لکھنؤ - ادبی مرکز")

مراسم نے ہمیشہ ثقافتی حیثیت اختیار کر لی تھی اور فرقہ وارانہ مذہبی اور دینی معاملات میں داخل ہو گئے تھے۔ ہندو مذہب کے بعض مراسم بھی مسلمانوں میں بلا کر شریک ہو گئے۔ مثلاً جس طرح ہندو دیوی کی منّت مانتے ہیں اسی طرح مسلمان عورتیں منت کے طور پر جناب سیدہ کی کہانی اور دل چسپ بات یہ ہے کہ ست نرائن کی کتھا اور جناب سیدہ کی کہانی کے بعض اجزا بالکل یکساں ہیں۔ سوز خوانی میں بھی مرثیوں کے ٹکڑے ہندو راگ راگنیوں میں پڑھے جاتے تھے۔

مذہب کا ذکر کرتے ہوئے نوابانِ اودھ کی ایک نہایت اہم خصوصیت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگرچہ ذاتی طور پر پورا خاندان شیعہ مذہب کا پابند تھا۔ اور ان میں سے بعض تو کٹر شیعہ اور اپنے عقائد میں حد سے زیادہ متعصب تھے لیکن یہ پابندی ان کی اپنی ذات تک محدود تھی۔ ملکی سطح پر ان کی نظر میں شیعہ اور غیر شیعہ، مسلم اور غیر مسلم کی یکساں حیثیت تھی۔ حکومت کے اہم مناصب ہندوؤں کے ہاتھ میں رہتے تھے اور دیوان کا عہدہ تو گویا انھیں کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ یہ عہدہ دار پوری خلوصِ نیت سے جاں نثاری کا حق ادا کرتے تھے اور اودھ کے حکمران نہ صرف ان کے پشت پناہ تھے بلکہ ان سے دلی عقیدت بھی رکھتے تھے۔

ہندوؤں کے مذہبی تہواروں سے بھی حکمرانوں کو خاص دل چسپی تھی۔ آصف الدولہ خود ہولی کھیلتے تھے۔ اس کا اندازہ میر کی ایک مختصر مثنوی سے ہوتا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ہولی کھیلے آصف الدولہ وزیر

محمد بخش مہجور کی "انشائے نورتن" کے ابتدائیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے یہاں بھی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ غازی الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ مہجور نے لکھا ہے۔ اس میں "تعریف ہولی" کے عنوان سے یہ شعر ملتے ہیں:

۱؎ سوز خوانی کے لیے موسیقی کی قدیم اور مشکل صنف دھرپد کا انتخاب کیا گیا۔ اگرچہ اس وقت تک خیال کی گائکی دھرپد پر غالب آ چکی تھی لیکن چند خصوصیات کی بنا پر سوز خوانی کے لیے دھرپد ہی کا اسلوب زیادہ موزوں تھا۔ شرعِ اسلامی خاص کر اس شرط پر قبول کرتی تھی کہ اس میں گلے بازی اور تکلف سے کام نہ لیا جائے۔ دھرپد کی بھی یہی شرط تھی کہ گلے بازی سے گریز کیا جائے۔ سوز خوانی میں ظاہر ہے کہ الفاظ پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ خیال کے برخلاف دھرپد کی بھی امتیازی خصوصیت یہی تھی کہ اس میں الفاظ ادا کرنے پر بھی اتنا ہی زور دیا جاتا تھا جتنا راگ کی پیش کش پر۔ البتہ دھرپد میں بول بانٹ کا سلسلہ ممنوع تھا لیکن سوز خوانی میں اس پابندی کو ہٹا دیا گیا اور خاص طور سے جب سوز خوانی میں یہ حیرت انگیز وصف پیدا ہوا کہ سوز راگ اور بول سے الگ کوئی چیز معلوم ہونے لگے۔ میر علی سوز خوان دھرپد کے ماہر استاد تھے۔ ان کے شاگردوں نے سوز خوانی کے بانے نکالے جیسے کال درشنیکے، بھیرویں، ٹوڑی، جوگیا، درباری، حجاز اور بعض دوسرے راگ راگنیوں کی بنیاد پر سوز کی بہترین دھنیں بنائی گئیں۔ ان بانوں کا لطف پیش خدمت کرنے کے لیے ہم سب کو نہایت گرم، ملک خوشبو کا تاثر پیدا کرتے ہیں اور یہ سوز میں ڈھل کر غم کی کیفیت ظاہر کرنے لگے۔ میر علی کی رکھی ہوئی سوز کی بعض دھنیں اب بھی ہاتھ میں ہیں جنھیں صحیح طور پر پیش کرنے والے سوز خوان خال خال ہیں۔

"تیغوں کے موسم میں تیری بزم کا دیکھیے رنگ ——— غش کے غش باندھے ہوئے اس سینے پہ ہوا
پھر تیرے جلتے شوق میں جن شکل سلسلے ہوئے ——— ہاتھ میں شکلی تھیا بھر کے سب پچکاریاں"

اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو ہندوؤں کی راس لیلا اور سری کرشن جی کی شخصیت سے بہت دلچسپی تھی۔ اردو کا پہلا ڈرامہ جو واجد علی شاہ نے لکھ کر اسٹیج کیا وہ "رادھا کنہیا کا قصہ" تھا۔ یہ ڈرامہ دراصل راس لیلا کی ترقی یافتہ اور پرشکوہ شکل میں پیش کرتا تھا۔[1]

فرماں روایانِ اودھ کا فوجی کردار ایک طرح سے شجاع الدولہ کے ساتھ ختم ہو گیا تھا اور ملک گیری کی نسبت اب ان کا میلان ملک داری کی طرف زیادہ تھا۔ آصف الدولہ غالباً اس سلسلے کے آخری شخص تھے جنہوں نے باضابطہ فوج کے ساتھ شریک ہو کر جنگ کی۔ میر تقی میر شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں کی جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"صاحبزادہ آصف الدولہ بہادر . . . جنگ کے میدان میں بڑی سرگرمی سے لڑتے، جدھر کا رُخ کرتے دشمنوں کا صفایا کر دیتے اور توپ خانے کے ذخیرے کو تلوار سے کاٹ دیتے۔"[2]

خیر ذاتی حد پر یہ پورا سلسلہ شجاع اور فنونِ حرب سے اچھی طرح واقف تھا اور ان میں سے بعض حیرت انگیز جسمانی قوت کے مالک تھے۔ ان کی زور آوری کے کچھ واقعات تو موجودہ زمانے کے معیار کو دیکھتے ہوئے ناقابلِ یقین سے معلوم ہوتے ہیں۔ واجد علی شاہ نے اپنے عہد میں فوج کی طرف بطورِ خاص توجہ کر کے اپنی عسکری قوت کو بڑھانا چاہا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا یہ بیان پڑھیے:

"(واجد علی شاہ) انتظامِ سلطنت کے سلسلے میں سب سے پہلے اپنی فوج کی درستی کی طرف متوجہ ہوئے اور کئی نئی پلٹنیں اور رسالے بھرتی کیے۔ روزانہ صبح کی نماز پڑھ کر پریڈ کے میدان میں پہنچ جاتے تھے اور فوجی قواعد کی جو فارسی اصطلاحیں انہوں نے ایجاد کی تھیں ان کے ساتھ تین چار گھنٹے فوج کو قواعد کرواتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ اگر فوج کا کوئی دستہ وقت پر پریڈ کے میدان میں نہ پہنچے تو اس پر دو ہزار روپیہ جرمانہ کیا جائے اور اگر وہ خود سلطنت کے ضروری کاموں کے علاوہ کسی اور وجہ سے غیر حاضر ہوں تو ان پر بھی اتنی ہی رقم جرمانہ کر کے فوج میں تقسیم کر دی جائے۔ ان کی یہ فوجی سرگرمیاں انگریزوں کو پسند نہ آئیں اور وہ ان کو ترک کرنے پر مجبور کیے گئے۔"[3]

جس طرح اودھ کے حکمرانوں کے دوسرے شغلوں کا اثر عوام نے قبول کیا اسی طرح ان کے سپہ گری کے شوق نے بھی لکھنؤ کی معاشرتی زندگی پر اپنا اور بہت گہرا اثر چھوڑا۔ ولیم نائیٹن کو لکھنؤ ایک ایسا فوجی شہر نظر آیا جہاں کے "خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں"۔ حرب و ضرب کے اسی ماحول نے اردو مرثیے کو اس دور میں رزمیہ عناصر سے ایک منفرد صنفِ سخن بنا دیا اور اسی عام فضا کا اثر تھا کہ اس دور کی بیشتر اردو داستانوں میں التزام کے ساتھ جنگ کے مناظر ملتے ہیں۔

---

[1] ص ۱۰۳ — لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔

[2] — ذکرِ میر، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۹ء، ص ۱۲۵

اودھ کے حکمرانوں کی فضول خرچی، عیش و عشرت اور شیعہ سنی [illegible] آج بھی [illegible] حاشیہ نشینوں [illegible] انگلستان کا [illegible] اور اس کے مستحق ہیں کہ ان کو ایک بار [illegible] تاریخ لکھی جائے [illegible] کہ انھوں نے اپنے [illegible] کیا دیا۔

لکھنؤ کی ثقافت کا ایک نہایت روشن پہلو یہاں کے دو بڑے مذہبی فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد تھا۔ یہ اتحاد اس شہر کی روایت ہو گیا تھا اور آج تک اس کا اثر باقی ہے۔ اس روایت کی بنیاد آصف الدولہ کے زمانے میں مستحکم ہو چکی تھی۔ آصفی کا میلہ، شاہ مینا کا عرس اور چہلم کے جلوس میں سب شہری دل چسپی اور جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے۔ [illegible] کی شرکت پر مذہب و ملک کی کوئی قید نہیں تھی۔ علم، ادب اور فنون کی تمام راہوں پر ہندو مسلمان دوش بدوش چل رہے تھے، دونوں یکساں داد و انعام سے نوازے جاتے تھے اور لکھنؤ کو بام عروج تک پہنچانے میں دونوں کا برابر کا حصہ تھا۔

اس شان کی [illegible] اودھ کے [illegible] تعصب [illegible] لیکن اس کے پس پشت [illegible] قوت کارفرما تھی وہ [illegible]، مگر وہاں دونوں فرقوں کو اتنا قریب لانے کی کہ دونوں ایک معلوم ہونے لگے۔

۱۸۵۶ء انتزاع سلطنت اودھ کا سال ہے اور یہی وہ سال ہے جس کے بعد سے لکھنؤ کی تہذیب اور ثقافت زوال کی طرف جھکنے لگی۔ [illegible] اہل کمال کو کھینچ کھینچ کر لکھنؤ کا تماشہ ختم ہوا اور یہ شیرازہ بکھرنے لگا۔ [illegible] کے [illegible] ہجرت اختیار کر کے کلکتہ جانے لگے۔ [illegible] کلکتہ کے اہل کمال بھی قدر دانوں کی تلاش میں ادھر اُدھر نکل گئے اور اب دوسری دیسی ریاستوں رامپور، بنارس، الور، بھوپال وغیرہ کے عروج کا زمانہ آیا۔ یوں لکھنؤ کے اقبال کا ستارہ [illegible] منزلیں روشن کر گیا۔

اودھ کے علاقے پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ لکھنؤ جہاں سلطنت بھر کی آمدنی کھنچ کر آتی تھی، تہی دست ہونے لگا اور اب یہاں کی دولت لندن پہنچنے لگی۔ اس طرح لکھنؤ کی خوشحالی کو ایسا دھکا پہنچا کہ اسے سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ اصل سبب یہ ہے کہ دولت کی فراوانی ہی خاص طور پر لکھنؤ کو مرجع خلائق بنائے ہوئے تھی، چنانچہ دولت کے ساتھ ہی لکھنؤ کی مرجعیت اور مرکزیت نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حکومت سے چھٹکارا پانے کی پہلی تحریک شروع ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے ملک بھر میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ لکھنؤ میں بھی یہ آگ دہک اٹھی لیکن دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی یہ تحریک ناکام ہو گئی۔ اس [illegible] میں لکھنؤ نے وہ کچھ دیکھا جو [illegible] نہ دیکھا تھا۔ ایک مختصر سی مدت میں [illegible] کا یہ پرستانی شہر بربادی اور ویرانی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ جن [illegible] میں زندگی اور زندہ دلی کا ہجوم رہتا تھا، ان میں وحشتوں کی وہ کثرت اور [illegible] کی وہ شدت ہوئی کہ ایک عرصے تک گدھوں اور کتوں کے سوا انسانوں کا ادھر سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ بڑے بڑے [illegible] ختم ہو گئے اور پھر ان [illegible]۔ [illegible] شیخ زادوں کا [illegible] تھا۔ [illegible]

نادر نسخے گم ہو گئے یا انگلستان کے عجائب خانوں اور شخصی ذخیروں، ہندوستان کے انگریزوں اور ریاستوں کے توشہ خانوں کی زینت ہو گئے۔ اس غارت گری میں صرف انگریز ہی نہیں، ہندوستانی فوج کے تلنگے اور بہت سے "گھر کے چراغ" بھی شریک تھے۔

۵۷ء کے واقعات متعدد کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہاں فاضل عیش کے بیان کے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں جن سے لکھنؤ کی تباہی اور اہلِ شہر کی خانماں بربادی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ عیش لکھتے ہیں:

"انگریزوں نے ...... لکھنؤ میں ہزاروں بم کے گولے آمارے۔ آگ برسا دی.... صدہا مکان لوٹے، ہزاروں کا انتقال ہوا۔ اس سے جو بچے اُنھوں نے بھاگنا شروع کیا ...... شہر کے تین ناکے بند تھے، ایک ناکہ کھلا تھا۔ بھاگنے کا وہی راستہ تھا۔ ہزاروں کیا، لاکھوں زن و مرد ایک کے پیچھے ایک پیدل رواں تھے...... وہ وہ شہزادیاں، امیرزادیاں جو گھر میں دو قدم بھی پیدل نہ چل سکتی تھیں...... بے مقنع و چادر روتی جاتی تھیں..... کوئی بی بی کہیں تھک کر بیٹھ گئی، کوئی نازنین کہیں گر پڑی، کسی نازک اندام کے پاؤں میں کانٹا چبھا، کسی چاند سی صورت نے ٹھوکر کھائی.... اپنا ہوش نہیں، لڑکوں کو کون سنبھالے........ دوپٹے ڈلائیوں سے منہ چھپائے، جنگل جنگل کی خاک چھانتی...... چلی جاتی تھیں.... بچے جو بلبلاتے تھے معصوموں کو بھوک پیاس سے غش پر غش آتے تھے....... مرد بھی غریب اسی حال میں مبتلا تھے....... جب کسی قصبہ یا قریہ میں پہنچے، کسی قدر آرام پایا۔ کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیا... رہزن کے ڈر سے نیند نہ آتی تھی....... بعض عورتوں کے وارث، بعضوں کے بچے چھوٹ گئے۔ بعض ناخدا ترس قصبے والوں نے یہ سلوک کیا، رات بھر گھر میں رکھا، صبح کو چلتے وقت لوٹ لیا۔ خلقت کے ہجوم سے جنگل میدانِ حشر کا نمونہ تھا...... کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ .... اس کس مپرسی کے زمانے میں معلوم نہیں کون کس طرف، کون کدھر گیا۔ کسی کے جینے مرنے کا حال نہ کھلا۔

"جب لکھنؤ رعایا سے خالی ہوا، مکانوں کے کھدنے کا حکم ہوا۔ لاکھوں گھر کھد کر زمین کے برابر ہو گئے۔ آبادی کا نشان کیا، نام تک نہ رہا۔ لکھنؤ سنسان، ہو کا مکان ہو گیا...... شب کا کیا ذکر، دن کو شہر میں جاتے خوف آتا تھا..... اگر یہ داستان بھی تحریر کروں تو ایک طومار ہو جائے۔" [1]

"جب تک یہ شہر بیت السلطنت تھا، مخزن اہلِ کمال، ہر چیز میں ضرب المثل رہا۔ اب ویرانی

---

[1] "فسانۂ دلفریب" ابتدائیہ

دہلی میں مشہور ہندوستانی تہذیب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس نے اس زمانے میں اس کا عروج
دیکھا تھا اس سے کچھ پوچھیے کہ اب دل پر کیا گزرتی ہے۔ کیونکہ آنکھوں میں دہلی کا نقشہ
پھرتی ہے: ۱

مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تباہی ریاست اور حسنے' بالا کر بیگانہ حسن ہوں' گم کر اور بھی افسردہ دل کر دیا۔ بلکہ میں کیا تباہ ہوں
حضرت کا انسان جیسے کہ وہ اپنی ہند کا افسردہ دل نہ ہوسکے ہوں گے : ۲

۱۸۵۷ء کے بعد سے انگریزوں کی اصل حکمرانی شروع ہوئی۔ اب ان کا اثر تہذیب و معاشرت کی رگوں میں بھی نفوذ کرنے لگا
نے ملکوں کے طور طریقوں کو اعلیٰ زندگی کا معیار قرار دے کر ان کی تقلید شروع کی اور دھیرے دھیرے 'مشرقی تمدن کا آخری نمونہ' مرزا
کے زیر اثر اپنے اصل خد و خال سے محروم ہو گیا۔ لکھنؤ کی ثقافت اور معاشرت جس مضبوط بنیاد پر قائم تھی۔ وہ قدیم روایات
حوادث و تجربات اور اور مسلسل کی وہ گرد تھیں جو کسی تہذیب کو دیرپائی بخشتی ہیں لکھنؤ اس سے محروم تھا۔ صدیوں میں تشکیل پانے والی
تہذیبیں صدیوں تک زندہ رہتی ہیں اور اسے ہر حالات کا سامنا کرنے کی سکت رکھتی ہیں اور ایک مدت تک حملوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں
کی تہذیب پر سے ایک صدی کی بہاریں جو تماشائیاں بھی دیکھ گزری تھیں اور وہ اس مدت میں انتہا و ارتقا کی منزلوں سے گزر رہی اور اپنے عروج
کی جدیدیں کو سر کر رہی تھی زوال کی پستیوں میں جا پڑی۔ اس یک لخت عروج و زوال کا سبب جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، لکھنؤ کی دولت
تھی۔ انتزاع سلطنت کے بعد دولت کے اس سرچشمے پر انگریز قابض ہو گئے۔ اب بر عکس دلی کے لیے سونے کی اس بہتی گنگا میں ہاتھ
دے سکتے نہیں رہے۔ ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ تحریک کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس لیے فتح یاب ہونے کے بعد انگریزوں نے یہاں دار و گیر کا بازار گرم کیا
جس کے نتیجے میں اہل کمال کا لکھنؤ کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف کے نتیجے میں اہل شہر نے گرد و نواح کے لکھنؤ سے جانا شروع کیا۔ یوں ۱۸۵۷
کے فوراً بعد کچھ عرصے کے لیے لکھنؤ کی پھر وہی حالت ہو گئی جو اس کے تہذیبی ارتقا سے پہلے تھی۔ وہی اداسی' ویرانی '
ویرانگی اور وہی کسمپرسی ایک دفعہ پھر لکھنؤ کا مقدر ہو گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے یہ شہر بیچارہ اپنے کچے مکانوں
ساتھ ویران تھا اور اب ملک بھر میں مقبول اور عالیشان محل سراؤں کے ساتھ۔

اگرچہ یہ حالت بھی زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہی' امن و امان بحال ہونے کے بعد مہاجروں نے پھر لکھنؤ واپس آنا شروع کیا ۳
پھر آباد ہو گیا' رونق کسی حد تک بھی ایک حد تک واپس آگئی' لیکن اب ملک دوسرے تھے' دیو ملک دوسرا تھا۔ انگریزوں کے

---

۱ "فسانۂ دل فریب"، انتخابیہ۔
۲ بنام شیخ لطیف احمد عثمانی بلگرامی۔
۳ شباب لکھنؤ، مقدمہ مترجم

نئے نظریات اور میلانات نے یہیں گھر کیا اور عوام نے ان کی پیروی شروع کی۔ خواجہ علی عیش کے مسدس "انقلاب لکھنؤ" سے اس تہذیبی تبدیلی کا سراغ ملتا ہے۔ چند ایسے بند پیش کیے جاتے ہیں جن میں شاعر نے لکھنؤ کی گزشتہ اور موجودہ حالتوں کا موازنہ کیا ہے:

"لکھنؤ میں وہ کسی شخص کو تھی جب کہ معاش ... سارے ساماں تھے بہم، تھی نہ کسی شے کی تلاش
تھی اسی شہر کی مشہور تراشش اور خراش ... عیب بھی کرتے تھے اس ڈھنگ سے بانکے اوباش
بات کرنے کا سلیقہ اُسے آجاتا تھا
ان کی صحبت سے بشر آدمی کہلاتا تھا

اب کہاں اس کی وہ رونق وہ شکوہ اور وہ شان ... اگلی باتوں کا نہیں خواب میں بھی نام و نشان
نہ وہ پوشاک نہ وہ لوگ نہ وہ لطفِ زبان ... دیکھ لیں آنکھوں سے احباب عیاں راچہ بیان
اب یہ تہذیب کے یوں چال بشر چلتے ہیں
سیٹیاں منہ سے بجاتے ہیں جدھر چلتے ہیں

لال ٹوپی تو سرِ پاک پہ کترے سے ہوئے بال ... تولیہ جیب میں جاکٹ کی بجائے رومال
گھڑی تو ہاتھوں میں دستی ہے تو بل چلتے ہیں چال ... گوشت بریان ولایت کو سمجھتے ہیں حلال
کوئی کھانا ہو اٹھاتے ہیں چھری کانٹے سے
میز پر بیٹھ کے کھاتے ہیں چھری کانٹے سے

ہے پسند آج گلاب اور چنبیلی کی زبان ... شگفتہ شستہ دل چسپ میں ہے لطفِ بیاں
کوئی ناول جو لکھے ہے وہ فصیحِ دوراں ... نثر نظمیں وہ سنتی کی نہیں قدر بیاں
جس میں انگریزی کے الفاظ ہوں تقریر وہ ہے
جس میں انگریزی کا پرداز ہو تحریر وہ ہے

عہدِ شاہی کے جو کچھ لوگ نظر آتے ہیں ... نیم وحشی وہی اس وقت میں کہلاتے ہیں
بعضوں سے غیر مہذب بھی سنے جاتے ہیں ... پڑھے انگریزی مہذب کا لقب پاتے ہیں
جو زباں اُن کی ہے عمدہ وہ زباں ہے اب تو
فعل انگریزوں کا مطبوعِ جہاں ہے اب تو

جابجا ڈیرہ مکانوں کے ہوا کرتے ہیں نظر ... کھینچ کر آہ بصد درد یہ کہتے ہیں بشر
تھا کسی وقت میں آبادیِ شہر خوش تر ... شام تھی شامِ اودھ صبح بنارس تھی سحر
پہلے آباد تھا یہ ملک سلیماں کی طرح
اب تو ویرانہ ہوا ہے خطِ یونان کی طرح"

غرض لکھنؤ کی تہذیب دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک کے نمائندے وہ تھے جو قدیم وضع پر قائم رہنا چاہتے تھے اور انگریزیت سے متعلق ہر بات کو کفر و الحاد کی نشانی سمجھتے تھے۔ دوسرا طبقہ اُن لوگوں کا تھا جو زمانے کے ساتھ خود بھی بدل جانے کے قائل اور قدامت پسندی کو جہالت کی علامت سمجھتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" میں خوجی اور میاں آزاد لکھنؤ کی تہذیب کے انہیں دونوں متضاد عناصر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

غرض ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ کی قدیم تہذیب بالکل تو نہیں مٹی لیکن اس کے نمائندے کچھ سے سنتا کی سرحد میں داخل ہو گئے اور یہ مستثنیات آج بھی لکھنؤ میں مل جاتے ہیں۔

رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں

اکبر علی خاں

ادھر کچھ عرصے سے رشید حسن خاں صاحب کا نام اُن مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں زیرِ بحث آ رہا ہے جن کے ذریعے انھوں نے مختلف لکھنے والوں کی سہل پسندیوں اور بے پروائیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان مضامین کو بہت سے رسالوں نے ایک دوسرے سے نقل کیا ہے اور اس طرح رشید حسن خاں صاحب کی اُس محنت کی داد دی ہے جو موصوف نے لکھنے والوں کی سہل پسندی اور موضوع سے بے تعلقی ثابت کرنے میں صرف کی ہے۔

بے شبہ یہی مناسب ہے کہ کام کیا جائے اور یہ کوشش کرنا چاہیے کہ جو اس کام کے کرنے والے ہیں زیادہ سے زیادہ محتاط ہو کر قلم اٹھائیں خصوصیت سے تحقیق کے میدان میں احتیاط برتنا اور بھی ضروری ہے تاکہ کسی ایک کی غلطی آئندہ کی اور بہت سی غلطیوں کا دروازہ نہ کھول دے لیکن اگر نقاد کا مطمحِ نظر صرف عیب جوئی ہو جائے تو یہ امر نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کی ہمت شکنی کا سبب بن جائے گا بلکہ معترض کی خود اپنی صلاحیتوں کا بھی کوئی اچھا مصرف نہ ہوگا۔

ابتدا میں رشید حسن خاں کے پیشِ نظر یہی بات رہی ہوگی کہ ان کے احتساب کے بعد لکھنے والے اپنے کام کو شائع کرنے سے پہلے اچھی طرح پرکھ لیں اور اس طرح کاموں کا معیار بلند ہو جائے لیکن یہ احتساب چند وجوہ کی بنا پر خود اُن کے لیے کسی طرح صحت مند ثابت نہیں ہوا چہ جائیکہ دوسروں کے لیے۔

ہوا یہ کہ ادھر انھوں نے جو مضامین لکھے ہیں اُن میں پڑھنے والوں کو وہ بے رنگی نظر نہیں آئی جس کی توقع اُن سے کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اکثر و بیشتر اپنے مضامین میں طنز و تمسخر کے تیر و نشتر چلائے ہیں جس کا ردِ عمل خوشگوار ہو ہی نہیں سکتا اور انھوں نے بعض مواقع پر اپنے اعتراضات میں کئی معذرتوں کو بھی نظر انداز کر دیا جو لکھنے والوں نے اپنی مجبوریوں کے تحت کی تھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی کتاب کے مقدمے کو نظر انداز کر کے ساری غلطیاں ایک بار پھر لکھنے والے کے حساب میں لکھا دیں چونکہ یہ رویہ خلوص کے سراسر منافی ہے اس لیے ان مضامین سے کسی صالح اثر کا مرتب ہونا قطعاً ناممکن ہو گیا اور کچھ کاموں میں جن کی ضرورت اور اہمیت کا ہم سب کو اعتراف ہے بے جا رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کام کرنا مشکل ہے اور اس پر اعتراض عاید کر دینا اتنا ہی سہل ہے جتنا سہل ہو سکتا ہے۔ کسی نمائش میں ایک مصور نے اپنی تصویر کے ساتھ یہ نوٹ بھی لگا دیا تھا کہ اگر کوئی صاحبِ نظر اس تصویر میں غلطی پائیں تو اس پر نشان لگا دیں۔ نتیجہ یہ کہ اتنے صاحبِ نظر پیدا ہو گئے کہ نشانات کی زد میں تصویر ہی غائب ہو گئی لیکن جب اسی مصور نے دوسری تصویر کے ساتھ یہ درخواست کی کہ غلطی کو درست کر دیا جائے تو کوئی بھی تصویر کی صحت پر انگشت نمائی کرنے والا نہیں تھا۔ یہی حال زبان و ادب کے معاملات میں

میں لانے میں اخلاص کو شبہ کی شکل میں ملنا چاہیے تاکہ دوستانہ فضا میں بحث کو سنا سمجھا جائے۔ اور اس کے نتیجہ میں ایک کوئی بہتر نتیجہ نکل سکے۔ دوسری بات یہ بھی ضروری ہے کہ معترض یا محتسب کا حرف معتبر اور احتساب کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لے کہ جس قسم کی غلطی پہلے دوسرے پر گرفت کر رہا ہے کہیں اسی قسم کی غلطی خود اس کے تحریری نشتر میں بھی تو نہیں چھپا ہوا ہے کہیں اسی قسم کی غلطیاں خود اس کے کارناموں میں تو شامل نہیں ہیں اور کیا اس نے کوئی بے داغ کام بھی پیش کیا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات کرنے والوں کو بھی یہ نقصان ہو سکتا ہے اور زبان و ادب کو بھی کہ وہ پھر اپنے نام سے کوئی کتاب بازار میں نہیں لانے سے پہلے سوچتے ہیں کہ اگر ان کی کچھ دوسری کتاب شائع ہو گئی تو تاثر کی وہ ساری کارکردگی ہوا ہو جائے گی۔ اور یوں وہ ساری محنت جو تحریر کا مطالعہ میں صرف ہونا چاہیے تھی منفی اور تخریبی کاموں میں ضائع ہو جاتی ہے۔

یہ کسی بھی زبان کی کم نصیبی ہے کہ اس کے باصلاحیت افراد یہ سمجھ پائے کہ تحقیق کرنے کا کام کیا ہے۔
رشید حسن خاں نے بھی اپنے تبصروں میں جو ان کی شہرت کا دار و مدار ہے منفی صلاحیتوں کو آزمایا ہے۔

اس معاملہ کا افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ اکثر حضرات جنھوں نے رشید حسن خاں کے یہ تبصرے پڑھے ہیں ان کی نیت پر بھی شک کرتے ہیں اور یہ مسئلہ ہے کہ جس تحریر کا خلوص مشکوک ہو وہ چاہے کتنی بھی کیوں نہ ہو مضبوط ہو بلند بانگ دعویٰ کرتا ہو کچھ مدت دو ہفتے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

رشید حسن خاں کی نیت پر شک کرنے والے کہتے ہیں،

ہم نے ان کے تبصرے تحقیقی و تنقیدی میں پیش کی ہوئی ہے، ابرو کی طرح کمزوری کو دور کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ تبصرہ نگار کے پیچھے ہمیشہ منتقمانہ جذبہ ہی کیوں کار فرما رہتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس مسئلہ نقد و نظر میں رشید حسن خاں نے اس ادارے اور اس ادارے سے منسلک مصنفین کی کتابوں کو کیوں شامل نہیں کیا جس ادارے سے وہ خود وابستہ ہیں یعنی شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔ اگر وہ اس ادارے کی مجبوریاں اور اس سے متعلق حضرات کی کتابوں پر نہیں لکھتے تو اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ،

(الف) ان کے نزدیک وہ سارے کام معیاری ہیں اور وہ ان سے مطمئن ہیں اور ان کے خیال میں ان کاموں پر لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔
یا پھر یہ کہ،

(ب) رشید حسن خاں کے یہاں بھی مصلحتوں کو دخل ہے۔

ان حضرات کے سوالوں میں سے شاید کوئی مطالبہ بھی بے جا نہیں اس لیے کہ اگر رشید حسن خاں کے نزدیک حکومت ہند پر شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کو امداد دینے سے غلط بخشی کا الزام آتا ہے تو دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے بھی تو اعلیٰ حکومت ہند کی بڑی بڑی امدادوں کا کوئی ایسا مصرف نہیں کیا جو تحقیق و ادب میں ہوا جس سے یہی ثابت ہوتا کہ اس نے حکومت کی رقم کا ناجائز استعمال نہیں کیا۔
کیا کوئی شخص اس بات کا منکر ہو گا کہ اصلاح اور احتساب کا کام اپنے گھر سے شروع ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو کیا

ایک شخص کو منتسب، مدعی پر شک کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عیب جوئی میں اپنا وقت برباد کرنے سے زیادہ افسوسناک کیفیت اور کوئی نہیں ہو سکتی، آئندہ گفتگو میں جو مثالیں رشید حسن خان کے صرف ایک مضمون سے پیش کرنے والا ہوں ان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ رشید حسن خان جو باشعور آدمی ہیں ان معروضات کی روشنی میں اپنے آپ کو مزید "فضول خرچ" ہونے سے بچائیں —— اس مثال کو سامنے رکھ کر جو ان کے لکھے چند صفحوں کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے، آپ تحمل سے غور فرمائیں۔

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

تاریخ لطیف اور رشید حسن خان

رام پور رضا لائبریری میں تاریخ لطیف نام کا ایک مخطوطہ ہے جس میں مہدی علی خاں رام پوری مرتب کتاب نے مشاہیر شعراء، رؤسا، امراء، علماء، اولیا اور اعیانِ ملک کے قطعات تاریخ وفات جمع کر دیے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے قابل قدر کتاب ہے کہ اس میں بعض مشاہیر بالخصوص شعراء کے بارے میں مستند مواد مل جاتا ہے۔ دلی کالج اردو میگزین کے شمارہ ۱۹۶۳ء میں رشید حسن خاں نے اس کتاب کا تعارف کرایا اور اپنے نزدیک چند اہم ترین شعراء سے متعلق قطعات تاریخ کے وہ شعر بھی نقل کیے جن سے مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے، اور ان پر حواشی کا بھی اضافہ کیا ہے۔

کسی قلمی کتاب پر کچھ لکھنا یا اس سے کچھ اخذ کرنا بڑی ذمے داری کا کام ہے اور بہت احتیاط اور دیدہ ریزی کا متقاضی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کتاب عام طور پر لوگوں کی دسترس میں نہیں ہوتی اور پڑھنے والوں کو اسی شخص پر تمام و کمال بھروسہ کرنا پڑتا ہے جس نے اس قلمی کتاب سے اخذ و اشاعت کا کام لیا ہے۔

اس نزاکت کے باوجود بھی رشید حسن خاں نے اپنے اس تعارفی مضمون میں بے توجہی اور سہل پسندی برتی ہے۔
میرے معروضات میں انہیں سے پیدا ہونے والی صغیر و کبیر کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

(الف)

۱۔ سب سے پہلے رشید حسن خاں صاحب نے مؤلف کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اُن کے نام کے ساتھ ان کا تخلص "مہدی" بتایا ہے لیکن یہ تعارف نامکمل ہے اس لیے کہ ان کا تخلص مہدی اور آنام بھی تھا ان میں سے آخر الذکر تو مذکورہ کتاب ہی کے ورق ۱۲۸ پر پایا جاتا ہے۔ مولف نے اپنے پر مہدی علی خاں کا کہا ہوا عبدالہادی خاں وفا رام پوری کا قطعہ تاریخ وفات موجود ہے (۲) سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تخلص آنام بھی تھا۔ قطعہ تاریخ یہ ہے:

دنیا سے گئے سید عبدالہادی   برہم ہوئی ان کے جانے سے انجمن
آنام کر دی سوئے قصیدہ سمدا   جنت میں جا کے خدا سے پانی وطن

۱۳۳۴ھ

اس کے علاوہ کتاب خانۂ رامپور میں [illegible] کا ایک مجموعہ [illegible] تصنیف کا [illegible]

رشید حسن خاں تاریخ بیعت جیسی مختصر تحقیق کے باوجود ناواقف ہیں۔

(ب)

۲۔ آگے چل کر رشید حسن صاحب نے کتاب کے صفحات کی تعداد ۱۱۲ بتائی ہے۔ جب کہ صحیح تعداد [illegible] ہیں۔ اس لیے کہ کتاب کے صفحات کی تعداد ۲۰۰ ہے۔ آغاز کتاب میں [illegible] شعرا کی فہرست ہے جو بیس صفحات پر مشتمل ہے، اس کے بعد ۱۸۰ صفحات پر قطعات تاریخ درج ہیں، اس طرح دونوں کی مجموعی تعداد ۲۰۰ ہوتی ہے۔

قلمی کتابوں کے حوالے میں عام طور پر صفحات کے بجائے اوراق لکھے جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں کے بیان کو دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید انھوں نے اوراق کی جگہ سہواً صفحات کا لفظ لکھ دیا ہے مگر [illegible] اوراق بھی نہیں ہیں۔ یہ [illegible] لگانی بھی [illegible] اس لیے کہ ۲۰۰ یا ۱۰۰ کی دو سے تقسیم کا حاصل [illegible] ہوگا، ۱۱۲ کسی طرح ممکن نہیں۔

پھر میں نے سرسری طور پر [illegible] تحقیق سے پتہ چلا کہ [illegible] بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب خانۂ رامپور کی فہرست مخطوطات [illegible] میں اس کتاب کے سرسری ۱۱۲ صفحات ہی بتائے گئے ہیں اور [illegible] رشید حسن خاں کی بے توجہی اور سہل پسندی نے وہیں سے بغیر کسی [illegible] اختیار کر لیا ہے۔

(ج)

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کتاب کے آغاز میں ۲۰ صفحات کی فہرست مندرجات ہے، اس میں سوائے شعرا کے تخلص کے [illegible] حروف تہجی پر ترتیب دیا گیا ہے۔ رشید حسن صاحب نے کتاب کے مشمولات میں اس فہرست کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ اس سے کوئی فائدہ اٹھایا حالانکہ اس سے بعض غلط معلومات [illegible] چاہیے تھیں۔ مثال کے طور پر:

۳۔ فہرست کے ص [illegible] پر مولانا عبدالرحمن [illegible] کے نام کے ساتھ مرتب کتاب نے ان کا رشتہ شاگردی [illegible] محمد حسین فقیر سے بتایا ہے جب کہ رشید حسن صاحب نے [illegible] کے حوالے سے ذوق کا شاگرد لکھا ہے۔ یا تو انھیں محمد حسین فقیر کا نام بھی لکھنا چاہیے تھا یا اس سے اختلاف کرنا چاہیے تھا۔

(د)

۴۔ رشید حسن خاں نے تاریخ بیعت کے نسخے کو مناسب توجہ سے دیکھے بغیر ہی بعض مقامات پر [illegible] دیے ہیں جو تضاد و اختلاف کے حامل ہیں۔ انھوں نے عرض کیا ہے۔

"تاریخ بیعت میں ہر جگہ ایک سنہ لکھا ہوا ہے ہجری، عیسوی یا فصلی۔"

لیکن ان کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ مخطوطے کے صفحہ [illegible] کی طرف رجوع کریں جس پر [illegible] حسین [illegible] کا کہا ہوا میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد کا [illegible] تاریخ وفات [illegible] ہے [illegible] اس کے ساتھ [illegible] مطابقت [illegible] کر دی گئی ہے۔ ذیل میں اسے نقل کیا جاتا ہے۔

جو ب تک داخل باغ جناں ہوئے

[redacted] تحقیق ۱۲۲۹ھ

تاریخ گو شعرا نے کہیں کہیں قطعات میں عیسوی اور ہجری دونوں سنین سے تاریخیں بتائی ہیں اس لیے بھی رشید حسن خاں کا ہر جگہ ایک سنہ لکھا جانا غلط ہے۔

(۴)

۵۔ رشید حسن خاں نے تعارف میں فرمایا ہے کہ تاریخ لطیف میں بعض مقامات پر شمار کی غلطی سے غلط اعداد درج ہو گئے ہیں، مگر میں یہ عرض کروں گا کہ رشید حسن خاں نے اپنے حواشی میں جہاں کہیں ایسی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ خود رشید حسن خاں کا سہو ہے مخطوطے کا نہیں ہے مثلاً:

نمبر [redacted] سنہ ۶ شمارے کے لکھے ہوئے راسخ عظیم آبادی کے قطعۂ وفات سے شعر مادہ کو رشید حسن خاں نے اس طرح نقل کیا ہے۔

سالِ فوتِ راسخِ فخرِ جہاں
گفت ہاتف "راسخِ شیوہ بیاں"

۱۲۳۱ھ

اور پھر حاشیے میں اعتراض کیا ہے کہ

"مخطوطے میں مادۂ تاریخ کے نیچے ۱۲۳۸ھ درج ہے لیکن اس لفظ سے ۱۲۳۱ھ نکلتے ہیں اور یہی درج کیے گئے لیکن اس کا صحیح سنہ وفات ۱۲۳۰ھ ہے۔"

یہاں رشید حسن خاں کا بیان غلط ہے۔ مخطوطے میں مصرع تاریخ صورت یہ ہے۔

گفت ہاتف "راسخ شیوا زباں"

اور اس مادے سے ۱۲۳۸ھ ہی نکلتے ہیں۔

۶۔ ضمیر کا مادۂ تاریخ مخطوطے میں مندرجہ ذیل ہے۔

بود سید ضمیر مرد امام

اور اس مادے سے ۱۲۰۱ھ نکلتے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب نے اس پر حاشیے میں لکھا ہے کہ:

"مخطوطے میں ۱۲۰۱ لکھے ہوئے ہیں جو سہو قلم ہے یا شمار کی غلطی۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سہو قلم اور شمار کی غلطی رشید حسن خاں کی ہے مخطوطہ تاریخ لطیف کی نہیں اس لیے کہ وہاں ۱۲۰۲ھ ہی درج ہیں۔

۷۔ قسمت و ہمدم کا مادۂ تاریخ وفات جو شاعر نے نکالا تھا۔ تاریخ لطیف میں اس طرح نقل ہوا ہے۔

• داستانِ گلشنِ نسیم بجگر

۱۲۰۵ھ

میں رشید حسن خاں نے اپنے حاشیے میں بتایا ہے کہ مخطوطے میں مادۂ تاریخ کے نیچے ۱۲۰۵ھ لکھے ہوئے ہیں اور [illegible]
قلم ہے:

یہاں بھی رشید حسن خاں کی اصلاح غور و فکر کا سبب ہے مخطوطے کا نہیں۔ مخطوطے میں ۱۲۰۵ درست ہے۔

(ق)

۸۔ حواشی لکھتے ہوئے رشید حسن صاحب نے غیر ضروری طوالت کا اضافہ کیا ہے اور جو مواد پہلے سے تاریخ ادبیات میں موجود تھا
اس کے لیے مآخذ ادھر ادھر سے لیے ہیں۔
مثلاً مسعود یادگار کے مادۂ تاریخ وفات "[illegible]" پر حاشیہ لکھتے ہوئے [illegible]
کا کہا ہوا قطعہ تاریخ تذکرۂ شعرائے ہند سے نقل کیا ہے۔ یہ قول غیر ضروری بھی ہے کیونکہ یہ قطعہ تاریخ ادبیات میں پہلے سے موجود تھا
اس قطعے کے مفید مطلب اشعار یہ ہیں:

بروز پنجشنبہ کرد رحلت — کہ این عالم نہ جائے جاودان بود
ماہ ربیع الاول و بست و چہارم — [illegible] سوی دار الجنان بود
خرد افسوس [illegible] — پدر دارم ہمیشہ [illegible] بود
[illegible] بست تاریخ [illegible] — [illegible] بود"

۱۲۸۵ھ

اس قطعے سے وہ تاریخ اور مہینہ اور سنۂ وفات کے ساتھ [illegible] معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ [illegible] کے [illegible] تھے۔
رشید حسن خاں نے تاریخ ادبیات میں اس قطعے کا موجود ہونا نہیں بتایا جس سے اس کا استفادہ ظاہر ہو جاتا۔

۹۔ امیر کے [illegible] امانت لکھنوی کے قطعہ تاریخ وفات سے مادۂ تاریخ

• جان داد امانت بخدا برد امین •

نقل کرکے رشید حسن خاں نے حاشیے میں [illegible] کا کہا ہوا قطعہ تاریخ وفات [illegible] دیوان [illegible]
[illegible] دیوان امانت [illegible] صاحب کے مقالے مشمولہ سالنامہ نقوش سنہ ۶۱-۶۲ء (یہاں قاضی صاحب
کے مقالے کا حوالہ درج نہیں کیا گیا) بھی نقل کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ قطعہ تاریخ ادبیات (ص ۳۱-۳۲) میں بھی موجود
ہے۔ اس قطعے [illegible] فضول سے کام لیا ہے جس سے سوائے [illegible] کے اضافے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(س)

حاشیہ [illegible] میں رشید حسن خاں نے [illegible] کرنے کی خاطر [illegible] تمام [illegible] کو [illegible] زیادہ

و سے فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ مرتب کے سامنے نہیں ہے کہ آیا وہی تاریخ لطیف ہے۔ قطعات تاریخ میں مادہ تاریخ اکثر آخری شعر میں نظم کیا جاتا ہے لیکن بعض قطعات میں تفصیل جزئیات، دن، مہینا اور تاریخ وغیرہ قطعے کے پہلے اشعار میں نظم کر دی جاتی ہیں۔ رشید حسن خاں نے اس قسم کی کسی اطلاع سے جو تاریخ لطیف کے قطعات میں پائی جاتی ہے، کوئی استفادہ نہیں کیا اور ادھر ادھر کے ذریعے حوالے فراہم کرتے رہے۔

ہر تحقیقی کام کرنے والے کو اس بات کا احساس ہوگا کہ مرتب کو سب سے پہلے اسی کتاب کی معلومات پیش کرنا چاہئیں جس پر وہ کام کر رہا ہے اگر وہ صحیح ہیں تب، غلط ہیں تب۔ اس کے بعد مرتب کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ مزید تحقیق سے اگر ممکن ہو تو کسی اطلاع کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں دلائل کا اضافہ کرے لیکن اصل کتاب کی اطلاعات سے صرفِ نظر کرنا سہل پسندی اور بے توجہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ایسی صورت میں ثانوی حوالوں سے غلطیوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور بہت سی ضروری معلومات پردے میں چھپ جاتی ہیں۔

رشید حسن خاں نے تاریخ لطیف پر اپنے مضمون میں اس انداز کار کی ایک مثال پیش کی ہے اور کتاب کے مندرجات کی قریب قریب ساری ہی اطلاعات سے چشم پوشی کی ہے۔

اس کے لیے مندرجہ ذیل معروضات کو سامنے رکھیے:

۱۰۔ امیر مینائی کے قطعۂ تاریخ وفات از غالب مرزا داغ (تاریخ لطیف صفحہ ۳۸) کا آخری شعر رشید حسن خاں صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ لیکن امراضِ موت کی جو تفصیل داغ نے دی تھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ متعلقہ اشعار یہ ہیں:

کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں — کیا لکھوں تفصیل امراضِ کثیرہ

بلکہ صحت مزاد تپ — مدد آثار اسہال و زحیر

اس قطعے کے ایک شعر میں "مینائی" نسبت کی طرف اور امیر سے رشتۂ شاگردی کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے:

شاہ مینا سے تھا نسلی سلسلہ

شاعری میں خاص تلمیذِ امیر

رشید حسن خاں نے اس سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۱۔ تاریخ لطیف صفحہ ۴۵-۴۴ پر امیر مینائی کا قطعۂ تاریخ وفات از کلیم لکھنوی بھی درج ہے جس سے وقتِ انتقال معلوم ہوتا ہے اور رشید حسن خاں نے جس حوالے سے تاریخ وفات بتائی ہے اس سے اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ متعلقہ اشعار یہ ہیں:

چہار شنبہ بہم بد ز جمادی دوم — بُد پاس یک شب شنبہ گزشتہ تقدیر

بچندھویں سیزدہم از مہ اکتوبر بود — ز صد و الف کہ سال عیسیٰ تحریر

رشید حسن خاں نے اس کے برخلاف ۱۹ جمادی الاول تاریخ انتقال بتائی ہے اور وقتِ انتقال کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

۱۲۔ میاں تمکین کی تاریخ وفات کے لیے رشید حسن خاں نے "امیر" کا مادہ تاریخ انتخاب کیا ہے اور مزید معلومات کا اضافہ

۲۲۱

[illegible] جاوید، تاریخ ادب اردو ... [illegible] ... کیا گیا ہے [illegible]
[illegible] کے ساتھ سنہ عیسوی کا بیان ہونے ... سے پہلے ... رشید حسن خاں صاحب ... اس قطعے کے
... [illegible] ... تاریخ ادبیات کے صفحات ۲۰ - ۲۱ پر یہ قطعہ درج ہے ... [illegible]
یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

قریب شام ہوئے آہ وہ کسی [illegible] تمام — اخیر ماہ تھا گزرے تھے دو مہینے [illegible]
سنا یہ واقعہ جانکاہ جب کہی تاریخ — کہ [illegible]
بیان مصرعِ آخر کے اب ہنر جوں — [illegible] ہے مطلب [illegible]
شروع مصرع تاریخ جو کریں دو حرف — [illegible]
سنین کی [illegible] اس سے عیسوی [illegible] — [illegible] زر [illegible]
وہ مرثیہ؛ وہ [illegible] — [illegible]

عجیب مصرع تاریخ ہے [illegible]
"یہ [illegible] تو کا ہے زمرہ [illegible]"

۱۲۹۱ھ

۱۳۔ اردو کے مشہور شاعر سید ضامن علی جلال کا قطعہ تاریخ وفات انہیں کے بیٹے میر مہدی کمال کا نتیجۂ فکر تاریخ ادبیات (صفحہ ۹۹- ۰۰
میں موجود ہے۔ رشید حسن خاں نے اس قطعے کا آخری شعر نقل کیا ہے اور اپنے حاشیے میں "خمخانۂ جاوید" تذکرہ کا حوالہ
خمخانۂ آرزو صاحب (یہاں بھی مقالے کا عنوان نہیں بتایا) بحوالہ جلال بنام ... اور انتخاب یادگار سے کام لیا ہے۔
مجھے یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود بھی صحیح تاریخ دریافت نہیں کر سکے حالانکہ کمال کے اس قطعے کے سامنے
جسے کہیں طویل تلاش کے سفر پر جانے کی ضرورت پیش نہ تھی۔ کمال کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں:

مہ شوال کی تاریخ چوتھی — وہ بدھ کا روز تھا آفت کا سا؟
وہ شاعر اٹھ گیا بزم جہاں سے — کمال شاعری جس پر تھا نازاں
کمال آنکھوں سے پنہاں ہیں ... — "چھپا ہے شاعری کا مہر تاباں"

لیکن رشید حسن خاں نے اپنی تحقیق میں مندرجہ بالا قطعے کو نظر انداز کر کے خمخانۂ جاوید کی اس اطلاع کو بنیاد بنایا ہے۔
"جناب جلال نے بعمر ۷۰ سال بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء انتقال فرمایا۔"
اور اس کے بعد تقویم کے حساب سے ہجری تاریخ دریافت کر کے ۵ شوال ۱۳۲۷ھ بتائی ہے۔
ہجری سال مع تاریخ ورود پہلے ہی سے سامنے ہوتے جسے سنہ عیسوی کو بنیاد قرار دے کر ہجری تاریخ نکالنا محض تکلف کے علاوہ کیا کہا جا
سکتا ہے جبکہ اس سعی کاوش کے باوجود تیجہ غلط ہو، یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ رشید حسن خاں نے منظور بالا قطعہ تاریخ سے

ہے تو بھی برق صاحب نے اس قطعہ کا آخری شعر خود نقل بھی کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ رشید حسن خاں نے بیٹے کی بتائی تاریخ پر نہ صرف یہ کہ دوسرے حوالوں کو ترجیح دی بلکہ اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ معلوم نہیں تحقیق کے وہ کون سے اصول ہیں جن کی بنیاد پر بیٹے کا بیان دیگر بیانات کے مقابلے میں غیر معتبر اور ناقابلِ ذکر قرار دیا گیا۔

بہر حال جلال کی صحیح تاریخ ۵ شوال نہیں جو رشید حسن خاں نے تحقیق کی ہے بلکہ ۴ شوال روز چہار شنبہ ۱۳۲۷ھ ہے جو جلال کے بیٹے کمال نے اپنے قطعہ میں نظم کر دی ہے۔

۱۴۔ داغ دہلوی کا مادۂ سالِ وفات جو احسن مارہروی نے نکالا تھا رشید حسن خاں نے نقل کیا ہے اور مہینہ اور اس کی تاریخ خمخانۂ جاوید کے حوالے سے۔ لیکن تاریخ بلبعت کے کسی قطعات سے کوئی استفادہ نہیں کیا جن میں سے ایک حفیظ جونپوری کا کہا ہوا ہے اس میں مہینہ اس کی تاریخ اور مرضِ موت کا تذکرہ موجود ہے۔ اس قطعے کے مفیدِ مطلب اشعار یہ ہیں:

ہائے فالج نے کیا ستم ڈھایا کیسی برپا ہوئی قیامت آہ

ماہ ذی حجہ کی نویں تاریخ یا ہے عاشور کا یہ روزِ سیاہ

مر کے چپ ہو گیا فصیح الملک یہ خبر منتشر ہوئی ناگاہ

ہائے وہ خوش نوائی بلبلِ ہند ہائے استادِ شاہ آصف جاہ

دہ شانہ حفیظ امیر کا غم کہ ہوا داغ کا غم جانکاہ

سالِ غم چرخ کے خونِ ناب بہا

شاعری داغ کے گئی ہمراہ

۱۹۰۵ء   (ص ۹۶)

اس کے علاوہ ایک اور قطعہ میں جو آزاد ؔشیخ پوری شاگرد امیر مینائی کا کہا ہوا ہے اور تاریخ بلبعت ص ۸۲ پر درج ہے مرضِ موت کا ذکر آیا ہے۔ متعلقہ شعر یہ ہے۔

ہائے فالج کا تھا وہ اک جھونکا جس ہوا سے یہ گل چراغ ہوا

مرضِ موت کا ذکر اور بھی مختلف قطعات میں ہے لیکن رشید حسن خاں لاعلم ہیں۔

۱۵۔ داغ سے متعلق کئی اور قطعات بھی ہیں جن میں سے ایک قطعہ مصنفہ قاضی سید محمود میاں حیرت شاہ جہاں پوری سررشتہ دار عدالت بھی خفیفہ گوالیار شاگرد داغ میں یہ اشعار بھی ہیں۔ ان سے داغ کے ساتھ شاگردوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

اے میرے استاد کیا کس نے ترا کر دیا استاد شاگردوں کو بھی

اشرف و احمد و بیاک و دوجد حیرت و مطلب جلال و راسخ

برق تمکیں شوق و بیتاب و شرر آذری جاوید کلیم انجم غنی

اختر و امید شیدا شوق و شاد فوق و مضطر سید احسن لکھنوی

شمعِ افسردہ شرفِ مخزنِ عشق — ماہِ نصیب محمود صاحب دہلوی

گوہرِ دانش ضیا سائل بے مثال — عیش نادان عیش شوخ نادر دہلوی

اشک و بسمل صاحب و مفتوں فصیح — نجم ثاقب احسن مارہروی

سرو باغ و رود و قیصر و سخن — شاعرِ قدس نسیم عسکری

جس کے ایسے سیکڑوں شاگرد ہیں — ایسی استادی مسلّم کس کی تھی

ص ۹۲-۹۳

سائل دہلوی کے قطعہ کا مندرجہ ذیل شعر بھی ذہن نشین کیے جانے کے لائق ہے

شد وفاتش بشام یوم الکل — دفن شد روز جمعہ سائلِ ہند

(ص ۱۰۰)

رشید حسن خاں صاحب نے ان میں سے کسی ایک مصرع سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۶- دبیر کا مادہ سال وفات از امیر نقل کرکے تاریخ کی تفصیل کے لیے شمار دبیر، خمخانۂ جاوید، آب حیات کو پیش نظر رکھا ہے لیکن سید وحالت کے قطعے کے مندرجہ ذیل شعروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

روز شنبہ تھا اور تاریخ و وقت صبح — تھے شروع ہی محرم ماہ و فرخ سعد

ان شعروں سے معلومات میں دن اور وقت کا اضافہ ہوتا ہے اور تاریخ کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھیے تاریخ لطیف ص ۱۲۶)

رشید حسن خاں نے اس سے کام نہیں لیا۔

۱۷- مولوی عبدالرحمن راسخ دہلوی کا مادۂ تاریخ وفات از آغا شاعر قزلباش نقل کرکے راسخ کی تاریخ وفات خمخانۂ جاوید کے حوالے سے ۲۹ ستمبر ۱۹۱۰ء بتائی ہے۔

تاریخ لطیف میں اس قطعے کے خاتمے پر حاشیے میں یہ عبارت بھی مؤلف کتاب ہی کے قلم سے درج ہے:

"۲۹ شعبان روز چہار شنبہ قبل از نصف النہار"

رشید حسن خاں نے اس حاشیے کا کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ اس سے استفادہ کیا۔ نہ یہ بتایا کہ عیسوی اور ہجری تاریخوں میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔

راسخ دہلوی کی وفات سے متعلق ایک اور قطعہ تاریخ منیر قادری منیر دہلوی کا نتیجۂ فکر بھی تاریخ لطیف میں درج ہے اور اس کے مادۂ تاریخ سے مہینے اور سنہ دونوں کا علم ہوتا ہے۔ قطعے کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔

منیر اب اُن کا سالِ فوت کہیے

"ہوئی شعبان میں بس اُن کی رحلت"

۱۳۰۵ھ (تاریخ لطیف ص ۱۳۵)

رشید حسن خاں نے اس قطعے سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۸۔ پیارے صاحب رشید کا مادۂ تاریخ از نشتر لکھنوی نقل کر کے گلزارِ رشید طبع ۱۹۵۱ء کے حوالے سے مزید معلومات فراہم کی ہیں لیکن اس قطعے کے مندرجہ ذیل شعروں کو محروم توجہ رکھا ہے۔

علالِ ضعف سے نالہ کے گو کر جنبش تھی — گمر گئے شورئے ایجاد جب کہ آئی قضا
سحر کا وقت تھا ذی قعدہ کی تھی بست و ششم — کہ آفتاب کمالات زیرِ خاک چھپا
وہیں پہ قبر بنی جس جگہ پہ سوتے تھے — قدم نہ گوشۂ عزلت سے مر کے بھی نکلا

(ص ۱۴۲)

رشید حسن خاں نے اس قطعے سے وقتِ انتقال تو دیا ہی نہیں لیکن ایک اور اہم اطلاع سے بھی محروم رکھا اور وہ یہ کہ پیارے صاحب رشید اپنی خوابگاہ ہی میں دفن ہوئے۔ اس کے برخلاف انھوں نے گلزارِ رشید کے حوالے سے باغ میر عشق تقلکا کپ گنج لکھنؤ مدفن بتایا ہے۔

۱۹۔ محمد جان شاد کے قطعۂ تاریخ کو گفتہ تجلی حسین تجلی کو نقل کیا ہے مگر اسی قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار سے صرف نظر کر کے اب بتا سے کام لیا۔

من از تخمین گفتنی می توانم — کہ عمرش از اندازہ ہشتاد شدہ وانی
بہ تاریخ چہارم بہ فرش مرگ افتاد — مرض ہم فی المثل افتاد شدہ وائی
ربیع الآخر و یکشنبہ ششم — بہ مغرب دیدہ را خیبا و شدہ وائی
ہمیں دو چار ساعت اندر بر خود — ز قید زندگی آزاد شدہ وائی
مکان ویران شدہ تاریخ ہفتم — مہ از سعتہ مشق آباد شدہ وائی

اس طرح مرض موت اور تاریخ دفن کی اطلاع رشید حسن خاں نے نہیں دی۔

(دیکھیے تاریخ طبیعت ص ۱۵۱)

۲۰۔ رشید حسن خاں نے غلام امام شہید کے مادۂ تاریخ کے لیے مرزا سالک دہلوی کا یہ شعر نقل کیا ہے جس سے ۱۲۹۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔

آہ ارباب درد پر طاری — ہے بہ ماتم امام شہید

اور اس پہ یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

"کلیاتِ سالک نے فی الوقت میری دسترس سے باہر ہے کہ تحقیق کر سکوں، موجودہ صورت میں اس شعر سے مطلوبہ تاریخ نہیں نکلتی ہے۔"

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ انھیں الفاظ سے تاریخ نکلتی ہے، رشید حسن خاں شعر کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں، اس شعر کو سمجھنے میں ناکام

ہے یہی اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ [illegible]
[illegible]
ہے کہ رشید حسن خاں [illegible] کا ذکر ہے۔

یہ ممکن بات ہے کہ رشید حسن خاں اپنی دسترس سے باہر کتابوں سے استفادہ نہ کر سکے ہوں لیکن تاریخ ادبیات
کے زیرِ مطالعہ رہی اس سے کوئی کام نہیں لیتے۔

۲۱۔ رشید حسن خاں نے شاہزادہ قادر بخش صابر کا مادۂ تاریخ وفات از محمد نامی مرقوم

"غم شاعراں بود ماں مردہ ہے۔"

۱۲۹۹ھ

نقل کر کے مقالہ قاضی عبدالودود نقوش شمارہ ۴۰۔ ۱۹۷۰ء کے حوالے سے مقامِ وفات کا اضافہ کیا ہے۔
لیکن اسی قطعے کے مندرجہ ذیل شعر سے استفادہ نہیں کیا جس میں تاریخ، مہینا اور دن بتائے گئے ہیں:

ز شعبان سوم بود روزِ دو شنبہ　　ایں شاہ و نام و نشاں مُردہ ہے

۲۲۔ میر غلام علی عشرت بریلوی کے مادۂ تاریخ وفات کے لیے کرم خاں رام پوری کے قطعے سے یہ شعر

بے غم دار کرم نے اس کی تاریخ　　کہی ہیہات ہائے میر عشرت

۱۲۳۶ھ

نقل کیا ہے اور مزید اطلاعات کے لیے تذکرہ کاملانِ رام پور کا حوالہ دیا ہے لیکن کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔ اسی قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار سے عشرت کے ناتمام منظوم ترجمہ پدماوت کی تکمیل بقصہ شمشیر کرم اور ایک دوسری نثری کہانی کی تصنیف اور انتقال کے مہینے اور تاریخ کا علم بھی ہو جاتا ہے جن میں سے کسی بات کا رشید حسن خاں نے اپنے حاشیے میں بیان نہیں کیا۔ اشعار یہ ہیں:

پدماوت ناتمام کی نظم　　جس سے شاد ہوئی روحِ عشرت
قصہ شمشیر کرم کا　　کا خونِ جگر کیا بہ محنت
مجموعہ عجیب بلکہ کہانی　　کی نثر بزبانِ فصاحت
شوال کی بست و ششمیں کو　　وا اس پہ ہوا ہے بابِ جنت　　(ص ۱۸۱)

۲۳۔ مندرجہ بالا قطعے کے کہنے والے کرم خاں رام پوری پر بھی انتخاب یادگار کے حوالے سے یہ حاشیہ لکھا ہے:

مرزا محمود عرف کرم خاں شاگرد قدرت اللہ شوق ۹۶ برس کی عمر پائی وفات

۵ ذی الحجہ ۱۲۵۳ھ بروز دو شنبہ

لیکن تاریخ ادبیات ہی میں منقول کرم خاں کا قطعۂ تاریخ وفات جو کرم خاں کے بھانجے احمد خاں عشرت و جان زادہ کا کہا ہوا ہے

۲۳- مامون صاحب رشید حسن خاں کے نزدیک "تاریخ بے مثال" نہیں، شعرا جس قطعے سے کرم خاں کا صحیح نام، مدت مرض، سوت، وقت
انتقال اور تاریخ وفات کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ مزید اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں:

شاعر کامل و ذی حوصلہ مامون صاحب — جن کو اُستاد کرم خاں کہے اَدنیٰ اَدنا
متخلص بہ کرم نام کریم اللہ خاں — مجمع خوبی و اہل حکمت و شرم و حیا
مرض ضیق کی تکلیف اٹھائی دو سال — شصت و یک سال تلک کھائی ہے جنھ دنیا
ہوئے اقلیم بقا ملک فنا سے جس دم — وہ تحفۂ قسم جہاں رخت سفر باندھ اُٹھا
ظہر دو شنبہ و ہفتم مہ ذی حجہ کی تھی — کہتے پچاکو تھے اسے ہندی میں پیرو ہ
طلب اس خسرو ثانی کے کیا سال وصال — آئی ہاتف کی یہ آواز کہ "خوش فکر مرا"

۱۲۵۳ھ

۲۴- مادۂ تاریخ فدا علی عیش لکھنوی کے لیے شاد لکھنوی کے قطعہ کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

شاد بہر چون پای فنا شد سال وفاتش مضاف
غسل موبی، حلۂ جنت، حور بہشتی، عیش جناں

عبدالحمید خاں اختر رام پوری کے ایک مضمون سے یہ جملہ مجلہ اخبار دبدبۂ سکندری رام پور ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ نقل کیا ہے۔

"منشی فدا علی عیش لکھنوی بعمر ۷۲ سال بہ ہفتہ گزشتہ"

لیکن اسی تاریخ لطیف کا پہلا شعر نقل نہیں کیا جس سے دن کا علم ہوتا ہے اور اس کی مدد سے صحیح تاریخ بھی دریافت ہو سکتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

عیش سخنور روز دوشنبہ چوں بہ ذی قعدہ برد
جمل روحش گشت پدید و گشت ارم زیب و عار جہاں (تاریخ لطیف ۱۸۲)

میں عرض کروں گا کہ ۱۳ ذی قعدہ کو یک شنبہ تھا اس رعایت سے ہفتہ گزشتہ میں دوشنبہ ۷ ذی قعدہ آتی ہے اور اس طرح عیش کا انتقال دوشنبہ ۷ ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ کو ہوا۔ رشید حسن خاں مطلع کے پہلے شعر کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے تاریخ بتانے میں ناکام رہے۔

۲۵- قدر بلگرامی پر حاشیے میں دیباچہ کلیات قدر سے کام لیا ہے لیکن تاریخ لطیف ص ۱۸۸ پر درج شدہ قطعہ تاریخ گفتہ غلام حیدر مجذوب بلگرامی شاگرد قدر کے ان شعروں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

روز یک شنبہ و بست و سوم ذی قعدہ
فوت کرد آں شے تسلیم غم داد دیلا

سند رحلت او داشت سخنور نوشت
شد مسند فصاحت بعدم او ا شد

۱۳۰۱ھ

۲۶۔ محمد قدرت کے ایک شعر سے نکالا گیا ان تاریخ بھی تلمیح تاریخ لمعات ص ۱۸۹ پر درج ہے۔ رشید حسن خان نے اس کی حیثیت واقع توجہ نہیں جانا۔ وہ شعر یہ ہے:

بعد ازاں ہم تو ہے قتیل کی تربت پہ لکھا ہے
یہاں پڑھ کے جھانکے کوئی اک دیوانہ آتا ہے

۲۷۔ باقر علی خان کامل کا قطعہ تاریخ از سالک تاریخ لمعات ص ۱۹۱ پر درج ہے۔ اس کا شعر جو رشید حسن خان نے نقل کیا ہے یہ ہے:

یہ کیا نوحہ ہے یہی تاریخ سن
نوجوان باقر علی خاں حیف ہے

قطعے میں اعداد ۱۲۹۳ درج ہیں جو اس مادے سے برآمد نہیں ہوتے۔ اس غلطی کی طرف مرتب صاحب نے قطعے کے صفحہ ۱۹۱ پر جہاں یہ قطعہ درج ہے ایک حاشیہ لکھ کر اشارہ کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ اعداد سہواً غلط درج ہوئے ہیں مصرعے سے ۱۲۹۳ھ نکلتے ہیں اور یہی تاریخ وفات ہے مرشی۔"

رشید حسن خان نے اس غلطی اور تصحیح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جبکہ وہ تین بار یہ اعداد کو غلط سمجھ کر نوٹ لکھ چکے ہیں ان مثالوں کے لیے دیکھیے زیر نظر مضمون کا نمبر ۵، ۶، ۷۔

۲۸۔ حکیم سید مہدی کمال کا دن اور مہینا دریافت کرنے کے لیے رشید حسن خان نے تذکرہ کاملان رامپور سے کام لیا ہے اور تاریخ بہجت (۱۹۵) کے درج ذیل قطعے سے اغماض کیا ہے جو جعفر علی خاں رئیس شمس آبادی نے کہا ہے۔

کرد تحقیق کمال شاعر نازک خیال
سید مہدی علی جائے نشین جلال
رفت چو زیر زمین گفت مورخ چنیں
آہ سخن با عدم گشتہ زوال کمال

۱۳۲۹ھ

۲۹۔ میر یونس لکھنوی کا مادہ تاریخ از میر نقی کے حاشیے میں آب حیات کے حوالے سے لکھا ہے۔

"میر محمد نواب یونس خلف میر خلیق برادر انیس۔"

لیکن تاریخ لمعات ص ۲۱۹ پر نقل شدہ قطعہ تاریخ از صاحب کے کلام میں نہیں ملتے جبکہ اس قطعے سے روشن ہوتا ہے

اور تاریخ سے کچھ معلوم ہوتا ہے۔ مزید اشعار یہ ہیں:

در مہ شوال کرد از درد دل فوز و وفات
در شب جمعہ دل احباب گشتہ دردمند
آہ قبل از نصف شب ثانی عشر از ماہ بود
کاں زباں داں جہاں را شد زباں یکبارہ بند
بہر سال ارتحالِ مومن را بسفتہ صفر گیر
وادکن مقلوب میم و نون بہم بیرون دو چند

۱۲۹۲ھ

۳۰۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا مادہ تاریخ از قر سندیلوی یوں نقل کیا ہے:

ہے سراپا ہیں علم و فضل و ہنر

اور اعداد ۱۳۳۰ھ بتلائے ہیں۔

لیکن ان الفاظ سے یہ اعداد برآمد نہیں ہوتے۔ دراصل یہاں رشید حسن خاں کا سہو ہے اور صحیح مادۂ تاریخ کے الفاظ اس طرح ہیں:

ہے و سراپا ہیں علم و فضل و اثر

۳۱۔ نواب کلب علی خاں والی رام پور کا قطعہ تاریخ وفات جو امیر مینائی اُستاد دربار رام پور نے کہا تھا۔ (تاریخ لطیف ص ۲۳۶ – ۲۳۹) میں نقل ہوا ہے۔ اُس سے مادۂ تاریخ رشید حسن خاں نے انتخاب کیا اور کلب علی خاں پر حاشیہ لکھتے وقت اس قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار کی طرف رجوع نہیں کیا۔

شاغل ذکر و نماز و عامل حج و زکوٰۃ
پیرو شرعِ حبیبِ خاصِ ربِ عالمیں
ز اہتمام اندر عہد او شد رام پور بہر پور
مُصطفےٰ آباد شد در دورِ او این سرزمیں
در ہزار و دو صد و پنجاہ پیدا گشتہ شد
در ہزار و دو صد و ہشتاد و یک مسند نشیں
در ہزار و سہ صد و چار از جمادی الآخرہ
بست و ہفتم چارشنبہ بہ ساعت چاریں

نگراں ندوۃ کرسی وحدت مسلمانان و الوگر

ندوۃ دینی یادداشت مذکور برائے بیتق

تحقیق کردہ خانہ حسیت سراج احمد

خطاب گاہ مالی اسلام امیر المومنین

(۱) صرف اللہ کی وجہ سے رشید حسن خان وقت کا وقت ضایع ہونے نہیں بتا سکے نہ پابندی صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کا کرسکے۔

مندرجہ بالا مثالوں کے ذریعے رشید حسن خان کی اصل پسندی اور موضوع سے بے توجہی پر گفتگو کرنے کا نو شکوہ کلام بھی دیا تھا۔ یہ امر میرے لیے ناپسندیدہ تھا مگر میں نے اس کو اس لیے کہ ایک ایسی تنقید کے خلاف جس کا احتیاط کے بغیر ہے جو علم پر چھا اور صحت مند نتائج پیدا کرتا ہے۔

مجھے امید بھی ہے اور میری یہ درخواست بھی ہے کہ رشید حسن خان جیسے اس اقدام پر صحت مند ہمدردی کے ساتھ یہ غور فرمائیں گے کہ وہ اپنے ایک مضمون میں مختصر سے موضوع پر لکھا گیا ہوتا تو فاحش غلطیاں کر سکتے ہیں تو انہیں دوسرے لکھنے والوں سے احتیاط اور توجہ کا کس حد تک مطالبہ کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ ایسی صحت میں جب کہ وہ عجلت سے کام کرتے ہیں انہیں کسی مطالبے کا حق پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔

عہدِ جدید کے شاعر کا ماڈل ۔ شاعرِ ندیم

طاہر ایم سید

ہر فنکار اپنی تخلیق سے پہلے اگر وہ کسی حد تک بھی اپنے فن کا وفادار ہے اُس خیال کو جسے وہ کاغذ یا پتھر کے سپرد کرنا چاہتا ہے، سالہا سال اپنے ذہن سے گزرتا ہے کوئی خیال اگر یکایک ہی ذہن میں آجائے تو وہ اپنے اندر اتنا حُسن نہیں رکھ سکتا، جتنا ایک صبر و ضبط کی منزل سے گزر کر وہ خیال منظم شکل اختیار کرکے سات پتھروں پر نقش و نگار کی صورت میں اُبھر کر حاصل کر لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو فنکار اپنے آپ کو اس دُشوار گزار اور صبر آزما تخلیقی عمل کے حوالے نہیں کرتا، وہ ممکن ہے وقتی طور پر اپنی جانب دُنیا کو متوجہ کرے مگر اُس کا کلام اور نام مستقبل میں زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکتا۔

قطعہ زِ ش بہانہ تراود ز دے
کش نہ گیری و در اندیشہ فتد سے ندہی

اس شعر کی تاب بہت کم لوگ لا پاتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے آپ سے یہ شکایت اکثر و بیشتر رہی ہے کہ میں اپنے خیال کو جلد سے جلد شعر یا پتھر میں تشکیل پایا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے اپنے تصور کو جسم دینے سے پہلے مہینوں سانس لیتی ہوئی دُنیا میں تلاش کیا ہے۔ کبھی میری تلاش مجھے بل بھی گئی ہے کبھی نہیں بھی ملی ہے، اس تلاش کا معاملہ ایسی صورت میں کچھ اور بھی نازک ہو جاتا ہے جب فنکار اپنی تخلیق کے ذریعے کسی خاص تھیم (Theme) یا کسی خاص عہد (Age) کی نمائندگی دینا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے موقع کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو جانا فنکار کی صلاحیتوں سے زیادہ اتفاقات پر مبنی ہے۔ یہ دو آنکھیں بھٹکتی رہتی ہیں مگر وہ چہرہ نظر نہیں آتا جس کو دیکھ کر زمانہ پکار اُٹھے،

ہاں خود سے شناسا یہ صدی بول رہی ہے

فنونِ لطیفہ کی تاریخ گواہ ہے کہ فنکار کی جستجو اس کی منزل کے نشانات کا کام دیتی رہی ہے اور ایک سچے اور اچھے فنکار کو ہمیشہ اپنی ناکامیوں میں کچھ کامیابیاں اور کامرانیوں کے اُفق نظر آتے ہیں۔ ہر دُھند سے روشنی کی ایک نئی کرن پھوٹی ہے اور ہر تاریک رات ایک نئے دن حقیقت کی ایک نئی صبح بن کر نمودار ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب تبھی ممکن صورت میں ہوتا ہے جب فنکار کے دل میں تمنا ایک بچے کی طرح ہو، ایک یقین اور ایک ایمان کی طرح ہو۔ سچائی، یقین اور اُس کے ساتھ استقلال جیسے دُنیا کے ہر بڑے ہنر کی ضمانت ہے اسی طرح فنکار اور اُس کے فن کی بقا کی بھی ضامن ہے۔ تلاش کا یہ سفر کبھی منزل بہ منزل ہوتا ہے اور راہی کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں تک پہنچا، اس کے پاؤں تھک تو نہیں گئے، اس کی تمنا کمزور تو نہیں پڑ گئی۔ عمریں بیت جاتی ہیں اور یہ تلاش

بہت سے عظیم فنکاروں کے شاہکاروں میں اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات فنکاروں کے عام و مسلکوں میں ... کو بھی ... کی تلاش اور عدم یکسوئی وقت کتنا درد عذر ساتھ اور کتنا دُکھ و آزار ہوتا ہے۔ یہ بات شاید کہنے کی ضرورت ہے کبھی کبھی یہ ہے کہ فنکار جس تلاش کے لیے اپنی زندگی تج دیتا ہے اور جس حسن کی کھوج میں اپنی نیند چین کھو دیتا ہے وہ حسن خود اس کے نزدیک ہوتا ہے جیسے اُس کی شہ رگ۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی شہ رگ کی آواز نہیں سنی اور اس کی حرکت کو محسوس نہیں کیا۔ ہم صرف اس کی انگلیاں تلاش کرتی ہوئی اُسے چھو رہی ہیں۔ حالانکہ یہ تنی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر اس کی آواز بند ہو جائے اور اس کی حرکت ختم ہو جائے تو یہ حقیقت بھی اور خواہش کی طرح ایک خواب ہو جائے۔

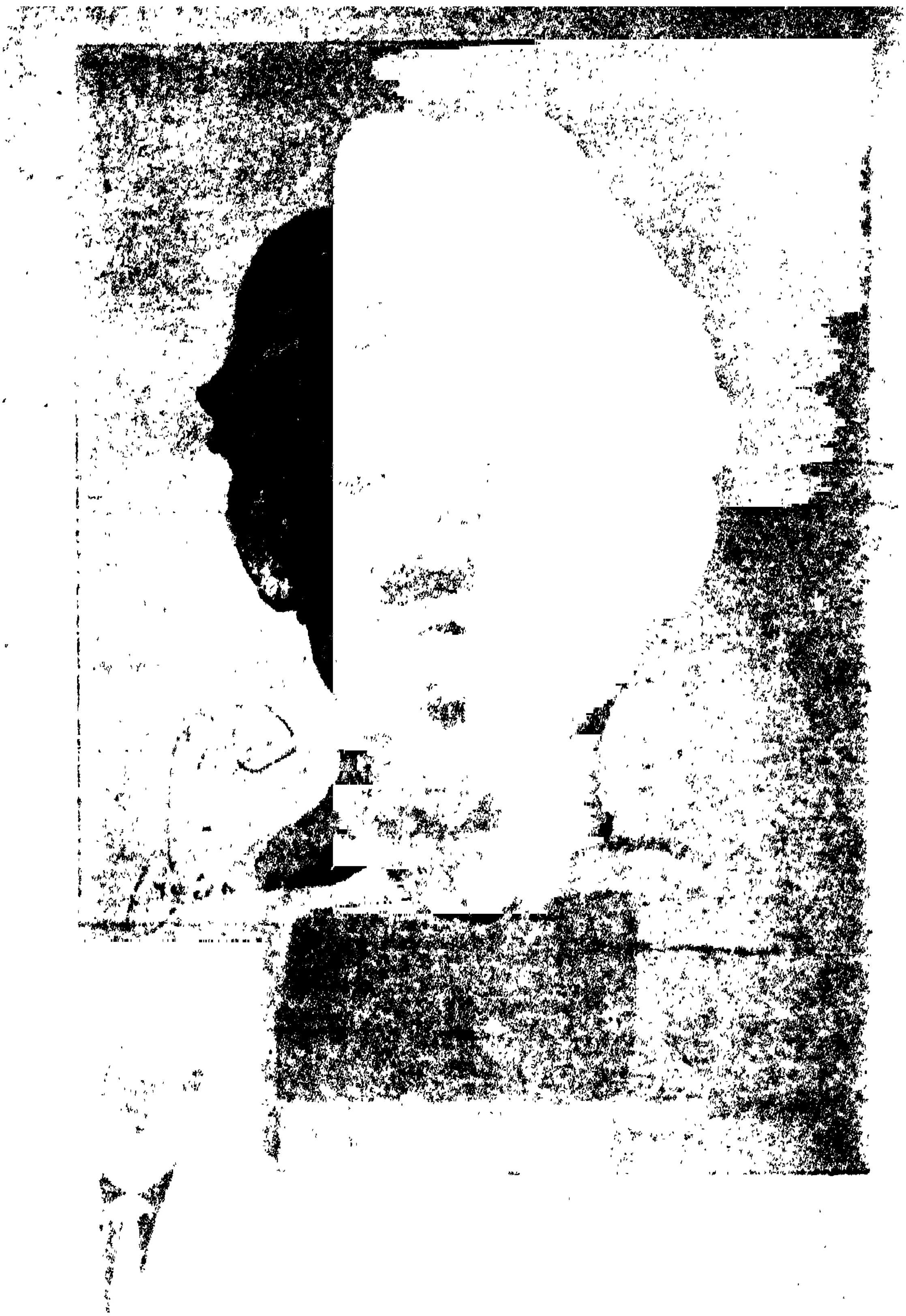
یہاں حسن کو فقط دیکھنے کے معنوں میں سے لیجیے یعنی ہر وہ چیز حسین ہے جو ایک فنکار کے فن کا موضوع ہو سکے۔ اس کے پیچھے میں بھی حسن ہے اور اُس کے کانٹے میں بھی۔ جو پھول کا محافظ بھی ہے اور مشام کا امتحان بھی۔ اُس کے لیے بہتے ہوئے دریا کی روانی میں بھی حسن ہے اور پانی کے بے ترتیب تڑپتے اور چیختے ہوئے موجوں میں بھی حسن ہے۔ اس کے لیے بکھرے بال کی سپیدی میں بھی حسن ہے جس میں گھری اپنے پیچھے من کی اس کے گیت گاتی ہے اس کے لیے بچوں کی تڑپ میں بھی حسن ہے جس سے آشیانے بنتے ہیں اور گھری کا دل بھی دہل جاتا ہے۔ حسن اس کے نزدیک حقیقت کا دوسرا نام ہے اور حقیقت سیاہ اور سفید دونوں ہوتی ہے وہ نرم و نازک بھی ہے اور تند و گراں سیل بھی۔

بڑا کٹھن تو ہوتا ہے ایسے موقع پر جب فنکار کو یہ علم ہو جائے کہ جس حسن کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا وہ پہلے ہی سے اس کے پاس تھا اس سے تسکین کا احساس؟ اگر وہ کچھ ہو بھی تو ختم ہو جاتا ہے اور پھر فنکاروں کے لیے اس حسن کے سوا کچھ نہیں رہ سکتا۔

میں اپنے آپ کو فنکار نہیں کہتا یہ بڑی جہالت کی بات ہے اور جرأت بھی جو گمراہ کرنے والی ہو۔ کبھی کبھی کوئی نقش اس خیال کا میرے دماغ میں آ جاتا ہے تو میں مریم کے بیٹے کی طرح اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اپنے دل کے بوجھ کو کم کر لیتا ہوں اور اس کے سبب بھی آئندہ کے لیے کام کرنے کا روشن اور صاف ستھرا راستہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ میں نے شطرنج کھیلنا شروع کیا ہے۔ اس کھیل میں عجیب عجیب شکلیں اور صورتیں بن جاتی ہیں جن سے میں خوش بھی ہو لیتا ہوں اور محظوظ بھی اور جنھیں بجا اور سنوار کر رکھ بھی دیتا ہوں اور ان پر میرا پیار ٹوٹ پڑتا ہے۔ لیکن وقت کی ایک صورت ایسی بھی آتی ہے جب میرے کھلونوں اور میری مخلوق کو مجھ سے شکایت ہوتی ہے کہ میں نے اُن کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اُن کی ترتیب میں بے ترتیبی آ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ آپس میں روٹھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ کل جو میری منزلیں تھے آج نشانِ منزل ہو گئے ہیں۔

یوں تو سفر کا ہر قدم ساحل اور راستے کے درمیان ایک طرح کا رشتہ ہوتا ہے جو ایک دفعہ قائم ہو گیا تو قائم ہو گیا لیکن پھر بھی ہر قدم یادوں کی کتاب پر گہرا نقش نہیں چھوڑتا۔ ان میں سے چند مقامات ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ماضی کے پردے میں چھپ جانے کے بعد بھی راہی کو یاد آتے رہتے ہیں اور ان پر چلتے ہوئے جو خود کو روشنی پہنچا کر مستقبل کی ... کو اپنا سفر جاری رکھنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں اور اس کی کامرانیاں جیسے اُس کی فتح مندیاں بنیں، اس کا حاصل بنے۔



میں بیکار بیٹھ کے اس کھیل میں اپنے ہاتھ سامنے اپنے چہرے پر اگرچہ کم سہی پھر بھی ماہ و سال کی اُڑتی ہوئی گرد و غبار کی ہلکی سی پرت پڑے دیکھتا ہوں اور یہ سوچ رہا ہوتا ہوں کہ میں نے اس مٹی اور پتھر کے کھیل میں کیا پایا۔ اور کیا کھویا ہے۔ کہنے کی تو ایک طویل داستان ہے ۔ میں سناؤں تو کون سُنے گا اور کیوں سُنے گا۔ پانے کی بات کروں تو مجھے خود شرم آتی ہے۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں !

بہرحال بقدرِ ظرف اور بقدرِ شوق میں نے کوشش کی ہے کہ میں اگر فن کی دیوی کے سامنے سُرخرو ہو کر نہ جا سکوں تو بھی کم سے کم تہی دست و تہی دامن تو نہ جاؤں اور مجھے حجاب [illegible] وقت یہ احساس ضرور رہے کہ میں نے اپنی توانائیوں کو فن کے لیے صرف کرنے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

میں نے خیال سے حقیقت تک ہر قسم کے کھلونوں کو جسم دیا ہے۔ میں ان میں سے کئی کھلونوں سے آج بھی خوش ہوں جیسے بہت سے کھلونوں پر نادم ہوں کہ میں ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ میں حُسن سے لفظ معنی اور پیکر ہر شکل میں لطف لیتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے الفاظ پر کوئی قدرت نہ ہو مگر پھر بھی اس رشتے سے جو فن کو فن سے ہوتا ہے میں نے ہمیشہ الفاظ و معانی کے نگاروں سے اسی طرح پیار کیا ہے جیسے جسم اور صورت سے۔

شاعری اظہارِ فن کا ایک لفظی اور معنوی رُوپ ہے چونکہ ہر فن اپنے اظہار سے پہلے اور اظہار کے ساتھ ساتھ بھی اپنے خالق میں جلوہ گر ہوتا ہے اس لیے میں نے تخلیق کو خالق میں ڈھونڈنے، پانے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی کا شعر بارود کے دھوئیں، مارچ کرتی ہوئی فوجوں کے بھاری بھرکم قدموں کی دھمک، مضطرب دل و دماغ کی کشمکش اور جسم و رُوح کی ساری پاکیزگیوں اور ملامتوں کا مظہر ہے۔ اس لیے اس کے خالق میں بھی ان سب کا سُراغ ملنا چاہیے۔ اس کے چہرے سے عظمتِ آدم اور اس کا فطری عزم و استقلال بھی ظاہر ہو، اس کے چہرے سے چاند کو چھونے کا قصہ بھی پڑھا جا سکے اور اس کی آنکھوں کے خلا کو دیکھ کر چھلک پی جانے کی بات بھی یاد آ جائے۔ وہ جوانی اور حُسن کے تقاضوں اور مطالبوں سے دبا ہوا بھی ہو اور جنگ و امن کے ماحول میں پرورش پانے سے وہ خطوط بھی اپنی پیشانی پر ابھارے ہوئے ہو۔ جو سے نفرت اور محبت پیدا کر کے فردوسِ حیات کی مہک کو سنگ کا سینہ دے دیا جا سکتا ہے۔ جیسے اس کی خاموش مگر جلتی ہوئی عاشقی نے صبر و ضبط کے وہ پیمانے ملا لیے ہوں جن سے دُوسروں کی پکارتی ہوئی عاشقی کو تسلی ملے۔ جس کے چہرے پر اضطراب خندہ تیغِ اصیل بن جائے اور جس کے پیش کا اطمینان گریۂ بہار۔

کسی نے کہا تھا بہت سے ایسے شاعر ہوتے ہیں جو عمر بھر شعر کہتے رہتے ہیں مگر ان کے قلم سے شاعری کا دُور دُور پتہ نہیں چلتا اور کتنے ہی ایسے غیر شاعر ہوتے ہیں جنھوں نے کبھی ایک مصرعہ موزوں نہیں کیا ہوتا لیکن انہیں دیکھ کر سوائے اس کے اور کوئی خیال ہی نہیں آتا کہ وہ شاعر کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں ———— یہاں میں جس کی بات کرنے چلا ہوں وہ شاعر بہت اچھا شاعر نظر بھی آتا ہے۔

[illegible] سے نصف صدی پہلے کے شاعر کا تصور ایک طنزیہ بات کا اظہار ہے کہ اس خیالی دور کے انداز کا شاعر [illegible]
جو [illegible] دنیا کی جو شکل ہے جیسا میں نے ابھی بیان کیا۔ کئی سالوں سے یہ وہ آبائی ساز جو ان شاعروں اپنے سے بیگانہ کردیوں،
آشنا، عہد حاضر کے افکار و اوہام کے سامنے میں پا رہا تھا اپنے بشرے پر وقت کی سختی کو معذرت کے آثار لیے سید ہا
کی خاموش پگڈنڈیوں پر چل رہا تھا۔ ان چپ چاپ پگڈنڈیوں سے حقیقت کی شاہراہ پر آئے وہ گزرنا مجھے آسان نہیں معلوم ہو
اور کئی بار مجھے شکست پر شکست اور پسپائی پر پسپائی اٹھانا پڑی۔ میں اپنے اس خیالی شاعر کو گوشت پوست کے پیکر میں دیکھ رہا
تھا، میری آنکھیں بے حد رہی تھیں، میرے ہاتھ کی ارتقا کی طرف بڑھتے تھے، ایک خاکہ بناتے تھے اور مٹا دیتے تھے لیکن مجھے نہیں
معلوم تھا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

جسے میں نے اتنا ڈھونڈا، تلاش کیا، اور جس کی خاطر میں اتنا پریشان اور آوارہ رہا وہ خود میرا دوست شاعر ندیم تھا۔

عہد جدید کے شاعر کا جو نقشہ میرے خیالوں میں بسا ہوا تھا اس کو مٹی میں ڈھال دیا، اگرچہ میں اپنی انا (Ego
سے کام لوں تو کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے فنائی مجسموں کے لیے ماڈل موجود ہونا چاہیے۔ دنیا کے سارے بڑے اسکیچ
یا پورٹریٹ جنہیں کوئی مقام ملا کسی نہ کسی ماڈل کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ لیونارڈو دا ونسی Leonardo da Vinci
نے مونالیزا (Monalisa) کو، رافیل سانزیو (Raphael Sanzio
نے مریم کو بنانے کے لیے لاوتا (La - Valla) کی بیٹی جاگتی صورت کا سہارا لیا۔ ڈوناٹیلو (Donatello)
نے سینٹ جارج (St. George) کو بناتے وقت اپنے ایک دوست کو سامنے بٹھالیا۔ اور ۰۰۰ قبل مسیح کے
ایک یونانی بت تراش فیڈیاس (Phedeas) نے تو خود اپنی ہی شکل کے نقوش اپنے اسکیچوں میں ابھار دیے جو
پردہ سزا کا مستحق بھی قرار دیا گیا اور اس کی محنت کا سارا ذخیرہ اس سے چھین لیا گیا۔ مائیکل انجیلو (Michealangelo
پندرھویں صدی کا ایہ ناز استاد مانا جاتا ہے اس نے بھی ڈیوڈ (DAVID) کو بناتے وقت اپنی تخلیق میں اپنے ایک شاگرد
اور چند دوسری صورتوں کے خدوخال اپنے ڈھنگ سے ترتیب دیا تھا۔ اس کا بنایا ہوا یہ مجسمہ آج بھی ہر لحاظ سے مکمل کہا جاتا ہے اور
جوانی اور بہادری کا نشان ہو گیا ہے۔ سترھویں صدی کے مشہور آرٹسٹ ریمبراں (Rembrandt
کی تصویروں میں اس کی بیوی ساسکی (Saskia) کے حسن کا پرتو ملتا ہے۔ اسی طرح رینوا (Renoir ،
گویا (Goya) ، کورٹ (Corot) ، ڈیگاس (Degas) وغیرہ کی تخلیقات کے
آئینے میں ان کی محبوباؤں کے عکس پائے جاتے ہیں۔

حقیقت پسند (Realist) کام کرنے والے تو بغیر کسی ماڈل کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے بلکہ
آپ کو [illegible] کہتے ہیں وہ بھی بہت سے حقیقی مناظر اور حقیقی تصویروں کو ذہن نشین کرنے کے بعد اس لائق ہوسکے ہیں
مزید یہ کہ جو لوگ اپنے آپ کو امپریشنسٹ (Impressionism) یا [illegible] آرٹسٹوں میں شمار کرتے ہیں اور

... ... کے علمبردار ہیں۔ اپنی تخلیقات میں ان چیزوں کا سایہ پڑنے سے نہیں روک سکتے جو کسی نہ کسی طور انھیں عزیز ہیں یا جن کا دخل ان کی زندگی میں ہے۔

انیسویں صدی کا مشہور آرٹسٹ وان گاف (Van - Gogh) جس کا نام آرٹ کی دنیا میں ایک انقلاب لانے والے کی حیثیت سے بے حد شہرت رکھتا ہے۔ ناکام عشق بھی تھا، ناکام دولت بھی اور اپنے جیتے جی ناکام شہرت بھی رہا اس نے بھی کئی جگہ اپنی محبوبہ ارسیلا (...) کی تصویر کشی کی ہے۔ آج بھی آرٹ کے ذریعے پیغام دینے کے لیے ضروری ہے کہ آرٹسٹ کے پاس اپنے گرد و پیش کے بارے میں گہری بصیرت اور تجربات کا ایک سلسلہ موجود ہو۔ آج کے دور کے فنکار کے لیے یہ گرد و پیش اور یہ تجربات دل و دماغ پر چھائے رہیں گے۔ ہر ایک رجسٹرڈ خیال کی اصل اسی دنیا میں موجود ہوتی ہے ممکن ہے وہ سمجھ میں نہ آئے اور تحت الشعور کی کال کوٹھڑی میں بیٹھی ہو مگر وہ ہوتی ضرور ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔ خوشی اور غم جو بظاہر محسوسات اور واردات ہیں اس مادے ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر ان کا مظہر نہ ہو تو احساس بھی آسان نہیں۔

آرٹسٹ کا موضوع اس کے دماغ کی نس نس میں بسا ہوتا ہے یا بسا ہونا چاہیے۔ وہ اس کا تجزیہ کر پائے یہ ذکر پائے یہ تو اس کی اپنی حیثیت ہے کہ جس موضوع کو وہ اختیار کرنا چاہتا ہے وہ اسے کہیں نہ کہیں بکھرا نظر آ جائے۔ کیا یہ میرے لیے مسرت، انبساط اور فخر کی بات نہیں ہے کہ مجھے وہ سارے اوصاف صورت کے اور معنی کے جو کہ میں عہد جدید کے شاعر کے بشرے میں دیکھنا چاہتا تھا ایک جا مل گئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے غیر شعوری طور پر شاعر ندیم کے چہرے کو اپنے تخیل کے تصویر خانے میں سجا رکھا ہو اور ایک عرصے تک میں یہ شعور نہ پا یا ہو کہ یہ میرا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا چہرہ ہے لیکن اس مسرت کا احساس ایک فنکار ہی کر سکتا ہے جو مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے اس کے چہرے میں اپنے تصورات میں بسائی ہوئی ساری امانتوں کو ایک ایک کرکے محفوظ پایا۔

اپنی پہلی فنکارانہ پہچان کے بعد میں نے اسے بار بار دیکھا اور اسے یہ بتلائے بغیر کہ وہ میرا موضوع بننے والا ہے میں نے اس سے مختلف باتیں کیں اس کے شعر سنے اس کی صورت کو اپنی آنکھوں میں جذب کیا اس کے چہرے کو جی لگا کر دیکھا اور اس تناسب میں نئی صدی کے ... غم، خوشیاں دیکھیں، حق اور ناحق دیکھیں۔ اس کے چہرے میں مجھے نزاکت نظر نہیں آئی مگر جمال ملا۔ اس میں آج کی تلخیوں کے ساتھ مستقبل کی بھیانک جنگ کا خوف و ہراس نظر آیا جو ہر دم ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ اس کے چہرے میں مجھے اس جنگ کی کم وقتی اس کی سراغ ملا اس جنگ سے نپٹنے کا حوصلہ بھی ملا اور فتح کے یقین کی چمک بھی ملی۔ مجھے عزم و استقلال بھی ملے اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ستاروں سے ڈھکوں کو مسخر کر چکا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میرے اسکیچ کی سطح کھردری ہے۔ چہرے کے تاثر کو بنانے میں اس کی بڑی بڑی غلافی اسے مدہوش آنکھوں کے گرد حسرتوں کے حلقے اور گالوں کے گڑھے مددگار رہے ہیں۔ گھنے بالوں کی بے ترتیبی بھی اس عہد کی افراتفری ابھار گئی ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ نئی صدی کے شاعر کے پاس خوشی ایک ہے غم ہزار ہیں۔

میں نے اپنے ماڈل کا تعارف کرا دیا۔ یہ تعارف ظاہر ہے کہ صحت کا زیادہ ہے معنی کا کم۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں نے فن کے سامنے رکھ کر۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے اس سے مختلف باتیں کی ہیں اس کی تخلیقات کو سنا ہے اور یہ محسوس کیا ہے ... ... کہ بہت کچھ ہے اس کے کہنے کا بے پناہ سلیقہ ہے۔ اس کے یہاں گہرائی اور گیرائی دونوں ہیں۔ اس کے باوجود وہ جب ...

اپنے لمسیات کے باقی رہتے ہیں اور کرتا نہیں ہوتا کچھ نہیں کرتا۔ اس پر خاموشی کے طویل دورے پڑتے ہیں اور ایک ایک لمحہ خاموشی میں سال ایک مسلسل عذاب میں گزرتا ہے یا کر شاید اس کے اندر کا فن کار گم ہو گیا ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اظہار پھر اپنی صدی دکھ کا پن کے ساتھ ابھر آئے۔ میرا گمان ہے (ممکن ہے وہ انکار کرے) کہ شاید کسی خاموش مسرت نے اسے اب وجود سے بے نیاز کر دیا ہو دوسروں کی خدمت ہی میں لگا رہا ہے، یہ تاثیر بغیر کسی درد کے پیدا نہیں ہوتی۔

مجھے کہنے دیجیے کہ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ اس کا سچ یہی میری واقفیت ہے بلکہ وہ صرف اپنے گاؤں کو جاننے کا دعویٰ ہے۔ وہ اس کی گفتار میں اسے تلاش کرنے کا کام، وہ میں اس مقالے کے پیچھے چھوڑے دیتا ہوں۔ ان کی یہ سطریں لکھتے وقت بھی اس کی ایک نظم کے ابتدائی مصرعے پکار پکار کر گونجتے سنائی دے رہے ہیں۔

جسم کی پیاس تو ہر شہر میں بجھ سکتی ہے
ذہن آوارہ کو منزل کا پتہ دے کوئی

دیکھنا ہے اس کھوج میں اس کا ساتھ کون دیتا ہے۔

سرشار بہ حیثیت انشائیہ نگار

ڈاکٹر احراز نقوی

انشائیہ نگاری پر قیامِ پاکستان کے بعد اچھا خاصا کام ہوا ہے۔ تحقیقی انداز کا، تنقیدی نوعیت کا اور تخلیقی پیمانے پر بھی کام ہوا اور ادھر چند برسوں سے منطقی اور فکری انداز کے مذاکرے اور بحثیں بھی ہو چکی ہیں۔ ہندوستان سے دو پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ فنی حدود، ہیئتی قیود اور فکری نمود کے سلسلے میں بے شمار نکتے باعثِ نزاع بنے ہوئے ہیں۔ یہ تو تنقیدی سطح کی بات ہے۔ تحقیقی حساب کتاب میں جہاں یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ ہمارا پہلا انشائیہ نگار کون ہے؟ یا ہمارے ادب میں انشائیہ نگاری کا سلسلہ کب سے اور کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ وہاں ہمارے بہت سے انشائیہ نگاروں کے نام بھی فہرست سے غائب نظر آتے ہیں۔

اردو ایسے موضوع پر کسی نقاد اور محقق نے اپنی بحث میں غالباً سرشار کا ذکر نہیں کیا۔ اور یہی سبب ہے کہ اردو انشائیوں پر تمام انتخابات ہو چکے ہیں مگر سرشار کا کوئی بھی انشائیہ کسی بھی انتخاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ دراصل وجہ اس کی یہی رہی کہ سرشار کے انشائیوں کو دریافت ہی نہیں کیا گیا اور نہ اس تصور کو ہی روا رکھا گیا کہ سرشار انشائیہ نگار ہو بھی سکتے ہیں۔

سرشار کو ناول نگار کی حیثیت سے میں نے اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع بنایا اور مختلف تحقیقی مرحلوں کو سر کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سرشار پر تحقیق ابھی کئی پہلوؤں سے باقی ہے۔ ہمارے یہاں سرشار پر کام کرنے والوں نے بڑی ہی آسانی سے کام لیا ہے اور تحقیقی نوعیت سے تو کچھ کام ہی نہیں ہوا ہے اور جو کچھ تحقیقی سرمایہ ہمارے پاس ہے وہ بہت کچھ مفروضوں پر استوار ہے۔ غلط ـــ اور گمراہ کن ہے۔

ہمارے نقادوں نے ہمیشہ سرشار کو ایک ناول نگار سمجھا اور فسانۂ آزاد سے آگے ان کا قلم نہیں بڑھا۔ بہت کم ہمارے پاس ایسی تحریروں کا سرمایہ ہے جن میں اس کے علاوہ بھی کچھ ملے۔ مگر ـــ

۱۔ سرشار بحیثیت انشائیہ نگار

۲۔ سرشار بحیثیت شاعر

۳۔ سرشار بحیثیت صحافی

۴۔ سرشار بحیثیت مترجم

۵۔ سرشار بحیثیت نقاد

۶۔ سرشار بحیثیت علمی اور معلوماتی مضمون نگار۔

ان موضوعات پر کہیں کوئی مضمون تو کیا ضمناً یا برسبیل تذکرہ بھی ذکر نہیں ہوتا۔

سرشار بحیثیت انشائیہ نگار — یہ میرا تحقیقی وجدان تھا جو مجھے ہر وقت اسی امر پر اکساتا تھا کہ سرشار نے یقیناً انشائیے لکھے ہیں جب میں نے اپنے کسی مضمون میں قدرے اس کا ذکر بھی کیا تھا اور یہ کہا ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ سرشار محض کچھ تراجم اور ناول نگاری پر اکتفا کرتے یہ ان کے زمانے کی روایت کے خلاف تھی۔ ذرا ۱۹ویں صدی کی مطبوعاتی صحافت پر نظر کیجیے۔ اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ خیر خواہ ہند (۱۸۴۷ء) ماسٹر رام چندر سے لے کر ۱۹ویں صدی کے سب سے آخری ماہنامے پردہ عصمت (۱۸۹۹ء)، عبدالحلیم شرر تک تمام ادبی جریدے دو حصوں میں منقسم نظر آتے ہیں، اول حصہ نظم اور دوم حصہ نثر۔ حصہ اول شاعری پر مشتمل اور حصہ دوم نثر پر محیط مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نثری تحریریں کیا ہوتی تھیں؟ ظاہر ہے کہ کل کی طرح افسانے، انشائیے، تحقیقی مقالوں کا رواج تو نہ تھا۔ عموماً معلوماتی مضامین ہی سے جلدوں کی تشکیل کی جاتی تھی تنقیدی مضامین برائے نام لکھے جاتے تھے۔

اس عہد کے تمام صاحب قلم انہی موضوعات کو اپنے تحریر بناتے تھے۔ تصوف، الہیات، منطق اور فلسفے کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ہیئت اور نجوم وغیرہ موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے جاتے تھے اور تمام صاحب قلم اس میں شریک تھے۔

سرشار نے اپنی تحریر کی بسم اللہ اسی نہج پر کی۔ ابتدا میں مراۃ الہند، کشمیر درپن، وکیل، ریاض الاخبار، اودھ پنچ اور اس کے علاوہ انگریزی کے کچھ اخباروں میں مضامین قلم بند کیے۔ وہ مضامین کو نہیں ایک جگہ سے شائع کراتے تھے۔ تقریباً یہ تمام مضامین ہنوز دستیاب نہیں ہو سکے۔ کچھ چیزیں بے حد تلاش کے بعد مل سکی ہیں۔ میرا اندازہ ہے سرشار کے یہ تمام مضامین اکٹھے کیے جائیں تو مختلف نثری اصناف کا ایک بڑا متنوع گلدستہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام تحریریں سائنس، ہیئت، تنقید، معاشرتی، علمی، معلوماتی اور ادبی موضوعات پر محیط ہیں۔ ان نثری سرمائے کو سامنے رکھ کر ہم اردو انشائیوں کا بھی ایک خوبصورت گلدستہ مرتب کر سکتے ہیں۔

نقوش کے اس شمارے کے لیے میں نے چند نمونے سرشار کی تحریر سے انتخاب کر دیے

ہیں دو تنقیدی مضامین ہیں پہلا شاعری سے متعلق ایک چھوٹا سا نزعی مضمون ہے۔ دوسرا نثری صنف پر یعنی ناول کے فن پر تنقید ہے اس مضمون کو سامنے رکھ کر ہم ان کی فنی بصیرت اور ان کے ناولی ادراک کا ایک ہلکا سا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تیسرا عشق کے عنوان پر انشائیہ ہے جو ہلکے پھلکے انداز سے من کی موج میں بہہ کر لکھا گیا اور چوتھا مضمون بنی نوع انسان پر ہے جس میں اردو انشائیہ کا انداز اور ہلکا پن نظر آتا ہے۔

یہ تمام تحریریں میں نے دبدبۂ آصفی کے ذخیرے سے دریافت کی ہیں۔ دبدبۂ آصفی، سرکشن پرشاد نے نکالا تھا۔ سرشاد اس کے اڈیٹر تھے جس کا ضمناً ذکر میں نقوش ہی کے ایک پچھلے شمارے میں چنپل نامہ کے ذیل میں کر چکا ہوں اور دبدبۂ آصفی پر تفصیلی اور تحقیقی مضمون نقوش کے آئندہ شمارے میں پیش کروں گا۔

عشق

ہائے اس عشق میں رونا ہی نہ آساں نکلا   جس کو ہم قطرہ سمجھتے تھے وہ طوفاں نکلا

عشق کس کو کہتے ہیں اس کا حال کسی چوٹ کھائے ہوئے دل سے پوچھیے۔ وہ دل جو مسلک عشق میں فنا ہو گیا ہو۔ وہ دل جو عشق کے صدمے اٹھانے کا جگر رکھتا ہو۔ وہ دل جو عشق کی کڑی منزل میں تھک کے بیٹھ گیا ہو مگر ہمت نہ ہارا ہو۔ وہ دل جو راہ عشق سرد و گرم چشیدہ ہو۔ وہ دل جو عشق کی بھول بھلیاں بھٹک بھٹک کر کعبۃ اللہ جانے جاتے ترکستان کا ڈھیرا پہنچے اور بحر اوقیانوس ہو کر خوارزم پہنچنے کا سیدھا راستہ سمجھے۔ وہ دل جس کی رگ رگ نشتر غم کی خوگر ہو۔ وہ دل جو نخچیر بن کر حوادث ہو کر صیاد جفا پیشہ کو لاکھوں دعائیں دے۔ وہ دل جو زخم پیکاں کے اندمال کے بدلے مرہم کے عوض نمک کا طالب ہو۔ وہ دل جو طبیب کو اجل اور اجل کو مسیحا سمجھے۔ وہ دل جس میں سوائے غم کا درد اٹھے کے ٹھکانا بنا ہو کہ اس مقام پر چوٹ لگی تو تڑپنے کا مزہ آئے۔ وہ دل جس پر عشق کا زخم کاری پڑا ہو۔ وہ جو اس دل کی لذت اٹھا کر دہیں زخم سے قاتل کو پکارے۔ وہ دل جو کسی عشق کے دریائے ناپیدا کنار کے منجدھار میں ہو اور نہ خدا ساحل ہو جس کا خدا ہی بیڑا پار کرے تو ہو۔ وہ دل جو عشق کے مرکز دار کے زہر ہلاہل کو زبان فاروق مذاق پر ترجیح دے۔ وہ دل جو حنظل عشق کو سلسبیل پر فوقیت دے۔ وہ دل جو کوچۂ عشق کا نشیب و فراز دیکھا بھالا ہو، بچپنے ہی سے دایۂ عشق کی گود میں کھیلا ہو، ناز و نعم سے پالا ہو۔ وہ جس کی ترکیب عشق ہو۔ وہ دل جس کی رگ رگ میں عشق کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔

روکھی پھیکی طبیعت پیدائش والے بھلا عشق کا حال کیا جانیں۔ اس قسمت کے اور ایسی دولت لازوال سے ان کو کیا سروکار۔ وہ عشق کو نفرت... عاشق کو جنون خیال کرتے ہیں اور عاشقانہ کلام، عاشقانہ خیالات کو ادب کی نہ سے گرے سمجھتے ہیں۔ یہ عقل و دانش ...یت۔ یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ کل بنی نوع انسان میں ہر فرد بشر کو ایک ہی قسم کا عشق ہو۔ یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ عشق کے لفظ کا ... زیادہ تر عورت اور مرد کے عشق پر کیا جاتا ہے بلکہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد کا عورت پر عاشق ہو جانا اور عورت کا مرد پر جان دینا بس اسی کا

[ا]م حقیقت یہ معلوم ہوئی ہے کہ یہ عشق بھی فاش ہے۔ عشق ایک عام چیز ہے۔ اس کا اس طرح پر شمار کرنا یوں ہے۔ عشق انسان کو ہر شے سے
ہوسکتا ہے۔ کسی کو گھوڑوں کا شوق ہے۔ اپنی حیثیت کے موافق گھوڑے خریدے جاتے ہیں۔ اگر امیر ہو تو ایک طرف کبھی گھوڑے
سے ہی ہو کی چیز میں انسان آ دا ہچپ جاتے کسی جانب عرب کے نایاب گھوڑے کبھی کاٹھیاواڑ کے عمدہ جانور منگائے جاتے ہیں
یلست کیپ کے اونچے اونچے ڈیل ڈول کی قدر ہے۔ بیگم کے تانگے میں جو گھوڑا ہے کس ہا کر بہت اور قد قامت اور عمدہ کا کام ہے
ہیں۔ پہاڑی یا ایرانی ... ترکی مشہور گھوڑوں کی کمی نہیں۔ معلوم ہوا کہ عرب کے گھوڑے کی نسل آپ ہی خیر ہیں مگر قد چھوٹا ہوتا ہیں
ذرا عیب ہے۔ اس عیب کو دور کرنے کے لیے کاٹھیاواڑ کی پوری تیز ہوئی جوان جوان گھوڑیاں منگوائیں اور عرب کے خوبصورت گھیروں کو
ملا ملا کر تیار کرنے کی ان گھوڑیوں سے ملایا تو جو بچے پیدا ہوئے ساری خدائی کے گھوڑوں میں فرد۔ غرضیکہ ان کے اصطبل میں ہر طرح کے
ترکی، عربی، تازی، کیپ، پیگو، کاٹھیاواڑ، دکھنی، پہاڑی، چینی ہر قسم کے جانور باد رفتار موجود اور

قدم کا وا ایڑ لو میٹھی پوئی دولا جمنا
میں سب ساتھوں میں ترکی اور تازی تیری لاثانی

ان بات اصطبل میں۔ اس کی سواری کا شوق ہی نہیں۔ نادر ی تکرار کبھی آتی ہے؟ لیکن کبھی نہیں یہاں کی اٹھائی گئی۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑا
اٹھنے اور مکھریاں کرنے کو خود تیار۔ سالوتری کی نوکر۔ خود مویشی خصوصاً گھوڑوں کے علاج سے واقف۔ غرضیکہ ان ہاتھ اسی میں
خالی اصطبل۔

بعض آدمیوں کو اپنے بچوں سے عشق ہوتا ہے۔ یوں تو اپنے بچوں سے کس کو عشق نہیں ہوتا۔ لیکن بعض احباب کے اور لوگوں کی
نسبت اپنے بچوں سے زیادہ عشق ہوتا ہے۔ شب و روز انھیں کی فکر۔ انھیں کا خیال۔ انھیں کے غور و پرداخت۔ عورتوں کی طرح خود پالنا
نہلانا دھلانا، اپنے پاس سلانا، اگر ذرا چھینک بھی آئی تو گویا ان کے دل پر تیر لگا۔ یوں ہی سا بدن گرم ہوا اور گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ڈاکٹر
ڈاکٹر۔ طبیب پر طبیب آ رہے ہیں۔ تیمارداری اور کیفیت کہ آئینہ کہ ننھے ذرا احتیاط کمال سے باندھنا کرلی دوا خراب یا وزن کم وبیش نہ
ہونے پائے۔ جس چیز پر بچے نے ذرا رغبت کی فوراً مول لے دی۔ جو اس نے کہا وہی ہوا۔ بالک ہٹ کو کبھی ٹالا نہیں۔

خیر یہاں تک تو خیریت ہے مگر اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر اس عشق کے ساتھ بچوں کی آئندہ بہبودی کا خیال رکھا تو عشق کو سچا
کامل کہیں گے۔ علم و فن کے زیور سے ان کو آراستہ کیا۔ پڑھانا۔ لکھانا۔ صحبت بد سے بچانا۔ لائق و فائق اتالیق ان کے لیے مقرر کرنا۔ یہ سچا
عشق ہے۔ یہ کچھ فرض نہیں کہ ہر بیٹا اور لڑکے کو پڑھانے لکھانے ہے۔ ضروری معمولی تعلیم کے بعد کوئی پیشہ سکھانے۔ بڑھئی کا
بیٹا کو بڑھئی یعنی نجاری کا کام سکھائے۔ سنار سناری کے پیشے میں اس کو طاق کرے۔ کسان کا لڑکا زراعت کے اصول سے واقفیت حاصل
کرے اور اگر اس کے برعکس والدین لڑکے کو کوئی کام نہ سکھایا نہ علم یا پیشہ سکھایا تو وہ لاڈ پیار کے گنوار کا گنوار نکلے گا اور سب کہیں
کہ اس کے باپ ماں نے لاڈ میں اس کو خراب کر دیا ہے اور دنیا میں کسی کام کا نہ رکھا۔ اس قسم کے عشق پر تف ہے۔

بر سر لوح او نوشتہ بزر — جور استاد بہ ز مہر پدر

بعض شوق اس قسم کے ہیں کہ عشق کے درجے کو رفتہ رفتہ پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ان سے کوئی فائدہ مقصود نہیں۔ بالکل بیکار شوق۔

وہ کون شوق۔ بٹیر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی، بینڈھے لڑانا۔ ہم کو اس قسم کے شوق سے نفرت ہے۔ کبوتر پالنے جوڑا نے پر پامال۔ دوپہر کو جلتی تپتی دھوپ میں چیل انڈا چھوڑ رہی ہے اور آپ کو۔ کو کر رہے ہیں۔ کنی دکھا رہے ہیں۔ مرغ بازی اس سے بھی بدتر ہے۔ ایسا ظالمانہ شوق دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ مرغ بیچاروں کی جان عذاب میں ہو جاتی ہے۔ دو دو پہر گھنٹے پڑے ہیں جن دن اس شغل پر دنیا و مافیہا کے کل اشغال کو فوقیت دیتے ہیں اور خرچ کرتے کرتے ان کے دھوے اڑ جاتے ہیں۔ پتنگ بازی کار بیکاراں۔ چڑیوں کو پالنے کا شوق بھی انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتا۔ بشرطیکہ چڑیوں کے ساتھ عشق کا درجہ ہو۔ اور نتیجہ اس کا کیا۔ لینا ایک نہ دینا دو۔ ہاں اگر شوق کے لیے۔ سو پانچ پنجری خوش نوا، خوش نغمہ، خوش رنگ طیور رکھے ہوئے تو مضائقہ ندارد۔

عورت کا عشق مرد اور مرد کا عشق عورت کے ساتھ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس سے مطلب اس عشق سے نہیں ہے جو بعض نوجوانوں کو زنانِ بازاری کے ساتھ ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی عشق میں عشق ہے۔ یہ عشق کا نام بدنام کرنا ہے۔ یہ عشق نہیں ہے، فسق و فجور ہے۔ اس شہوت پرستی کو اگر واقعی عشق کہتے ہیں تو ایسے عشق کو عقلا کا سلام۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فہمیدہ آدمی زنانِ بازاری، ہرجائی، بدکار، ... عورتوں پر کیونکر لٹو ہو سکتے ہیں۔ آج ایک کی کل دوسرے کی، پرسوں تیسرے کی۔ اس وقت زید کی بغل میں دو دن بعد بکر سے ملاقات۔

شاید ہوس باشتہ با کلے   کرمے با ماوش شود بلیے

عشق سے اس بیہودہ بات کو کوئی سروکار نہیں

ممکن ہے کہ کسی مرد کو کسی عورت کا عشق ہو اور وہ عشق پاک ہو اس کو بعض کوتہ اندیش معاملات سے بہتے ہیں مگر یہ ان کی نافہمی عقل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پختہ مغز نہیں ہیں۔ چھوٹے خیالات کے آدمی ہیں اور ان کی طبیعت بدی اور فسق و فجور کے دلدل میں ... اور ... ہوتی ہے کہ اُبھر نہیں سکتے۔ اگر کوئی شاعر غزل جو اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو کسی شاعر دوست کی زبان ... کا کلام سن کر ... دل پر نشتر کا کام کرے تو بیشک اس کی روح وجد کرنے لگے گی اور عشق کا درجہ ہو جائے گا۔ عام ... ہے کہ شاعر وہ جوان ہو یا بوڑھا حسین ہو یا کریہہ منظر۔ حسنِ ظاہری کا وہ عاشق نہیں۔ وہ تو حسنِ باطنی کا عاشق ہے۔ وہ جادو جو ان آنکھوں پر نہیں ہے وہ بیان کے جادو کا دلدادہ ہے۔ سخن اور فصاحت وہ جادو ہے کہ اس کی تہ روح میں بات ... ہو جاتے ہیں اور اس کی منزلت کو وہی پہچانتے ہیں جو پہچانتے ہیں۔ یہ کچھ فرض نہیں ہے کہ انسان نہیں عورت کو دل سے چاہے۔ بدن کا خیال ان دونوں میں ہرگز نہیں۔

بہ مجنوں گفت روزے ساربانے   چہ بیہودہ دشت اندر کانے
اگر با لیلیٰ ات باشد سروکار   ...
در عشق بکار دیگر است   ...
ز حرف ساربان مجنوں برنجید   جواب این داد و زیر لب بخندید
میان عاشق و معشوق رمزیست   کرام الکاتبین را ہم خبر نیست

رموزِ عاشق و معشوق بدآنند
چہ داند ابلہ اشتر می چراند

مجنوں سے کسی ساربان نے کہا کہ میاں تم دشت نوردی کیوں کرتے ہو لیلیٰ تمہاری ہتھنی چڑھی ہے۔ مصرعہ

ایں خباثت و نجاست مجنوں

مجنوں نے ہنس کر کہا تو اس پیر میں نہ پڑ تجھے معشوقوں کے عشوے اور غمزے سے کیا سروکار تو شتر غمزے کا عادی ہے اپنے اونٹ چرا۔

دردِ الم عشق زلیخا کا طبیعت   خواہش وصل زنا انصافیت

اب ذرا سے سمجھنے کے قابل ہے۔ اگر عشق یہی چاہتا ہے کہ فلاں بدنمکوس ہمدم، سنبل مو، آتش میدہ ہم بستر بلکہ ہم آغوش ہوں تو کام عشق نہیں یہ تو صرف خواہش نفسانی ہے۔ جس کو شہوت پرستی کہتے ہیں۔ اگر وہی محبت علیل ہو کر بد قطع ہو جائے یا چیچک نکلے اور وہ جاتا رہے۔ پھر دیکھیں معنوی عاشق صاحب کیونکر محبوب مطلوب سابق پر مرتے اور جان دیتے ہیں۔ ہاں سے بڑھ کر عشق کسی کو ہوتا۔ اس کی انتہا مشہور ہے۔ اگر وہ کالا بیروس بھی ہو جائے تو اس کو نیچے سے وہی محبت رہے گی جو پہلے تھی عشق اس کو کہتے ہیں ۔۔ عشاق کے زمرے میں عاشق اللہ کا بہت بڑا درجہ سمجھا جاتا ہے اور ہماری ایک غزل کا مقطع اسی مضمون کا ہے۔

چھوڑ کر عشق حسینانِ جہاں ای سرشار   عاشق اللہ کا ہو عشق بشر کچھ بھی نہیں

مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہ باتیں کچھ حقانی آدمیوں ہی کو پسند آتی ہیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم نے خدا اللہ والے لوگوں کو عشق حقیقی میں گم پایا۔ بحر عرفان میں غرق فنا فی اللہ لیکن ناداں خشک سے ڈر کر کہتا ہوں کہ ہمارے نزدیک دنیا دار آدمیوں کے جو عشق سب عاشقوں سے بڑھا ہوا ہے وہ اور ہی عشق ہے دنیا دار کے لفظ کو یاد رکھیے گا۔ مگر گرہستوں کا ذکر ہے۔

جو بہت پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

ان کے نام پر درود پڑھیے ان کا درجہ ہم جاہل لوگ کہاں سے پائیں۔

خیر وہ عشق کیا ہے اسے وہ عشق ایسا ہے کہ اس سے بغیر عشق ہو ہی نہیں سکتا بشرطیکہ دل ملے ہوئے ہوں جس عشق کا ہم اب ذکر کرنے والے ہیں وہ عشق انسان کو چوندھیا دیتا ہے۔ جان کی کوئی حقیقت نہیں مال کیا چیز ہے یعنی میاں بی بی کا۔ بی بی میاں پر پروانہ۔ میاں بلبل کی طرح شیدا۔ میاں کی دلی آرزو کہ یا اللہ میں چاہے ایک دن فاقہ کیا کروں مگر میری پیاری بی بی آرام سے رہے۔ بی بی روز صبح شام دعا مانگتی ہے کہ یا خدا پاک رانڈی کی کوئی اور تمنا نہیں ہے سب سے تو یہ ہے کہ میرا سہاگ ہمیشہ قائم رہے۔ میاں نے بی بی کو دیکھا تو غم غلط ہو گیا۔ بی بی نے میاں کی صورت دیکھی تو باچھیں کھل گئیں۔ گویا تمام دنیا کی نعمتیں مل گئیں۔ اگر میاں کے پاؤں پر کانٹا چبھے تو بی بی کے گویا رونگٹے رونگٹے پر کسی نے نشتر پر نشتر چبھو دیے اور اگر بی بی کا پنڈا پھیکا ہوا تو میاں کی کوئی حد نہیں۔

بی بی چاہے بدشکل ہی نہ ہو مگر عشق کے یہ معنی ہیں کہ میاں ہر حالت میں شیدا ہیں۔

انسان چاہیے جس قدر تھکا ماندا شل ہو بھر اپنے پیشے کے مطابق محنت شاقہ کرکے شام کو گھر آئے اور بی بی کے گورے گورے پیارے گالوں کو ادھر اُدھر چومے تو ان گرما گرم بوسوں سے سب تھکاوٹ دُور ہو جائے۔

پیپرز پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی حیدرآباد دکن
۲۰ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ۔ جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱

نوع انسان

یہ آدمی ہے کہ برسوں بحال رہتا ہے — وگرنہ ماہ و کوکب شب کا ساں رہتا ہے

حضرت انسان نے اپنے لیے اشرف المخلوقات کا خطاب فضیلت انتساب تجویز فرمایا ہے۔ دیدۂ انصاف وا کرکے دیکھیے تو یہ خالی [illegible] میاں مٹھو نہیں بن بیٹھے بلکہ واقعی خلعت اشرف المخلوقات کو خالق کارساز نے ان کے قد پر راست کیا ہے۔ اللہ اللہ زمین کے رہنے والے آسمان کی خبر لاتے ہیں۔ شمس جیسی منور کرے کی باتیں بتاتیں جس کو انسان بے تجربۂ مشاہدہ جیت نہیں سکتا۔ قمر کے پہاڑوں کی بلندی دریافت [illegible] دریائے ذخار کا بند کرنا ہوا [illegible] میں تماشا ہے۔ آگ اور پانی کے ذریعہ سے ریل کا چلانا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ مگر عقل کے صدقے [illegible] موم کر دکھایا۔ دُنیا میں جتنے مخلوق ہیں سب ان کا لوہا مانتی ہیں۔ سب کو انھوں نے نیچا دکھایا۔ [illegible] زبردست کو زیر کیا ان کے [illegible] کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ یہ مشت خاک کا پتلا ہے۔ غبارہ وہ ایجاد کیا کہ کائنات الجو کی سیر کو نکلنے لگے۔ جہاں پرندوں کے پر جلیں [illegible] جانے لگے۔ جدھر جاؤ ان ہی کی دھوم ہے۔ جہاں دیکھو ان ہی کا سکہ چلتا ہے۔ کوئی ملک کوئی جزیرہ کوئی [illegible] الغرض [illegible] تمام ایسا نہیں جہاں یہ نہ پہونچے ہوں۔ اپنے قدوم میمنت لزوم سے جنگل کو گلزار اور بن کو فرخار بنا دیا۔ جہاں کبھی نہیں [illegible] وہ صورتیں نظر آتی ہیں کہ انسان عش عش کر جائے۔ انسان ہر قسم کی آب و ہوا کو برداشت کر لیتا ہے۔ ہر قسم کی [illegible] میں [illegible] جاتا ہے۔ قریب قریب ہر قسم کی غذا استعمال میں لاتا ہے۔ دریائے بنگال کے کناروں پر آفتاب عالمتاب کی تمازت اس غضب کی ہوتی ہے [illegible] شرب اُبلنے لگتی ہے۔ وہاں بھی انسان بہ آرام تمام زندگی بسر کرتے ہیں۔ گرمی کو اصلا نہیں مانتے۔ برعکس اس کے ایشیا [illegible] شمال و مشرق میں اس درجہ سردی ہوتی ہے کہ پارہ [illegible] جم جاتا ہے۔ لیکن یہ وہاں بھی چین سے بستے ہیں۔ ڈاکٹر [illegible] کا یہ [illegible] ہے کہ تمام روئے زمین پر صرف انسان ہی اس قسم کی ذی روح ہے جو [illegible] صنعت اور دستکاری سے [illegible] ہر طرح کی آب و ہوا کے لائق اپنے جسم کی حفاظت کے لیے کپڑا بنا لیتا ہے۔ سردی سے بچنے کے لیے اس قدر گرم کپڑا تیار کرتا ہے کہ [illegible] پہنتے ہی سردی کی صورت بھی سرد ہو جائے۔ جو موسم گرما میں ایسی پوشاک پہنتا ہے کہ گرمی کی گرم بازاری پر اوس پڑ جائے۔ بارش کے [illegible] ایسا ایجاد کیا ہے کہ چاہے جیسا ہی موسلا دھار برسے بدن پر [illegible] اثر نہ کرے۔ ان ہی اسباب سے وہ ہر [illegible] اور ہر فصل میں رہ سکتا ہے اگر اور جانوروں کی طرح اس کے جسم پر اون یا کسی قسم کی پوشش ہوتی تو گرم ملکوں میں وبال جان ہو جاتا۔

حکمانے نوع انسان کو مختلف اقسام پر منقسم کیا ہے جن کے خد و خال آنکھ اور بال کے رنگ اور کھال میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر [illegible] نے کل مخلوق کو تین جنس پر منقسم کیا ہے۔ اول ملینک یعنی سیاہ وہ لوگ جن کے بالوں کا رنگ سیاہ ہے۔ دوم [illegible] یعنی [illegible] وہ لوگ جن کے بال زرد یا سرخ یا بھورے ہیں۔ ثالثاً [illegible] یعنی سفید جن کے بال بالکل سفید ہیں اور آنکھیں سرخ۔ [illegible]

صاحب نے اس بارہ میں خوب لکھا ہے اور اکثر مصنفین نے ان کی رائے صائب سے اتفاق کیا ہے۔ ان صاحب نے انسان کے پانچ فرقے قرار دیئے ہیں جو یہ ہیں۔ فرقے کی کھوپڑی کا مختصر طرز کہتے ہیں۔ کاکیشین۔ منگولین۔ ایتھیوپک۔ امریکن۔ ملے۔ (۱) کاکیشین فرقہ کا سر قریب قریب گول ہوتا ہے۔ پیشانی نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی۔ چہرہ بیضاوی استخوان رخسار نکلے ہوئے نہیں ہوتے۔ دونوں جبڑوں میں آگے کے دانت بصورت عمود۔ چہرہ بیضاوی۔ ناک محراب دار۔ دہن چھوٹا۔ نیچے کا ہونٹ کسی قدر نکلا ہوا۔ ٹھوڑی مدور۔ اس فرقہ کے لوگ ہر ایک رنگ کے ہوتے ہیں۔ اصلی رنگ ان کا سفید ہے مگر آب و ہوا اور تمازت آفتاب وغیرہ کی وجہ سے گندم گوں، سیاہ فام اور سرخ سفید بھی ہو جاتے ہیں۔ اہل اسیریا، اہل بابل۔ اہل سیتھیا۔ فارسی۔ یہودی۔ عرب۔ ترکی۔ تاتاری۔ ہندو۔ فرانسیسی۔ ڈچ۔ اہل یونان۔ جرمن۔ پروس۔ آسٹریا۔ کوہ قاف۔ اسی گروہ میں شامل ہیں۔ افریقہ میں جو لوگ بحر شمالی کے قریب رہتے ہیں۔ وہ اور مصری اور اہل ابی سینیا فرقہ کاکیشن سے ہیں۔ (۲) منگولین ان کے سر قریب قریب مربع ہوتے ہیں استخوان رخسار نکلے ہوئے۔ چہرہ چپٹا۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ ناک چپٹی۔ اس فرقہ کے لوگ سرخ و سفید بہت نہیں ہوتے۔ بلکہ رنگ کسی قدر مائل بہ زردی ہے۔ بال سیدھے۔ کالے اور مضبوط ہوتے ہیں مگر بہت ہی کم۔ داڑھی سوائے ... کے ہوتی بھی تو بالکل ذرا سی۔ چینی۔ جاپانی۔ ... اہل ... تبت۔ ... اسی گروہ سے علاقہ رکھتے ہیں (۳) ایتھیوپک۔ سر ... دبا ہوتا ہے۔ پیشانی ... گنبد۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے۔ نیچے کے جبڑے بڑے اور مضبوط آنکھیں ابھری ہوئی۔ اوپر کا ہونٹ موٹا۔ رنگ بالکل سیاہ اور گھونگھر والے بال۔ جنوب صحرائے اعظم اور ابی سینیا۔ آسٹریلیا۔ تیونس۔ ... نیوگنی۔ جزیرہ ... وغیرہ کے باشندے فرقہ ایتھیوپک سے متعلق ہیں۔ (۴) امریکن۔ یہ لوگ منگولین سے کسی قدر مشابہت رکھتے ہیں۔ استخوان رخسار محراب دار کھوپڑی بلی۔ چہرہ چپٹا۔ پیشانی تنگ۔ ناک کسی قدر چپٹی۔ رنگ سرخی مائل یا کسی قدر سیاہ۔ بال منگولین سے۔ داڑھی بالکل ندارد۔ امریکہ کے اصلی باشندے اسی گروہ سے ہیں۔ (۵) ملے۔ ان لوگوں کی پیشانی کچھ یوں ہی سی ابھار ہوتی ہے۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے۔ ناک موٹی اور چوڑی رنگ گیہواں۔ بال سیاہ۔

یکم رجب ۱۳۱۶ھ جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۵

ناول نگاری

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری
اول بہ شگون کرد طواف حرم ما

تعلی اور لن ترانی اور دوسروں کی ہینا اور شیخی بگھارنا میری وضع کے خلاف ہے اور ایک مجھ پر کیا فرض ہے کل اہل آبرو کی وضع کے خلاف ہے یہ شعر جو چیمبرز نے زیب عنوان کیا ہے اس کو تعلی پر محمول کرنا انصاف بیچارے کی گردن کو کند چھری سے سلاکی کے ریتنا ہے۔ میں آپ تعریف اپنے ناولوں کی کروں تو چور کی سزا وہ میری۔ ہاں اگر امر حق کا اظہار تعلی اور ہیچ ہو تو ... مجھ سے ... کے ذریعہ کوئی نہیں ہے۔ اس شعر کے یہ معنی ہیں کہ ... نے قصہ دانوں کی قدر دانی سے وہ قدر پائی کہ لندن، پیرس اور شکاگو تک اس کی شہرت ہوئی اور اسی کی دیکھا دیکھی لوگوں کے دلوں میں ناول لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ گو قصوں کی کتابیں

...انے اردو میں بیشتر بلکہ کہیں پیشتر سے موجود ہیں لیکن بالکل انگریزی اصول اور یورپین طرز پر کوئی ناول مثل فسانہ آزاد کے اودھ اخبار سے مشہور اخبار کے ساتھ روزانہ شائع نہیں ہوا تھا۔ جن صاحبوں نے اس کے بعد ناول لکھا۔ ان میں سے انصاف پسند بزرگوار دل نے قبل اشاعت خود اس کا اعتراف کر لیا۔ چنانچہ گورکھپور سے حضرت ریاض نے لکھا تھا کہ ہمارا ناول اُسی طرز یورپین پر ہوگا۔ جس میں فسانۂ آزاد ... کچھ شہرت پا چکے ہیں۔ چنار کے رئیس بابو ہنومان پرشاد صاحب نے بھی اپنے ناول میں فسانۂ آزاد کو تعریف کے کلمات سے عزت بخشی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھ سے بڑھ کر ناولسٹ دُنیا میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تو اس کی تعلی کی تہمت سے شکایت کرنا بیجا ہے۔ اس کی شکایت ڈاکٹر سبھا الدین صاحب تفضل یا ب جنگ سے کرنی چاہیے کہ مجھ مجنوں کی فصد نہ کھلوائی

خیر یہ امر برسر مطلب۔ اُردو زبان میں جو کتب قصص بیشتر کی ہیں وہ پُرانی وہمی جغرافیے اور اکثر دقیانوسی خیالات اور اُن امور پر مبنی ہیں جن کا عدم وجود بجا ہے اور حسب عادت محال اور حسب عقل غیر ممکن ہیں تب اُردو کی سرزمین پر نئی تہذیب کا آفتاب اچھی طرح نہیں چمکا تھا۔ سب کے پہلے انڈیا میں انگریزی اصول پر اہل بنگالہ نے اپنی بنگلہ زبان میں ناول لکھے اور رائے بنکم چند چٹرجی نے اس فن کی گھوڑ دوڑ میں بازی جیت لی۔ ہندوستان میں ابھی تو کل کی بات ہے کہ ناول لکھنے ہی نہیں۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت بھاشا کا یہاں ذکر نہیں ہے اردو کے ناول نہ تھے اور جو قصے وہ پرانے فیشن کے۔ ان ڈراما جس کا نام ہے۔ اس کے مرجد ہندو ہیں۔ بڑے بڑے مبصروں کی یہ رائے ہے۔ جو بہت زبانیں تھے اور جن کو ڈرامہ سنسکرت سے بڑھ کر لاطینی میں نہ یونانی میں ... دیکھ ...

اُردو کے ناول یعنی افسانے پُرانے زمانے کے لکھے ہوئے حال کے تربیت یافتہ پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ عموماً پوچ یا در ہوا خیالات سے مملو ہیں۔ اب نئی واقعات ڈھونڈتے ہیں۔

اب ہم پرانے قصص کے مہمات کی چند مثالیں دیتے ہیں:

۱۔ ایک مصنف صاحب نے اپنے ہیرو کو جوالے ایک گڑھے میں دھکیل دیا تو وہ بیچارے دس کروڑ دس لاکھ دس ہزار برس تک اس گڑھے میں گرتے گرتے کہیں خدا خدا کر کے تہ تک پہنچے جل بلاؤ۔ اب کوئی اس با خلوص مصنف سے پوچھے کہ اگر کوئی انسان بغرض محال سطح ارض سے قعر کرۂ زمین تک دھنستا ہوا جائے یعنی زمل جیبات کی رو سے کتنے عرصہ میں انتہائے قعر تک پہونچ جائے گا اور زمین کا قطر کتنا ہے؟

۲۔ ایک مصنف صاحب نے اپنے ہیرو کو سمندر کے اس کنارے سے اس کنارے تک چشم زدن میں پہنچا دیا۔ یہ سہو ہے ریل بھی ایسی سریع الرفتار نہیں ہے۔ تار بھی نہیں ہے مگر مصنف نے بزور دعا ہیرو کو ... پکڑوا دیا ادھر آنکھ بند ہوئی اُدھر ایک ساحل سے دُوسرے ساحل پر دندناتے ہیں۔

۳۔ ایک ناولسٹ فرماتے ہیں کہ چوہوں نے جھیل کے نیچے نیچے منزلوں سرنگ لگائی اور ہاتھی اور گھوڑے اور اونٹ اور ما بہ ماہتاب اور علم اور نشان کے ساتھ بہ سون کا راستہ چلیوں میں ... اور ضیغم ... اور جادو کے زور سے سرنگ کی ہر منزل میں میناروں میں لگا دیا۔

۴۔ ایک صاحب نے شہزادہ کشمیر پر پرستان کی ایک پری کو ہوا پر اُڑا دیا اور وہ آپ پر عاشق ہو گئی۔ عین نوم کی حالت میں ان کو

اُڑان کھٹولے پر بٹھا کر پرستان کی راہ لی یہ جا وہ جا۔

اب ذرا سوچیے کہ دنیا میں کوئی پڑھا لکھا آدمی جس کو قوتِ تمیز سے حصّہ ملا ہے کبھی ایسا ہوگا کہ کبھی ان مزخرف خیالات کو تسلیم کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ یہ پرانے ایشیائی خیالات کی کہانیاں ہیں جن کا نہ سر نہ پاؤں۔ نہ بچوں کے فائدے کی نہ نوجوانوں کی اور نہ پیر فرتوت بڈھوں کے توڑ جس۔ بس

کوسا را پیر شد و کارنا شد

آج کل کے ذہنی قصے واقعات پر مبنی ہیں، تاریخی امور پر مبنی ہیں، اخلاقی باتیں ان سے پیدا کی جاتی ہیں۔ ناول نتائج نکلتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ پڑھا لکھا انسان ان کو پڑھے اور انتہا سے زیادہ دلچسپ معلوم نہ ہوں۔ مگر ان بہت سے پرانے فیشن کے آدمی دیکھیں تو پسند نہ کریں اور کہیں کہ ان میں تو وہ باتیں لکھی ہیں جو ہم روزمرہ دیکھتے اور سنتے اور کہتے ہیں:

دندان تو جملہ در دہانند

چشمان تو زیر ابروانند

وہ تو اس بات کے پڑھنے کے شائق ہوتے ہیں کہ (طوطی یا توتا) مینا کو حسن زبان کہا کہ فلاں بادشاہزادی کے حسن پر آفتاب ہے۔ واہ رے واہ قوت

تو نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

کوہ قاف ملک بلغار میں فیلستان نامی شہر سے اس پار ایک بادشاہ رہتا ہے وہاں اس کی لڑکی حسن و جمال میں یکتا رہتی ہے فلاں کے رخ کا یہ حال ہے کہ رات اس ملک میں ہوتی ہی نہیں۔

بس (اس اول جلول سے) سنتے ہی ادن کے چھوڑ پھاڑ کر ادن کے عاشق نے طلسمان کی راہ لی چل جا رہ۔ اب اندھا دھند چلے جاتے ہیں جہاں سینگ سمائے کم پہونچے منزد۔ اب جا بجا بھوت اور پریتا اور چڑیل اور دیو سب کے سب مڈبھیڑ ہوئی اور جا کے اس کو بیاہ لائے۔ (مبارک ہو) دولت کے ہم بھی کہتے ہیں کہ ایک تو لی کسی ہیرو کو ایسی ملی کہ وہ سب کو دیکھیں اور باقی سب اندھے۔

زمانہ حال کے اردو ناول نویسوں کو اس امر کا خیال چاہیے کہ ملک کے خیالات بدل رہے ہیں کہ ان خوبصورتی سے قلمبند کریں کہ تصویر کھینچ دیں۔ جیسا ان قلم سے ہیں۔ پس یہ معلوم ہو کہ مصنف کوئی چشم دیدہ واقعہ بیان کر رہا ہے جیسے کسی سٹیج پر کوئی چابکدست کامل فن انجینئر یا ایکٹر اپنے سینے کے گھوڑے کی باگ کو یوں قابو میں رکھے جیسے استاد شہسوار اصیل گھوڑے کی باگ جہاں جی چاہے وہاں موڑے۔

دیگر ازفعل اور احتلاب کو ہر امر میں ملزوم ہو مگر ناول میں تو سخت سے سخت عیب سمجھا جاتا ہے جہاں تک ممکن ہوسکے ہر پارٹ یعنی حصہ یا فصل کو قریب قریب مساوی رکھے۔ ہاں یہ ذرا مشکل ضرور ہے لیکن جہاں تک ہوسکے ایسا نہ ہونے پائے کہ ایک حصہ پچاس صفحے کا ہو اور ایک آٹھ صفحے کا۔ اس کا بھی خیال ضروری ہے کہ اس کا مکالمہ سب چیدہ ہو اور کم ہو۔ مگر فضول مکالمہ خواہ مخواہ طول دیا جانے یہ بڑا عیب ہے۔ لوگ پڑھتے پڑھتے عاجز ہو جاتے ہیں اور سرسری طور پر پڑھ کر ختم کر دیتے ہیں۔

اس طرح کی سطول کہانی یا بات نہ چھیڑ دے کہ وہ فقرا والفضل ہو جانے ناول کے کسی ذکر کرکے شیطان کو ...ہو جانے کوئی پسند

ذرے کاہ

خاصہ ناول کا ایک یہ ہے کہ جب ایک باب ختم کر دیں تو پھر ناظرین بڑے دلی شوق سے دوسرے باب کے مطالب جاننے کے منتظر رہیں۔ اس کا لکھنا مشکل ہے کہ ایک نہایت ضروری اور تعجب خیز بات ختم کرکے ناظرین اس کے چھوڑے ہوئے ٹکڑے کو جب تک دریافت نہ کرلیں تب تک کھانا پینا حرام ہو جائے۔

رومانٹک ناول اور عشق جو اصلی واقعات پر مبنی ہوں اُن کا اُردو ناولوں میں کم چرچا ہے اور جو ہیں وہ دقیانوسی خیالات سے مملو، بیہودہ اور کوڑی کے۔ ٹریجڈی کو ہمارے اُردو خواں بھائی کم پسند کرتے ہیں حالانکہ ایشیائی خیالات غم کے قصص سے خالی نہیں۔ عاشق و معشوق کے دائمی ہجر کا حال لیلیٰ و مجنوں۔ فرہاد و شیریں، وامق و عذرا، نل دمن بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ابھی اُردو خوانوں کے طبائع ٹریجڈی کی طرف مائل نہیں ہوا ورنہ ٹریجڈی کا لکھنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اُردو ناولوں کے مطالعہ کا شوق ہم لوگوں میں بڑھتا جاتا ہے۔ اللّٰھم زد فزد اسی سبب سے ان کی اشاعت بھی زیادہ ہونے لگی اور ہوگی۔ اور اسی باعث سے اب اچھے بُرے ناولوں میں ہم تمیز بھی کرنے لگے۔

بیچمدان پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کاشمیری
یکم جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ شمارہ نمبر ۳، جلد نمبر ۱

شعر و شاعری کی بحث

عالیجناب مہاراجہ پیشکار بہادر وزیر فوج آصفی نے ایک قصیدہ شگرف حضرت نسیم حیدرآبادی سے مشاعرے کے لیے بتقریب سعید سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ طرح کے مصرع پر سرکار ممدوح الشان نے تصنیف فرمایا تھا۔ اس قصیدہ کے ایک شعر پر کسی صاحب نے گمنام خط رانچور سے بھیجا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(میں حیدرآبادی ہوں اور مُلکی ہونے کی سبب سے میرا جی خوش ہوتا ہے جب میں کبھی
حیدرآبادی کو قابل اور لائق پاتا ہوں مگر تعجب ہے کہ اتنے بڑے اور عالم پیشکار صاحب
بہادر نے ایک بڑی غلطی کی وہ یہ ہے ؎

یہ غلط ہے کہ ستم جانی تھا سعی
مہر محبوب علی شہ ساتھا کب بازل

باذل کو ۔ بازل ۔ لکھا ہے۔ غیاث اللغات میں بوار منتخب لکھا ہے (باذل بفتح ذال
بمعنی بخشندہ و سخی)

یہ اعتراض چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہے اٹھایا جاتا ہے اور یہ شعر مثل ماہ نیم ماہ جو کر چاند کی طرح سے صاف نکل آتا ہے۔ واضح ہو جب شاعر عمداً کوئی غلطی کرتا ہے تو اسی شعر میں خود اپنی غلطی کا خوبصورتی کے ساتھ اعتراف کر لیتا ہے۔ عیب میں حسن ہو جاتا ہے حافظ شیرازی کی غزل کا مطلع مسکت جواب ہے:

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مصرع اولیٰ میں خراب بمعنی اسکے موصدہ اور مصرع ثانی میں تا بہ بیچ ہی۔ مگر حافظ نے تو خود اقرار کیا کہ صلاح کار کجا و من خراب کجا۔ اسے صلاح پہ سردکار اور بہر تحتا ہے۔ دیکھو تفاوت رہ کس قدر ہے کہ کہا انتہا بہ کجا قافیہ پیائی میں طرح غالب نے ایک قصیدہ میں معشوق کے منہ نہ ماروں کو سیوے سے تشبیہ دی ہے مگر خود کہہ دیا کہ — غلط کردم کہ گفتم...... نگاہ یار را سوا۔

بیچمیز پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی
یکم جمادی الاوّل ۱۳۱۵ھ جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱

موسیقی اور ہماری ثقافت کی ترجمانی

سید عابد علی عابد

فنونِ لطیفہ میں یوں تو ہر فن اس لحاظ سے اہم ہے لیکن اپنی پیچیدگی، تاثیر اور تجربے کے اعتبار سے موسیقی کو بعض اعتبارات سے شعر پر فوقیت حاصل ہے۔ امیر خسروؔ نے جو ان دونوں فنون کے شہسوار اور محرمِ اسرار ہیں ایک مناظرہ قلم بند کیا ہے۔ جس میں آخرکار موسیقی کو ہی شعر پر [illegible] ہے اور دوسرے دلائل سے قطع نظر ایک دلیل یہ بھی دی ہے (جو خاصی وزن دار ہے) کہ شعر کم از کم الفاظ کا محتاج تو ضرور ہے۔ اس نے [illegible] موسیقی لفظوں کے پیرہن سے بھی بے نیاز ہے اور صرف صوتِ مجرد سے کام لے کر وہ جذبات کی فضا پیدا کرتی ہے کہ خواص اور عوام دونوں [illegible] ہوتے ہیں بشرطیکہ تاثیر سے خالی نہ ہو اور موسیقار لحنِ خوش سے بے نیاز ہو کر صرف موسیقی کی گرامر یا صرف و نحو کی مشق ہی نہ کر رہا ہو۔

ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ موسیقی صوتِ مجرد یا صوتِ خالص سے کام لیتی ہے البتہ یہ صورت منظم اور مربوط ہونی چاہیے تاکہ شورِ محض میں اور موسیقی میں تمیز ممکن ہو۔ شور میں آوازیں منظم نہیں ہوتیں۔ نپے تُلے وقفوں کے سانچوں میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ یہ سوال دوسرا ہے کہ ساز [illegible] ب اور ساخت میں شور یعنی صدائے محض کس حد تک دخیل ہے اور کیا فریضہ ادا کرتا ہے۔

یہ باتیں مدِ نظر رکھی جائیں تو واضح ہو جائے گا کہ موسیقی کی حرمت و حلت کے متعلق کسی حد تک اختلاف کیوں موجود ہے۔ قصہ یہ ہے کہ موسیقی جو کہ سُروں کی ایک خاص ترتیب اور ترکیب کا نام ہے بنفسہٖ بغیر کسی اور خارجی عنصر کے گناہ کے ارتکاب میں یا کسی خلافِ شرع امر کے وقوع [illegible] کا باعث نہیں ہو سکتی۔ سُریں تو محض آوازیں ہیں۔ مجرد اور خالص اور معصوم۔ ان کو حلال و حرام سے کیا تعلق؟ ہاں غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے [illegible] موسیقی کو ایک خاص تناظر میں سُنتے ہیں مثلاً یہ صورت کہ غزل سُنی تو بعض الفاظ تہذیب یا فحش نکل آئے یا پھر یہ صورت پیدا ہوئی کہ گانے [illegible] اپنے حُسنِ ادا اور اصطلاحاتِ [illegible] سے کام لے کر دل میں ایسا ہیجان پیدا کر دیا جو نامناسب ہے یا گانے والے نے [illegible] کی اور اپنی [illegible] اور خوش وضعی سے ایسے احساسات کو برانگیختہ کیا جنہیں شرفاء عام طور پر [illegible] کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم یہ غلط فہمی دور کر دیتے [illegible] موسیقی کو اپنے صحیح رنگ میں دیکھتے ہیں تو اسے معصوم پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر [illegible] تو سنا گیا ہے کہ فلاں صاحب نے ایک [illegible] [illegible] تو ایسے پُر جوش ہوئے کہ نازیبا باتیں کرنے لگے یا کسی امرد سے [illegible] خوش وضع ہم [illegible] تھا قوالی سنی [illegible] اور فساد پیدا ہوا [illegible] بھی [illegible] بار صاحبِ ساز کی موسیقی سن کر یوں اپنے آپے میں نہ رہے ہوں کہ خلافِ شرع [illegible] تو ہم سنتے ہیں کہ فلاں [illegible] ذوقی لیکن یہ نہیں سُنتے کہ صاحب کو [illegible] دیوانہ وار آشفتہ کر دیا اور وہ دین و دنیا سے جاتے رہے۔

سماع کو جو بعض صوفیوں نے جائز قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوتِ مجرد کو معصوم سمجھتے ہیں اور [illegible] کلمات ہیجان کو منع کر [illegible] یہ قید بھی عاید کر دیتے ہیں کہ سماع کی صورت تبھی ہو۔ سننے والے اپنے آپے میں رہیں تو [illegible] حال کی ایسی کیفیت کا اظہار کریں [illegible] وضع ہو۔ خوش وضع امردوں کو قوالوں میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ قوال بھی عموماً نیک خصلت ہوں [illegible]

علامت ہیں حالانکہ یا خدا کسی طرح بیان نہ کیا جا سکے گا۔ مندرجہ استعمال ہوتے کچھ مخصوص الفاظ سے بیان کیا جانا ہے مشکل
علامتوں میں عرفان و اخلاق اور تزکیۂ قلب و روح کے اعمال شامل ہوں گے۔

جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ موسیقی میں عناصر ہندو اور مسلم دونوں کی ثقافتی رنگ کے شامل ہیں کہ مسلم مسلمانوں کا ایک مل جل کر مجموعہ ہوتی ہے۔ البتہ چوں کہ راگ موسیقی کے ثقافتی استعمال و فروغ کی نشاندہی کرتے ہیں ورنہ غزل، گیت، ٹھمری، کجری وغیرہ اسی طرح کے ذریعے انسانی خیال کے مختلف جذبات سے وابستہ ہوتی ہے۔

ہندوستان کے کلاسیکی موسیقی میں راگ اپنے مزاج کے مطابق ہوتے ہیں۔ بہت سارے راگوں کی نمایاں حیثیت ہوتی ہے۔ انسان کے جذبہ محبت، سرگشتگی، برکت و عقیدت کے مختلف پہلو راگ اپنے اندر سموئے رہتا ہے جس کی خوشحالی، ثروت اور مسرت کی ضامن ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک ... (...) کہتے ہیں کہ ... منسوب ہیں کردہ ... ثروت اور خوشحالی کی دیوی ہے۔ اس راگ کا ... موجود ہیں یہاں صرف اشارہ دینا کافی ہے کہ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی نے صرف اس راگ کی خدمت میں عقیدت پیش کرتی ہے بلکہ خاص طور پر اس راگ کو ... مختلف اسلوب سے ادا کیا جاتا ہے۔ شیام کلیان اور بعض اوقات شنکرا کے ساتھ بھی اس کا نام لیتے ہیں۔ مشہور بول ہیں۔

شنکر شو ہر ہر —

شام کے وقت یہ راگ اس دیوتا سے جو فقیری اور خدا کی علامت ہے۔ ... کے گائے ہیں جس کے شروع کے بول ہیں۔

بے نا در

ان گزارشات سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کا ثقافتی مزاج ... ہر روپ سروپ میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی تصویر کے ... ہے۔ جب ... کا گمبھیر خیال اپنے ... ہے تو بھی صوفیانہ حقیقت کا عنصر صاف نظر آتا ہے ... کی علامت نہیں دیتا ... کی رمز بھی نہیں دی گئی ہے۔ چنانچہ ... کے ناز و نیاز کی تصویر ... ہے۔ مثال کے طور پر بہاگ ... کے مشہور بول ہیں۔

البیلی رے ... ڈالی ... کا ... کر ... سکا
البیلی رے ... ڈالی ... کا

اسی طرح بہاگ کے مشہور بول ہیں:

رس بھری انکھیاں ... کی
سو چین لیہ کرکے بتیاں رس بھری انکھیاں ...

تو یہ ... ہے کہ ... موسیقی کا ثقافتی ... مشرقی مزاج ... سے متعین ہوتا ہے اور ہندو
دوں نے عقیدت ... اپنا لیا ہے۔

امیر خسرو نے سب سے پہلے اس حقیقت کو بھانپا کہ سنگیت کا ثقافتی مزاج بولوں سے بنتا ہے اور سُریں معصوم ہوتی ہیں اور راگ راگنیوں کے
... بے معنی ہیں ... امیر خسرو ... ہندوستانی تہذیب کو سیرت ... مزاج کی حد تک کر کے ... ہمنوا ہو کر (جس نے ... کر
... یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب ... کسی شخص میں نظر نہیں آتی۔ امیر خسرو نے شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ پرانے راگوں
راگنیوں کے لیے نئے بول لکھیں جو مسلمانوں کی مذہبی عقیدت کا رنگ جھلکتا ہو اور ایسی تخلیقات پیش کریں جو مدح نعت اور منقبت کی
... بیان ... سے متعلق ہیں یا ایک مقدس ... جو اپنے ماحول کے مطابق وجود میں آیا کہ وہ خواجہ نظام الدین
... تھے: صرف ... ان کی عقیدت میں سرشار اور ان کی محبت میں ...—

چنانچہ امیر نے خواجہ ... کی منقبت میں اپنی مشہور چیزیں لکھیں مثلاً بسنت میں (امیر خسرو کی ایجاد کردہ مشہور راگنی کا نام ہے)
... بول آج ... سے ... ہندو کلاکار کی زبان پر ہیں:

حضرت خواجہ سنگ کھیلیے دھمال
پیش خواجہ تم بن عشق آئے
حضرت رسول صاحب جمال
حضرت خواجہ سنگ کھیلیے دھمال

میں نے ... کے ... بڑے اونچے درجے کے ہندو کلاکاروں کو یہ بول گاتے سنا ہے بول چونکہ ہندی میں ہیں اس لیے
... اپنی عقیدت ... کو بڑی اچھی طرح ظاہر کر سکتا تھا

یہ محفل گھنٹوں جاری رہی اور یہی بول گائے جاتے رہے۔ ہر کلاکار نے اپنی انفرادیت کا جوہر دکھایا اور ایسا سماں باندھا کہ دکھائی
دینے لگا ... عالم ... جھوم رہے تھے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ پہلے تو امیر نے یہ نئے بول اپنے پیر کی مدح میں لکھے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں انھوں نے
شعوری کوشش کی کہ کلاسیکی سنگیت سے ثقافتی مزاج کو نئے بول ڈھالیں کر وہ ... طور پر ہندوستان اور اسلامی عقیدت کے ... کا
اظہار کریں۔ ان کی مختلف چیزوں پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ... یہ کام کرنا چاہا اگرچہ ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت
ایک نیا رنگ روپ دیں۔ اس سلسلہ میں پہلے تو انھوں نے ایرانی دھنوں اور ہندوستانی دھنوں کی مختلف سروں کے امتزاج سے نئی راگنیاں
... میں زینت ۔ فارا ۔ بہار اور ایمن کلیان بہت مشہور ہیں۔ ایمن کلیان کا گول پن کلاکاروں کو ایسا بھایا کہ انھوں نے اس
... کے لیے بہت سے نئے بول لکھے جو مذہبی عقیدت کے آئینہ دار تھے مثلاً:

آلِ نبیؐ اولادِ علیؓ

اسی طرح بہار راگنی کی لچک، خوبصورتی اور اس کے مزاج کی یہ خصوصیت کہ ہر سانچہ میں ڈھل جاتی ہے۔ کلاکاروں کو بہت بھائی

اور مختلف راگوں کی بہاروں کے لیے بول لکھے گئے مثلاً بسنت کی بہار۔ بھیروں کی بہار۔ پھر یہی نہیں بلکہ بہار راگنی کے نام کی خصوصیت کے اعتبار سے کلاکاروں نے مذہبی رنگ ترک کر دیا اور موسم بہار کے متاثر ہو اور اس رُت کے مطابق پیا کی تصویر بھی بولوں میں کھینچیں مثلاً مشہور بول ہیں۔

کلیاں سنگ کرت رنگ رلیاں

افسوس ہے کہ امیر خسرو کی شعوری کوششیں پوری طرح بار آور نہ ہو سکیں البتہ ٹھمریوں کے سلسلہ میں مسلمان فنکاروں نے اپنی ذہنی پیچ اور جودت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے خیال کے ٹھپّہ کو فنائی رنگ دیا اور رادھا کرشن کے ناز و نیاز کے نقشوں کی بجائے مہ چہرہ والوں اور چاہنے والوں کی بے قراریوں اور نازنینوں کی بھی تصویریں کھینچیں۔ جب لکھنؤ اور اودھ کے دربار میں حدود و بلاد موسیقی سے لگاؤ نہیں تو زبردست اپج تھے کہ مسلمان کلاکار میدان میں آئے جنھوں نے انسانی جذبات و احساسات کی تصویریں کھینچ کر سنگیت سے ثقافتی مزاج کو اور بھی بدل دیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا ان کی یہ کوششیں شعوری تھیں یا نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر خسرو نے راگ اور راگنیوں کے جو بول باندھے ہیں وہ زبان حال سے پکار رہے ہیں کہ ہم سنگیت میں ایک نیا عنصر پیدا کر داخل ہوئے ہیں اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ کلاسیکی سنگیت کو شعور بخشیں اور ہر ہندو کے دائرہ عقیدت سے نکال کر اسلامی تصورات و افکار کے دائرہ میں لے جائیں تاکہ ساتھ ہی قوالی کی سنگیت اپنی پرانی زبان بھی بولے لیکن نیا مطلب ادا کرے۔ یہ بات بہت ضروری تھی ہندی کی زبان میں اتنی مٹھاس، لوچ اور رس اور گداز ہے کہ اگر بول اردو یا فارسی میں لکھے جاتے تو اس وقت کے کلاکاروں میں نہ مقبول ہوتے نہ عوام الناس تک پہنچتے اور امیر خسرو کی کوششوں کا مطلب ہی فوت ہو جاتا۔

خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی نے اپنی تصنیف "حیات حضرت امیر خسرو" میں صرف اس بات کی تشریح کی ہے کہ خسرو نے ایرانی راگ راگنیوں اور پردوں کو ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت میں کس طرح سمویا بلکہ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو نئے راگ امیر نے ایجاد کیے ہیں ان کی ہیئت ترکیبی اور کوائف کیا ہیں؟ انھوں نے پنڈت بھاتکھنڈے آغا صاحب کے حوالے سے بتایا ہے کہ امیر کے نئے راگوں اور ان کے کوائف کیا ہیں؟ مثال کے طور پر انھوں نے مجیر۔ ساز گری۔ ایمن۔ زیلف۔ فرغانہ۔ سرپردہ۔ عشاق۔ زنگولہ کی تفصیلات بیان کیے ہیں۔ میں صرف ایک دو مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر امیر خسرو کی طرح دوسرے کلاکار بھی اسی طرح پرانی کلاسیکی موسیقی کا ثقافتی مزاج بدلنے کی کوشش کرتے رہتے تو آج ہمارے اس گراں پایہ ورثہ کی شکل مختلف ہوتی اور ہمیں یہ سوچنا نہ پڑتا کہ پرانے راگ اور راگنیوں کے بول بول کس سے اور کس طرح لکھوائے جائیں کہ وہ ہمارے مذہب، ہماری ثقافت، ہماری معاشرت، رہن سہن اور عمومی زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کریں۔

بھیرویں میں امیر نے یہ بول لکھے ہیں:

حضرت نظام الدین اولیاءؒ
پیر مشائخ ذرّہ
آن پڑی در بار تمہارے

خسرو پر کرپا ہو براۓ انبیاءؑ

پیر مشائخ نور

اس کو آردہی سارے بھاؤ دکھانی ستا ہے۔ اس کی امردہی بہت ہی دھاپا تا نی گا تا رے سا۔ یہ راگ کافی ٹھاٹھ کا ہے۔ آردہی میں گا ورجت ہے تان کی صورت ایسی ہے کہ ملار کے رنگ کا شبہ ہوتا ہے اس بہ حیثیت وادی اور گندھار سموادی سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن کو گانا چاہیے۔ استھائی کے لیے اور پورے کوائف کے لیے دیکھیے کتاب مذکور صفحہ ۱۱۱

اسی طرح ایمن خالص فارسی راگ ہے۔ اس کا الاپ بہت خوبصورت ہوتا ہے کہ سمپورن ہے۔ آردہی۔ امردہی شدھ ہیں اس کے گانے میں کوئی وقت نہیں ہوتی۔ اس کی خاص تان مارے گا رے سا ہے۔ یہ تان ایمن سے مخصوص ہے اور بہت لطف دیتی ہے۔ اس راگ میں بھی امیر نے بول لکھے ہیں جو یوں شروع ہوتے ہیں:

علی علی علی علی علی
خدا بن کون جگت بن اپنا
نبی کے پیارے حسنؑ حسینؑ کے پتا
زہراؓ کے پتی

اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر نے ہمارے سامنے ثقافتی مزاج بسنے کی ایک ترکیب پیش کر دی ہے لیکن اس ترکیب پر عمل کرنا مشکل کام ہے۔ جو شخص پرانے راگ اور راگنیوں کے لیے نئے بول لکھنا چاہتا ہے اس میں ان خصائص کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔ سنگیت ودیا میں کم و بیش پنڈت کا تبحر رکھتا ہو۔

۲۔ راگ راگنیوں کی مختلف شکلوں اور متبادل سُروں کے استعمال سے واقف ہو۔

۳۔ اپنی ثقافت، تمدن اور معاشرت کی نہج اس کے امکانات اور اس کے رُخ سے واقف ہو۔

۴۔ ہر لفظ کو ایک تمثالی اکائی سمجھ کر ایک طرف تو اس کی فصاحت اور روانی سے آگاہ ہو تو دوسری طرف موسیقی کے ضمن میں اس کی کیفیت سے کماحقہٗ واقف ہو۔

۵۔ تال پر عبور کامل ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ کام ایک شخص کے کرنے کا نہیں اس لیے ضروری ہے کہ میل جول سے کام کیا جائے۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہوگا کہ پہلے ہم ان گیتوں، نیتوں اور بولوں کو ہاتھ میں لیں جو مستعمل ہیں لیکن جن کی بنیاد کلاسیکی سنگیت پر صحیح طریقے سے قائم نہیں ہے۔ بعض بولیاں ہماری معاشرت کی بہت اچھی ترجمانی کرتی ہیں ان کو کلاسیکی سنگیت کا روپ دینا چاہیے اور بندش ان میں لطافت خیال اور لطافت فن پیدا کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ حکومت اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹائے گی مگر ہر کام میں حکومت ہی کی طرف دیکھنا ٹھیک نہیں۔ سنگیت کے متوالوں

[illegible]

[illegible] ہے۔ اور [illegible]

[illegible] چاہیے۔

دوسری شق کی تعلیم جو لوگوں کے ذمے ہے۔ انہیں اس کے لیے [illegible] چاہیے [illegible] کرنا چاہیے [illegible]

[illegible] کوشش، خلوص اور [illegible]

[illegible]

ہماری کلاسیکل موسیقی

شاہد احمد دہلوی

ہماری کلاسیکل موسیقی کی کوئی مکمل تاریخ موجود نہیں ہے تاہم پرانے شاستروں اور کتابوں سے اس سلسلے میں کچھ مدد لی جا سکتی ہے جو دست بُردِ زمانہ سے بچ رہی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم سام وید ہے اور اس کے بعد سنگیت رتناکر' جو ان میں سب سے مشہور رتناکر ہے۔ پچھلی صدی کی دو چار کتابیں اور موجود ہیں جو اب کمیاب اور نایاب ہو چکی ہیں۔ شاستروں اور گرنتھوں کی موسیقی میاں بیتیں کسی پُراسرار طریقے پر گم ہو گئی اور اب اس کا تراشہ بھی کہیں نہیں ہے۔ جو موسیقی آج کل رائج ہے اور جسے عرفِ عام میں پکا گانا کہا جاتا ہے ہندوستان میں مسلمانوں کے تسلط کے ساتھ اس کا ظہور ہوا۔

عرب اور ایران کی موسیقی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ اور یہاں آ کر مسلمانوں کی تہذیب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح گھل مل کر ایسی گھلی ملی کہ یہیں کی چیز ہو گئی۔ ہندوستان کی قدیم موسیقی شلوک اور کبت پڑھنے کے ایک مخصوص لحن پر موقوف تھی۔ نئی حیثیت اس نے مسلمان فرماں رواؤں کے زیرِ سایہ اختیار کی۔ مسلمان حکمران موسیقی کے حد درجہ دلدادہ اور نہایت قدر دان تھے۔ انھوں نے جنوبی ہند میں اور شمالی ہند میں دونوں جگہ موسیقی کو فروغ دیا اور بعض نے اس حد تک موسیقی سے شیفتگی ظاہر کی کہ پورے پورے شہر ہزاروں کلاکاروں سے آباد کیے۔

سندھ میں محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمانوں کی موسیقی نے قدم جمائے اور سندھی موسیقی نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ جنوبی ہند میں مغربی ساحل سے عرب تاجروں کو سیلون تک کا اتفاق رہا یہاں تک کہ اکثر عرب تاجر یہیں آباد ہو گئے اور ان کی نسلیں اب تک مدراس کی تہذیب میں موجود ہیں۔ جنوبی ہندوستانی موسیقی کو عرب سے پہنچے' عربی گانے کی جھلک اس میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہی زیر و بم جو عربی موسیقی میں پایا جاتا ہے خفیف سی تبدیلی کے ساتھ کرناٹکی موسیقی میں ڈھل گیا ہے۔

آب و ہوا کے فرق سے نغمے کی ساخت میں فرق ضرور آ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کی موسیقی جداگانہ خصائص رکھتی ہے۔ ہندوستان تو بجائے خود ایک برِ عظیم ہے جس کے چاروں کھونٹ آب و ہوا کے اعتبار سے الگ الگ خاصیتیں رکھتے ہیں چنانچہ جنوبی ہند کی موسیقی اور شمالی ہند کی موسیقی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مشرقی بنگال کی موسیقی مغربی بنگال کی موسیقی سے غیر مشابہ ہے۔ لیکن ان سب میں ایک جزو مشترک ہے اور وہ ہے راگ۔ راگ ہی کی وجہ سے ان سب میں مماثلت ہے اور کل ہند موسیقی میں یکسانیت

من سرزمینِ پاک و ہند

کی شباہت پائی جاتی ہے۔ جغرافیائی اور طبعی حالات کی وجہ سے ان میں فرق آنا ضروری تھا ہے اس لیے تقریباً ہر صوبے کی ایک مخصوص جداگانہ موسیقی بھی ہے جو کلاسیکی موسیقی یا کل ہند موسیقی سے متاثر بھی معلوم ہوتی ہے اور اسے متاثر بھی کرتی ہے، چنانچہ بعض صوبائی یا مقامی موسیقی کے ڈھنگ کلاسیکی موسیقی کے مستقل اور سکہ بند طریقے یا اسلوب بن گئے مثلاً پنجاب کا ٹپہ، اور پورب کی ٹھمری اور دادرا۔ ان کی ترقی کے ساتھ ساتھ جیسے زمانے کی مانگ بڑھتی گئی انھیں معتوبیت حاصل ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ انھیں قبولِ عام کی سند مل گئی۔

موجودہ موسیقی کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے ہوئی۔ باہمی اثر و تاثر سے ایک نئی موسیقی نے جنم لیا۔ بعض محققین مقامی دھنوں نے ترقی کر کے راگوں کے روپ دھارے ہیں۔ اس فن کو مکمل شکل مسلمان بادشاہوں اور مسلمان فنکاروں نے دی ہے۔ موجودہ کلاسیکی موسیقی کے موجد تو حضرت امیر خسرو ہیں جنھوں نے عربی و عجمی راگوں کی مدد و آمیزش سے نئے نئے راگ بنائے۔ ہندی راگوں میں سلم نامک کے راگوں کے پیوند لگائے، کئی نئے اسلوب وضع کیے، بین کو بدل کر ستار بنایا، پکھاوج کو بیچ میں کاٹ کر دایاں بایاں طبلہ بنایا۔ قوالی کے پیسے روپ کو بدل کر ڈھولک بنائی، جل ترنگ بنایا۔ جگت گرو گوپال نایک کو علاؤالدین خلجی کے دربار میں نیچا دکھایا۔ عجب جامع الصفات بزرگ گزرے ہیں حضرت امیر خسرو۔ پانچ لاکھ شعر فارسی میں کہے اور طوطیِ ہند کہلائے۔ اردو کے پہلے شاعر ہیں۔ گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا کئی کے وزیر و مشیر رہے۔ موسیقی میں نایک کہلائے۔ صوفیا میں اعلیٰ مرتبہ پایا۔ شاہوں میں شریک ہو کر سپہ گری کے جوہر دکھائے۔ ان کا کوئی مثیل آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کے بعد آسمانِ موسیقی کے درخشندہ ستارے نظام الدین مدہ نایک ہیں، والیٔ جونپور سلطان حسین شرقی ہیں، دربارِ اکبری کے رتن میاں تان سین ہیں۔ ان کے بعد ایک طویل سلسلہ مغل درباروں کے گائیکوں کا ہے۔ پھر محمد شاہ بادشاہ دہلی کا زمانہ آتا ہے کہ اسے فنِ موسیقی کا نشاۃ ثانیہ عروج کہنا چاہیے وہ دہلی کے موسیقی پرست تھے اور بادشاہ "رنگیلے" کہلانے لگتے ہیں۔ ان کے دربار کے دو استادوں سدا رنگ اور ادا رنگ نے خیال کی گائیکی کو چار چاند لگائے۔ آخری مغل تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر شاعری میں اور موسیقی کی چیزوں میں "شوق رنگ" تخلص کرتے تھے ان کے دربار کے گائیک تان رس خاں کی استادی کو شمالی ہند کے تمام گھرانوں نے تسلیم کیا، یہاں تک کہ پٹیالے کے علیا فتو (علی بخش اور فتح علی خاں) نے بھی جو موسیقی کے کرنیل اور جرنیل کہلاتے تھے۔ شاہانِ اودھ میں آخری بادشاہ واجد علی شاہ موسیقی کے سرپرست اور دلدادہ تھے، اور موسیقی کی چیزوں میں "اختر پیا" تخلص کرتے تھے۔ اس صدی میں گوالیار والے اللہ دیے خاں، بڑودے والے فیاض خاں، کیرانے والے عبدالکریم خاں اور عبدالوحید خاں، پٹیالے والے عاشق علی خاں، لاہور والے بڑے غلام علی خاں، دلی والے چاند خاں، امراؤ خاں، اور نصیر خاں، اندور والے نصیر الدین خاں ڈاگر اور امیر خاں، دیواس والے رجب علی خاں، رامپور والے مشتاق حسین خاں، آگرے والے ولایت حسین خاں، بمبئی والے نثار حسین خاں ——— کہاں تک ان کے نام گناؤں؟ ان کی تعداد سیکڑوں پر نہیں ہزاروں لاکھوں پر ہے۔ چند نام جو اس وقت یاد آئے اور جنھیں میں نے سنا بھی ہے قلم برداشتہ لکھ دیے۔ بہت سے اعلیٰ درجے کے گائیکوں کے نام حافظے سے نکل گئے۔ ان کے علاوہ ساز بجانے والوں کی فہرست بھی ان سے کم طویل نہیں ہے۔ وہ گانے والی عورتیں بھی ہیں جنھوں نے استادی کا موسیقی میں نام پیدا کیا۔ صرف دو نام بطور نمونہ پیش کرتا ہوں، پٹیالے والی گوہر بائی

ـنے کریل جیٹلی کی جوڑی تیار کی۔ اور آگرے والی زہرہ بائی جس نے بڑے بڑے گویوں کا پانی اُتار رکھا تھا۔ اس زمانے میں روشن آرا بیگم
ہو با طور پر ملکۂ موسیقی کہلانے لگی ہیں۔ ان سب مسلمان فن کاروں نے موسیقی کو بام عروج پر پہنچایا ہے۔

مگر یہ کلاسیکی موسیقی یا پکا گانا آخر ہے کیا جسے ہزاروں لاکھوں فنکاروں نے صدیوں کی جد و جہد کے بعد اس درجے تک پہنچایا؟
ـسا سوال ہے جس کا جواب چند لفظوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ اسے بیان کرنے کے لیے ضخیم جلدیں لکھی گئیں ہیں۔ تاہم کوشش کی
ـے گی کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کی عام فہم تشریح کی جائے۔

موسیقی کی سب سے پہلی اکائی سُر ہے۔ سُر ارتعاش سے پیدا ہوتا ہے۔ ارتعاشات میں جس قدر کمی ہوگی سُر اتنا ہی اُترتا چلا جائے گا،
ارتعاشات میں جس قدر اضافہ ہوگا سُر بڑھتا چلا جائے گا۔ اب اگر ایک سُر کو قائم کر کے اُسے بنیاد تصور کیا جائے اور ارتعاشات میں
ـ زدہ دیا جائے تو دُوسرا سُر پیدا ہوگا جو پہلے سُر سے اُونچا ہوگا۔ اس طرح اگر ہم ارتعاشات کو بڑھاتے چلے جائیں تو چڑھتے سُر پیدا
ـے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ پھر ایک سُر ایسا پیدا ہو جائے گا جو بنیادی سُر یا قائم کردہ پہلے سُر سے ہم آہنگ ہوگا' اور اس
ـ کے بڑھنے پر پھر وُہی تمام سُر دہرائے جائیں گے جنھیں پہلے سُنا جا چکا ہے۔

پہلے بنیادی سُر اور بنیادی سُر سے ہم آہنگ دُوسرے سُر کے درمیان بے شمار سُر ہوتے ہیں اس فاصل کو سپتک کہتے ہیں۔ یہ ہلت
ـ کہلاتی ہے اور ہمارا سارا گانا بجانا اس سپتک سے نکلا ہے۔ اس کے لاتعداد سُروں میں سے ایسے سُر چھانٹ لیے گئے ہیں جنھیں
ـ آسانی سے ایک دُوسرے سے تمیز کر سکتے ہیں۔ ان کی کل تعداد اگلے ماہروں نے ۲۲ مانی ہے' اور ان کو سُرتیاں یعنی چھوٹے سُر کہا ہے
ـ ان سُرتیوں میں امتیاز کرنے کے لیے بڑی مشق و مزاولت کی ضرورت ہے۔ اس لیے ایک سپتک میں سات شدھ سُر پہلے قائم کیے گئے
ـ ان کے نام کھرج' رکھب' گندھار' مدھم' پنچم' دھیوت اور نکھاد رکھے گئے' جنھیں مخفف کر کے سا' رے' گا' ما' پا' دھا اور
ـ نا ما گیا ہے اور ان کے مجموعے کو 'سرگم' ان کے بعد کھرج اور پنچم کو اچل یا قائم سُر قرار دیا گیا۔ پانچ سُروں کا ایک ایک رُوپ اور قائم
بنایا' اس طرح ایک سپتک میں کل بارہ سُر قائم' تیور (چڑھے) اور کومل (اُترے) اس ترتیب سے ہوئے:

(۱) کھرج۔ قائم (۲) کومل رکھب (۳) تیور رکھب (۴) کومل گندھار (۵) تیور گندھار (۶) کومل مدھم (۷) تیور مدھم (۸)
پنچم قائم (۹) کومل دھیوت (۱۰) تیور دھیوت (۱۱) کومل نکھاد اور (۱۲) تیور نکھاد۔

عام رواج اور برتاؤ میں یہی بارہ سُر آتے ہیں اور انہی کی جداگانہ ترتیبوں سے ہزاروں راگ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی راگ ہمارا
کلاسیکی موسیقی اور پکا گانا کہلاتا ہے۔

راگ کا تعلق انسانی نفسیات سے بہت گہرا ہے۔ یہ جذبات و احساسات کی موسیقی ہوتی ہے۔ راگوں کے سُر کچھ اس ترکیب و ترتیب
ـ سے لے جاتے ہیں کہ ان سے سننے والوں میں غم و اندوہ' مسرت و بہجت' خوف و ہراس' مجبوری و دوری وغیرہ کے اثرات پیدا
ـ ہوتے ہیں۔ موسیقی کا جادو تو جانوروں پر بھی چل جاتا ہے شتر حدی سُن کر اونٹوں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ طبل جنگ کی گرج پر گھوڑے
ـ بے خوف دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔ سپیرے کی بین پر زہریلا ناگ جھومنے لگتا ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے' بھلا موسیقی
ـ سے کیسے متاثر نہیں ہوگا؟ جالینوس اور اطبائے قدیم نے مختلف نغموں سے مختلف امراض کا علاج تجویز کیا۔ آج کل بھی دماغی امراض کا علاج نغموں سے

گیا جاتا ہے۔ ہمارے راگ ہر مزاجی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں اور اس کیفیت کو اپنے فضا سامعین میں منتقل کرسکتے ہیں۔
راگ کیا ہے؟ ایک مغربی نقاد سے اس کا جواب سنیے:

It is an arrangement of notes produceing definite spiritual, psychological and physical effects —As a magical formula, or let us say, a very mathematical and scientific one, the Raga takes hold of the laws of vibration, and applies them, through the art of music, to the growth and developement of the soul. The Raga is not arrived at hap-hazard, but is the expression of a supra-mundane urge in close conformity with divine nature, and this is what give it its magical form, its powers and beauty."

راگ جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کسی نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ انھی نفسیاتی کیفیات کو قدیم ہند کے پنڈتوں نے نظریے کی اساس بنایا۔ وہ احساسات جو جذبات کو جنم دیتے ہیں اُن کی تعداد ۹ بتائی ہے:

۱۔ رتی (RATI) بلاوا۔ محبت۔ جنسی مسرت۔
۲۔ ہاسیہ (HASA) ہنسی۔ دل لگی۔ تمسخر۔
۳۔ شوکا (SHOKA) غم۔ اندوہ۔ ترس۔
۴۔ کرودھا (KRODHA) غصّہ۔ غیظ و غضب۔
۵۔ اُتساہا (UTSAHA) کوشش۔ محنت۔ استقلال۔ ہمت۔
۶۔ بھےیا (BHAYA) خوف و ہراس۔ وحشت۔
۷۔ جُگپسا (JUOPUSA) ناپسندیدگی۔ نفرت۔ حقارت۔
۸۔ وسمایا (VISMAYN) استعجاب۔ حیرت۔
اور ۹۔ شاما (SHAMA) سکون۔ راحت۔ بے کیفی۔ بے حسی۔

ان سے جو نو رس بنتے ہیں ان کے نام یہ ہیں

۱۔ شرنگار ۔ ۲۔ ہاسیا ۔ ۳۔ کرونا ۔ ۴۔ رودرا ۔ ۵۔ ویرا ۔ ۶۔ بھیانکا ۔ ۷۔ بیبھتسا ۔ ۸۔ اد
اور ۔ ۹۔ شانتا

بعض پنڈتوں نے دو رس اور بھی مانے ہیں:
۱۔ واتسلیہ ———— ماتا

۱۰. ۲. بھگتی ——— عبادت پرستش۔

ان نو رسوں کی مزید تشریح یا وجہ کا بیان یہاں غیر ضروری ہے۔

فنکار کسی ایک رس کو تمام و کمال پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاعر مناسب الفاظ کا وسیلہ اختیار کرتا ہے۔ مصور رنگوں کی زبان سے بناتا ہے اور موسیقار سُروں سے فضا میں جذبے کی تصویر بناتا ہے۔ شاعر کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس سے دشوار مصور اور بت ساز کا ہے۔ موسیقار کا کام سب سے دشوار ہوتا ہے۔ شاعر اور مصور کے الفاظ اور رنگوں کی طرح موسیقار کے سُر آنکھوں کے سامنے قائم نہیں رہتے۔ سُروں کا قیام لمحاتی ہوتا ہے۔ انھیں آنکھوں سے نہیں کانوں سے دیکھنا ہوتا ہے۔ حکیم مومن خاں نے اسی خصوصیت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

پنڈتوں نے سُرتی سے ایک داخلی کیفیت کو وابستہ کیا ہے۔ راگوں کی ترتیب انھی سُرتیوں سے ہوتی ہے اور چونکہ ہر مزاجی کیفیت کا ایک رنگ بھی مقرر ہے، مثلاً غم کا سیاہ، خوشی کا گلابی، فراق کا زرد، حسد کا سبز، اس لیے کیفیات کے ساتھ تخیل میں رنگ بھی بدلتے رہتے ہیں اور گھلتے ملتے ہیں کہ اچھے سننے والوں کے ذہن میں راگ کی ایک مکمل تصویر بن جاتی ہے۔ اسی سے راگوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں، گویا موسیقی کو مصوری میں ڈھالا گیا ہے۔

راگ راگنیوں کے لیے وقت بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ انسانی مزاج آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی ایک سا نہیں رہتا۔ راگ کا تعلق مزاج یا نفسیاتی کیفیت سے ہوتا ہے اس لیے راگ کے لیے بھی وقت کا تعین ضروری ہوا۔ راگ اسی وقت زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے جب فنکار اور سامعین کی مزاجی کیفیت ہم آہنگ ہو۔ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

۱. تڑکے سے دوپہر تک۔
۲. دوپہر سے غروبِ آفتاب تک۔
۳. شام سے آدھی رات تک اور
۴. رات ڈھلے سے طلوعِ آفتاب تک۔

دوپہر سے شام تک کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان عموماً کسل اور تھکن محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس رات ڈھلے سے صبح کے وقفے میں طبیعت جولانیوں پر ہوتی ہے۔ راگوں کے سُروں کو اس لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے کہ وقت کے مطابق بدلتے جائیں۔ سُر تیز بھی ہوتے ہیں اور ملائم بھی۔ جیسے جیسے رات ڈھلتی جاتی ہے اس وقفے کے راگوں میں تیز سُر کم ہوتے جاتے ہیں اور ملائم بڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بھیرویں میں، جو صبح کو گائی جاتی ہے، پورے سُر ملائم ہو جاتے ہیں۔

علم موسیقی سر تا پا ایک عملی فن ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف سُروں ہی کا علم و فن نہیں ہے، تالوں کا بھی اس میں بہت دخل ہے۔ یہاں موسیقی کے اس پہلو کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

صدیوں میں جا کر راگوں کے اصول و قواعد بنے ہیں اور یہ اتنے مکمل ہیں کہ ان سے ذرا سا بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ ہر راگ کے سُر مقرر ہیں اور ان کی ادائیگی کا ایک خاص ڈھنگ ہے۔ جب تک مقررہ اصولوں کی پوری پوری پابندی نہ کی جائے، راگ وارد ہو

سروپ قائم نہیں ہو سکتا، اور راگ کا منشا پورا نہیں ہوتا۔ کسی راگ کا مقصد اگر سکون پیدا کرنا ہے تو اُس کے گانے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس راگ کی تمام باریکیوں اور نزاکتوں سے پوری طرح واقف ہو اور اس کی ادائیگی پر پوری قدرت رکھتا ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سننے والوں میں ایسا سکون پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ سعادت بہت کم فنکاروں کو حاصل ہوتی ہے اور ہر فن میں اچھے فن کار کم ہی ہوتے ہیں۔ یہ اچھے فن کار وہ لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے عطیۂ خداوندی کی اس طرح قدر کی ہے کہ آٹھوں پہر عبادت کی طرح اس میں ساری عمر منہمک رہے ہیں اور اس علم کو ایسا سوچا سمجھا کہ انھیں اس کا عرفان حاصل ہو گیا۔ اسی عرفان اور اسی قدرت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کچھ عجب نہیں اگر روایتیں صحیح واقعات ہی ہوں اور ان کا حکم آب، آتش، باد، خاک پر بھی چلتا ہو۔

فن کے انتہائی انحطاط کے بعد بھی راگوں میں تاثیریں تو اب بھی باقی ہیں، حالانکہ خالص فن کی طرف نہ کسی کی توجہ ہے اور نہ فن کی پرستش۔ راگوں کا علم ایک نہایت دشوار علم ہے جسے سمجھنے کے لیے اور جس سے لطف اندوز ہونے کے واسطے بڑی جد وجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسے برتنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے، اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر ختم ہو جاتی ہے اور فن کار فن پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔

موسیقی کو سننے اور سمجھنے کے لیے ایک خاص ذوق بنانا پڑتا ہے اور اپنے اندر ایک مخصوص صلاحیت اور قابلیت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ یہ اصول کچھ موسیقی ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ جملہ فنونِ لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص ذہنی تربیت درکار ہوتی ہے، اور موسیقی میں اس کی احتیاج اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح ہمیں دیکھنے اور غور کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

فن اور فن کاروں کی ناقدری اور سننے والوں کی سہل پسندی کے ہاتھوں راگوں کی شکلیں مسخ ہو گئی ہیں، اس لیے اب وہ اگلی سی تاثیر کہاں؟ اگلے وقتوں میں فنکاروں کو ہر طرح کی فراغت حاصل تھی اور کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ ایسی ہی قدر دانیاں بھی تھیں کہ موتیوں سے منہ بھر دیے جاتے تھے اور جاگیریں انعام میں دی جاتی تھیں۔ کیا تعجب کہ ساری عمر کی ریاضت کے بعد فنکاروں نے درجۂ کمال حاصل کر لیا ہو کہ راگ کی تاثیر سے انہونی باتیں ہونے لگی ہوں۔ قوتِ ارادی کی کرشمہ سازیاں کس نے نہیں دیکھیں؟ فنکار بھی راگ کے ذریعے ایک جذبے یا ملے جلے جذبوں مثلاً غصہ اور نفرت یا خوشی اور ہنسی وغیرہ کی تصویریں سُروں سے بناتا ہے۔ خود اس کیفیت کو اپنے اوپر طاری کر کے نقل اتار کے ذریعے سننے والوں میں بھی وہی جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ جذبات یوں بھی متعدی ہیں، کسی کو ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسی آ جاتی ہے، اور غم زدہ انسان کو دیکھ کر رونا آ جاتا ہے۔ بس جس طرح ؎

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اسی طرح اگر واقعی جذبہ صادق ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اس سے متاثر نہ ہوں۔ زمانۂ حال کے ایک فلسفی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ فضا میں سُروں کے زیر و بم سے تموّج پیدا ہوتا ہے اور کچھ ایسی برقی لہریں پیدا ہوتی ہیں جو سننے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسے آلے بن جائیں یا بن چکے ہوں جن سے ان برقی لہروں کی قوت کو جانچا جا سکے۔ دوسری ناممکن نظر آنے والی باتوں کی طرح ممکن ہے سائنس اس بات کو بھی ممکن کر دکھائے۔ آج کل موسیقی کے وہ اعجاز دکھائی نہیں دیتے جن کا ذکر کتابوں اور روایتوں میں ہوتا ہے تو کیا

کی تاثیریں اڑ گئی ہیں، راگ تو موجود ہیں لیکن ان سے اثر آفرینی کرنا ہمارے فنکاروں کا کام ہے۔ فنکاروں میں اتنی صلاحیت ہی اب نہیں ہوتی کہ راگوں سے اثرات مرتب کر سکیں۔ ورنہ سترہ اٹھارہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ سردار پٹیل عارضۂ قلب میں مبتلا تھے تو انھیں ان کے ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ کسی اعلیٰ درجے کے فنکار سے نرم و نازک موسیقی سنیں۔ سردار پٹیل اس زمانے میں نشریات کے بھی وزیر تھے۔ انھوں نے ریڈیو والوں سے کہا اور ریڈیو والوں نے سارنگی کے جادوگر استاد بندو خاں کو بھیج دیا۔ خاں صاحب گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ ان کی کوٹھی پر جاتے اور انھیں طرح طرح کے سُکھ راگ سناتے۔ اللہ کی شان کہ سردار کو دل کے دورے پڑنے ملتوی ہو گئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد استاد کو بڑی بڑی رقمیں ریڈیو سے دلوانے کا اعلان کر دیا، مگر جیسے ہی استاد کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ ملا استاد پنجرے سے نکل آئے اور کچھ عرصے بعد سنا کہ سردار پٹیل ہارٹ اٹیک میں چل بسے۔ اور یہ تو خود ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک صاحب اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر آئے اور بولے کہ اسے مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ کسی نے کبھی ان سے کہا تھا کہ اسے گانا سکھاؤ تو اس کا مرض جاتا رہے گا۔ لہٰذا ہم نے اس لڑکے کو گانا سکھانے کے لیے ایک استاد مقرر کر دیا۔ جب تک یہ لڑکا سیکھتا اور گاتا رہا اسے دورہ نہیں پڑا۔ پھر بعض وجوہ سے اس نے گانا چھوڑ دیا تو اسے دورے پڑنے لگے۔ اس نے پھر گانا شروع کر دیا، دورے ملتوی ہو گئے چھوڑ دیا پھر شروع ہو گئے۔ اب تک یہی تواتر کے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔

فن اور فنکاروں کے تنزل کے اسباب پر بھی ہمیں دھیان دینا چاہیے۔

اوّل تو راگوں کی صداقت مشتبہ ہو گئی کیونکہ متنوں اور گھرانوں میں اختلاف ہو گیا اور ہر ایک کو اپنی روایت کی صحت پر اصرار ہے۔ گندھاری کو میں نے چار طرح سے سنا ہے۔ اس کا فیصلہ کیسے ہو کہ صحیح کون ہے اور غلط کون؟ دوسرے فنکاروں کی ناقدری نے ان کو فن کی صحیح تحصیل سے محروم کر دیا۔ تیسرے پیٹ پالنے کے تفکرات اور غم دوراں کی کشاکش سے انھیں اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ فن کو اعلیٰ پیمانے پر پہنچائیں۔ چوتھے جہالت کی وجہ سے فن کی علمی شان گھٹتی چلی گئی۔ پانچویں قدامت پرستی نے فن کو جامد کر دیا جس کی وجہ سے ترقی تو یکسر موقوف ہو گئی اور فن گھٹتے گھٹتے تنزل کی آخری حد میں پہنچ گیا۔ چھٹے اس فن کو ہر دلعزیز بنانے اور عام کرنے کے بجائے اسے میراث بنا کر محدود کر دیا اور اس کے بتلانے میں اتنے بخل سے کام لیا گیا کہ بعض صورتوں میں شاگردوں کا ذکر ہی کیا باپ نے بیٹے کو بھی فن کے گر نہیں بتلائے اور جب اس فن کو سمجھنے والے ہی نہ رہے تو اس کی قدر کون کرتا؟ پیشہ ور فن کاروں نے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری نتیجہ یہ کہ فن مٹتا چلا گیا اور بہت کچھ ان ہی کے ساتھ دفن ہو گیا۔ ساتویں ہمارے فن کاروں نے راگوں کی روح کو تو چھوڑ دیا اور صرف ہئیت کی تکمیل کو فن قرار دے لیا، جس کی وجہ سے راگ کا رس غارت ہو گیا۔ آٹھویں فنکاروں کی جہالت کے باعث معاشرے میں فنکاروں کو پست ترین درجہ دے دیا گیا اور انھیں حقارت سے دیکھا جانے لگا۔ یہاں تک انھیں گرایا گیا کہ ان کا شمار کمینوں میں ہونے لگا اور ان کے ساتھ چھوٹا سا برتاؤ کیا جانے لگا۔ نویں افلاس کی وجہ سے خصوصیت میں جو بُرائیاں بالعموم در آتی ہیں وہ سب ان فنکاروں میں بھی پائی گئیں اور فنکاروں نے فن کو پس پشت ڈال کر اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پسند کی موسیقی کو اپنا شعار بنا لیا اور شیعت میں ایسی ایسی اختراعات کیں جن سے تمام راگ مسخ ہو گئے۔ فن کی جگہ بازیگری نے لے لی اور ہماری موسیقی محض چند تغوّتیوں کا ایک پشتارہ ہو گئی۔ اس کی روحانیت رخصت ہو گئی اور اس میں مادیت نے جگہ پائی۔ دسویں حکومت نے دیس کے سنگیت کی سرپرستی نہیں کی اور اس طرح تعمیر و تعلّم سے ادارے

قائم نہیں کیے اور نہ اس فن کی بقا و ترقی کے لیے کچھ کیا۔ لہٰذا اس کی ابتری ہوتی ہی چلی گئی۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر ہماری موسیقی کا علم و فن پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ وہ روحانیت اور وہ تاثیر اب اس میں کہاں باقی رہ جاتی جس کے تذکرے ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ دیپک گانے سے آگ لگ جاتی تھی اور میگھ ملہار گانے سے مینہ برس جاتا تھا۔ آج کل ان روایتوں کی حیثیت کہانیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن جس زمانے میں فنکار موسیقی کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور فن حاصل کرنے کے لیے ایسی کڑی ریاضت بھی کرتے تھے تو کیا عجب کہ ان کی [illegible] روحانیت کے باعث ایسے معجزے ظہور میں آتے ہوں۔ آخر صوفیا کے ایک فرقے نے موسیقی کو (قوالی بھی موسیقی میں شامل ہے) تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اگر ہمارے فنکار بھی اس نقطۂ نظر کو قبول کر لیتے تو آج ان کی یہ درگت نہ ہوتی۔ اور فن کا بھی بھلا ہوتا۔

فن اور فنکار کے اس درجہ برباد ہو جانے پر بھی ہمارے راگوں میں کچھ نہ کچھ تاثیر اب بھی باقی ہیں۔ اور اگر راگ ودیا کی چھان بین اور سائنٹیفک اسٹڈی کرنے کی کسی میں توفیق ہو تو کوئی تعجب نہیں کہ موسیقی کی ناقابلِ یقین قوتوں کا حیرت انگیز انکشاف ہو جائے اور معجزہ خیز کہانیاں اسی طرح سچی حقیقتیں ثابت ہو جائیں جیسے ہوائی جہاز، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے مضحکہ خیز نظریے آج ہماری روزمرہ کی زندگی کی ملموس حقیقتیں بن گئے ہیں۔

مسلمانوں کے اس عظیم ورثے کو مٹ جانے سے بچانے کے لیے تعلیم یافتہ حضرات کو اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو بھی اس کی سرپرستی پر مائل ہونا چاہیے اور آرٹ کاؤنسل اور میوزک کاؤنسل جیسے سرکاری امداد پانے والے اداروں کو اس فن کی بقا و ترقی کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے کیونکہ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کلاسیکل موسیقی سے ہمسری

سجاد سرور نیازی

جنابِ صدر، معزز خواتین و حضرات!

مجھے آپ کی خدمت میں اس امر کی وضاحت کرنی ہے کہ وہ کون سے عناصر ہیں جنھوں نے ہماری کلاسیکی موسیقی کو للکارا اور اس کی ترقی اور ترویج کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ اس کے لیے ہمیں اس فن کی تاریخ کے کچھ پرانے ورق اُلٹنے پڑیں گے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ صدیوں پہلے کلاسیکی موسیقی کی بنیاد دیہاتی عوامی دھنوں پر رکھی گئی تھی۔ عوامی دھنیں عوام کے دلوں سے اُٹھیں اور ان کے ہونٹوں سے سادہ نغموں کی صورت میں ہویدا ہوئیں۔ انسان تجربے اور اجتہاد سے زیادہ عقلمند ہوتا گیا اور فنونِ لطیفہ جو انسان ہی کی جدتِ طبع کا نتیجہ تھے انسانوں کی عقل و بصیرت کے ساتھ ترقی کرتے گئے۔ شہری پیشہ ور اور شوقین موسیقاروں نے دیہاتی دھنوں پر زیادہ خوش قطع عمارتیں تعمیر کیں۔ آواز اور نغمے کے قواعد مرتب کیے اور کلاسیکی موسیقی کی بنیاد رکھ دی۔ دیہاتیوں کی روح اور جذبات کو تسکین دینے کے لیے دیہاتی دھنیں کافی تھیں۔ گو عوامی گیت زمانے کے ساتھ شکل و صورت بدلتے رہے لیکن بنیادی طور پر وہ عوامی گیت ہی رہے ان میں ان کی خصوصی خوبیاں بدستور قائم رہیں لیکن شہری موسیقاروں کی ضروریات عوامی دھنوں سے پوری نہ ہو سکیں۔ انھوں نے اپنے وقت کے تقاضے کے مطابق عوامی دھنوں کے نقش پر موسیقی کے مختلف اسلوب تیار کیے اور سامعین کو ان کے سننے اور پسند کرنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ مذہبی، جنگی، رومانوی اور دیہاتی بولوں کو مختلف راگوں میں پیش کر کے ایک کثیر تعداد سامعین کی پیدا کر لی۔ الاپ، دھرپد، ہوری، ترانہ، ٹپہ اور خیال آگے پیچھے معرضِ وجود میں آئے اور خوب مقبول ہوئے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان وقتوں کی سوسائٹی کو دیکھ کر اس موسیقی کو تیار کیا گیا تھا۔ فن اور سوسائٹی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں سوسائٹی کی وجہ سے ہیئت نے یہ صورتیں اختیار کیں اور ان صورتوں نے سوسائٹی کو اپنے رنگ میں رنگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی امنگ اور طمانیت بخش فن پرورش پا گیا۔

دیہاتی عوامی گیتوں اور راگوں سے جی بہلاتے رہے۔ شہری دھرپد اور خیال سے دل لگاتے رہے۔ بادشاہوں، مہاراجوں اور نوابوں نے گویوں کو ملازم رکھا جہاں مال و دولت، فوجیں اور ساز و سامان حسبِ ضرورت رکھا جاتا تھا وہاں ثقافتی میدان میں بھی ایک دوسرے سے بازی لے جانا شاہانہ طمطراق اور شان و شکوہ کے لیے لازمی تھا۔ نامی گرامی اور قابل شاعروں، مصوروں اور موسیقاروں کو دربار کی زینت بنایا گیا۔ گویے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے گانے کے نئے اسلوب پیدا کرنے کی دھن میں لگ گئے اور مشکل تانیں اور طریقے اختراع کرنا شروع کر دیے۔ انھوں نے جان توڑ کر اپنے فن میں خوبیاں اور دلچسپیاں ڈالیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ قدر دان بادشاہ اور نواب بے انتہا خوش ہوتے اور طرح طرح کی نوازشوں، جاگیروں سے مالا مال کر دیتے۔

اب اودھ کے تاجداروں کا زمانہ آیا۔ واجد علی شاہ نے ٹھمری کی لطافت کی نظروں سے دیکھا۔ جو انھوں نے عجم سے ٹھمری دادرے اور رسیلے لوگوں کے دلوں اور مذاق پر اثر انداز ہونے لگے۔ کلاسیکی موسیقی کی نشستیں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ ناٹک اور اوپیرا کے زمرے میں اندر سبھا کا تجربہ کامیاب ہوا تو تھیئٹر نے بھی سر نکالا۔ پارسیوں نے سیکڑوں ناٹک لکھوائے۔ ہارمونیم ماسٹروں یعنی اس زمانے کے میوزک ڈائرکٹروں کی جماعت وجود میں آئی اور کمپوزڈ میوزک کی بنا پڑی۔ میوزک ڈائرکٹر ناٹک کی طرزیں بنانے لگے۔ یہ طرزیں چونکہ ناٹک کے کرداروں سے گوائی جاتی تھیں اس لیے ان کو عموماً آسان اور ہلکی پھلکی موسیقی میں تیار کیا جاتا تھا۔ ڈرامے کے پس منظر میں یہ طرزیں لوگوں کو بہت بھائیں اور ان میں سے کئی ایک زبان زد عام ہو گئیں۔ اتنے میں گراموفون کمپنی کا زمانہ آگیا۔ چونکہ یہ کمرشل ادارہ تھا انھوں نے شہر شہر ریکارڈنگ روم کھول کر معیار کا خیال بالکل نہ رکھتے ہوئے ہر وہ گانا ریکارڈ کر ڈالا جو بک سکتا تھا۔ شہروں کے علاوہ گاؤں اور قریہ قریہ کمپنی نے اپنی گراموفون مشینیں بیچیں۔ کلاسیکی موسیقی کے چیدہ چیدہ اور مستند لوگوں کے ریکارڈ بنائے۔ لیکن موسیقی کی باقی صنفوں میں کسی ایک کو بھی جلب منفعت کی خاطر ریکارڈ کرنے سے نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ عامیانہ سطح کی سیٹھنیاں اور مبتذل گانے جو رنڈیوں سے بھی بازاروں میں گائے گئے تھے ریکارڈ کر ڈالے۔ بھجنوں اور قوالیوں کی بھرمار شروع ہوئی۔ آپ خود خیال فرمائیں کہ جب لوگوں کو آسان فہم اور ان کے مذاق کے مطابق گانے سستے داموں مہیا ہونے لگیں، تو کلاسیکی موسیقی ان کو رفتہ رفتہ کیوں نہ گراں گزرنے لگے اور ایسا ہی ہوا۔

اب کلاسیکی موسیقی کے پرستاروں اور گرویوں کو اور، ان میں بالخصوص ہندوؤں کو جو راگ ودیا کو مذہب کا ایک ضروری اور اہم جزو سمجھتے تھے بڑا خطرہ لاحق ہوا۔ گھر گھر خدشات کا اظہار ہونے لگا۔ کانفرنسیں بلائی گئیں۔ گندھرو مہاودیالے میوزک سکول اور کالج کھولے گئے غرض راگ ودیا کا سبھاؤں، جلسوں اور میلوں میں زور شور سے پرچار کیا گیا۔

جو بہت اچھے اور نامی گائک تھے ان کے سننے والے تو پھر بھی کئی تھے لیکن بھدی آوازوں والے مصنوعی قسم کے گرویوں کو سننے پر ناٹک دیکھ لینے یا گراموفون ریکارڈ سن لینے کو ترجیح دی جانے لگی۔

اندریں حالات کلاسیکی موسیقی کی جاتی ساکھ کو بچانے کی کوششیں شد و مد سے جاری تھیں کہ متکلم فلموں کا زمانہ آگیا۔ لوگوں کے لیے یہ ایک نہایت دلآویز اور دلربا مشغلہ تھا۔ فلمیں درجنوں کے حساب سے بنتے جاتے اور سینما گھروں پر تماشائیوں کی وہ بھیڑ لگتی کہ ٹکٹ کا دستیاب ہونا دشوار ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ دیسی متکلم فلموں نے شائقین کی ایک بہت بڑی جماعت کو کلاسیکی موسیقی کے دائرہ اثر سے نکال کر اپنی طرف راغب کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور غضب ہوا کہ مغربی فلمیں بھی اپنی موسیقی اور رقص کے کچھ اس انداز سے پیش ہونے لگیں کہ متمول اور متوسط گھرانوں کے بے شمار نوجوان مغربی موسیقی سے متاثر ہونے لگے۔ وہ کان جو دھرپد، خیال اور ٹھمری کی نغمہ سرائی کے لیے وقف تھے۔ جیز کی تال اور مغربی موسیقی سن کر خوش ہونے لگے۔ نئی پود راک این رول اور ٹوسٹ کرنے لگی۔

عوامی ناچوں میں شہری حصہ نہیں لیتے لیکن جب سے انھیں مغرب کے استادوں سے معلوم ہوا ہے کہ کسی ملک کی ثقافتی سرگرمیوں میں عوامی موسیقی اور رقص کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے تو پھر ان شہروں میں اپنی ثقافتی فوقیت اور برتری دکھانے

کے لیے بیہودہ تھا۔ سستی پکچروں جیسے فرسودہ پیشے اور دیہاتی ناچوں کی نقل کر کے دیہاتیوں کی عزت افزائی کرتے رہے۔ اعلیٰ درجے کی تربیت یافتہ رقصوں کا شمار کلاسیکی موسیقی میں ہوتا ہے۔ جن میں بھارت ناٹیم، کتھا کلی، منی پوری، کتھک ناچ مشہور اور مقبول ہیں۔ ان میں مسلمانوں نے کتھک کو زیادہ مروج کیا لیکن یہ ناچ اب طوائفوں نے اپنا لیا ہے۔ بیشتر گھرانوں میں رقص و سرود کا شمار خرافات میں ہے اور شرفا اپنی اولاد کو اس کے کسب و اکتساب سے منع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیسی ناچ کے لیے طبلہ سارنگی وغیرہ کی سنگت درکار ہے۔ لیکن راک اینڈ رول، ٹوسٹ، یا بال روم ڈانس کے لیے مغرب نے بیشمار ریکارڈ تیار کیے ہیں جن کو بجا کر ان کی لے کے ساتھ ہمارا نوجوان طبقہ ناچنے کی حسرت پوری کر لیتا ہے۔ گویا یہ ایک اور وجہ ہے ہمارے نوجوانوں کے مغربی موسیقی سے لگاؤ کی۔ انسان کی توجہ کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف لگن زیادہ ہو جائے تو دوسری طرف سے میلان کم ہو جاتا ہے۔

دیسی کلاسیکی موسیقی کو حاصل کرنے اور اس پر قادر ہونے کے لیے تو ایک عمر چاہیے لیکن انسان اس سے کما حقہ لطف اندوز تو صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ایک حد تک اس کی تکنیک سے واقفیت ہو۔ یہ درجہ پانے کے لیے بھی کافی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو راگ رنگ کو کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر فضول اور مخرب اخلاق سمجھتے ہوئے اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دلوانا گوارا نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے بچوں کے آوارہ ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ان قدغنوں کے ہوتے ہوئے ایک قوم کس طرح موسیقی میں مناسب دلچسپی لے سکتی ہے۔ چہ جائیکہ اپنے آپ کو کلاسیکی موسیقی کا دلدادہ بنا لے۔ اور فرض کیجیے کہ کچھ لوگ کلاسیکی موسیقی کے رسیا کسی نہ کسی طرح بن بھی گئے تو موجودہ دور میں ان کے پاس وقت کہاں کہ کسی خیال، دھرپد یا اس کی ولمبت اور درت لیکاری اور تان پلٹوں کا دو گھنٹہ، دو گھنٹے بیٹھ کر کر یا سن کر لطف اندوز ہو سکیں ہاں کبھی کبھار جب موسیقی کی خاص مجلس ہو اور اس میں گراں پایہ گائیک اور بجائیک اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوں یا نامور رقاص اپنے فن پیش کرتے ہوں تو کبھی شائقین گھنٹوں ایسے خوشگوار لمحے خوشی سے گزار دیں۔ لیکن یہ تو کبھی کبھار کی بات ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے مطلب پر اب کئی ([illegible]) ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن پر وقت بھی تھوڑا صرف ہوتا ہے اور آدمی اس سے پوری طرح متمتع بھی ہو سکتا ہے۔ آج کل زندگی کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ اب سے تیس پینتیس برس پہلے ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خاص مجلسوں کو چھوڑ کر عام موقعوں پر گویا مشکل تانوں پلٹوں سے بھرپور لمبا خیال گائے گا تو سننے والوں میں بے چینی اور اکتاہٹ پیدا ہو جائے گی اور وہ دوبارہ ایسی مجلس میں بیٹھنے سے گریز کریں گے۔

اس ضمن میں پہلے ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان اور اس محکمے کے دیگر اصحاب اقتدار کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ریڈیو پاکستان ہر نام نہاد کلاسیکی موسیقار کو پروگرام دے کر ان کی معاشی زندگی کو سہارا دینے کا ثواب کما رہا ہے لیکن ہر وہ گویا جو جسمانی ذہنی اور فنی لحاظ سے گانے کو نہیں نباہ سکتا۔ سننے والوں کو کلاسیکی موسیقی سے متنفر کر دیتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ریڈیو کی سوئی کلاسیکی موسیقی کے پروگرام سے ہٹ کر فلمی نشریات کی طرف گھوم جاتی ہے۔

ایک بے آواز گویا یا عمر رسیدہ ضعیف موسیقار جس کے گلے میں صحیح سُر لگانے یا تان پلٹے کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کی طاقت نہ ہو ریڈیو پر گا کر کلاسیکی موسیقی کی ترویج اور قدرشناسی کو سخت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ریڈیو پر صرف بہترین گانے والے

کا بھی ہو جس میں خوبصورت طریقے سے گانے کی قدر ہو۔ جو گیت اب گانے کے قابل نہیں رہے یا ان کا نشر کرنے سے سُننے والوں کی توقعات پوری نہیں ہو سکتیں ان کی مالی امداد کرنی اگر بہت ضروری ہو تو ان کے لیے کوئی اور مناسب انتظام کیا جائے۔

کلاسیکی موسیقی کو ریڈیو پر زیادہ وقت دے کر اور ہر کس و ناکس گویئے کو نادر موقع کے لیے بھرتی کر کے مطمئن ہو جانا کہ اس سے کلاسیکی موسیقی کی توقیر یا اس کی جاذبیت میں اضافہ ہو جائے گا میری رائے میں کوئی تسلی بخش اقدام نہیں۔ اپ گانے والے بھی کسی پلان (PLAN) کے تحت گانے نشر کریں۔ گراں پایہ گویوں کی قابلیت کے ہم معترف ہیں اور ان کی دل سے عزت کرتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر گراں بہا فن کے مالک ہونے کے باوجود اس کو کامیابی سے سُننے والوں کے سامنے مؤثر طریقے سے پیش نہیں کر سکتے اس کام میں شومین شپ (SHOW MAN SHIP) اور سیلز مین شپ (SALES MAN SHIP) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی نشریات کو کوئی صاحب نظر و فن پیش کرے نشر کیے جانے والے راگ ان کی بولوں کی شانِ نزول، گانے والے کی شہرت اور گائیکی کا انداز، سُر کے اُتار چڑھاؤ، جلتے کے ٹھیکے اور وغیرہ، گانے کو سامعین سے متعارف کرواتے وقت بتائے جائیں۔ مگر اس کام کو پیشہ ور اناؤنسروں پر نہ چھوڑا جائے جو کام صرف لکھی ہوئی اناؤنسمنٹ کو پڑھ دینا ہے۔

سب سے آخر میں اب میں اس مدمقابل کا ذکر کروں گا جس نے کلاسیکی موسیقی کے ساتھ سب سے زیادہ مقابلہ کیا ہے اور اس کی ہر دلعزیزی میں کافی کمی پیدا کر دی ہے۔ میرا اشارہ فلمی موسیقی کی طرف ہے۔ یوں تو اس پر دفتر لکھے جا سکتے ہیں لیکن میں مختصراً فلمی موسیقی کی دو قسموں کا ذکر کروں گا۔

پہلی قسم جو بہت زیادہ مقدار میں کمپوز کی گئی ہے۔ اس کو کوئی خاص نام نہیں دیا جا سکتا۔ آپ اسے بازاری فلمی موسیقی کہہ لیجیے۔ اس کے کمپوز کرنے والے بے شمار ہیں۔ کوئی بھی معمولی درجے کا ساز بجانے والا بہت قلیل معاوضے پر فلمیں بنانے والے کے ہاں ملازم ہو جاتا ہے۔ ایسا پروڈیوسر کہانی بھی سستے داموں خریدتا ہے یا کم تعلیم کے باوجود خود لکھتا ہے اور گانے بھی کوڑیوں کے دام لکھواتا ہے جس کے بول بہت کمزور اور ناقص ہوتے ہیں۔ سینسر ہوتے وقت ابتذال کے الزام سے بال بال بچتے ہیں۔ ایسی موسیقی کو خوش ذوق لوگ تو کبھی پسند نہیں کرتے لیکن اس کا عوام کے دلوں اور ذہنوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس قسم کے گانے کو سُننے والے کلاسیکی موسیقی کی طرف کبھی راغب نہیں ہو سکتے۔

دوسری قسم اعلیٰ درجے کی فلمی موسیقی ہے۔ یہ موسیقی ہمارے مُلک کے قابل اور ہونہار کمپوزر تیار کرتے ہیں۔ چونکہ ان موسیقاروں کو موسیقی کے ہر شعبے سے مکمل واقفیت ہوتی ہے اور خود صاحب ذوق اور صاحب دل ہوتے ہیں اس لیے ان کی تیار کردہ موسیقی پُرکشش ہوتی ہے۔ یہ لوگ نت نئے نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ان کی موسیقی ایک طرف ہماری کلاسیکی موسیقی کی مرہونِ منت ہوتی ہے تو دوسری طرف ہماری عوامی موسیقی کی دلآویزیوں کی حامل ہوتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو بسا اوقات مشرقی اور مغربی پاکستان کی موسیقی کے خصوصی رنگ کو آپس میں بڑی خوبصورتی سے ملاتے ہیں۔ ان لوگوں نے دنیا کے دیگر ممالک کی موسیقی سے بھی اقتباس کیا ہے اور جہاں جہاں خوبصورتی نظر آئی ہے اسے اپنایا ہے۔ یہ لوگ گویا ہماری موسیقی

... سندا کی پر رونق بلکی پھلکی موسیقی پیدا کر رہے ہیں۔

باوجود اس کے کہ اس موسیقی کو میں اچھی موسیقی میں شمار کرتا ہوں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ بسا اوقات اس موسیقی نے کلاسیکی موسیقی کا رنگ پھیکا کر دیا ہے۔ چونکہ میں کلاسیکی موسیقی کا بذات خود بہت مداح ہوں اور اسے پسند کرتا ہوں میں اپنے ملک کے کلاسیکی موسیقاروں سے گزارش کروں گا کہ وہ ان خطرات کو جن سے میں نے اُن کو آگاہ کیا ہے مدنظر رکھتے ہوئے اپنی موسیقی کے انگ اور ڈھنگ میں نئی اور خوش آئند تبدیلیاں پیدا کریں۔ پرانی روش سے بھی سامعین کا دل خوش کریں اور ان کو اپنا گرویدہ بنائے رکھیں۔

امیر خسرو اور اصنافِ موسیقی

مسعود پرویز

اس مقالے میں امیر خسرو کی جامع الصفات شخصیت کے صرف اس فنی کمال کو اجاگر کرنا مقصود ہے جس کا تعلق اصناف موسیقی سے ہے۔ ان کے ایجاد کردہ راگوں، تالوں اور سازوں پر بحث و تمحیص اس مقالے کا موضوع نہیں۔ اس سلسلے میں جو مواد ہماری رہنمائی کر سکتا ہے وہ یا تو خود ان کی اپنی تصانیف میں بکھرا ہوا ہے یا تذکرے اور شعبیت جو وقتاً فوقتاً مرتب ہوتے رہے۔ یا پھر وہ روایات ہیں جو موسیقاروں میں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر نے ۹۹ کتابیں تصنیف کیں۔ امین رازی ہفت اقلیم میں ان کی تعداد ۹۹ بتلاتے ہیں لیکن ان میں سے آج ہمیں بیس سے زیادہ کا سراغ نہیں ملتا۔ دولت شاہ کے مطابق امیر نے ایک رسالہ فن موسیقی پر بھی لکھا (شعر العجم ص ۱۲۲) اور وحید مرزا اپنی فاضلانہ کتاب لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو میں لکھتے ہیں:

یقیناً اس موضوع پر اگر شاعر نے کچھ لکھا بھی ہو تو وہ کوئی ضخیم یا مستقل کتاب نہ تھی (ترجمہ ص ۲۴۶)

اس کے ثبوت میں وحید مرزا امیر کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

نظم را کردم سہ دفتر ور بہ تحریر آمدے
علم موسیقی سہ دفتر بودے ار باور بود

حیرت ہے کہ رفیق محمد خان خورجوی اپنی تصنیف حیات امیر خسرو میں اسی شعر سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

"گویا موسیقی کا بیش بہا ذخیرہ انہی کی زندگی میں ضائع ہو گیا تھا" (ص ۱۹)

اور شاہد احمد دہلوی اسی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"خود امیر خسرو کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے موسیقی کے تین دفتر لکھے تھے جو تلف ہو گئے۔"

اس شعر کا ترجمہ یہ ہے:

"میری شاعری کے تین دفتر ہو گئے اور اگر میں تحریر کرتا تو یقین کرو علم موسیقی کے بھی تین دفتر ہو جاتے۔"

یہ شعر امیر کے قصیدہ ... غرۃ الکمال میں شامل ہے اور اس کے بعد امیر نے فن موسیقی پر کوئی کتاب نہ لکھی کیونکہ ہو سکتا ہے بعد میں لکھی ہو۔ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انھیں ایسی کتاب لکھنے کی خواہش ضرور تھی۔

اس بنا پر اگر اس تصنیف کا کوئی سراغ نہ مل سکا تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی ضخیم یا مستقل کتاب نہ تھی۔ البتہ

میں فن موسیقی پر ایک باب ہے جس کا عنوان امیر نے یوں باندھا ہے :

"در تشعب اصول و فروع موسیقی مصرع بست این همه حرف نسبت موسیقی"

اس باب کے سترہ صفحے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ باب الگ رسالے کی صورت میں بھی مروّج رہا اور فنِ موسیقی پر جس رسالے کی طرف تذکرہ نگاروں نے اشارہ کیا ہے وہ یہی ہو۔ وحید مرزا نے اپنی کتاب میں اس باب سے استفادہ کیا ہے لیکن یہ بات نہیں۔ بظاہر اس باب میں تصنع زیادہ ہے اور مضمون کم لیکن اس کی ہر سطر موسیقی کی مصطلحات سے بھری ہوئی ہے اور تمام صنائع و بدائع موسیقی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً ایرانی راگوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"کہ اصول چرا منحصر بر چہار است و پردہ بر دوازدہ و ابریشم بر شش و مابقی فرعیت کہ ہم

از یناشاخ میزند۔" (ص ۱۸۷)

مثنوی قران السعدین میں سات صفحے سازوں اور پردوں کی صفت میں ملتے ہیں (ص ۱۷۷ تا ۱۸۳) موسیقی سے متعلق امیر کی ان تحریروں کے مستند ترجمے اور قابلِ اعتماد تشریح کے لیے کسی ایسے ماہرِ زبان کی توجہ چاہیے جو ایرانی اور عربی موسیقی کے رموز سے آشنا ہو۔

میں اب آپ کی توجہ امیر کی بسیار نویسی کے ایسے میدان کی طرف دلاتا ہوں جس کا بظاہر موسیقی سے کوئی تعلق نہیں۔ دولت شاہ کے مطابق امیر نے خود اپنی تحریروں میں تصریح کی ہے کہ ان کے ابیات کی تعداد پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہے اور داودی نے عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے (شعر العجم ص ۱۳۸) لیکن ان کے ہندی دوہوں میں سے گنتی کے چند اشعار پہیلیوں، مکرنیوں، دوہروں اور دوسخنوں وغیرہ کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ باقی ہندی کلام کیا ہوا؟ وحید مرزا کی رائے میں امیر اپنے ہندی کلام کو فارسی کلام کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور امیر کا اس وقت کی کتابی ہندی پر کھڑی بولی کو ترجیح دینا بھی وحید مرزا کے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ وہ:

"ہندی شعر صرف اپنا اور اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لیے کہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس مقصد کے لیے وہی عام روزمرہ کی زبان موزوں تھی جو اس وقت بولی جاتی تھی۔" (ترجمہ لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۳۱)

میری رائے میں امیر خسرو کی عظمت متقاضی ہے کہ اس مسئلے کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جائے۔ امیر ایک درباری فنکار ضرور تھے اور علم و فضل میں یگانۂ روزگار، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک عوامی فنکار بھی تھے۔ ان کی ہمہ گیر مقبولیت اس امر کی دلیل ہے۔ ترکی اور فارسی زبانیں انھیں باپ کی طرف سے ورثے میں ملیں لیکن ہندی (یا ہندوی) صحیح معنوں میں ان کی مادری زبان تھی۔ ان کا ہندی کلام محض ایک مصروفیت یا دل بہلاوا نہ تھا بلکہ ان کی روزمرہ زندگی کا ایک اہم جزو۔ اس کلام میں وہ ہمہ گیری اور خلوص تھا جو ایک عوامی فنکار کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر یہ حقیقت پیشِ نظر رہے تو اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ امیر کا بیشتر ہندی کلام کیا ہوا؟ اس کلام نے اپنی ہمہ گیر مقبولیت کے باعث لوک گیتوں کی صورت اختیار کر لی۔ یہ شاعری جو موسیقی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی

زندگی کے اس قدر قریب تھی کہ یہ عوامی ادب اور فن میں جذب ہوگئی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے یہ عوام کی اپنی تخلیق ہو۔ گنتی کے چند لوک گیت ہیں جن کے مصنف کا نام عوام کو اب تک یاد ہے۔ مثلاً:

" چھاپ تلک سب چھین رے موسے نیناں ملاکے "

یا " کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے "

یا " اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا " وغیرہ

ان لوک گیتوں کے علاوہ امیر کی وہ بے شمار بندشیں ہیں جنہوں نے قدیم ہندوستانی موسیقی کی روش تبدیل کرکے رکھ دی اور سنگیت کی روایات میں ایسا عظیم انقلاب برپا کر دیا کہ موسیقی کی تاریخ میں اس دور کو خسروی دور کہنا بجا نہ ہوگا۔ اس دور کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ بھارت میں امیر خسرو کے نام سے ایک مستقل اکیڈمی قائم ہو چکی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان میں ابھی تک ایسا کوئی ادارہ وجود میں نہ آسکا اور اس عظیم فن کار کی تصانیف و اختراعات کے متعلق تدوین و تحقیق کا دروازہ ابھی تک بند ہے۔

اس مختصر تمہید سے آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ جس فردوس گوش کی تخلیق امیر کے ہاتھوں ہوئی وہ یا تو وقت کے دبیز پردوں میں مستور ہے یا اس کی بازگشت عوامی ادب اور فن میں سنائی دیتی ہے یا ان موسیقاروں کے حلقوں میں جنہیں امیر کی نغماتی اختراعات سینہ بہ سینہ ورثے میں ملیں یا پھر اس کی جھلک امیر کی ان تحریروں میں ملتی ہے جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہیں۔ ان حالات میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث ناممکن ہے۔ مجبوراً کہنا پڑتا ہے:

حریمِ ناز کی خلوت میں دسترس ہے کسے
نظارہ ہائے سرِ گنبد کی بات کرو

تو اس مقالے کی حقیقت " نظارہ ہائے سرِ گنبد " سے زیادہ نہیں۔

اس فردوس گوش کا پہلا طلسم خانہ الفاظ سے مرتب ہوا۔ امیر کا ذوقِ سخن اس درجہ حساس اور ذوقِ سماع اتنا ہمہ گیر تھا کہ مثنوی مطلع الانوار میں لکھتے ہیں:

ہر چہ دریں پردہ نہاں ساختند
قافیہ از بہر سخن ساختند

الفاظ صوتی اشارات (　　　) کی حیثیت سے خیال و معنی کا وسیلہ ہیں لیکن ان کی محض صوتی کیفیت ایک موسیقار کے لیے بجائے خود دعوت تخلیق ہے۔ ڈھول کی آواز کا اثر ان الفاظ کے ڈھانچے پر پڑتا ہے:

دہل زن اں دہل زن بر قفس او
کر دیں دریں او دیں اُو دیں او

آدھی رات کی نوبت میں انہیں تکرار سنائی دی۔

نان کہ خوردی خانہ برد ۔ نان کہ خوردی خانہ برد ۔ خانہ برد ۔ خانہ برد
نان کہ خوردی خانہ برد ۔ نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد ۔ خانہ برد ۔ خانہ برد

خیال گائکی میں بول بڑھت آپ نے سنی ہوگی۔ بعض الفاظ میں اس کا بدل بھی سن لیجیے ۔ دُھنیے کے روئی دُھنکنے کا صوتی تاثر یوں ملتا ہے۔

در پئے جاناں جاں ہم رفت ۔ جاں ہم رفت ۔ جاں ہم رفت ۔ رفت ۔ رفت ۔ رفت جاں ہم رفت
ایں ہم رفت و آں ہم رفت ۔ آنہم رفت ۔ آنہم رفت ۔ ایں ہم رفت ۔ آنہم ۔ اینہم ۔ آنہم ۔ آنہم رفت ۔
رفتن ۔ رفتن ۔ رفتن دہ ۔ دہ ۔ دہ ۔ رفتن دہ ۔ رف ۔ رف ۔ رفتن دہ ۔ رفتن دہ ۔

"آج کل" کے موسیقی نمبر میں ڈاکٹر سید رغیب حسن نے امیر کی ایک رباعی یوں دی ہے۔

آں روز کہ روح پاک آدم بہ بدن
گفتند در آ، نمی شد از ترس بدن
خواندند ملائکان بہ لحن داؤد
درتن درتن در آ در آ درتن درتن (اگست ۱۹۵۶ء ص ۵۸)

اس رباعی کے پہلے مصرع میں غالباً کتابت کی غلطی ہوگئی کیونکہ پہلے دو مصرعوں میں تخلص کے اعادے سے ایطا واقع ہوتا ہے اصل رباعی مجھے امیر کے کلام میں نہ مل سکی۔ بہرحال میرے موضوع کے اعتبار سے اہم صرف آخری مصرعہ ہے۔ الفاظ کا طلسم دیکھیے جیسے آپ سے آپ چھڑ گئے۔

جب امیر نے الفاظ کی صوت کو ان کے معانی سے ہم آہنگ کیا تو وہ شاعر تھے اور جب صوتی کیفیت معانی پر حاوی ہوگئی تو وہ موسیقار تھے۔ لیکن ان کی تحریر میں سوائے ایک استثنیٰ کے غالباً ایسا کبھی نہ ہوا کہ معانی صوت پر حاوی ہو گئے ہوں۔ یہ استثنیٰ ان کی تصنیف افضل الفوائد ہے جو فارسی نثر میں لکھی گئی اور امیر کے مرشد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے اقوال پر مبنی ہے۔ یہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روحانی عقیدت اور تصوف کے قیود نے امیر کے قلم کو ادب اور احتیاط کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اس کے برعکس ان کی تصنیف اعجاز خسروی، جو بظاہر نثر لکھنے کے اصول و قواعد مرتب کرنے کی غرض سے مرتب کی گئی، الفاظ کے معنوی گورکھ دھندوں کے ساتھ الفاظ کی صوتی کیفیات کا بھی بے مثال مرقع ہے۔ تاریخ علائی اور خزائن الفتوح میں بھی ان کی فارسی نثر کا یہی عالم ہے۔ شبلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا۔ (شعر العجم ص ۱۳۲) لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نثر کا ریت میدان ان کی جدت طرازیوں کے لیے ایک تجربہ گاہ تھا جس میں وہ بحیثیت ایک شاعر اور موسیقار کے الفاظ کی معنوی مشق اور صوتی ریاض کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے ان صنائع و بدائع کا جوہر تو ان کی شاعری میں موجود ہے لیکن تصنع غائب ہے۔ چنانچہ اس پر شبلی نے خوشی کا اظہار کیا ہے کہ صنائع و بدائع کا جو جال انھوں نے بچھایا اس میں خود کبھی نہ پھنس جائیں (شعر العجم ص ۱۹۰)۔ یہاں الفاظ کے صوتی تاثرات کا جائزہ مقصود نہیں لیکن اس کی طرف اشارہ ناگزیر تھا کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری کی سرحد موسیقی سے جا ملتی ہے۔ اس

موضوعات گفتگو کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس ضمن میں نظامی کا ایک شعر پیش نظر رکھ لیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

زخمہ ساز آغاز آمد برون
کرد دل از دست دل دست گردون دون

یہ وہی نظامی ہیں جن کے خمسہ کے جواب میں امیر نے پانچ عظیم الشان مثنویاں لکھیں۔ امیر مثنوی قران السعدین میں لکھتے ہیں:

آنکہ بہ بینم بہ ہنر پیشتر
کوشش آن راہ کنم بیشتر
آنچہ ہنر ہست بگیرم ازو
وانچہ جز اینست بگیرم ازو (ص ۲۳۸)

یہی وہ غیر متعصب اور ہمہ گیر اصول تھا جس میں امیر کی فنی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ اسی اصول کی بنا پر انھوں نے ہندوستانی و ایرانی ادب اور موسیقی کے امتزاج سے سرمایہ لے کر اور الفاظ کا ایک عظیم قصر تعمیر کر ڈالا۔

علم ما ذ التلفظ سے نکل کر ہم جب فن موسیقی میں داخل ہوتے ہیں جس طرح شاعری کی مختلف اصناف ہیں مثلاً غزل، مثنوی، مثلث، رباعی وغیرہ اسی طرح موسیقی کی بھی مختلف شکلیں ہیں لیکن بعض مروجہ کتابوں میں ان اصناف یا شکلوں کو راگوں یا دھنوں سے خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ مثلاً سعید مرحوم نے امیر کی صنفی اختراعات قول ترانہ اور خیال کو ان کے ایجاد کردہ نغموں میں شمار کیا ہے۔ (لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۲۸) اور انھی کے حوالے سے ڈاکٹر سید حبیب نے بھی ان صنفی اختراعات کو راگوں کی فہرست میں شامل کر دیا (آج کل اگست ۱۹۵۶ء ص ۵۰) قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی بھی قول اور ترانہ کو امیر کے ایجاد کردہ راگوں میں گنتے ہیں۔ (ہماری موسیقی ص ۴۲) غالباً یہ غلط فہمی شبلی کی ایک عبارت سے پیدا ہوئی۔ شبلی لکھتے ہیں:

"قول، ترانہ، خیال، نقش و نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ، یہ سب بھی امیر خسرو کی ایجاد ہیں۔" (شعر العجم ص ۱۴۰)
لیکن انھوں نے انھیں راگوں میں شامل نہیں کیا اور راگوں کی فہرست الگ دی ہے۔ اسی طرح شاہد احمد دہلوی اور شیخ اکرام نے ہوا کو اصناف موسیقی میں شمار کیا ہے (راگ ودیا ص ۲ اور ثقافت پاکستان ص ۱۰۰) حالانکہ ہوا امام پرووے مشتاق حسین خان کے نزدیک بھی ایک راگ تھا (آج کل اگست ۱۹۵۶ء ص ۳۲) اور امیر خسرو خود مثنوی قران السعدین میں صفت پردہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

آن شدہ و تنبک بجاہ نوا
مرغ در آوردہ ز رود نے ہوا

اس شعر میں نوا اور ہوا دونوں راگ ہیں۔

موسیقی کے باب میں امیر کی جن تحریروں کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ امیر ہندوستانی و ایرانی دونوں نظام موسیقی سے پوری طرح آشنا تھے۔ عزۃ الکمال میں امیر ایک موسیقار سے بحث کے دوران یہ دعوے کرتے ہیں کہ انھیں شاعری کی طرح موسیقی پر بھی پورا عبور حاصل تھا اور وہ اس کے اسرار و رموز سے عملی طور پر بھی واقف تھے (لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۴۶) اصناف موسیقی:

امیر کے اجتہاد کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس زمانے میں مروجہ گائیکی کی صورت کیا تھی؟ یہ مسئلہ ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے اور اس سلسلے میں سنسکرت کے قدیم سنگیت ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ان نایاب سنگیتوں کی تدوین اور تراجم کا کام بھارت میں کئی ادارے بڑے اہتمام سے کر رہے ہیں لیکن افسوس کہ پاکستان میں ایسا ایک بھی ادارہ نہیں جو کم از کم موسیقی سے متعلق موجودہ ادبی ذخیرے کو کسی کتب خانے کی صورت میں یکجا کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہو۔

سارنگ دیو کی تصنیف سنگیت رتناکر تیرھویں صدی کی رائج الوقت موسیقی پر ایک جامع کتاب ہے۔ سارنگ دیو نے ۱۲۴۷ء میں وفات پائی اور امیر خسرو ان کی وفات کے چھ سال بعد پیدا ہوئے۔ اس سنگیت کے چوتھے باب میں موسیقی کی ایک صنف پربندھ کی تشریح یوں کی گئی ہے۔

"پربندھ گانے کی وہ قسم ہے جس میں یہ التزام ہو کہ اس میں کتنے دھاتو یا حصے ہوں گے . . .
. . . اور اس میں کتنے اور کس قسم کے انگ ہوں گے پربندھ میں دو یا دو سے زیادہ انگ ہو سکتے ہیں
اور ان کی مندرجہ ذیل چھ قسمیں ہیں۔

۱۔ سُر ۔ جو آج کل کے سرگم کے مترادف ہے۔
۲۔ بِرد ۔ کالا یا دھات سے بنے ہوئے اور پھونک سے بجائے جانے والے سازوں کے بول (ہو وغیرہ (یہ بول ان آوازوں سے مشابہ ہیں جو افسوس، حیرت، خوشی؟، وغیرہ کے زیر اثر بے اختیار انسان کے منہ سے نکلتی ہیں)
۳۔ پد ۔ یعنی عام الفاظ خواہ وہ نثر کی صورت میں ہوں یا شعر کی صورت میں۔
۴۔ تینک ۔ یعنی لفظ تن یا تنا کی تکرار (اس کا مادہ لفظ تت ہے جس کے معنی برہما کے ہیں اور تت مست تتوم سی میں تت انہی معنوں میں آتا ہے)
۵۔ پاٹا ۔ وہ بول جو ان آوازوں کی ترجمانی کریں جو تال کے سازوں کے ساتھ مخصوص ہیں (مثلاً مندل، مردنگ، کھڑتال وغیرہ)
۶۔ تال ۔ لیکن پربندھ کی ایک قسم بغیر تال کے بھی گائی جا سکتی ہے۔ پربندھ کے زیادہ سے زیادہ چار حصے یا دھاتو ہو سکتے ہیں یعنی اُدگراہ، ملاپک، دھرو اور ابھوگ (انہیں دھرپد کے چار حصوں کے مترادف سمجھیں) اور کم از کم دو حصے یعنی ادگراہ اور دھرو"

(ترجمہ اور اقتباس از شرح (انگریزی) گیت سوتر سار کرشن دھن بینرجی کلکتہ ۱۹۶۱ء ص ۶۰، ۶۹)

ان چار حصوں اور چھ انگوں کی ترکیب، تدوین اور کمی بیشی سے اس صنف موسیقی کی اتنی مختلف شکلیں بنتی ہیں کہ پربندھ کو ہندی موسیقی کا باوا آدم سمجھنا چاہیے۔ امیر خسرو نے اپنے اس ہنر پر اصول کے مطابق کہا ہے:

آنچہ ہنر ہست بگیرم بگو — وآنچہ جدا نیست بگیرم ازو

پربندھ کی بعض صورتوں کو اس مناسبت سے اپنایا کہ انھیں چار چاند لگ گئے۔ لیجئے اب ان اصنافِ موسیقی سے متعلق امیر کے اجتہادات و اختراعات کا جائزہ لیں۔

۱۔ غزل (اور دیگر اصنافِ شاعری) : موسیقی پر امیر کا ایک عام احسان یہ ہے کہ انھوں نے قدیم موسیقی کے سرمائے کو جو بیشتر سنسکرت زبان میں تھا ہندی اور فارسی زبانوں کے سانچوں میں ڈھالا اور فارسی شاعری کے بحور کو اصنافِ موسیقی میں داخل کیا۔ چنانچہ غزل سرائی ہماری موسیقی کا مستقل جزو بن چکی ہے۔

۲۔ ترانہ : یہ رباعی کو گا کر ادا کرنے کا ایرانی انداز تھا۔ عابد علی عابد صاحب قاموس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سلاجقہ کبیر کے زمانے میں ترانہ ایجاد ہوا۔ رباعی کو ایک خاص دھن میں گاتے تھے۔ تو اسے ترانہ کہتے تھے۔" (ہماری موسیقی ص ۱۰)

رباعی کے چوبیس اوزان ہیں اور ان میں زحافات کی کثرت اسی لیے گوارا کی گئی کہ رباعی شاعری کے علاوہ موسیقی کی بھی ایک صنف تھی۔ بعد میں لفظ العام ہو کر لفظ ترانے کا اطلاق ایک دوسری صنفِ موسیقی پر ہونے لگا جس کا اصل نام تلانہ تھا۔ عابد علی عابد وضاحت نہیں کرتے کہ ترانہ آج کل کے اصطلاحی معانی میں اس ترانے سے مختلف ہے جو رباعی سے مخصوص تھا لیکن اس کی ترویج تلانے کا کہیں ذکر نہیں۔ پروفیسر شبلی نے امیر کی اختراعات میں ترانہ اور تلانہ دونوں کا الگ الگ نام لیا ہے اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ تلانہ : (جسے اب ترانہ کہتے ہیں) بیزگی کے نزدیک لفظ تلانہ کا ماخذ تلنگ ہے جو پربندھ کا چوتھا انگ ہے اور جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ (شرح گیت سوتا سار ص ۲۲) اس انگ میں صرف لفظ یعنی تن یا تنا کی تکرار ہوا کرتی تھی اور اسے پرستش کا اہم غنائی اسلوب سمجھنا چاہیے۔ اس لفظ کی باطنی کیفیت میں رب کا تصور تھا لیکن بھجنوں کے لگے بندھے سُروں کی بندش میں صدیوں سے جکڑے رہنے کے باعث اس لفظ کی تکرار غالباً بے کیف ہو چکی تھی۔ پجاری یہ لفظ دہراتے تھے لیکن صرف اس طرح جیسے کوئی جادوگر کسی طلسماتی لفظ کا ورد کرے۔ پرستش کا یہ غنائی اسلوب محض جنتر منتر بن چکا تھا اور تن یا تنا کی معنوی اور وجدانی کیفیت غائب ہو چکی تھی۔ لفظ تن یا تنا کی رعایت سے لفظ تنتر بھی غور طلب ہے۔

امیر خسرو کی طبیعت نے جب تصوف کا رنگ پکڑا تو انھوں نے پرستش کے اس غنائی اسلوب پر فارسی اور ہندی کا جامہ چڑھایا اور اس کے بے جان پیکر میں جذبات کی روح پھونک دی۔ امیر کی ایک رباعی پہلے دی جا چکی ہے جس میں روزِ ازل کی واردات کا بیان ہے :-
روحِ پاک آدم کے جسمِ خاکی میں داخل ہونے سے گھبرائی تو

خواندند ملائکان بہ لحنِ داؤد
در تن در تنا در آ در تن در تن

چونکہ ہندی کے تن کو صوتی مناسبت اور فارسی کے تن کی معنوی رعایت سے امیر نے اس آخری مصرعے کے الفاظ پر تلانے کی بنیاد رکھی
لفظ تن کو امیر تصرف کے ایک دوسرے پیرائے میں یوں باندھتے ہیں :

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

اب ترانے میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو:

درآ آ ۔ درآ آ

دتنم درآ جان من ۔ درآ ۔ درآ

بتنگ آمده ام چند انتظار کشم

بیا بیا که ترا تنگ در کنار کشم (حیات امیر خسرو ص ۲۰۱)

اس بندش میں ایک شعر بھی شامل ہے۔ گویا اس میں پرندے کے تیسرے انگ کی بھی آمیزش ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپ خالی نہیں کہ ستار کے باج کے لیے جو بول وضع کیے گئے ہیں وہ بھی درآ اور تن سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ستار غالباً امیر ہی کی ایجاد ہے۔ اس دعوے کی تردید میں وحید مرزا ایڈیٹر یہ دیتے ہیں کہ ستار کا لفظ امیر کی تحریروں میں انہیں کہیں نہ مل سکا (لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۳۹) اور عابد علی عابد کو بھی یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ امیر اس ساز کے موجد ہوں اور اپنے اشعار میں اس ساز کا ذکر نہ کریں (ہماری موسیقی ص ۷) جواہر خسروی مرتبہ مولانا رشید احمد کے صفحہ ۴۱ پر امیر کا ایک دو سخنہ میری نظر سے گزرا جس میں ستار کا لفظ موجود ہے۔ دو سخنہ یوں ہے:

ستار کیوں نہ بجا، عورت کیوں نہ نہائی؟ جواب۔ پردہ نہ تھا۔

امیر نے ترانے کی بندشوں میں درآ تن درآ کے علاوہ اور بھی بہت سے الفاظ کا اضافہ کیا ہے مثلاً دانی توم توم دیرے نا تا یلا لے وغیرہ اور آج کل ترانے میں عموماً اسی قسم کے بول ہوتے ہیں اور شعر نہیں ہوتا۔ یہ الفاظ غالباً شروع میں بامعنی تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کی صورت بگڑتی گئی اور لغوی معنی عرفانی اشاریت میں کھو گئے۔ الفاظ کے ماخذ کی حقیقت ابھی تک تحقیق طلب ہے۔ اور اس سلسلے میں ہندی، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۴۔ **قول:** اس صنف میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو۔

استھائی نعت صدق قول نعال

انترہ امیر خسرو بل بل جائیں

حضرت نظام الدین کے دربار میں

غالباً قول کا ماخذ یہی قول ہے اور اس کا اطلاق اس صنف موسیقی پر ہوتا ہے جس میں قرآن مجید کی کوئی آیت یا رسول کریم کا کوئی قول عربی میں پیش کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کی وجدانی تفسیر بھی ہو۔ مذکورہ بندش میں ترانے کے بول شامل نہیں ہیں۔

۵۔ **قلبانہ:** قول اور قلبانے میں کیا فرق ہے؟ اس کی تصریح کسی مروجہ کتاب میں میری نظر سے نہیں گزری۔ بعض کہتے ہیں کہ قول میں صرف قول ہی کا ٹھیکہ بجنا چاہیے اور قلبانے میں مختلف تالیں ہو سکتی ہیں۔ میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ قلبانہ جب بنتا ہے کہ قول میں ترانے کی آمیزش ہو۔ جواہر خسروی میں قلبانے کے عنوان سے امیر کی مندرجہ ذیل بندش ملتی ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ
درتیلے ۔ درتیلے ۔ دردانی ۔ ہم تم تانا تانا رے
یلی ۔ یلی ۔ یلا یالی
من کنت مولاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس میں رسول اکرم کی ایک مشہور حدیث کو اس کی وجدانی تفسیر کے ساتھ ترانے کے انداز میں پیش کیا ہے ۔ اس صنف موسیقی میں امیر کی ایک اور بندش بھی ملاحظہ ہو۔

استھائی ۔ ہی یا دردر تالالا رے
من و نظام الدین اولیا دیم دیم درد رتنے
تانانانانا
انترہ ۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ
درتم درتم توم توم تانانانا
درنے تنے تنے درا جانم
دیم دیم در در در در تنے ۔ تنے نانانا (حیات امیر خسرو ص ۱۹۹)

اس ترانے میں امیر خسرو نے رجوں میں سے نکلتے ہوئے قرآن حکیم کی ایک آیت کا وجدانی چراغ جلا کے بے خودی کی منزل کی طرف بڑھے ہیں۔ ترانے کے مختلف حصوں میں تال اور سُر کی حال کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لفظ ترانہ کا مخرج قلب بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس صنف موسیقی میں ارباب تصوف کی اصطلاح میں قلب پر ضرب پڑتی ہے۔

۴۔ قوالی ۔ گانے کے اس اسلوب کا عام نام ہے جس کی سنگت میں طبلے پر قوالی کا ٹھیکہ بجتا ہے اور الفاظ کی تکرار اصطلاح بصورت قول اور ترانے کے انداز میں کی جاتی ہے۔ اشعار میں عام طور پر حمدیہ یا نعتیہ مضامین ہوتے ہیں یا تصوف کی واردات کا بیان یا مشائخ میں سے کسی بزرگ سے عقیدت کا اظہار۔ اس اسلوب خاص میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو۔ اکثر عرسوں میں آخری روز آخری محفل سماع اسی پر ختم کی جاتی ہے اور گانے کے انداز کو رنگ کہتے ہیں:

آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے
ایا پیر پایو نجام الدین اولیاء
جگ اجیارو میں تو ایو رنگ اور نہیں دیکھوں ری
دیس بدیس میں تو ڈھونڈ پھری ہوں
تورا رنگ نہیں پایو رے نجام الدین اولیا
آج رنگ ہے ۔ ۔ ۔

ترووٹ۔ شبلی نے اس صنف کا امیر کی اختراعات میں ذکر نہیں کیا لیکن نغمات الہند اور معارف النغمات میں اسے بھی امیر سے منسوب کیا ہے۔ یہ پربندھ کی ایک شکل ہے۔ اس کے تین حصے ہیں اور اسی لیے ترووٹ کہتے ہیں۔ پہلے حصے میں الفاظ سے مضمون ادا کیا جاتا ہے، دوسرے حصے میں ترانے کے بول ہوتے ہیں اور آخری حصے میں طبلے کے بول۔ غالباً پربندھ کی اس قدیم شکل میں دوسرا حصہ تلک پر مبنی تھا اور آخری حصے میں مندل یا مردنگ کے بول تھے۔ جب امیر نے قول ترانہ اور طبلہ ایجاد کیا تو تلک کی جگہ ترانے نے لے لی اور مندل اور مردنگ کے بولوں کی بجائے طبلے کے بول آ گئے۔

۳ سہیلا۔ (سوہلا یا سہیلا) اس صنف کی تشریح بھی میری نظر سے نہیں گزری۔ ہو سکتا ہے اس سے مراد ڈھولک کے وہ گیت ہوں جو بیبیاں مل کر گاتی ہیں۔ مثلاً:

کاہے کو بیاہی بدیس سے لکھی بابل مورے

بسیط۔ اس صنف کی تشریح بھی کہیں نہ ملی۔ اس کے لغوی معنی کشادہ یا وسیع کے ہیں یعنی گانے کا وہ اسلوب جس میں پھیلاؤ ہو۔ ممکن ہے یہ اصطلاح الاپ کے لیے وضع کی ہو۔

نقش گل۔ ولرڈ نے ۱۸۸۲ء میں ہندوستانی موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں ایک صنفِ موسیقی کا ذکر کیا ہے جس کا نام پھول بند تھا۔ لکھتے ہیں:

"ایسے دھرپد جن میں پھولوں کے نام ذو معنی انداز میں باندھے جائیں۔ پھول بند کہلاتے ہیں۔" (ہندو میوزک (انگریزی) راجہ ٹیگور کلکتہ ۱۸۸۲ء ص ۱۰۲)

دھرپد پربندھ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور پھول بند پربندھ ہی کی ایک قسم سمجھیے۔ ہو سکتا ہے نقش گل سے مراد یہی صنف ہو۔ معارف النغمات میں نقش گل کا ایک ترانہ یوں درج ہے:

استھائی۔ تانانا۔ تانانا دیرے نا دیم دیم
انترہ۔ دست صبا چو نگاہ فتد بر رخ تو
گل گرفتہ بار صبا گل بہ گل

نقش گل کی اختراع امیر سے منسوب ہے اس لیے ہو سکتا ہے یہ بندش بھی امیر کی ہو۔ لیکن صاحب معارف النغمات نے صراحت نہیں کی۔ اس بندش کا آخری ٹکڑا گل بہ گل کہیں یہ اشارہ تو نہیں کرتا کہ یہ بندش نقش گل کی ذیل میں آتی ہے؟

نقش و نگار۔ شبلی نے نقش گل کا ذکر نہیں کیا لیکن نقش و نگار دو لفظ ساتھ ساتھ لکھے ہیں۔ (شعر العجم ص ۱۳۰) نواب واجد علی شاہ کی تصنیف صوت المبارک میں نقش اور گل امیر سے منسوب کیے گئے ہیں لیکن نگار کا کوئی ذکر نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نقش و نگار بھی غنائی اسلوب کی ایک جامع شکل تھی جس کی ایک خاص قسم نقش گل ہے۔ ہو سکتا ہے نقش و نگار پربندھ کی وہ مبدل ہوئی صورت ہو جس پر خیال گائیکی کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۰ خیال۔ نواب واجد علی شاہ صوت المبارک میں امیر خسرو کو خیال گائیکی کا موجد گردانتے ہیں [illegible]

کا اختراع امیر سے منسوب کرتے ہیں (آج کل اگست ۱۹۵۶ء ص ۱۰۲) راگ درپن کے حوالے سے شبلی نے بھی امیر کو بانی خیال مانا ہے۔ قول واجب۔ لیکن امیر کی اپنی تحریروں میں خیال کا کوئی ذکر نہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس صنف کے موجد حسین شرقی تھے۔ (معارف النغمات ص ۱۰۸)

اس مسئلے کا حل غالباً یہ ہے کہ حسین شرقی نے امیر کی ایجاد کردہ صنف موسیقی نقش و نگار کے لیے عام فہم صنف خیال کی اصطلاح وضع کی اور اس صنف کو دیگر اصناف موسیقی پر ترجیح دی لیکن یہ محض میرا قیاس ہے اور اسے محتاط نظر سے دیکھنا چاہیے۔ خیال گائکی کا بنیادی اصول بول اور سر کا ادغام یعنی امتزاج اور بہ بہ نغمہ سرائی ہے۔ خیال گائکی میں گویا الفاظ کو دقیق جذبات کے زیر اثر اور راگ کے لوازمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سروں کے نت نئے سانچوں میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ گائکی کا یہ انداز امیر کی دیگر اصناف موسیقی یعنی قول قلبانہ اور قوالی میں بھی کسی حد تک موجود ہے مگر ان میں راگ کا تدریجی انکشاف مقصود نہیں ہوتا اور مختلف سروں میں الفاظ کی تکرار سے وجدانی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ ترانے میں راگ کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے اور اس کی سرحد خیال سے جا ملتی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں کہ خیال امیر کی ایجاد ہے میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف دلاتا ہوں کہ شیخ رستا کرکے تالوں میں خالی اور بھری کا امتیاز نہیں جو خیال گائکی کے لیے نہایت اہم ہے۔ بہ بہ نغمہ سرائی میں گویے کو پتہ چلنا چاہیے کہ کب آنے کو ہے تاکہ وہ مناسب مقام سے بول پکڑ سکے۔ خالی کی اختراع اسی مقصد کے لیے ہوئی اور یہ اختراع بھی امیر سے منسوب ہے۔

اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امیر کے بعد راجہ مان سنگھ تنوار نے پندرھویں صدی میں دھرپد ایجاد کیا۔ میری رائے میں اسے خیال گائکی کے خلاف ہندوؤں کا ردعمل سمجھنا چاہیے۔ دھرپد پربندھ کی ایک قسم ہے لیکن اس اصطلاح میں زور لفظ دھرو پر تھا جس کے معنی قائم یا اٹل کے ہیں۔ گویا یہ خیال گائکی کی بظاہر بے راہ روی اور آزادی کے بارے میں برہمنوں کا حرف تنبیہ تھا۔ پندرھویں صدی ہے جس میں سلطان حسین شرقی جونپوری نے خیال گائکی کو خیال کی اصطلاح سے نوازا اور دھرپد یوں کے خلاف خیالیوں کا محاذ قائم کیا۔

شیخ اکرام اس روایت کو کہ خیال امیر کی ایجاد ہے شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"مگر قوالوں سے خیال کبھی نہیں سنا۔" (ثقافت پاکستان ص ۱۰۰)

اس سلسلے میں ناتی محمد خاں خورجوی نے قابل قدر کام سرانجام دیا ہے اور اپنی تصنیف حیات امیر خسرو میں بہت سی بندشیں مع نوٹیشن یکجا کر دی ہیں۔ ان بندشوں میں کچھ خیال بھی ہیں۔ راگ سنم میں اکتالے کا ایک خیال ہے، بول ملاحظہ ہوں:

استھائی ۔ اندھیری گھٹا کالی من چیراغ

انترہ ۔ علاج دل ناکن خسرو کیج باغ

اصناف موسیقی کے باب میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ممکن ہے امیر نے دھرپد کے سلوب میں بندشیں مرتب کی ہوں۔ چنانچہ دھرپد یوں کے سرتاج تان سین امیر کو نائک تسلیم کرتے ہیں۔ تان سین کے ایک دھرپد کی سچاری کے بول یہ ہیں:

تان سین کے تم ہو نائک خسرو کرت استتی گن گاؤ رے

اصناف موسیقی کے سلسلے میں میں نے امیر خسرو کی چند ایجادات اور اختراعات کا نہایت مختصر ذکر کیا ہے۔ یہ "فہرست نہایت

ل و تشنہ ہے کیونکہ جیسا میں نے عرض کیا امیر رحمۃ اللہ علیہ کے تخلیقی اور فنی کمالات پر بڑے پیمانے پر تحقیق و تفتیش ہونی ضروری ہے اور
یہ ہے کہ ہمیں ادب اور فن تاریخ کی حیثیت کے ساتھ ساتھ ہماری موسیقی کی تاریخ اس کے ارتقائی مدارج اور اس کی قدیم و جدید اصناف و
مراحل ضروری ہے یا ان کی مروجہ تصانیف اور ان کی نادر تصانیف کی فراہمی (اگر ممکن ہو) اور ان کا تحقیقی اور تحلیلی مطالعہ اس کے علاوہ سے
بہت دور یہ کام بہت مختلف علوم کے ماہروں کی ایک ہمہ وقت اکیڈیمی ہی عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔

حضرت امیر خسرو سے منسوب جو اصناف موسیقی میں نے بیان کی ہیں، خود ان کی نوعیت نہج اور اسلوب داد تحقیق کے لیے وسیع
ان موجود ہیں کیونکہ ان میں سے جو اصناف دور جدید تک پہنچی ہیں ان کی نوعیت اور ان کا اسلوب حضرت امیر کے اجتہادی اور ایجادی قالب
سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔

موسیقی — آواز، اس کی لرزشوں، ان کی کیفیات اور ان کے رد عمل کی گوناگوں دنیاؤں کا نام ہے۔ صوت و صدا کی بے پایاں
وسعتوں کو خاص نظم و ضبط دے کر جس شخصیت نے اصناف میں حلقہ بند کیا اس کا کمال فن صوت و صدا کی دنیاؤں کی طرح وسیع و عظیم ہے۔ اس
وسعت اور عظمت کا احاطہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ:

عمرے بستہ ام — از خاک — بخون شہدا
تا دل و دیدہ غوغا بہ نشانم دادند

؟


شکل میں موجود ہے
قومی دفاعی فنڈ
میں زیادہ سے زیادہ عطیات دیجئے
اسٹینڈرڈ بینک

جنگ اور بیمہ زندگی

اپنی دیرینہ روایات کے عین مطابق "مسلم انشورنس"
ہند و پاک کی حالیہ جنگ کے آغاز سے فیاضانہ
رعائتیں دے رہی ہے :

دفاعی ملازمین کے لئے ۔

(۱) بغیر زائد پریمیم کے تمام پالیسیوں پر جنگ کے خطرات کا تحفظ دیا گیا ہے ۔

(۲) ہنگامی حالات کے نفاذ تک ان پالیسیوں کے ایام مہلت میں توسیع کر دی گئی ہے جن کی تاریخ ادائیگی ۶ ستمبر ۶۵ء یا اس کے بعد ہے ۔ اس عرصہ میں یہ پالیسیاں بحال رہیں گی ۔ بقایا جات آسان قسطوں میں ادا کیے جا سکتے ہیں ۔

شہری آبادی کے لئے

(۱) پالیسی ہولڈر کوئی بھی پیشہ یا ملازمت اختیار کر سکتے ہیں بشمول دفاعی سروسز کے ۔

(۲) جو پالیسی ہولڈر براہ راست بھارتی جارحیت کا شکار ہوئے اور جن کی تاریخ ادائیگی ۶ ستمبر یا اس کے بعد ہے ، ہنگامی حالات کے دوران انہیں تین ماہ کی مہلت دی گئی ہے ۔ بقایا جات آسان قسطوں میں ادا کیے جا سکتے ہیں ۔

مسلم انشورنس کمپنی لمیٹڈ





ایک یاد اور صدہا پہلو

جوش ملیح آبادی

قریبِ شام جب اک سوگواری، دل پہ چھاتی ہے
سسکتے کُنج کو، اُجلی ہوا، نوحے سناتی ہے
شفق، دھندلی فضا میں خون کے آنسو بہاتی ہے
میانِ گلستاں، بادِ خزاں کی، تہ جب آتی ہے
اور اس کی رَو میں جب ہر اک پتی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

تھکے سے جھٹپٹے میں، اونگھنے لگتے ہیں جب منظر
فضا کی سوگواری، اوڑھ لیتی ہے سیہ چادر
طلسمی وادیوں میں اک ذرا سا، شہر سے ہٹ کر
کماں کی طرح بل کھاتے ہوئے، خوابیدہ ساحل پر
سسکتے دل کے مانند یہ ندی جب ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نظر آتا نہیں اک پھول بھی جس وقت دامن میں
کوئی تنہا پرندہ شب کو بول اٹھتا ہے جب بن میں
سسکتی ہے رُندھی سی چاندنی جب صحنِ گلشن میں
اور اک ویران حسرت یاد کے خوابیدہ مدفن میں
ہوا جس وقت آدھی رات کو سیٹی بجاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

سبک سازینیاں جب گونجتی ہیں بزم یاراں میں
حسیں زلفوں کی مہکیں، تیرتی پھرتی ہیں ایواں میں
نگاہوں کے سفینے ڈوب جاتے ہیں جب افشاں میں
اور اس موقع پہ مجھ آشفتہ قسمت کی رگ جاں میں
چھلکتی راگنی، جب آنچ بن کر سنسناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اُٹھیں ہے تند سے، جب بفیض جام زرافشاں
وہ راتیں ہوتی ہیں، جو بھی تھیں نشۂ دم الحاں
پرانی داستانیں، جب چھڑتی ہیں نئے عنواں
اور اس موقع پہ گھبرا کر بیاد وعدۂ جاناں
نظر جب ایک عاشق کی گھڑی کی سمت جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اُفق پر پھوٹتا ہے صبح کا جس وقت فوارا
تھرکتا ہے سنہری وادیوں میں شربتی دھارا
شفق کا دھوپ چھاؤں کا چمن بنتا ہے اندھیارا
نظر آتا ہے آدھے چاند کے آغوش میں تارا
اور اپنی صبح کو جب آرزو ویران پاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

فلک کی نغمہ باری سے فضا کی مسکراہٹ سے
افق کی گرد انگڑائی سے شبنم کی گراوٹ سے
چمن کی خاک گل پرور کی ٹھنڈی سنسناہٹ سے
نسیم صبح کے ہونٹوں کے بوسوں کی چپاچپ سے
کلی میں جب چٹکنے کی تمنا کسمساتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ہوائے سرد چھوتی ہے لٹیں جب ٹوٹنے ترکاں کی
جگر میں چٹکی لیتی ہے مہک انفاسِ خوباں کی
گلابی روشنی سے آنکھ کھل جاتی ہے بستاں کی
اور اس کے ساتھ ہی پہلی کرن صبحِ بہاراں کی
جب اس ابھرے ہوئے سینے میں چبھ کر ٹوٹ جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چھلکتی ہے سرِ دوشِ صبا جب شکریں سردی
لرزتے ہیں ستارے دوڑتی ہے چاند پر زردی
دلوں کو گدگداتی ہے تمنائے جہاں گردی
مسک جاتی ہے جب دوشِ فضا کی مخملی وردی
نویلی صبح جب آہستہ سے کنگن گھماتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

طرب کا رنگ اڑا کر جشن کی دھوموں کو ڈھا کر
ربابوں کو بجھا کر راگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کر
فضا کو کپکپا کر چمپئی مکھڑوں کو سنولا کر
صبا کی تھپکیاں کھا کھا کر آئینوں کو دھندلا کر
قریبِ صبح جب شمعِ شبستاں جھلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جھلکتی ہے ستاروں کی ردا جب خوش نواؤں پر
برستی ہے نکیلی کج کلاہی دلرباؤں پر
اترتی ہے شعاعِ آئینہ پیکر مہ لقاؤں پر
نداسی راگنی، گھنگھرو بجاتی ہے ہواؤں پر
نشیلی بھیرویں ہونٹوں سے جب گھونگھٹ اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مسلسل دو ٹکڑوں سے ایک ہو جاتے ہیں جب جل تھل
ہزاروں داروں سے پھوٹتی ہے جب ہری کونپل
اڑا دیتی ہے ذہن سے کاوش ہوش سے جب بادل
پپوٹے کم سنوں کے نیند سے جھکتے ہیں جب بوجھل
چٹکتی چولی میں ہولی جب نئی ہلچل مچاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

بھری برسات میں جب ناچتے ہیں دھوم سے جگنو
محیط رنگ میں جب تیرتا ہے نشترِ پی ہو
ہوا پر جب مچلتی ہیں پھواریں دم بدم پہلو
کھنکتی بوندیوں میں تیر برساتی ہے جب لُو لُو
رخ جاناں پہ دُھل کر بچے گل جب قبا دھانی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

گرجتے گونجتے کم بخت ساون کے مہینے میں
لگا دیتی ہے پانی کی جھڑی جب آگ سینے میں
شبِ غم کے دہکتے کھولتے ٹھنڈے پسینے میں
تمنائے سحر جب ڈوب جاتی ہے پسینے میں
حیات اپنی امیدوں کے جنازے جب اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اچھلتا ڈوبتا ہے چاند جب ابر گریزاں میں
ستارے غوطہ زن ہوتے ہیں سنگم کے شبستاں میں
کبھی ہلکا کبھی لرزاں دھواں ہوتا ہے میداں میں
وہ اک آواز گونجے ڈوب کر شوق فراواں میں
تھکی جمنا کراہ کر جب بگلے سے گاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

لرزتے ہیں در و دیوار پر یادوں کے جب سائے
نظر آتی ہیں جب گم کردہ گھڑیاں بال بکھرائے
چمک اٹھتے ہیں جب وہ چاند کب کے جو گہنائے
ہوا آتی ہے جب بیتے ہوئے لمحوں کو مہکائے
فضا جب گھپ اندھیرے میں کبھی راتیں جلاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نفس کی آمد و شد کو گھنی زلفوں میں الجھا کر
اصولِ پختگی و خوفِ رسوائی کو ٹھکرا کر
بھرے جلسوں میں رازِ عاشقی کا خود سلگا کر
کھنکتے ساز پر آواز کی پازیب جھنکا کر
جب اس ناپختہ پن کی خام کاری گنگناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

وہ اک چہرہ جو گوہر فروش و گل بداماں تھا
متاعِ مہ وشاں تھا دولتِ محفل نشیناں تھا
کلیسائے نگاراں کعبۂ اصنامِ دوراں تھا
جو کل کی بات ہے بت خانۂ قومِ حسیناں تھا
جب اس چہرے سے خود میری نگاہ منہ چھپاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اٹھائے دوش پر گم کردہ لمحوں کی امانتیں
ملاقاتیں وفائیں شکریے شکوے مناجاتیں
بھرے چاندی کی تھالی میں دھلتی کندنی باتیں
مری گردن میں باہیں ڈالتی ہیں چاندنی راتیں
وہ ان کی آب شبنم آگ دل میں جب لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں میری تمناؤں نے کل دھومیں مچائی تھیں
جہاں کل مست گیتوں نے ساز پر راتیں بجائی تھیں
گھنی زلفوں کے سائے میں جہاں نیندیں جگائی تھیں
جہاں شیریں لبوں پہ مدتوں قسمیں لگائی تھیں
مجھے پہچان کر جب وہ کلی آنکھیں جھکاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حیا سے کانپ کر جھک کر بہ ہجوم شرمساری سے
کلائی میں سبک کنگن گھما کر بے قراری سے
ذرا سا رہ کے رہ جا کر اک ادائے بادہ خواری سے
دھنک کی سی حسیں انگڑائی لے کر طرح داری سے
کوئی دلہن کسی کو دیکھ کر جب مسکراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کوئی الھڑ کلی میں رات کو کیا کیا جتن کرتی!
جھجکتی ڈولتی تھمتی لجاتی بالی قدم دھرتی
لرزتی ہانپتی رکتی بہکتی ہولتی مرتی
سمٹتی کانپتی مڑتی جھجکتی جھینپتی ڈرتی
کسی کا در جب اک انگلی سے آکر کھٹکھٹاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چمن کو غرق سوز و ساز کر جاتا ہے جب بھونرا
نیاز عاشقی کو ناز کر جاتا ہے جب بھونرا
خموشی کو نحیف آواز کر جاتا ہے جب بھونرا
کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھونرا
اور اس کے بعد جب تا دیر ٹہنی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جفائے تاج داری سے تنگ آ کر بھنگ آ کر
سزاؤں ذلتوں پابندیوں فاقوں سے گھبرا کر
بھڑکتے جذبۂ ناموسِ انسانی کی شہ پا کر
پچھورسے حاکموں کی نازبرداری سے اُکتا کر
غرورِ آسماں کو جب زمیں نیچا دکھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں لیلیٰ کے عشوے سرنگوں رہتے ہیں محمل میں
گھُٹی رہتی ہیں دُکھیاروں کی فریادیں جہاں دل میں
جہاں جھنکار دم سادھے پڑی رہتی ہے پائل میں
جہاں سرگوشیاں تک جرم ہیں اس قصرِ باطل میں
گرجتے سورماؤں کی زباں جب الالاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چھنچ جاتا ہے جب مظلوم کے سینے کا انگارا
فضائے ظلم پر باقی نہیں رہتا کوئی تارا
مذاقِ سرفروشی کا ابل پڑتا ہے فوارا
مچلتا ہے شہیدوں کے لہو کا دور تک دھارا
اُپلی تلوار مقتولوں کو جب دولہا بناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کڑکتی ہے کمانِ بے کساں جب فرقِ سلطاں پر
کروڑوں ہات پڑتے ہیں حکومت کے گریباں پر
چھُری مجبوری کی چلتی ہے جابر کی رگِ جاں پر
سلگتے جھونپڑوں کی آنچ منڈلاتی ہے ایواں پر
ندا کے خون میں جب شہریاری ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نُچلے ظلم کا پانی سروں سے جب گزرتا ہے
جوانوں کے دلوں میں جذبۂ غیرت اُبھرتا ہے
سرِ میداں پئے اقدارِ انسانی جو مرتا ہے
بجائے غم پدر مرتے پسر پر ناز کرتا ہے
بوجہ فخر ماں جب لاش بیٹے کی اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں کہ اہلِ وحشت کی جبیں پر تاج ہوتا ہے
جہاں شہرِ خلائق زندگی تاراج ہوتا ہے
جہاں ہر آن سُولی پر نیا معراج ہوتا ہے
جہاں ننگے سروں پر روز لاٹھی چارج ہوتا ہے
وہاں بارود ایوانوں کو جھلسانے جب آتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جو مظلوموں کی ٹوٹی ہڈیوں کو جوڑ دیتی ہے
جو عفریتِ حکومت کی کلائی موڑ دیتی ہے
جو شاہین چشم فرعونوں کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے
جو قصروں کو فقط ضربِ نظر سے توڑ دیتی ہے
سرِ جاں بازیں جب وہ بغاوت گنگناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حفیظ جالندھری

(شاعری کا دورِ رفتہ)

دورِ رفتہ دیکھ لیتا ہوں گلستاں دیکھ کر
گل کو خنداں دیکھ کر بلبل کو گریاں دیکھ کر

ناخدا پر مطمئن تھے بندگانِ ناخدا
اب خدا یاد آ رہا ہے موجِ طوفاں دیکھ کر

سنگدل سمجھا برہمن، شیخ سمجھے بد مذاق
ہنس پڑے دونوں مجھے اب تک مسلماں دیکھ کر

شکوہ فرماتے ہیں اُلٹی منتیں کرنی پڑیں
دل پشیماں ہو گیا اُن کو پشیماں دیکھ کر

شانِ رحمت کو بھی اپنا جائزہ لینا پڑا
آ پڑی مشکل میں ٹھو بارِ عصیاں دیکھ کر

اس مشقت گاہ میں راحت کا یہ گوشہ حفیظ!
دیکھ لو اور خوش رہو تو ہر بیاباں دیکھ کر

احمد ندیم قاسمی

○

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیم! کاش یہی ایک کام کر جاؤں

یہ دشتِ ترکِ محبت، یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں

مرا وجود مری روح کو پکارتا ہے
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پر
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں کدھر کدھر جاؤں

میں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو
جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں مر جاؤں

جراحتوں پہ بھی جاری ہے وقت کی گرد
ذرا لہو میں نہالوں تو پھر سنور جاؤں

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے گھر جاؤں

خدا کرے ترا معیارِ عدل اور بلند
میں تیری بزم سے کیسے بچشمِ تر جاؤں

یہ سوچتا ہوں کہ میں بت پرست کیوں نہ ہوا
تجھے قریب جو پاؤں تو خود سے ڈر جاؤں

اسی چمن میں لبوں اس خزاں سے گزرا ہوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اتر جاؤں

حکیم احمد شجاع ساحر

○

وفا کا مدعی غارت گرِ جنسِ وفا نکلا
جسے ہم آشنا سمجھے وہی ناآشنا نکلا

تلاشِ جاہ میں اس کو بھی پھرتے دربدر دیکھا
سمجھتے تھے جسے منعم گدائے بے نوا نکلا

عبث اس شیخ کے کہنے میں آکر دیر کو چھوڑا
جو دیکھا تو وہی زنّار زیرِ بوریا نکلا

وہ زاہد دھوم تھی گھر گھر میں جس کی پارسائی کی
چھپایا لاکھ پردوں میں مگر کافر کھلا نکلا

متاعِ سجدہ ریزی برہمن بت دیتا ہند
خدا کے گھر میں جب داخل ہوا گھر سے خدا نکلا

اسیروں کی اسیری کا تماشا دیکھنے والے
کہیں چھپ جا کہ تن کو توڑ کر دستِ دعا نکلا

جو آیا میکدے میں شیخ اک محشر ہوا برپا
کہاں دیوانوں کی محفل میں یہ بدبخت آ نکلا

ہوئی گر ہونی بربادی ہم غریبوں کی
تمھارے دل کا ارماں تو بہت کافر ادا نکلا

تعجب سا تعجب ہے ہوئے حسنِ پری میں
مگر ساحر کیا کیسے صنم خانے میں جا نکلا

احمد ندیم قاسمی

○

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیم! کاش یہی ایک کام کر جاؤں

یہ دشتِ ترکِ محبت، یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں

مرا وجود مری روح کو پکارتا ہے
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پہ
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں کدھر کدھر جاؤں

میں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو
جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں، مر جاؤں

جراحتوں پہ بھی جاری ہے وقت کی گرد
ذرا لہو میں نہاؤں تو پھر سنور جاؤں

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے گھر جاؤں

خدا کرے ترا معیارِ عدل اور بلند
میں تیری بزم سے کیسے بچشمِ تر جاؤں

یہ سوچتا ہوں کہ میں بت پرست کیوں نہ ہوا
تجھے قریب جو پاؤں تو خود سے ڈر جاؤں

اسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اتر جاؤں

حکیم احمد شجاع ساحر

○

وفا کا مدعی غارت گرِ جنسِ وفا نکلا
جسے ہم آشنا سمجھے وہی نا آشنا نکلا

تلاشِ جاہ میں اس کو بھی پھرتے دربدر دیکھا
سمجھتے تھے جسے منعم گدائے بے نوا نکلا

عبث اس شیخ کے کہنے میں آ کر دیر کو چھوڑا
جو دیکھا تو وہی زنارِ زیرِ بوریا نکلا

وہ زاہد دھوم تھی گھر گھر میں جس کی پارسائی کی
چھپا تو لاکھ پردوں میں مگر کافر کھلا نکلا

متاعِ سجدہ ریزی بر جبین بت در بغل واعظ
خدا کے گھر میں جب داخل ہوا گھر سے خدا نکلا

اسیروں کی اسیری کا تماشا دیکھنے والے
کہیں چھپ جا سن کو توڑ کر دستِ دعا نکلا

جو آیا میکدے میں شیخ اک محشر ہوا برپا
کہاں دیوانوں کی محفل میں یہ بدبخت آ نکلا

ہوئے گو ہونی برباد مٹی ہم غریبوں کی
تمہارے دل کا ارماں تربت کا فرادا نکلا

تعجب سا تعجب ہے ہوئے خشک پیری میں
مگر ساحر کو کیا کہیے صنم خانے میں جا نکلا

حکیم احمد شجاع ساحر

○

کہتا ہے کون درد کے درماں کی بات کر
تو میری جان خنجر و پیکاں کی بات کر

اب تجھ سے دل کو چارہ گری کی امید تھی
مرہم کا ذکر چھوڑ نمکداں کی بات کر

رکھا ہی کیا ہے حجرۂ زاہد میں جز ریا
قدحِ شراب و محفلِ رنداں کی بات کر

صیاد کے کرم کی حکایت سے فائدہ
کچھ بے وفائی چمنستاں کی بات کر

پھر شورِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دستِ جنوں و چاکِ گریباں کی بات کر

کب تک خیالِ عافیتِ گوشۂ چمن
زنجیر و طوق و روزنِ زنداں کی بات کر

ذکرِ بہارِ حسن مرے سامنے نہ چھیڑ
رنگِ حنائے خونِ شہیداں کی بات کر

غیرِ سکون و عیش ہے اک مرگِ خانہ زاد
گرداب و موج و صرصر و طوفاں کی بات کر

ساحر کو پند و وعظ و نصیحت سے کیا غرض
زلفِ سیاہ و کاکلِ پیچاں کی بات کر

فضل احمد کریم فضلی

○

تعلق تو نہیں اُن کو رہا مجھ سے، مگر اب بھی
ادھر گزروں تو روشن پھر وہ چلمن ہو ہی جاتی ہے

نظر نیچی کیے یوں تو گزر جاتے ہیں ہم دونوں
مگر کچھ تیز پھر بھی دل کی دھڑکن ہو ہی جاتی ہے

بہت راہِ طلب کی دھوپ ہوتی ہے کڑی لیکن
بالآخر زلفِ جاناں سایہ افگن ہو ہی جاتی ہے

نگاہیں جب ملا کرتی ہیں لب کچھ ہل سے جاتے ہیں
مگر قندیل سی آنکھوں میں روشن ہو ہی جاتی ہے

انھیں اللہ نے بخشی ہے صورت ایسی پاکیزہ
نگاہِ بوالہوس بھی پاک دامن ہو ہی جاتی ہے

بگڑ بیٹھو جو تم ضد سے تو بگڑو شوق سے بگڑو
محبت کرنے والوں میں تو اَن بن ہو ہی جاتی ہے

ترے خونِ جگر سے اور کچھ ہو یا نہ ہو فضلی
مگر تھوڑی بہت زیبائشِ فن ہو ہی جاتی ہے

فضل احمد کریم فضلی

○

کاش پھر مثلِ نسیمِ سحری تو آئے
پھر مہک جائے فضا، پھر تری خوشبو آئے

یوں تو ہر سانس میں آتی ہے تری یاد، مگر
آج کیا جانے کیوں آنکھ میں آنسو آئے

دن تک بس کی نہ بن جائے تجھے سر کی قسم
زلفِ مشکیں جو تری مثلِ صبا چھو آئے

ہیں کھلے پھول مگر جیسے ہوں سب کاغذ کے
تو جو آ جائے گلستاں میں تو خوشبو آئے

آئینہ خانۂ حیرت سے جب عشق کہیں
وہ نظر آئے مجھے اور ہر اک سُو آئے

یہ خبر گرم رہی شہر میں چلتی ہے سموم
در زنداں تو کھلے آتی ہے گر لُو آئے

گفتگو کے جو کئی آپ نے بدلے پہلو
سامنے حسنِ غزل کے کئی پہلو آئے

تیرے شعروں نے تو دل موہ لیا ہے فضلی
ایسا لگتا ہے کہ جیسے تجھے جادو آئے

سرورِ کائنات

پروفیسر منظور حسین شور

صبحوں کے سنہرے طاقوں میں ظلمات کی شمعیں جلتی تھیں
دوزخ کو چھپا کر سینے میں جنت کی ہوائیں چلتی تھیں
سنگین بتوں کی پیشانی آدم کے لہو سے ڈھلتی تھی
اوہام کی خونیں تاریکی معبد کی سحر پر تلتی تھی
خورشید سحر کے سینے میں ظلمات کے بھالے ہوتے تھے
اصنام کے سنگیں حجروں میں انساں کے نوالے ہوتے تھے
نسل اور نجابت کا قشقہ ماتھوں پہ لگایا جاتا تھا
رنگ اور نسب کے پردے میں ہر کوڑھ چھپایا جاتا تھا
اس وقت وہ آیا راتوں کو پیغام سحر دینے والا
آفاق کی ڈوبی کشتی کو ساحل کی طرف کھینچنے والا
مرہم دے کر زخموں کے تحفے لینے والا مسیحائی
آنکھوں کو نظر سینوں کو اجالے دینے والا صحرائی
وہ ابر کہ جس کے سائے نے روحوں پہ سکوں برسایا ہے
وہ سیل جو کبر و نخوت کے کہساروں سے ٹکرایا ہے
باطل کے گھنے اندھیروں سے جو بادل ہنستا گزرا ہے
تاجوں پہ گرجتا آیا ہے کاسوں پہ برستا گزرا ہے
جو بطنِ صحرا سے اٹھ کر دنیا کے افق پر چھایا ہے
جس کا پرچم اسپین سے لے کر چین تلک لہرایا ہے
سینے میں صفا، ہونٹوں پہ دعا، آنکھوں میں تقدس کا عالم
قدموں میں وقارِ قیصر و جم ماتھے پہ غبارِ کرب و الم!
اے وہ کہ جس نے بخشی ہے خاروں کو گلوں کی رعنائی
آفاق کو کب تک روندے گا تودوں سے غرورِ دارائی
جمہور کی زندہ لاشوں پر ناچے گی کہاں تک سلطانی
اس خون میں کب تک تر ہو گی تاریخ امم کی پیشانی
تقدیس کے پردے میں کب تک انساں کو انساں کھائے گا
بپا ہے طوفاں تھمے گا، یہ سیل کہاں تک جائے گا
تہذیب کی سرمستی کب تک قوموں کے لٹنے تھرائیں گے
سونے سے کہاں تک آدم کے معبود تراشے جائیں گے
بیچیں گے غلاموں کو کب تک مغرب کے خدا بازاروں میں
آواز رہے گی گم کب تک زنجیروں کی جھنکاروں میں
اوہام کہاں تک آئے گا صدیوں کے چمکتے سورج پر
ابنائے زمیں کی ہیبت سے لرزیں گے کہاں تک بحر و بر
مغرب کی سیاہی مشرق کے سورج کو کہاں تک کھائے گی
انساں کے لہو میں انساں کو کب تک یہ گھٹا نہلائے گی
تاریک افق کے ماتھے سے کب رات کی ظلمت چھوٹے گی
صبحوں کا اجالا کب ہوگا، سورج کی کرن کب پھوٹے گی

سن میری فغاں اے میرا سلام اے ارض و سما کے پیغمبر
خورشید کا ماتھا پھر دھوئے پھر نور سے جھرنے جیب سحر

مختار صدیقی

○

یہ بحر بھی زمیں تھی، جو غیرت سے شق ہوئی
ہم سنگ بن گئے، تو سراپا عرق ہوئی

بے کار حادثے ہیں، کہ احساس، کُند ہے
عبرت، جو یادِ ماضی کا بھولا ورق ہوئی

دن بھر ہر ایک سایہ گریزاں تھا نور سے
دونوں ملے ۔ تو مہر کی رنگت بھی فق ہوئی

آگ اور لہو سے عرصۂ ہستی ہوا ہے سُرخ
اب کائنات، شاملِ حالِ شفق ہوئی

خود سے کبھی کبھی کا وہ ملنا بھی کیا ضرور!
سب کی رسائی، اب تو افق تا افق ہوئی

ریزۂ جاں

مجید امجد

ہماری زندگیوں کے سمندروں میں چھپے
کہیں دلوں کی تہوں میں، عجیب اندیشے!
کبھی کبھی، انہی بھیدوں کی گونج میں، ہم نے
اک آنے والے تموّج کی سیٹیاں بھی سنیں،
مگر یہ کس کو خبر، کیا ہے اک وہ ربطِ عمیق،
وہ گھور اندھیروں کا لنگر ہمارے ذہنوں میں
وہ ایک بس بھری حِس — جو ہوا میں بٹتے گئے
سیاہ لمحوں کی آہٹ کو بھانپ لیتی ہے!
کسے خبر ہے کہ اس جان و تن کی کشتی میں،
لہو کی جھیل سے خوں کے اس جھمیلے میں
کڑی وہ کونسی ہے، اُلجھے سلسلوں کی کڑی
کہ جس کی دل میں یہ تہہ سی اک جھنک پھر آئی،
مرے لیے کوئی مبہم سی بات لائی ہے!
میں ڈر گیا ہوں — پُراسرار واسطوں کے تمام
یہ خوف ہی تو ہے اک وہ حصارِ بے دیوار،
جو میرے دل کو تری چاہتوں نے بخشا ہے،
تری ہی دین، سیہ ساعتوں کو سونگھتی حس،
ترا ہی خوف، اس ان بوجھے رابطے کا ڈر،
میں ایک ریزۂ جاں، ان عجب قرینوں میں،
ترے ہی خوف کی زد میں — تری گرفت میں ہوں!
ترے ہی ضبط کی حد میں — تری پناہ میں ہوں!

عدم

○

آپ کی آنکھ اگر آج گلابی ہوگی
مری سرکار بڑی سخت خرابی ہوگی

پھول کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ رُت بیت گئی
کیا خبر تھی کہ تمہیں اتنی شتابی ہوگی

محتسب ہی نے پڑھا ہوگا مقالہ پہلے
میری تقصیر پہ ہر حال جوابی ہوگی!

یا مصور کے بھروسے کا کرشمہ ہوگا
یا سرشتاً مری تصویر شرابی ہوگی

جرم تو میرا تھا وجدان کا مرہونِ ستم
حاکمِ وقت کی تاویل کتابی ہوگی

پھر وہی رات

ظہیر کاشمیری

ان گنت حسرتوں میں ایک اُمید
جیسے عصرِ کہن کی لاشوں پر
تھرتھراتی ہو تابشِ خورشید

بحر کے سُرمئی کناروں پر
موتیوں کے چراغ جلتے ہیں
موج اِن کو مگر بجھا دے گی
تندیٔ سیل میں بہاتے ہوئے
ظلمتِ بحر میں چھپا دے گی

اسی انداز سے شعاعِ امید
دیر تک ٹمٹما نہیں سکتی؛
ایک طوفانِ سرد آئے گا،
پھر وہی رات، پھر وہی آہیں،
کلفتوں کا غبار چھائے گا،

حکایتِ نَے

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند
(رومی)

ترے دیار کی خوشبو سے نے چمن آرا
مشامِ جاں کو معطر کرے نگارِ صبا

میں سوختی تو نیستاں نے کیے دلدار!
میں صاحبان [illegible] میں تیرا تو دل کھا

میں مرلی اور تو ساتا میں آمدی تو گیت
ہے تو چنیر دلستاں تو میں لیلا

پکاریں تجھ کو جب اکثیر ہو کر فوجاں
ہے تو [illegible] اور میں زہرا

نہیں میں نظر جمگی پہ ہوں تری شیریں
تو کبھی نہیں [illegible] ہے میرا

میں تیری بیاک سی ہوں تو میرا قلب تپی
جنوں کو جادۂ ہموار سے کھینچ دیا

تو میرا باز بسا دیں تیری روپ تپی
جلالِ اکبرِ اعظم کا قصیدہ ترا

میں ساقی ہوں تو کیہ [illegible] تو ہے میں یار تی
تو شنہ دال میں ساوحا، تو گرشن میں میرا

تو بے نظیر ہے میرا میں تیری بے نظیر
میں ہوں بکاولی، تاج الملوک نام ترا

پری نہیں پہ بہت جسماں ہو تیری
تو دلربا مرا سیف الملوک شہزادہ

تو کام روپ، کلا کام پکنیز تری
مری متاع تری آرزو، ترا سودا

تو سیتہ دان ہے میرا میں تیری ساوتری
میں مرلی ہوں تو ہے قلب میں آمدہ تھا

میں چاند رات ہی تو تارا تو پرستی
تو کام دیو [illegible] میں میں چلی تو جھڑا

تو تارہ ہے نرگس نگاہ میں [illegible]
تری تلاش میں [illegible] خود و کو پہا

تو ماہ گل میں [illegible] تیری
[illegible] میں [illegible] عجب تیرا

[illegible] میں [illegible] تری حسن
میں [illegible] نظر کو ملا

قصہ ہو کر لکھا کرشن کا بن
میں پنچھی تو پنچھی میں بیکلی تو اودھے بیان
میں بلبل ہوں تو صبا میں عندلیب تو گل
میں شہرزاد کی ہوں گلعذار نہیں تاج

ہے رشتہ ہم میں عزیزہ و عزیزہ کا جانی
میں تیرے ساتھوں کی شب قبا سینہ ہوں
براؤننگ ہے تو میں الیزبتھ بیرٹ
میں مرجبین تری تو مرا اسد غازی
تو شاہزادہ سلیم اور میں انارکلی
میں تیری جستجو کا تیری شاخ نبات
تو زمیں دار میں رتناولی تو تلسی داس
تو نیلکنٹھ میں گوری تو شیام میں گوپی
کلک ناسی میں واسودتہ تو ادین
ہے تو مرید میں حالی، میں رات تو روز
میں ست کل مٹھی، تو ویر و ہی جہان
ہوں میں سات کی دو رتنی تو آدم خان
تو شاہ جام تماچی ہے اور میں نوری
میں ودفام کی اندام اور تو بیسرام
زبیدہ گودیہ میں اور تو علاؤالدین
تو چاند نیلے گگن کا میں موج تو سبد کی
میں تیری سبز پری اور تو مرا گلفام
وہ پتنگی ہوں جو شمع پہ جان دیتی ہے
تو دیوداس میں پارو میں صابرہ تو شید
نہ ہو سکا عاشق و معشوق کی خوشی میں شریک
جو میرے دل میں ہے ان میں وہ التہاب نہیں

ہمیشہ جاپ کرے رام نام کا سیتا
تو کرشن رام گری میں حسینہ رادھکا
تو بن گئی ہے میں کنہیا ہوں دختر رنگیں
تو میرا مست نوا، مسافر البیلا

نگاہ عشق میں تو جان شاہ میں شمسہ
تو شیکسپیئر، وشن رواں و نغمہ نوا
چکور چاند کا عاشق ہے میں تری شیدا
ہے سرگزشت ہماری طلسم ہوش ربا
ہے تیری دید مجھے صبح عید کا مژدہ
تو میرا عشق پرست و حافظا شیدا
میں تیری چندر بدن ہوں تو ماہیار مرا
ہے دیوتا تو مرے من کا مجھ کو مندر کا
تجھے ملے کے دنیا سب مجھے مصر بالا
تو معتمد میں تری دلربا رمیکیہ
میں شہربانو تو یوسف، حسین کا بیٹا
ہے تو بلاوت تو میں شاہزادی محبوبہ
تو مہندرا ہے میں مومل میں ماہی تو دیا
سنہرے دیس کا تو دیر چاند، میں ہمدرا
نفس زکا بیچ ہوں میں تو ہے کان مانک
میں شہزادہ ہوں تو شمسہ یار بزم آرا
کنو میں جھنکا سنتے ہیں تیرے رنگ نے کیا کیا
تو سیدی ابو جعفر میں شاعرہ حفصہ
میں ہاتھی جیوں تو کلاپیہ باہی بچھڑوں کا
حسد زمانے کی عادت ہے کیا گلہ اس کا
نظر سے گزرے گا کاتب اختر و سلمیٰ

سنا ہے قصۂ زیب النساء و عاقل خاں
پڑھا ہے تذکرۂ [illegible] محبت [illegible]

تو میرا عشق ہے باقی بیان وہم و گماں
ہیں اہلِ آنند و اہلِ جہاں سب بے پروا

بتقدیرِ تہِ عشق و حسن ناز کرے
تو باغِ گل و چمن یا سمن تری [illegible]

تو سو رہی اس کی کایا، میں سرِ ہستی کا روپ
میں ہوں کلا تو کلاکار بشر کا جو ہوا

تو سو رہی میں آشنا ہوں، میں ہستی تو پھول
کوئی کسے بھی ہیں تو ابھی اور میں کچھ سا

تو ہے عشق و محبت میں حسن کی دیوی
ہیں دونوں اپنی جگہ بے عدیل و بے ہمتا

میں تیرے شعروں کی مست شباب شہزادی
تو میرے خوابوں کا شہزادہ شوخ شرمیلا

رباب بجر پہ گاتی ہوں نغمۂ نغمات
میں شوکیت ہوں تو جانشیں سلیماں کا

ہوا اتفاق ہی سے حسن و عشق کا سنجوگ
ازل سے دشمنِ ارباب شوق ہے دنیا

بھٹک رہی ہے دیارِ وفا کی راہوں میں
یہ دشتِ غم کا پتہ پوچھتی ہے موجِ صبا

بکھیرتی ہیں جو بیں جہاں گلاب کے پھول
وہیں ہے تاج محل میری آرزوؤں کا

ارم کہیں انھیں فرخندہ رہگزاروں کو
دو عاشقوں نے جہاں زیست کا مزہ پایا

ترا خیال نسیمِ زندگی کا ہے تریاق
سیاہ بھیگی راتوں میں جل رہا ہے دیا

خمارِ عشق تری نوابناک آنکھوں میں
تو کردگارِ اساطیرِ حسن و رومان کا

ہنسو تو وعدے کا پابند، صابر و ضابط
قلندرانہ طبیعت مزاج شاہوں سا

تری زباں میں لسانِ حکیم کی نکہت
ترے سخن میں شفا بخشیٔ دمِ عیسیٰ

ہو نور اس میں نمو زیب و معانی کی
جو نہی تو لفظوں کو دے حکم قم باذنی کا

دماغ روشن و فکرِ سلیم دے کے تجھے
خدائے پاک نے قلب گداختہ بخشا

کتب خواں ہی ہے تو صاحبِ کتاب بھی ہے
خودی کا سرِ نہاں تجھ پہ آشکارا ہوا

تو نور کا کہکشاں کا، میں دھول دھرتی کی
یہ مسکن زمیں اسے مہ فلک پہ گیا

مری غذا تری یادیں مری شراب آنسو
فغاں ہے میری غزل، مرثیہ مرا نغمہ

ہے داستان مری ایک لمبی گہری آہ
بنے گا کتبہ مری گور کا "شہیدِ وفا"

اثر ہے نغمے کی فریاد کا مری لے میں
گماں ہے میری نوا پر حکایتِ نے کا

برہ کی آگ میں جلتی ہوں کل نہیں پڑتی
غمِ فراق نے صبر و قرار لوٹ لیا

نہ رات رات ہے میرے لیے نہ دن دن ہے
سکونِ قلب ہے بھاگتا ہوا سایہ

اب ایک آہ مری زندگی کے ساتھی ہیں
انھیں تو جھیل نہ پاتا بہ عذرِ کارِ جہاں
پریت پیا کے دُکھ جھیلنے نہیں آساں
ہے جو یک دل و یک جاں بنے وہ پردیسی
ترے ہی شہر میں تیرے لیے ترستی ہے
خوشی حرام ہوئی مجھ پہ تیرے جانے کے بعد
مآلِ خونِ جگر ہے بیانِ حسرت پر
معاملاتِ محبت نہ رہ سکیں مخفی
دل اختیار سے باہر، نگاہ بے قابو
مثالِ دُستِ حنا نہ ہوں میں گریہ کناں
چھپا بروگ کے بادل میں آس کا مہتاب
کہاں وہ ساعتِ سرگوشی وہم آغوشی؟
وہ الف لیلیٰ کی سی پُرفسوں جواں راتیں
زبان چوستے صہبائے ناب لب پیتے
سے وہ سینے سے وہ یادگار جگراتے
نکال کر قفسِ تنگنائے لذت سے
سکھی! پیا کو منا کیوں وہ مجھ سے روٹھ گئے
زباں سے کر نہیں آنکھوں سے گفتگو کرتے
نوائے راز کو لفظوں کی احتیاج نہیں
سفیرِ سوزِ نہانی ہے حرفِ زیرِ لبی
ہے بے نیازیِ خوباں ادائے محبوبی
چھڑا کے ہاتھ چلے دل سے جاؤ تو جانوں
تو میرے دل میں تو رہتا ہے خود کے مگر تو
میں دل کی آگ کو لفظوں میں کس طرح ڈھالوں؟
نہ بدگماں ہو سجن میری جان کی سوگند

ہے سوتے جاگتے ماتم نشاطِ رفتہ کا
بندھے جو راتوں کی تنہائیوں میں عہدِ وفا
دئیے کی لاش کی مانند دل جلے میرا
جو اپنے بس میں نہ ہو اس کے عہد و پیماں کیا!
تری ستوہی و سیقو، تری تسلو پیطرہ
قرار پھر نہ دلِ بے قرار کو آیا
شبِ فراق میں لکھتی ہوں نسخہ ہائے وفا
نظر سے لوگ لگا لیں سراغ باطن کا
نہیں ہے کھیل چھپانا کشاکشِ دل کا
کھلا کھلا کے محبت نے دل گداز کیا
ہجومِ درد میں گم ہو گئی شبِ وعدہ
وہ صبحِ عشوہ و غمزہ، وہ شامِ ناز و ادا!
امیدِ حسن کو رہا تا حیات جن کا نشہ ؟
نشے میں جھومتے کرتے سپاس و حمدِ خدا
جنھوں نے حوصلۂ ترکِ ترک ہم کو دیا
براہِ غمِ ابدیت سے ہمکنار کیا؟
کیا جو غیر نے اغوا تو میری اس میں خطا!
ترس نہ درد رسیدہ پہ کچھ انھیں آیا
زبانِ دل کی سرِ شک و تبسم و ایما
ہے ترجمانِ محبت نگاہِ دُزدیدہ
ہے رمزِ ربطِ نہاں، سرسری سلام دعا
تو مجھ سے بھاگ کے آخر کہاں پہ لے گا؟
مرے سکوت سے ناحق تو خشمناک ہوا
مجھے فسانہ و افسوں کا فن نہیں آتا
سُن اے سرورِ دل درد آشنائی میرا:

کہاں ترکِ محبت مجھے؟ کمالِ جنوں / خیالِ ترکِ محبت — [illegible]

میں بھول جاؤں تجھے کس طرح یہ ممکن ہے / بچن ہے میرا وِرثہ، عقیدۂ عصمت

یہی سنا ہے یہی تجربہ ہے خود کا کہ ہے / محبت ایک مقدس امانت و جذبہ

نہ دو قدم مجھ سے مری جاں پاؤں پڑتی ہوں / نہ دے خدا کے لیے طعنہ بے وفائی کا

کہ اس طرح نہ کیا با نہ گفتگو مجھ سے / خفا ہو تو، تو کسی شے میں جی نہیں لگتا

سمجھ نہ مجھ کو پرائی میں ہوں تری پابند / پرستار ہوں تری، تو پران ناتھ مرا

تو میرے جسم مری جان کا مالک و مختار / تو زندگی ہے مری، موت ہے فراق ترا

دکھائی دیتی ہوں گر خوش تو محض مجبوراً / سمجھ کے فرض نبھاتی ہوں کار و بارِ وفا

سکھائی مجھ کو صنم عشق نے اداکاری / جبھی مذاق ہے میرا تماشہ سارا

ترے بغیر جہنم ہے مجھ کو جنت بھی / نسیمِ صبحِ گلستاں ہے صرصرِ صحرا

ترے بغیر خزاں رنگ ہے بہارِ شباب / ترے بغیر بیاباں ہے قصرِ الحمرا

جنم جنم کی میں داسی کہوں نہ کیوں خود کو / ہے نقش دل کے نگیں پر ازل سے نام ترا

ترا خیال ہے یا شب چراغ گوہر ہے / بجھا کے دل کا کنول داغِ سینہ تاب دیا

بفیضِ جلوۂ جاناں، بپاسِ خاطرِ دوست / بنا ہے جامِ ہلاہل، پیالہ امرت کا

تھی اجنبی جو بنا ہر دو محرمانہ نظر / بغیر کچھ کہے سب حال کہہ گئی دل کا

خیالِ خالِ خدِ خورشید رخ سے روشن ہے / رواقِ تیرہ و تارِ خزانِ غم دیدہ

ہوں مال مال فشاندِ الم کی دولت سے / نفس نفس ہے ثنا خواں تری کریمی کا

مجھے شعورِ حریمِ زندگی عطا کر کے / سرورِ سرمدی و کیفِ جاوداں بخشا

خدا نے عرش پہ باندھا ہے خود دلوں کا نکاح / نہ مل سکے اگر آپس میں جسم، کیا پروا!

ہمارے نام ہلال و ستارہ کی مانند / رہیں گے تا بہ اوجِ سخن پہ درخشندہ

رہیں گے شہرۂ آفاق و زندۂ جاوید / مثالِ وید و رامائن و وامق و عذرا

یہی دعا ہے کہ شادا جوانیاں مانگے!
ہمیشہ سرخوش و دلشاد رکھے تجھ کو خدا!

ادا جعفری

دل زدوں کے بس میں کیا تھا بے بسی بڑھتی گئی
بے رخی بڑھتی رہی، وارفتگی بڑھتی گئی

دل کے چھالے ہیں نہیں ہیں پاؤں کے یہ آبلے
منزلیں ہٹتی گئیں، وابستگی بڑھتی گئی

الجھنیں سی الجھنیں تھیں زندگی میں ہر نفس
ہر نفس اس زلف کی ژولیدگی بڑھتی گئی

اک جستجوئے اک گل کافی تھی ساری عمر کو
کیا کریں ہر گھونٹ اپنی تشنگی بڑھتی گئی

جتنا جتنا بے ثباتی کا یقیں آتا گیا
اتنی اتنی زندگی میں دلکشی بڑھتی گئی

ہاتھ میں جو شمع تھی گھٹتی گئی گھلتی رہی
نقشِ پائے رہرواں کی روشنی بڑھتی گئی

سرکشی کا بھی نتیجہ چلتے چلتے دیکھ لیں
جتنا جتنا سر جھکایا بے رخی بڑھتی گئی

ارتباطِ نور و ظلمت سے مفر ممکن نہ تھا
روشنی گلیوں میں دل میں تیرگی بڑھتی گئی

چند ہی لمحے تھے لیکن کیا گراں گزرے ادا
اور وہ سمجھے لذتِ بے چارگی بڑھتی گئی

شا : مستان مرزا

○

ہمارا راز داں کوئی نہیں ہے
محبت کی زباں کوئی نہیں ہے

ہر اک غنچہ ہے مرجھایا ہوا سا
چمن میں باغباں کوئی نہیں ہے

قفس سے چھوٹ کر جائیں کہاں ہم
ہمارا آشیاں کوئی نہیں ہے

اندھیرے راستے ، رستے کٹھن ہیں
چراغ کا ، واں کوئی نہیں ہے

ہیں پژمردہ تیری یادوں کی کلیاں
بہارِ جاوداں کوئی نہیں ہے

عبارت ہے حیات و مرگ تم سے
ہماری داستاں کوئی نہیں ہے

یہاں ہر جنس بک جاتی ہے مستانؔ
سخن کا قدرداں کوئی نہیں ہے

خانم ممتاز مرزا

○

وہ کبھی سامنے جو آتے ہیں
اشک پلکوں پہ تھرتھراتے ہیں
دُور، پھر بھی ہوئی نہ تاریکی
ہم نے لاکھوں دیئے جلائے ہیں
پھر دلِ لالہ، داغ داغ ہے آج
پھر صبا کے پیام آئے ہیں

ہار گوندھے ہیں پھر امیدوں نے

شوق نے پھر دیئے جلائے ہیں
ہائے مجبوریاں محبت کی
ہر قدم پر فریب کھائے ہیں
رہگزر ہے نہ کوئی منزل ہے
ہاں مگر منزلوں کے سائے ہیں
ہم نے ٹھکرا دیئے ہیں دیر و حرم
جب ترے راستے میں آئے ہیں
دشمنوں کی تو دشمنی معلوم
ہم پہ اپنوں نے ظلم ڈھائے ہیں
اپنا سرمایۂ حیات ہی کیا
کچھ لرزتے بجھتے سے سائے ہیں

شفقت کاظمی

O

لالہ و گل سے پیار کیا کرتے
ہم یقیناً بہار کیا کرتے

حد کوئی اپنی حسرتوں کی نہ تھی
حسرتوں کا شمار کیا کرتے

بارِ گلشن تھا جب وجود اپنا
ہم برِ شاخسار کیا کرتے

جام اپنا تھا جب نہ مے اپنی
احترامِ بہار کیا کرتے

اپنے شکووں پہ خود ہوئے نادم
ہم تجھے شرمسار کیا کرتے

چل دیے تیری راہ دیکھ کے
وقت کا انتظار کیا کرتے

تجھ میں گم ہو کے خود کو بھول گئے
اور اسے یادِ یار کیا کرتے

اپنی دنیا میں جب اندھیرا تھا
فرقِ لیل و نہار کیا کرتے

آ گیا یاد خود بخود کوئی
ہو گئے اشکبار کیا کرتے

کاظمی ترکِ آرزو کے سوا
چارۂ انتظار کیا کرتے

شاعر لکھنوی

○

جو بھی آیا غمِ دنیا کی طرح
بس گیا دل میں تمنا کی طرح

دیر سے منتظرِ سنگ ہیں ہم
میکدے میں سرِ مینا کی طرح

اُس کی معصوم نظر کے احساں
دل پہ ہیں تہمتِ بے جا کی طرح

تُم سے منسوب ہے اک طرزِ ستم
تم نہ دیکھو مجھے دنیا کی طرح

زندگی ایک چمن تھی جس میں
ہم سلگتے رہے صحرا کی طرح

دیکھ لیتے ہیں تماشا اپنا
ہم بھی ہیں چشمِ تماشا کی طرح

چند اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
تم بھی پایاب ہو دریا کی طرح

جان دینے کا ہُنر جانتے ہیں
وہ جو مٹتے ہیں مسیحا کی طرح

اُن کا پیمانِ وفا ہے شاعر
مستقل وعدۂ فردا کی طرح

شفقت کاظمی

○

لالہ و گل سے پیار کیا کرتے — ہم یقینِ بہار کیا کرتے
حد کوئی اپنی حسرتوں کی نہ تھی — حسرتوں کا شمار کیا کرتے
بارِ گلشن تھا جب وجود اپنا — ہم برِ شاخسار کیا کرتے
جام اپنا تھا جب نہ مے اپنی — احترامِ بہار کیا کرتے
اپنے شکووں پہ خود ہوئے نادم — ہم تجھے شرمسار کیا کرتے
چل دیئے تیری راہ دیوانے — وقت کا انتظار کیا کرتے
تجھ میں گم ہو کے خود کو بھول گئے — اور اسے یادِ یار کیا کرتے
اپنی دنیا میں جب اندھیرا تھا — فرقِ لیل و نہار کیا کرتے
آ گیا یاد خود بخود کوئی — ہو گئے اشکبار کیا کرتے

کاظمی ترکِ آرزو کے سوا
چارۂ انتظار کیا کرتے

شاعر لکھنوی

○

جو بھی آیا غمِ دنیا کی طرح
بس گیا دل میں تمنا کی طرح

دیر سے منتظرِ سنگ ہیں ہم
میکدے میں سرِ مینا کی طرح

اس کی معصوم نظر کے احساں
دل پہ ہیں تہمتِ بے جا کی طرح

تم سے منسوب ہے اک طرزِ ستم
تم نہ دیکھو مجھے دنیا کی طرح

زندگی ایک چمن تھی جس میں
تم سلگتے رہے صحرا کی طرح

دیکھ لیتے ہیں تماشا اپنا
ہم بھی ہیں چشمِ تماشا کی طرح

چند اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
غم بھی پایاب ہے دریا کی طرح

جان دینے کا ہنر جانتے ہیں
وہ جو مٹتے ہیں مسیحا کی طرح

اُن کا پیمانِ وفا ہے شاعر
مستقل وعدۂ فردا کی طرح

شاعر لکھنوی

○

لب پہ آتا تھا نہ آنکھوں سے رواں ہوتا تھا
آپ کے غم کو تو آرائشِ جاں ہوتا تھا

شوخیٔ گل کی طرح تجھ کو عیاں ہوتا تھا
رنگ کو شرح تو خوشبو کو بیاں ہوتا تھا

چھوٹ وہ جسم عرق ہو گئی شبنم کی طرح
نکہتِ گل کو نہ اتنا بھی گراں ہوتا تھا

ہم بھی بیٹھے تھے کسی پھول کی خوشبو لیے
اس طرف بھی تو نسیمِ گزراں ہوتا تھا

جانے کیا ہے کہ پشیماں سی گزر جاتی ہے
وہ لغزش جس کو حریفِ دل و جاں ہوتا تھا

بڑھ گیا بن کے وہ عنوانِ "فاصلہ" ہجر و وصال
اس قدر آپ کو نزدیک کہاں ہوتا تھا

میں اگر چپ تھا تو کھلتا ترے رخسار کا رنگ
کچھ نہ کچھ معرکۂ شرح و بیاں ہوتا تھا

زیست دشواریٔ منزل کا ہے نام اے شاعر
راہ میں ایک نہ اک سنگِ گراں ہوتا تھا

فرصت

ابو سعید قریشی

تحیر کدہ ہے یہ دنیا خدایا
نہیں ہے یہاں
کوئی فرصت کی آسودگی کی، مسرت کی ساعت
یہاں طفلِ نوزاد کی سانس اک چیخ ہے ٹوٹتے تارے کی مانند
یاں سسکیوں کا دھواں
قمقموں کا گلا گھونٹتا ہے
یہاں حسن غازے کا مرہونِ منت ہے
بجا ہے
مہوشوں، گلعذاروں کی خاطر
یہاں ناچتی جھریاں جال بنتی ہیں چپ چاپ میٹھی
چٹکنے سے پہلے ہی غنچے نگوں سار ہیں۔ یاں
ہر شام ہی سے سہاگن کے جوڑے کی کلیاں ہیں باسی
شامِ حنا ودہ کا فردیں فرق مشکل ہے
یاں شادیانوں میں نوحوں کے نغمے نجتے ہیں —یہاں
یہاں زندگی موت کی جنم ہے
یہاں سانس لینے کی مہلت نہیں ہے
یہاں — نور کی کوکھ میں تیرگی کے بسیرے ہیں
بطن میں پھولوں کے کانٹوں کے ڈیرے

خزاں کا ہو یاں بہاروں کے ماتھے کا ٹیکا ہے
یاں کشتِ لالہ فروزاں ہے خونِ جگر سے
ترقی — تنزل کی منزل کی یاں پیش رو ہے
عماموں کے نیچے یہاں کچھ نہیں ہے
معابد کے آگے بھکاری کھڑے ہیں — پجاری
یہاں آدمی — آدمی کا خدا ہے
مگر لوگ کہتے ہیں — دنیا
یہ دنیا خدایا — مصیبت نہیں ہے
اذیت نہیں ہے - یہ نعمت ہے
لیکن —
نہیں
مجھ کو یہ سوچنے کی بھی مہلت کہاں
اتنی فرصت کہاں دی ہے تو نے خدایا
بس اک سانس ہے زندگی، آتی جاتی — یہاں
اتنی فرصت کہاں
اتنی مہلت کہاں
مجھ کو فرصت نہیں
مہر و مہ کے اشارے سمجھنے
ستاروں کے مکھڑے
افق کے جھروکوں
شفق کے نشیمن میں رنگیں نگاروں کے جلووں سے چشمک کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
کہکشاں کی روش پر بہاروں کی نکاسی

آبشاروں
پھواروں
ہواؤں
فلک کی بلندی پہ رقصاں ستاروں
درختوں کی شاخوں میں سرگوشیوں کے ترنم
تخیل بیاباں پہ باران رحمت کی رم جھم
شبستاں کے سایوں میں ہونٹوں کے ملنے
دھڑکتے دلوں کے
تنفس کے نغموں کو سننے کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
مجھ کو فرصت نہیں ہے
محبت کی
ہنس بول لینے
کہیں دل لگانے
خیابان حیرت میں آہو خصالوں کی رم خوردگی کے تماشے کی فرصت ـ
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
چاک گل کے رفو
اشک شبنم پہ آنسو بہانے کی حسرت کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
صید و صیاد کے عہد باہم پہ غم خوردگی کی — تحیر کی — حیرت کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
جور و بیداد خواہش
آلِ وفا پر
جفا پر حسینوں کے دل خون کرنے
ستم پر تمنا کی رونے
خواب محبت کے ارمان کی بے چارگی ۔ بے بسی کا تماشا دکھانے
فسانہ سنانے کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
سخن گستری کی
ستائش کی خواہش کی
عرضِ ہنر کی
شکایت کی ۔ شکوے کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں ہے
مگر سوچتا ہوں کہ شاید اسی میں کوئی مصلحت ہو
یہ فرصت کا ہونا نہ ہونا
اندھیرے اُجالے کی مانند احساس ہے اک اضافی
خوشی اور غم کی طرح
اور وجود ایک کا دوسرے کی بدولت ہے

ورنہ
وہی ہیں کہ جن کو شکایت ہے فرصت نہ ہونے کی
اس کو ـــــ مجھی کو،

مجھے یاد ہے وہ زمانہ
وہ شب پھیل کر سیکڑوں سال پر جو مسلط تھی،
حاوی تھی
جس کا بنا تھا فسانہ
وہ شب جس کی اک ایک ساعت
فقط ایک بے مہر عورت کے دردِ جدائی میں کوہِ گراں بن گئی تھی
مگر مجھ کو اس وقت فرصت کی خواہش کہاں تھی

مجھے یاد ہے
اور — مجھے یاد ہے
بندگی کا غلامی کا وہ دورِ سنگین
شب و روز کا وہ تواتر
ہمالہ کے سایوں میں زنجیرِ جنباں
مرا پائے کوباں
مگر سوچتا ہوں
وہ فرصت کی گھڑیاں اذیت تھیں
اس وقت فرصت کی خواہش کسے تھی
مجھے یاد ہے
اور مجھے یاد ہے وہ سحر
جو سلاسل کے کٹنے کا اعلان تھی
اک نئی زندگی کا قلم لے کے اُبھری تھی
لیکن —
مرے ہی لہو سے منور تھی
اس وقت سوچا تھا میں نے
اسی کے لیے۔ کیا اسی کے لیے مجھ کو فرصت کی خواہش تھی

اے کاش فرصت نہ ہوتی مجھے
مجھ کو فرصت نہ ہوتی

مجھے یاد ہے
اور مجھے یاد ہے
ایسی فرصت کی ساعت
کہ جب سہم کر وقت
اک طفلِ مکتب کے سائے کی صورت
سمٹ کر
تہ بہ تہ انساں کے اس کی فطانت سے ڈر کر
تحیر زدہ
ہیروشیما کے بازار میں نقشِ دیوار تھا — تھم گیا تھا
مگر اس کے چاروں طرف
آگ کی آندھیاں تھیں
بگولے تھے
صحرا تھے
دریا تھے
طوفاں تھے
اور فیوجی یاما کے نغمے
تباہ کاریاں اس کی
سب ہیچ تھیں جن کے آگے
مگر آہ وہ نقشِ دیوار فرصت کی وہ تابکاری کی — وہ مستقل جانکنی کی اذیت کی ساعت
تصور سے اس کے مجھے آج بھی ہول آتا ہے

توبہ ہے میری
تمدن کو تہذیب سے
آدمیت کو انسانیت سے بچانے کی اس فرصت حشر ساماں سے ڈر کے

قصہ مرا
مجھ کو ان جنگلوں میں لیے جا رہا ہے
جہاں روشنی جیسے بھٹکے ہوئے جگنوؤں کی طرح اک ذرا سی ضیا جگمگا کر کہیں
سرد سنسان سایوں میں فرصت کی اک ساعتِ مضمحل کی صدا بن کے
سارے میں پھیلی ہوئی ہے
جہاں تیرہ و تار وحشت کدوں کے کنارے کہیں زندگی کے بسیرے ہیں

اور

ابنِ آدم یہاں برگِ انجیر سے بھی معرّا ہے،
یہاں آگ اور ناگ معبود ہیں
اور وقت ایک رفتارِ معکوس،
قابوس بن کر معلق ہے
نوحہ کناں، پا بجولاں گراں بار لمحے یہاں آدمی کے لیے سینہ زن ہیں،
یہاں ریگِ صحرا سی پھیلی ہوئی ساعتیں پا بریدہ
پجاری ہیں رفتار کی
کتنی فرصت ہے یاں
کتنی فرصت ہے یاں — اُف — خدایا
نہیں مجھ کو فرصت کی خواہش نہیں ہے!

رفعت سلطان

○

نصف شب یہ ہوا کا جھونکا ہے
یا دبے پاؤں کوئی آیا ہے

ایک مدت کے بعد میری طرف
غور سے آج اس نے دیکھا ہے

بے خیالی میں یہ خیال کہاں
کب کسی نے مجھے پکارا ہے

کوئی میرا نہیں رفیقِ سفر
میرے ہمراہ میرا سایا ہے

کس زباں سے تجھے یہ سمجھاؤں
تو مری آخری تمنا ہے

خندۂ گل بھی، اشکِ شبنم بھی
زندگی کیا ہے اک تماشا ہے

ایسی دنیا کو کیا کہیں کہ جہاں
ہر حسیں آرزو بھی رسوا ہے

تشنہ لب ہیں جہاں تمنائیں
آہ، وہ میرے دل کا صحرا ہے

آرہی ہے ترے بدن کی مہک
حسن اعجازِ صبا کا ہے

اب تو اس بزم میں بھی اے رفعت
میری خاموشیوں کا چرچا ہے

رفعت سلطان

○

حسنِ فطرت کی جستجو ہے مجھے
زندہ رہنے کی آرزو ہے مجھے

میں کہ ہوں تشنۂ ازل، پھر بھی
حسرتِ ساغر و سبو ہے مجھے

پھر ترے پاس آگیا ہوں میں
پھر تمنائے گفتگو ہے مجھے

میں فدائے گل و گلستاں ہوں
کیا کروں ذوقِ رنگ و بُو ہے مجھے

بیٹھ کر با ادب سنیں شاعر
پڑھ رہا ہوں غزل وضو ہے مجھے

میری دیوانگی پہ طعنہ نہ کر
کیا خبر کس کی جستجو ہے مجھے

جاؤں اس کی گلی میں کیوں رفعت
پاسِ ناموس و آبرو ہے مجھے

بشیر بدر

○

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پروئے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں۔ کہ دلِ شاعر پہ چھپائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پہ چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اُس جانِ تغزل نے جب بھی کہا کچھ کہیے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

پیش بدن

○

میرے سینے پر وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا۔ روتا رہا

شبنمی میں دھوپ کی جیسے وطن کا خواب تھا
لوگ یہ سمجھے میں سبزے پر پڑا سوتا رہا

وادیوں میں گاہ اُترا اور کبھی پربت چڑھا
بوجھ سا اک دل پہ رکھا ہے جسے ڈھوتا رہا

گاہ پانی، گاہ شبنم اور کبھی خوناب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

پوچھنے والوں نے آ کر حالِ دل پوچھا مگر
درد جس پہلو سے ہوتا تھا جہاں ہوتا رہا

اک ہوا سے بے تکاں سے آغوش مرجھا گیا
زندگی بھر جو محبت کے شجر بوتا رہا

رونے والوں نے اُٹھا رکھا تھا گھر سر پہ مگر
وہ تمام عمر جاگا تھا پڑا سوتا رہا

بند دروازوں، دریچوں پر گرا کر پردوں کو
ایک خط پڑھ پڑھ کے ساون کی طرح روتا رہا

رات کی پلکوں پہ تاروں کی طرح جاگا کیا
صبح کی آنکھوں میں شبنم کی طرح سوتا رہا

روشنی کو تیرگی کر کے گئے جب رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چھُپا روتا رہا

بشیر بدر

○

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پرونے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں کہ دلِ شاعر پہ چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پہ چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اس جانِ تغزل نے جب بھی کہا کچھ کہیے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

بشیر بدر

○

میرے سینے پر وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا۔ روتا رہا

شبنمی میں دھوپ کی جیسے وطن کا خواب تھا
لوگ یہ سمجھے میں سبزے پر پڑا سوتا رہا

وادیوں میں گاہ اترا اور کبھی پربت چڑھا
بوجھ سا اک دل پہ رکھا ہے جسے ڈھوتا رہا

گاہ پانی، گاہ شبنم اور کبھی خوناب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

پوچھنے والوں نے آکر حال دل پوچھا مگر
درد جس پہلو سے ہوتا تھا جہاں ہوتا رہا

اک ہوا سے بے تکاں سے آغوش مرجھا گیا
زندگی بھر جو محبت کے شجر بوتا رہا

رونے والوں نے اٹھا رکھا تھا گھر سر پہ مگر
وہ تمام عمر جب گھر تھا پڑا سوتا رہا

بند دروازوں دریچوں پر گرا کر پردوں کو
ایک خط پڑھ پڑھ کے ساون کی طرح روتا رہا

رات کی پلکوں پہ تاروں کی طرح جاگا کیا
صبح کی آنکھوں میں شبنم کی طرح سوتا رہا

روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جو رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

شکیب جلالی

○

حرف جو اس زبان سے نکلا / نکہتِ گل کی شان سے نکلا

چاندنی جھانکتی ہے گلیوں میں / کوئی سایہ مکان سے نکلا

ایک شعلہ پھر اک دھوئیں کی لکیر / اور کیا خاکدان سے نکلا

چاند جس آسمان میں ڈوبا / کب اسی آسمان سے نکلا

اس کے سایے سے کیوں گریزاں ہو / کام جس مہربان سے نکلا

یہ گہر جس کو آفتاب کہیں / کس اندھیرے کی کان سے نکلا

آہٹوں کی تراش کر چادر / پتھروں کے جہان سے نکلا

جب بھی نکلا ستارۂ امید / کہر کے درمیان سے نکلا

پھر ہوا سے سلگ اٹھے پتے / پھر دھواں گلستان سے نکلا

شکر ہے اس نے بے وفائی کی / میں کڑے امتحان سے نکلا

دھیرے دھیرے شکیب یاد کا شہر
دھند کے سائبان سے نکلا

سوزوفن

صدیق کلیم

فان : یہ ہر اک سمت گھنی تیرگیاں
روشنی ابھرتے ہوئے تیرتی ہے ڈوبتی ہے
اسی اک چاند کا ہو جائے طلوع
یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا، یہ منوّر کر دیں
کاش پھر کوئی کلیم
کوہِ سینا پہ رگِ جاں ہو جائے
مشعلِ راہ فروزاں ہو جائے

ـسہ : اُف یہ سوچ!
اس قدر گہری گھنیری سوچیں!
پھیلتی کانپتی راہوں کا سفر
دور بھی نزدیک بھی برفاب چناروں کا ہجوم
دو دھیا غاروں کے پُرہول قطار
اُف یہ خاموش الم ناک نظاروں کا سکوت
مرفان : کیسے خاموش الم ناک نظاروں کا سکوت!
تو نے دیکھا کیا ہے؟

کوہ کی سطح سے تنتے ہوئے بھاری بادل
پھیلتے ناچتے ہر سمت گرجتے بادل
وحشت انگیز ہواؤں میں کڑکتے بادل
سنسناتی ہوئی وحشی لہریں

ہر نفس ناچتی ہیں ڈولتی ہیں چیختی ہیں
بجلیاں کوندتی ہیں، ڈوبتی ہیں کوندتی ہیں
شمسہ : پاگل انسانوں کے بے تاب دلوں میں کیا رکھا ہے!
تم شاعر ہو
تم دانشور ہو
تم سب کچھ ہو پر تم دنیا کے رسیا بھی ہو
تم کو دنیا کا علم نہیں ہے
تم دنیا کو بدلو گے؟
تم پاگل ہو
یا اس فکر کی ایندھن سے آگ جلاؤ
یا اس کو نیچے غار میں پھینکو
انسان بنو
پاگل نہ بنو
میں سچ کہتی ہوں
تم پاگل —
عرفان : اس درد کو سینے سے نکالے پھرنے سے کیا حاصل ہے؟
جس درد کو اظہار میسر ہی نہیں
اس دولت کیا حاصل ہے؟
پاگل انسانوں کے بے تاب دلوں میں کیا رکھا ہے!
سننے والوں کے دلوں میں جب تک نہ اُترے

گیتوں کی آگ سسک کر بجھ جاتی ہے
اس درد سے کیا حاصل ہے؟
یہ درد سسک کر مر جاتا ہے
انسانوں کا درد امر ہو جاتا ہے
بے کار امر ہو جاتا ہے
اس درد سے کیا حاصل ہے؟

ماض: ہیلو! عرفان!
او ہو تم تو کھوئے بیٹھے ہو۔ اپنے سے بھی روٹھے بیٹھے ہو
رات ایک نہیں دو نظمیں لکھی ہیں
وہ بھی سنو؛

(۱)

مری پیاری مری جاں
پھر پائل خوب چھیڑ
لے کر اس رقص کی لے تیز کرو
سلگتے ہوئے ہونٹوں کی بہار
یہی سب کچھ یہی امرت رس ہے
مری پیاری مری جاں
تلخیٔ مے تیز کرو
بھول جاؤ مری آغوش میں آؤ
کہ ذرا پیار کریں
یہ مرے گیت یہی دولت ہیں
مری پیاری مری جاں
مجھ کو محروم نہ کر
"تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ"
نغمۂ زیست سنا
تن بھرا ساز بجا
گا ابھی اور بھی گا
ناچ کی لہر اٹھا
زیست کا ساز بجا
مری پیاری مری جاں!

(۲)

اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
میں اپنی پیاری کو اپناؤں گا
آخر وہ مجھ کو نہ بھی ملی تو کیا
جو سینے کے زنداں میں سلگتا ہے
اس درد کو راہ نہ بھی ملی تو کیا
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
چاند ستاروں کی اوٹ وہ بستی ہے
سب سے اونچا محل ہے اس کا گھر
وہ پیت نگر کی ایک ہی رانی ہے
مجھ کو ہے پیت نگر کا پیش سفر
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
میں اس کا ایک سنہری پیارا مجسمہ
یہ سارا جیون دے کے بناؤں گا
وہ مجھ کو بے شک نہ بھی اپنائے
میں اپنی پیاری کو اپناؤں گا
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا

عرفان: پھر وہی گیت۔ وہی پیار کی سطحی باتیں
کبھی اونچی کبھی نیچی بس یہی سطحی باتیں
تم کبھی اپنے سے باہر آؤ — دیکھو
ان دہکتے ہوئے بازاروں کی رونق دیکھو
ان مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو

ں تمہیں شعر سناتا ہوں - مرے دوست -
ور سنو -
ندگی درد بنے گی مجھے معلوم نہ تھا
ر بسے بوجھ بنے گی مجھے معلوم نہ تھا
ے خوں کے ستاروں سے سلگتی ہوئی آگ
وشنی ایسے بجھے گی مجھے معلوم نہ تھا
ح کے پیار کی سندر متحرک کرو!
س طرح شام ڈھلے گی مجھے معلوم نہ تھا
ندگی درد بنے گی مجھے معلوم نہ تھا"
ں تو پھر آپ کے اشعار سے محروم رہی
ی درخواست • مکرر ارشاد"
: تم ہمیں شعر سناؤ نظم

} تم ہمیں شعر سناؤ نظم

ہ شعر ایک رسالے میں چھپی ہے
ہ پسند آئی بھی لکھ رکھی ہے

} ارشاد!

سانس کا سلسلہ جاوداں
ہے رگوں میں حرارت رواں
ہے مری دھڑکنوں کا امیں
ہے چمکتی بہاروں کا رس
ں فضا میں نئی زندگی ہے
ہر قدم پر یہاں تازگی ہے

نغمہ خواں جسم کی راگنی
سر سے پاؤں تلک رنگ ہے
پھول سے چاند کی دلکشی،
شاہراہوں کی یہ رونقیں
یہ بسیں ہر جگہ موٹریں،
یہ دکانیں۔ یہ سب رستوراں
درد و لذت کی آمیزشیں
ہر نفس خون کی گردشیں
سنگتراشوں نے پتھر میں دیکھا جسے
شاعروں نے زباں میں پرویا جسے
فارمولوں میں سائنس نے لکھا جسے
دو صدی سے مشینوں نے ڈھالا جسے
حسن ہی تھا صداقت بنایا جسے
آج یہ زندگی کا نیا روپ ہے
اک نیا فن ہمیشہ حقیقت نئی
یہی زندگی ہے - یہی زندگی
زندگی اے نئی زندگی!
تیرے بیٹے، تری بیٹیاں
اس جہاں میں جہاں پر بھی ہیں
دو ملوں میں ہوں کھیتوں میں ہوں
درسگہ ہو کہ ہو رزمگہ،
تیری خاطر کسی کام پہ
جی رہے ہیں ترے نام پہ
ہر نفس ہے تیری بندگی
زندگی اے مری زندگی!

مضطر اکبرآبادی

○

تھک کر چلے ہیں راہ میں ہر نقش پا سے ہم
آگے رہے ہیں چار قدم رہنما سے ہم

سائے کی بھیک دھوپ سے مانگیں تو کس لیے
کیوں لیں وفا کا عہد کسی بے وفا سے ہم

اک مستقل سکوت ہے دل سے زباں تک
محروم ہو گئے ہیں اب اپنی صدا سے ہم

جرم وفا کیا ہے کریں گے ہزار بار
ڈرتے نہیں جہان کی کسی بھی سزا سے ہم

حائل ہیں اپنی راہ میں کوتاہ دستیاں
کس طرح چھین لیں تری خوشبو صبا سے ہم

بجھتے ہوئے چراغ سے لیتے ہیں روشنی
بڑھتے ہیں ابتدا کی طرف انتہا سے ہم

کچھ غیر مطمئن بھی ہیں کچھ مطمئن بھی ہیں
مضطر سکوت ساز و شکست صدا سے ہم

آوازوں کا بھنور

(مشرقی پاکستان کے بارے میں طویل نظم کا ایک حصہ)

ریاض انور

میں اک مسافر شکستہ دل، پا بہ گِل
نہ کوئی جادہ نہ کوئی منزل
سکونِ قلبِ حزیں کی خاطر مثالِ بسمل
نہ جانے کب سے تڑپ رہا ہوں
چمن چمن، دشت دشت گھوما
مگر کہیں بھی ملی نہ مجھ کو
وہ اک کرن جو حریفِ شب ہو
روش روش، کُنج کُنج ڈھونڈا
وہ گیت جو کہ متاعِ لب ہو
میں اک مسافر شکستہ دل، پا بہ گِل
گئے زمانوں کے نقش ہائے قدم کی شمعوں کی جستجو میں
عظیم دریا کی شوخ لہروں سے بات کرنے کی آرزو میں
ازل کی محرومیوں کا عفریت ساتھ لے کر
بہ قلبِ ویراں، بہ دیدۂ تر
کھڑا ہوا ہوں صلیب بن کر
کنارِ دریا
خموش، تنہا!

عظیم لہرو، عظیم موجوں کی ہمسفیرو ٹھہر بھی جاؤ
مجھے کچھ اس سرزمینِ نغمات و رقص کی داستاں سناؤ

یہ سرزمیں جس کے گیت جھرنوں کی نغمگی سے بھی دلنشیں ہیں
یہ سرزمیں جس کے رقص قوسِ قزح کے رنگوں سے بھی حسیں ہیں
یہ سرزمیں جس نے دکھ حسین ترین شعر و نغمہ کی چاندنی سے
یہ سرزمیں جس میں موت چلتی ہے اک قدم ہٹ کے زندگی سے
عظیم مرد، عظیم مردوں کی ہمسفیرو
تمہارے لطف و کرم سے شاداب کھیتیوں میں یہ دلکشی ہے
تمہارے حسنِ نفس سے روشن ہیں قریہ قریہ چراغ کتنے
تمہارے دم سے چمن چمن پھول مسکراتے ہیں سرخوشی سے
یہ صندلی کھیت جوٹ کے، جھنڈ تاڑ کے، ناریل کی خوشبو
یہ صف بہ صف باغ آم کے اور دھان کی لہلہاتی فصلیں
ندی ندی تیرتے کنول مسکراہٹوں کی بہار ہر سو
تمہارا خوں ہی ہر ایک پتے کے ریشے ریشے میں گھومتا ہے
تمہاری آواز ہی کے سنگیت پر یہ سنسار جھومتا ہے
عظیم مرد، عظیم مردوں کے ہمسفیرو
کبھی تو وجہِ حیات ہو تم کبھی ہو پیغامِ نیستی کا
تمہارے دستِ جفا سے اکثر بجھا ہے مہتاب زندگی کا
وہ بستیاں جن کو تم نے پالا ہے اپنی آغوشِ جاں فزا میں
تمہارے شوقِ فنا کے ہاتھوں کی زد میں آکر کھنڈر بنی ہیں

پہلی آواز : افق پہ یہ کیسا اندھیرا ہے، کیسا دھواں ہے
سنو ذرا سے یہ ہواؤں کی آواز جیسے کوئی رو رہا ہو

دوسری آواز : یہ طوفاں کی آمد کا پہلا نشاں ہے

پہلی آواز : یہاں دل تو پہلے ہی محرومیوں کے بگولوں کا مسکن بنے ہیں
یہاں آنسوؤں کی جھڑی دیدنی ہے
یہاں تو ہر اک آنکھ پہلے ہی مرتی ہوئی آرزوؤں کا مرگھٹ بنی ہے

یہاں تو ہر اک گام پہ موت کی ایک چادر تنی ہے
برس ہا برس سے فلاکت کے طوفاں، فاقوں کے جھکڑ یہاں خیمہ زن ہیں
یہاں کیسا طوفاں؟
دوسری آواز: یہی زیست اور موت کی کشمکش
ارضِ بنگاں کے رقص و نغمہ کی جاں ہے

درخت کے پتوں کی آواز چیخوں میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے
یہ دریا کی لہریں ہیں یا کوئی دیوار بڑھتی ہوئی آ رہی ہے
مکاں اس طرح گرتے جاتے ہیں جیسے
کوئی بلبلہ آب کا پھوٹ جائے
یا جیسے گھروندا کوئی ریت کا
بادِ صرصر کی یلغار سے ٹوٹ جائے
چھتیں ٹین کی اس طرح اُڑ رہی ہیں
ہواؤں کے ریلے میں جیسے کوئی خشک پتا رواں ہو
یہی کھڑکھڑاتی چھتیں تیغ بن کر سروں کو بدن سے جدا کر رہی ہیں
ہر اک سمت چیخوں کا شورِ قیامت
سسکتے، بلکتے ہوئے آدمی
موت کے دستِ بے رحم سے بچ نکلنے کی خاطر
تناور درختوں سے چمٹے ہوئے ہیں
مگر تند دریا کی بے مہر لہریں
سروں سے گزرتی
نگاہوں کی شمعوں کو بے نور کرتی
مجسم اجل بن کے آثارِ ہستی مٹاتی چلی جا رہی ہیں

افق سے گھٹا ڈھل گئی ہے، ہوا تھم گئی ہے
کراں تا کراں سنسناتی ہوئی خامشی نوحہ خواں ہے
نہ کوئی مکیں ہے نہ کوئی مکاں ہے
یہ اُجڑے ہوئے کھیت، ٹوٹی ہوئی کشتیاں گزرے لمحات کی داستاں ہیں
دھڑکتے ہوئے دل، مہکتے ہوئے ہونٹ، شاداب چہروں کے گلشن کہاں ہیں؟

خلیج بہرو، خلیج لہروں کی ہمسفیرو
کھڑا ہوا ہوں تمھارے پہلو میں اپنے خوابوں کی راکھ لے کر
شکستہ دل، پا بہ گِل
بہ قلب ویراں، بہ دیدۂ تر
تمھاری آغوش کاش بن سکتی میری منزل

اختر ہوشیارپوری

میں نے یوں دیکھا اُسے جیسے کبھی دیکھا نہ تھا
اور جب دیکھا تو آنکھوں پر یقیں آتا نہ تھا

ریگِ ساحل تھا بہارِ ساحلِ دریا نہ تھا
پھر بھی قدموں میں رہی ہے موج میں پیاسا نہ تھا

بام و در سے سخت بارش میں بھی اُٹھے گا دھواں
یوں بھی ہوتا ہے محبت میں کبھی سوچا نہ تھا

آندھیوں کو روزنِ زنداں سے ہم دیکھا کیے
دُور تک پھیلا ہوا صحرا تھا نقشِ پا نہ تھا

لوگ لائے ہیں کہاں سے شب کو مر مر کے چراغ
ان چٹانوں میں تو دن کو راستہ پیدا نہ تھا

شہر کی ہنگامہ آرائی میں کھو کر رہ گیا
میں کہ اپنے گھر میں بھی مجھ کو سکوں ملتا نہ تھا

تم سے پہلے راستوں میں قمقمے روشن نہ تھے
شہر کی دیوار سے صحرا نظر آتا نہ تھا

نت نئے انداز سے رہتی تھی اُن سے گفتگو
دوستوں میں جب مرا رنگِ سخن رسوا نہ تھا

برف اپنے آپ گھُل جاتی ہے سورج ہو نہ ہو
شام سے پہلے یہ جانا تھا مگر سمجھا نہ تھا

اُن دنوں بھی شہر میں سیلاب آتے تھے بہت
وادیوں پر جب کہیں بادل ابھی برسا نہ تھا

دامنِ گل تک نہ تھا محفوظ گردِ راہ سے
ہاں مگر تیرے شہیدوں کا کفن میلا نہ تھا

رات کی تنہائیوں میں جس سے چونک اُٹھتے تھے ہم
اپنی ہی آواز تھی شعلہ کوئی چمکا نہ تھا

وہ بھی سچ کہتے ہیں اختر لوگ بیگانے ہوئے
ہم بھی سچے ہیں کہ دنیا کا چلن ایسا نہ تھا

بشیر منذر

○

بات ہے تب کی وہ جب دیکھیں گے
چاند نکلے گا تو سب دیکھیں گے

کیا ہے جینے کا سبب دیکھیں گے
ہم بھی وہ پھولوں سے لب دیکھیں گے

ہونے والا ہے چراغاں دل میں
آپ بھی جشنِ طرب دیکھیں گے

حسرتیں اپنی جو یکجا کر لوں!
لوگ اک شہرِ عجب دیکھیں گے

جب وہ گزریں گے ادھر سے تو ہمیں
باملاحظہ، باادب دیکھیں گے

دیکھنا شانِ کریمی مُنذر
وہ مرا عرضِ طلب دیکھیں گے

بشیر منذر

دامان تار تار ہے دل لخت لخت ہے
تعزیرِ عشق زہرہ وشاں کتنی سخت ہے

ہونٹوں کی تازگی ہے بہاروں کا زادِ راہ
آنکھوں کا حُسن چاند ستاروں کا رخت ہے

سایہ نہ کوئی شاخِ ثمر دار ہے کہیں
کتنا عجیب تیری وفا کا درخت ہے

پنبہ بگوش کس لیے رہتی ہے مرگ بھی
آوازِ سازِ زیست کی شاید کرخت ہے

مرنے کے بعد بھی نہ سکوں مل سکا کہیں
جاں دادگانِ عشق کا اتنا ہی بخت ہے

اختر لکھنوی

○

ہر رنگ میں جو ان کے وفادار رہے ہیں
اخترؔ وہ خطاکار سزاوار رہے ہیں

جب تک نہیں واقف ہوئے تری راہگزر سے
ہر راہ میں ہم صورتِ دیوار رہے ہیں

ہنگامِ جنوں میں بھی تری چاہ کی حد تک
دیوانے ہمیشہ ترے ہشیار رہے ہیں

مہتاب کی منزل میں ہیں اب قافلے ان کے
جو لوگ ترے محرمِ اسرار رہے ہیں

وہ چشمِ غضب ہو یا نگاہِ کرم ان کی
ہم لوگ بہرحال سپر دار رہے ہیں

چاہیں تجھے چھپ چھپ کے یہ ہم سے نہیں ہوتا
ہم چاک گریباں سرِ بازار رہے ہیں

اعتراف

شاعر ندیم

آج تجدیدِ وفا کا دن ہے
آج کے دن کو تری یاد سے نسبت دی ہے

آج پھر اپنے ارادوں کی اٹھے گی تمہید
آج پھر ہوگی نگاہوں کو ادب کی تاکید
آج پھر تجھ سے محبت کی رہے گی تائید

آج پھر حرفِ محبت پہ نکھار آئے گا
آج پھر تذکرۂ رقصِ بہار آئے گا
تجھ پہ پیار آئے گا اور ٹوٹ کے پیار آئے گا

پھر ترے دستِ حنائی پہ بندھیں گی سہریاں
پھر سے کھل جائے گی ترسی ہوئی باہوں کی کماں
پھر سے مجبور اٹھیں ارمانوں کی مچی رگِ جاں

تیرے گیسو کی سیاہی میں گزارا ہوگا
تیری معصوم نگاہوں کا سہارا ہوگا
غمِ ایام کی وحشت سے کنارا ہوگا

جلوۂ حسن سرِ بام ہمیں پر ہوگا
تیری چاہت کا ہر الزام ہمیں پر ہوگا
تیرے انعام کا اکرام ہمیں پر ہوگا

آج آئے ہیں تو ہم دادِ وفا لے لیں گے
ایک قامت کی تمنا کا صلہ لے لیں گے
جتنی تقدیر ہے پورا اُس سے سوا لے لیں گے

لبِ تشنہ لمسانہ ہوئے جس سے وہی شوق کی بات
زندگی جس سے عبارت ہے وہ غم کی سوغات
کتنے چاندی سے حسیں خوابوں کی تکمیل بات

تیرے پہلو میں لطف بن کے اُتر جائے گی
میرے معصوم پیار دیدہ اثر لائے گی
بیاہنے تجھ کو ترے روپ نگر آئے گی

سوچتے تھے کہ ترے در کو بھلا دیں گے
اب اُٹھے ہیں تو کہیں دور نکل جائیں گے
اب چلے ہیں تو ترے پاس نہیں آئیں گے

تجھ سے روٹھے تو زمانے میں کہیں بھی نہ گئے
تجھ سے بچھڑے تو بسے دل میں تری یاد لیے
تجھ سے چھوٹے تو ترے اور قریب آ بیٹھے

آج کے دن کو تری یاد سے نسبت سی ہے
آج تجدیدِ وفا کا دن ہے

صت

ساعر ندیم

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
دل سے شاعر کے انگشتِ حنائی کا خیال
میں کہیں دور کہیں دور چلا جاؤں گا
کتنا اندوہ فزا ہے یہ جدائی کا خیال

مجھ سے منہ موڑ کے ایک ایک چلے جاتے ہیں
یہ مہکتے ہوئے دن اور یہ تاروں بھری رات
چند یادوں کے دیے چند خیالوں کے نجوم
یہی واماندہ مسافر کو ملے گی سوغات

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
ان میں کھو جائے گا اک شاعرِ سادہ کا ثبات

نئے مہرے نئے شاطر نئی چالیں لے کر
غمِ ایام بچھائے گا فریبوں کی بساط
سب حسیں نقش بکھر جائیں گے پتوں کی طرح
ذہن و افکار سے مٹ جائے گی تصویرِ نشاط

اک نگہ اور سہی اور سہی اور سہی !

یہ مہکتی ہوئی زلفیں یہ غزالیں آنکھیں
کون آئے گا پلٹ کر یہ خیال آتا ہے
کہیں حسرت کوئی رہ جائے نہ باقی دل میں
جب کرم فرصتِ گستاخی و بیباکی ہے
اک نظر اور ابھی اور ابھی اور ابھی !

جب چراغوں کی لویں سوتی ہیں

شاعر ندیم

جب چراغوں کی لویں چپ ہو جائیں — روشنی سوتی ہے دھرتی میں کہیں
جب ستاروں کے دیے بجھتے ہیں — رقص کرتی نہیں چاندی کی زمیں
چاند جب روٹھ کے چھپ جاتا ہے — رنگ اور روپ کا انبار کہاں
ساز کے تار بکھر جاتے ہیں جب — خاک ہو جاتے ہیں مایوس ارماں
آشنا ہو چکے جب نغموں سے — اپنے لب پہ کوئی جھنکار نہیں
بھول جاتے ہیں محبت کے رسوم — جیسے اب کچھ بھی سروکار نہیں

جب چراغوں کی لویں سوتی ہیں
دور کی راتیں بہت روتی ہیں

اب نہیں جاگیں گے بیتے ایام — اب نہ اٹھے گا سُر یہ سنگیت
اب چراغاں نہیں ہوگا ہرگز — اب نہ تڑپیں گے فضا میں نئے گیت
کسی آواز کا خاموش طلسم — اب بہاروں کو نہیں لائے گا
کسی تقدیر کا رخشاں انداز — چاند تاروں کو نہیں لائے گا
دل کی دھڑکن میں نہ ہوگی کوئی لرزش — اب نہ مہکیں گی سہانی راتیں
اب تو بس دن خیالات کے ساتھ — غم و آلام کی ہونٹوں کی باتیں

اب نہیں جاگیں گے بیتے لمحات
اب نہیں نکلے گی ارماں کی برات

پہرے

شاعر ندیم

احساس عزم و شدت جذبات پہ پہرے
خود ہم نے لگا رکھے تھے ہر اک بات پہ پہرے
پہلے ہی سے محتاط تھا جو رند خرابات
بڑھتے گئے اس رند خرابات پہ پہرے
جو بات ابھی وہم و گماں میں بھی نہیں تھی
کیا خوب لگائے ہو اسی بات پہ پہرے
اچھی یہ عنایت ہے کہ لبوں کی بھی فکر ہے
گر ہے یہ عنایت تو عنایات پہ پہرے
ہم ہیں سو اٹھائیں گے یہ اک بار ندامت
وہ نذر رکھے ہم سے خوش اوقات پہ پہرے
خاموش خیالات پہ بس کس کا چلا ہے
کس طرح بٹھاؤ گے خیالات پہ پہرے
وہ تیری ہی یادوں کے لیے وقف رہیں گے
ہم نے بھی لگا رکھے ہیں کچھ اوقات پہ پہرے
اب کس کی شکایت کریں اے دوست کہ ہم کو
منظور رہوں جب خود ہی مری ذات پہ پہرے

قتیل شفائی

○

پیار کی راہ میں ایسے بھی مقام آتے ہیں
صرف آنسو جہاں انسان کے کام آتے ہیں

ان کی آنکھوں سے رکھے کیا کوئی امیدِ کرم
پیاس مٹ جائے تو گردش میں وہ جام آتے ہیں

زندگی بن کے وہ چلتے ہیں مری سانس کے ساتھ
ان کو ایسے کئی اندازِ خرام آتے ہیں

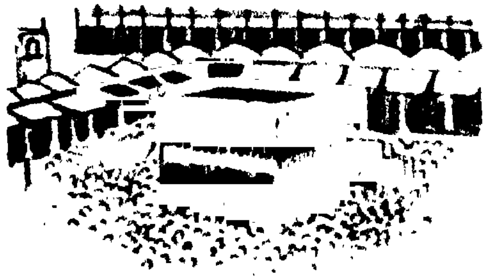
ہم نہ چاہیں تو کبھی شام کے سائے نہ ڈھلیں
ہم تڑپتے ہیں تو سحروں کے سلام آتے ہیں

قوتِ دستِ طلب کا نہیں جن کو ادراک
تیرے در سے وہی بے نیلِ مرام آتے ہیں

منہ چھپا لیتے ہیں غم حضرتِ ناصح کی طرح
جب بھی میخانے میں رندانِ کرام آتے ہیں

ہم پہ ہو جائیں نہ کچھ اور بھی راتیں بھاری
یاد اکثر وہ ہمیں اب سرِ شام آتے ہیں

چھن گئے ہم سے جو حالات کی راہوں میں قتیل
ان حسینوں کے ہیں اب بھی پیام آتے ہیں



حج
کی تیاری
مسلم کمرشل بینک
سے شروع کیجئے

مسلم کمرشل بینک کی مغربی یا مشرقی پاکستان کی کسی بھی شاخ سے رابطہ قائم کریں۔ ہمارے بینک کے مستعد اور تجربہ کار افسران آپ کو حج کے درخواست کے فارم مفت مہیا کریں گے۔ یہ افسران آپ کو درخواستوں کی خانہ پری میں بھی مدد دیں گے۔ ہماری یہ تمام خدمات عازمین حج کے لئے بلا معاوضہ ہیں۔ مسلم کمرشل بینک کی تمام شاخیں غیر ملکی زرمبادلہ اور کرایہ سفر حج وغیرہ وصول کرتی ہیں جن کی رسید بھی دی جاتی ہے۔

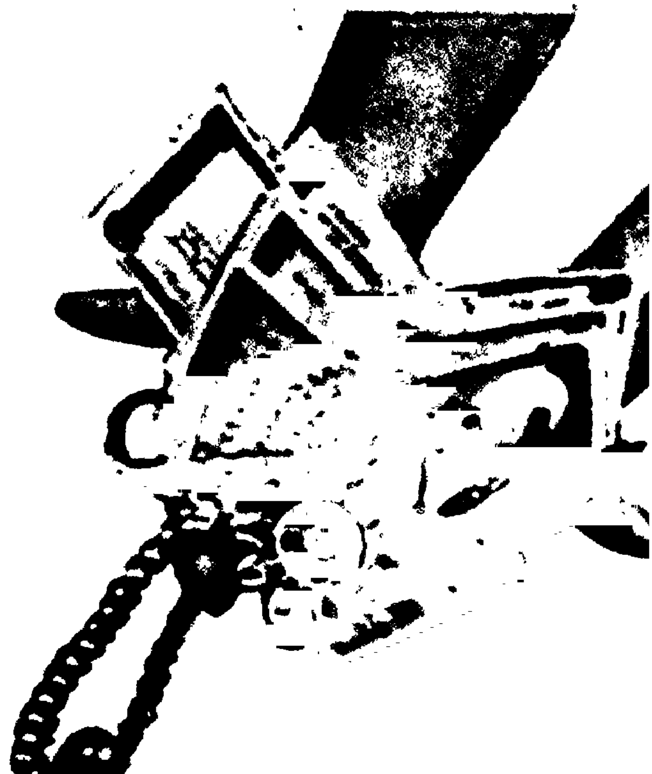
عازمین حج بینک کی ان بلا معاوضہ خدمات سے شام کے اوقات میں بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حج کے سلسلے میں تمام خدمات مفت مہیا کی جاتی ہیں

ایس۔ مصطفیٰ اسمٰعیل
جنرل منیجر

ہیڈ آفس
کراچی

وطن پر سب کچھ نثار



دفاعی بانڈ

۱۹۷۰ء

میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگایئے۔

۵٪ فیصد شرح منافع

بانڈوں پر ۵ فیصد سالانہ منافع دیا جائے گا جس کی تقسیم ششماہی ۱۰ مئی اور ۱۰ نومبر کو کی جائے گی۔ جو لوگ اپنے بانڈوں پر منافع لینے کے خواہاں نہ ہوں وہ درخواست کے اوپر دائیں کونے میں نمایاں طور پر "بلا منافع" لکھ دیں اور اس کے نیچے دستخط کر دیں۔ بانڈوں کے لئے درخواستیں ایک صد روپیہ یا اس کے حاصل ضرب میں ہونی چاہئیں۔ بانڈ اسٹاک سرٹیفکیٹ یا پرامیسری نوٹ کی صورتوں میں جاری ہونگے۔

رقومات کی واپسی ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ کو عمل میں آئے گی۔

درخواستوں کے ہمراہ مطلوبہ رقومات نقد یا چیک کی صورت میں مندرجہ ذیل مقامات پر ادا ہونی چاہئیں

اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے دفاتر واقع کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی، کوئٹہ، ملتان، ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا اور بوگرہ۔

ان مقامات پر جہاں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے دفاتر نہیں ہیں درخواستیں نیشنل بینک آف پاکستان کی شاخوں میں وصول کی جائیں گی

جہاں اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور نیشنل بینک آف پاکستان کی شاخیں نہیں ہیں وہاں سرکاری خزانوں میں درخواستیں وصول کی جائیں گی

جاری کردہ: وزارت مالیات، حکومت پاکستان


جوشاندی
نزلہ زکام کھانسی کی زود اثر دوا
صدیوں کے آزمودہ جوشاندے کی ترقی یافتہ شکل
جس میں جوشاندے کے تمام اجزاء موجود ہیں
جوشاندی سالہا سال سے نزلہ زکام کے
مریضوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔
نہ جوش دینے کی قباحت نہ چھاننے کی ضرورت
صرف ایک پیالی تیز گرم پانی میں
دو ٹکیاں حل کر کے استعمال کریں
ہر موسم میں استعمال ہوتی ہے
ہر جگہ ملتی ہے
اجمل
دواخانہ حکیم اجمل خان لاہور

六

استعفا

ڈاکٹر محمد باقر

حضور! آپ باور نہیں فرمائیں گے لیکن میں واقعی اپنی ملازمت سے استعفا دے رہا ہوں۔ اور باور نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں [...]یہ تحریر میرے ہاتھوں سے لکھی ہوئی آپ کے سامنے ہے۔ البتہ آپ کو تعجب ضرور ہوگا کہ اس بیروزگاری کے زمانہ میں میں نے [...]ت کیسے کی، خصوصاً ان حالات میں جبکہ میرا کوئی اور ذریعۂ معاش بھی نہیں۔ میرے پاس آپ کی طرح زمین بھی نہیں۔ نہ [...] [...]ں۔ میں نے آپ کی طرح ایک درجن ٹیکسیاں بھی نہیں بنائیں جو مجھے ہر شام کو پچاس روپے فی ٹیکسی وصول کرائیں۔ میرا اس کارخانے [...]میں حصہ بھی نہیں جس کو امپورٹ لائسنس میری ہی وساطت سے آپ نے اس شرط پر دیا تھا کہ کارخانہ دار دس فیصد حصے کا مالک آپ [کی] بیگم صاحبہ کو قرار دے۔

لیکن سرکار! میں اب اس ملازمت کی زندگی سے اس قدر اکتا گیا ہوں اور تھک گیا ہوں کہ میرے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں [...]ں قبر میں پہنچنے سے پہلے ایک دفعہ کم از کم پھر اس زندگی کو شروع کروں جس سے مجھے ذہنی آسودگی کے ساتھ حلال کی [...]ملے۔

مائی باپ! آپ میری اس جسارت کو دیکھ کر تیوری کیوں چڑھا رہے ہیں۔ میں اپنی چشم تصور میں پہلے ہی اس پیشانی کو دیکھ رہا ہوں جس پر [...]رہے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بل بلا وجہ بھی پڑتے تھے۔ اور میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جب کاغذ آپ کے سامنے میز پر رکھتا [...]عالم غیظ و غضب میں ہوتے تو میں گردن نیچی کر کے اپنے آپ کو اس قدر سکیڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ آپ یہ محسوس کریں کہ آپ [...]پر بیٹھے ہوئے بھی مجھ سے تین فٹ اونچے ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ میرا قد آپ سے لمبا ہے۔ آپ جب کمرے میں [...]ے میں میں مسکراتا۔ بتاتا اور یہ ظاہر کرتا کہ آپ ایک ایسے شیر ہیں جس کے سامنے میری حقیقت بلی کی بھی نہیں بلکہ چوہیا کی سی تھی۔ [...]اس کرتا کہ جب میرا کاغذ میرے سامنے پڑے ہوتے (حالانکہ مجھے معلوم بھی نہ ہوتا کہ آپ کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے [...]کس آدمی نے یہ معروضہ کیا ہے) تو میں کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے یہ ظاہر کرتا جیسے آپ نے مجھے کوئی بہت بڑا تحفہ عنایت [...]فرمایا ہے۔ اور میں [...] کر کے کاغذ میں سے شکار کرتے ہوئے باہر نکل آتا۔

لیکن حضور آج میں آپ کی دسترس سے باہر ہوں۔ آپ میرا لکھا ہوا کاغذ دیکھ کر برافروختہ ہوں یا اس کاغذ سے پہلا کاغذ دیکھ کر [...]برافروختہ ہوں یا یہ دونوں کاغذ دیکھ کر برافروختہ ہوں اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں۔ کیونکہ میں تو اب حلال کی روٹی کمانے اور کھانے [...] چلا جاؤں گا اس لیے یہ استعفا داخل کر رہا ہوں۔

---

* [illegible] کے ساتھ۔

واقعہ! آپ جاننا چاہیں گے کہ آخر میں نے یہ فیصلہ اتنی دیر سے کیوں کیا ہے۔ پچیس سال پہلے ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے اور پچیس سال میں ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ یا تقریباً افسر [illegible] گزر جاتے ہیں اور میرے سارے جوش ختم ہو چکے ہیں [illegible] سے [illegible] بیتے ہوئے ہیں [illegible] ایک صورت کے اعتبار سے [illegible] کی ملازمت کے بعد [illegible] میں نے تقریباً [illegible] سوچتے [illegible] ڈرافٹ [illegible] پاس کیا تھا۔ آپ نے مجھے بہت بہتر ڈرافٹ [illegible] پاس کیا تھا اس روز میں جہاں [illegible] کر کے خدمت [illegible] تھی، ان سب [illegible] سے پیشتر [illegible] ساتھ والی میز پر بٹھا دیا گیا تھا کیونکہ آپ خدمت [illegible] ہونے والے سارے [illegible]۔ آپ کو یاد ہوگا کہ شروع شروع میں آپ کے ڈرافٹ میں درست کیا کرتا تھا اور جب ہم دونوں کے ڈرافٹ آپ کے [illegible] افسر کے پاس جاتے تو وہ آپ کے ڈرافٹ کی بہت تعریف کرتا اور آپ کے سامنے مجھے [illegible] کر اپنا ڈرافٹ [illegible] ہے معنی ہے۔

حضور! آپ نے پہلے [illegible] خوبصورتی اور ہوشیاری سے ترمیم کی وہ تو غیر [illegible] تھا کبھی کبھی تو میرے [illegible] تھا۔ لیکن آپ کو تو ڈرافٹ [illegible] نے تھا۔ اس لیے جب [illegible] کرتے کرتے میرے [illegible] ہو گئے تو مجھے اپنے کمرے میں [illegible] اور میرے ڈرافٹ پر ایک جگہ [illegible] کر کے پوچھنے لگے یہ کیا لکھا ہے؟ اب میں کیا جواب دیتا۔ مجھے کیا معلوم کہ میں نے کیا غلطی کی ہے۔ [illegible] آپ کو یقین ہو جاتا کہ آپ نے پیار [illegible] میری [illegible] اپنے [illegible] کے متعلق [illegible] ہی۔ [illegible] کہ کر آپ کی [illegible] کے [illegible] سے پیار ڈرافٹ [illegible] کرتے ہیں تو [illegible] کے بعد [illegible] کے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تو آپ کو یقین ہو جاتا کہ آپ نے [illegible] کام [illegible] پہلے [illegible] ڈرافٹ کو قبول کرتے ہوئے کہتے "اب ٹھیک ہے نا۔" پہلے کیوں کوشش کر کے یہ کام نہیں کرتے" میں "یس سر" کہ کر سر [illegible] آپ کے کمرے سے باہر آ گیا۔

لیکن یہ سارا [illegible] تو تقریباً [illegible] تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب آپ کو [illegible] اٹھایا گیا اس کی وجہ آپ کا [illegible] ہے کہ اس وقت پہلے آپ کے ماموں [illegible] تھے۔ پھر جب آپ کی شادی ہو گئی اور آپ [illegible] کلب میں اپنی بیگم کے ساتھ شامل [illegible] اور ماموں کے ریٹائر ہونے سے پہلے اس کے [illegible] سے آپ کے [illegible] ہو گئے کہ کلب میں آپ کی بیگم [illegible] سوا وہ کسی اور کو پارٹنر نہیں بناتے تھے اور جب [illegible] وہ کلب نہیں جاتی تھیں وہ آپ کی [illegible] ان کی [illegible] کی کیفیت اور مزاج پرسی کے لیے آپ کی کوٹھی پر حاضر ہو جاتے تھے۔ لہٰذا ہر سال آپ کا ترقی [illegible] اور آپ اس جگہ پہنچ گئے جہاں کہ اب ہیں۔ اس زمانے میں میری یہ حالت تھی [illegible] اپنی میز سے اگلی میز پر پہنچنے کے لیے کئی سال لگے۔ یہاں تک کہ [illegible] میں آپ کے ساتھ والی میز پر [illegible] کرسی [illegible] جہاں پہنچ گئے ہیں اس سے کئی سال زیادہ [illegible] گھسا [illegible] اور اس میں میرے بال سفید ہو گئے۔ ماشاء اللہ آپ [illegible] ابھی تک [illegible] ہیں۔ کم از کم آپ کے سب بال ابھی تک سیاہ [illegible] ہیں۔ گو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ [illegible] بالوں کو [illegible] استعمال کرتے ہیں اور آپ کی دوسری بیگم [illegible] کرتی ہیں۔

حضور! مجھے آپ کی پہلی بیگم سے بہت ہمدردی ہے۔ وہ آپ کی امن پسند بیوی تھیں اور آپ کے مناصب کی ضامن بھی۔ لیکن جب آپ میرے افسر [illegible] کمرے میں پہنچے اور آپ کی یہ سیکرٹری ملی جو بعد میں آپ کی بیگم بنی تو آپ نے امن زادہ ہونے پر بڑا سلیقہ الزام [illegible] اور اس سے آنکھیں پھیر لیں۔ حالانکہ وہ بدستور طلب جاتی تھی۔ برج کھیلتی تھی۔ جیسے جیسے شروب بھی پیتی تھی۔ تیسرا بزرگ [illegible] میں بیٹھ کر آپ کو یہ احساس ہوا کہ محبت ناپ نہ جانے تو خدمت کے سب نقش پھیکے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خوبی آپ کی سیکرٹری میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ چنانچہ آپ نے ازدواجی محبت کو ضرورت ازدواج میں تبدیل کر لیا۔

غریب پرور آپ کا یہی مسئلہ ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں اب حلال کی روٹی کماؤں گا اور کھاؤں گا۔ آپ شاید یہ جاننے کے لیے بے قرار ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ کیونکہ آپ ہمیشہ مجھے یہ تلقین کیا کرتے ہیں کہ اس ملک میں ملازمت کر کے حلال کی روٹی کمانا اور کھانا ناممکن ہے۔ میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کا موقف درست نہیں۔ آپ کی تائید کیا کرتا تھا اور یہیں سے میری [illegible] کا آغاز شروع ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہیں یقین تھا کہ آپ اس قسم کی غلط باتیں اکثر کرتے ہیں اور ایسے فیصلے صادر فرماتے ہیں جو [illegible] کے مفاد کو ضرر پہنچاتے ہیں لیکن میں آپ کے احکام کی تعمیل اس لیے کرتا تھا کہ اگر نوکری نہ کروں تو کماؤں کہاں سے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں آپ نے فائل پر لکھا تھا کہ کئی سال سے سٹاک میں پڑا ہوا چھ ہزار گز کپڑا [illegible] کر کے دریا برد کر دیا جائے کیونکہ اس نے بیکار جگہ گھیر رکھی ہے تو میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ یہ کپڑا نہ اس قدر گل گیا ہے کہ اسے دریا برد کر دیا جائے اور نہ کسی کپڑے کی اس قدر [illegible] ہے کہ ہم چھ ہزار گز کپڑا یونہی پھینک دیں ——

میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہم اس کپڑے کو یتیم خانوں میں بھجوا دیں۔ لیکن آپ تو اپنی مصلحت اندیشی میں تھے۔ آپ نے فوراً مجھے ڈانٹ دیا کہ جب کپڑا پھینکا جانے لگے تو اس وقت اپنے ملازموں کے لیے کپڑا تم بھی لے لینا اور پھر میں بھی خاموش ہو گیا۔ یہاں سے میری بے [illegible] اور آپ کی مصلحت کوشی کے نقش پا پر چلنے کا آغاز ہوتا تھا یہاں تک کہ وہ بے ضمیری کی اس انتہا کو پہنچ گئی جہاں سے واپس آنا اس کے بس کی بات نہ ہوتی۔

لیکن سرا کیا کیا جائے۔ آپ تو قدم قدم پر مجبور تھا۔ اور آپ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ آپ کو بھی تو ترقی و رتبے کے لیے مصلحت بینی اور بے حیا [illegible] عمل کرنا پڑتا ہے جس میں آپ کی حیثیت صرف ایک حقیر پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اگر آپ یہ پرزہ بن کر نہ چلیں تو سرکار اس پرزے کو بدل دے۔ وہ دن تو آپ کو یاد ہوگا جب ایک آدمی محکمے کے سربراہ سے ایک تاریخ خود آپ کے نام لایا تھا کہ اس کی منتقلی [illegible] ہو جاتی تھی۔ آپ نے جب مجھے تفتیش کرنے پر مامور کیا تو چپراسی آپ کے سامنے ہی ایڈجسٹ کر سکتے تھے۔ ابھی میں اس آدمی کو اب [illegible] خیال نہیں ہونے دوں گا جب تک یہ میرا حصہ مجھے نہیں دے گا۔ مجھے تو اپنے حصے سے آپ کے گھر کے سربراہ کی خاطر ہر روز شیرینی پہنچانا ہوتی ہے۔ سربراہ کو کیا معلوم ہو کہ میں لوگوں کو ریشمی دفتر میں آنے نہ دوں تو شام کو صاحب اور بیگم صاحب کھانا [illegible] دیں اور پھر آپ چپ ہو گئے تھے اور آپ نے شکایت کرنے والے سے بڑی نہایت خوش خلقی سے کہہ دیا تھا کہ یہ بھی ذمہ دار ہیں ان کے گرد میں وہ کسی وسعت دیا کرو تو کام میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرت آپ یاد رکھیں سے یہ خیال نہ کریں کہ میں آپ کی بیگم دیوان کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ میری [illegible]

[illegible] آپ کے تعلقات منتقل کرنے کے ساتھ ہوا تھا اور جو کچھ بھی پہلا وقت کے لیے مجھے [illegible] تھے اس لیے میں خوش ہوں یہ تمام کام سرانجام دینے کے بعد اس امر پر کہ شاید میری پاس ملک کے ساتھ [illegible] کام کرتے تھے تو میں نے بعد میں سال تک [illegible] کرنے کی جگہ کہیں [illegible]۔

دوسرا اس لیے کہ میرے پانچ [illegible] میں سے کسی کو بھی میری کسی تک نہیں پہنچنے دیا۔ جو میرا لڑکا اب [illegible] ہے وہ میرا [illegible] ہے۔ جس نے میری شادی ایک [illegible] کی لڑکی سے کی تھی اس نے جہیز میں [illegible] کی کہ ایک [illegible] [illegible] میں میرا لڑکا اب کاروبار کرتا ہے۔ میری بیوی بھی بڑی شکر ہے۔ [illegible] سے بڑھ کر سربراہ لوگوں کی [illegible] ہے مجھ سے بعض نہایت اہم [illegible] مات میرا بیٹا حاصل کرتا ہے۔ اس وقت کا انتظام [illegible] بیٹے [illegible] ہے جب وہ [illegible] کمانے کے بعد [illegible] میرے بیٹے [illegible] تو ایک [illegible] ہے۔ [illegible] باقی ہیں۔ [illegible] میں میری [illegible] وہ خود آپ کو بتا سکتی ہے معلوم نہیں اس نے کبھی آپ کو [illegible] بتایا نہیں۔

دوسرا بیٹا [illegible] جو میرا لڑکا اپنے آپ کو [illegible] کیا اس کتاب [illegible] تو امتحان میں کسی کا بیٹا [illegible] نہیں۔ میں نے تقسیم ملک سے پہلے [illegible] کرائی تھی [illegible] اسکول کے [illegible] ہندوستان کی ایک [illegible] کی قسمت [illegible] امتحانوں میں [illegible] میرے بیٹے نے [illegible] شکل تو [illegible] نہیں دیکھی۔ اس نے اپنے [illegible] امتحان میں [illegible] اور کامیاب ہو گیا۔ تقسیم سے پہلے [illegible] میں لڑکا [illegible] کی قسمت چمک اٹھی۔ اس نے ایک سربراہ کی [illegible] سے [illegible] اپنے [illegible] سے [illegible] پیش کر دیا [illegible] آپ [illegible] اس کے پاس کیا ہوتا تھا۔ [illegible] ذات نے [illegible] خوش کرنے کا [illegible] دیا [illegible] وہ جب کبھی [illegible] سے ملنے جاتا تو اپنے [illegible] کے ساتھ [illegible] جب سربراہ کے ملک سے باہر نکلتے تھے تو ہر مرتبہ ایک [illegible] حضور [illegible] کہہ سکتے ہیں کہ [illegible] کیسے [illegible] تھا لیکن صرف ایک بات معلوم ہے کہ میرے [illegible] اس کم [illegible] سیکرٹری کو [illegible]

میرا سب سے [illegible] لڑکا ابھی اس میدان میں پاؤں چلنے لگا ہے۔ وہ بڑی دلچسپ [illegible] کتاب ہے۔ میرا ایک [illegible] [illegible] مرحلے [illegible] تعلیمی سربراہ ہے۔ [illegible] اس [illegible] خیال میں [illegible] حضور میں [illegible] وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھا۔ لیکن [illegible] اپنے لڑکے کے [illegible] کر چکے تھے۔ [illegible] آپ [illegible] ہوں۔ حضور میرے [illegible] کو [illegible]

سو چلیے تو پیارے [illegible] مرحوم [illegible] حسین حالی نے [illegible]

کمال کشش دونوں کی علم و فلاحوں سے بڑھ کر ہے

مجھے پچیس سال کا تاثر ملا دست کش کر گزرا ہے۔ میں نے سیکڑوں خوشخط اور ریکارڈ لکھے ہیں۔ مجھے ایک خط
ے یا لکھنے کی اجرت کسی نے کبھی نہیں دیا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بڑا کمال کیا جو پروف پڑھ کر اس صفحہ پار آنے
ے۔ آخر میں ایم۔ اے پاس تھا۔ فرسٹ کلاس۔ بہرحال عرض میں یہ کر رہا تھا کہ میں نے پروف پڑھتے ہوئے اندازہ لگایا تھا کہ کتاب
ہے۔ بک سٹال کو بیچ دوں گا بانٹوں گا۔ لیکن لڑکے نے کتاب چھاپ کر نہایت اطمینان سے ایک الماری میں بند کر دی۔ وہ کچھ دیر
[illegible] ہوا۔ اس نے تمہیں سربراہ اداروں کے نام و پتا کا بھی مجھ سے ذکر کیا۔ میں اپنی آنکھوں کے موٹے موٹے شیشوں والے
سے صرف گھور گھور کر اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک دن اس نے مجھے آکر بتایا: "ساری کتاب بک گئی۔"

الماری میں پڑی ہوئی کتاب ایک ہی دن میں کیسے ساری کی بک گئی؟ لڑکے نے بتایا "ابا! تجارت بھی ایک ڈھنگ ہے۔ آپ
دوست بڑے پکے نمازی ہیں۔ وہ ایک پائی کی رشوت نہیں لیتے۔ اس لیے سفارش بھی نہیں مانتے۔ شہر میں سیلاب آیا ہوا تھا
میں سبزی، پھل، انڈوں کا قحط پڑ گیا۔ ایسے چیزیں آنی جانی بند ہو گئیں۔ میں انڈوں کا ایک ٹوکرا اٹھا کر آپ کے دوست کی خدمت
لے کر حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ یہ انڈے بیچنے آیا ہوں۔ بہت مزا۔ [illegible] چیز کر یہ انڈے لے کر ہم تک پہنچے ہیں۔ چونکہ سیلاب
عبور کر رہے ہیں اس لیے صرف دو پیسے ایک انڈے کی قیمت مانگتے ہیں۔ (یہ کئی سال کی بات ہے بازار میں اس وقت دو
آنے کا بھی انڈا نہیں مل رہا تھا) کہنے لگے دس درجن دے دیں۔ میں نے سوچا آپ والد صاحب کے دوست ہیں۔ اس لیے آپ تک پہنچا دوں
انہوں نے جانفشانی سے [illegible] اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تیرہ روپے بارہ آنے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میں نے کہا۔ جناب مناسب غریب
دی ہیں۔ وہ ٹوکرا واپس کر دیں۔ انہوں نے کہا۔ ابھی آپ کو واپس ملتا ہے۔ وہ اندر گئے۔ میں باہر نکل آیا۔ جو آدمی بیگم صاحب کی طرف
سے ٹوکرا دینے آیا۔ اس نے کہا۔ بیگم صاحبہ فرماتی ہیں۔ ایک دو ہفتوں کے بعد زمینوں سے اور انڈے منگوا دیں۔ میں "اچھا جناب"
کہہ کر چلا آیا اور ٹوکرا میں نے سڑک پہ لا کر ایک طرف پھینک دیا۔ میری کتاب بک چکی تھی۔

مختصر میں آپ کو اب زیادہ درد سر نہیں دینا چاہتا۔ آپ صرف یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نے حلال کی کمائی پیدا کرنے
کا یا مستقبل تیار کرنے کا منصوبہ کیسے بنایا جس نے مجھے یہ استعفیٰ پیش کرنے کی جرأت دلائی۔ میں تفصیل سے آپ کو پریشان نہیں
کروں گا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ میرا بیٹا اس [illegible] صاحب کا مرید بن گیا تھا۔ اور یہ انہی کی نظر کرم کا اثر ہے کہ میں اپنی ملازمت سے
مستعفی [illegible] ہو رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نہ صرف دفتر میں
سوچا کرتا تھا کہ آپ میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں بلکہ گھر آکر بھی صرف یہی سوچا کرتا تھا کہ آپ میرے متعلق کیا سوچتے ہیں۔ اور بعض
دفعہ میں سوچتے سوچتے کچھ ایسی حرکتیں کرنے لگتا تھا کہ دیکھ کر لوگوں کو شبہ ہوتا کہ میں قتل کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں اس قسم کا آدمی
نہ [illegible] آپ نے میری نیت و جرأت اور شرافت کو گرفت [illegible] سالوں میں اس سانچے میں ڈھال دیا؟
[illegible] سب سے [illegible] ہمدردی اور تعلق کا [illegible]۔ لیکن یہ قوت تنفیذ بھی عجیب شے ہے۔ مجھ ایسی [illegible] کی بجائے [illegible]
[illegible] چہرے پر کبھی کبھار ایسی نفسی کیفیتیں پیدا ہو جاتیں [illegible]۔ لیکن حقیقت کی زندگی اس سے بالکل مختلف
[illegible] ہے۔ جب ایک دوست نے کبھی کبھار وحشت کے لمحے دیکھا تو اس نے مشورہ دیا کہ تمہیں اپنے کرب و اضطراب سے

بیعت ہونے کے لیے پیر سالوس حیات کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ مگر اکثر سے نکال کر منتقل عورتیں اور بنا کر قبول کر لیا جاتا ہے۔

آپ جانتے ہیں میں پیروں کا قائل نہ تھا۔ میں صرف خدا اور خدا کے محبوب ہی کو مانتا ہوں مگر آپ جیسے سربراہ ... سے پناہ پاتا تھا۔ میری زندگی کے تلخ اوقات میں ہمیشہ آپ کا سہارا رہا۔ تم نہ ہوتے تو شاید کام ایک کوئٹ ... کی بدولت نہ جانے چار برس گزار رہے ہیں۔ میری خفگت میری محبت میری ... صرف انہی سہاروں سے ... تیس منزلیں ... ہے۔ اسے کوئی انسان ... تک ... دوست کو تنگ ہی کر دیتا ہے۔ خود کو ... میں ... لیکن پیر ہر شخص اللہ کے بندے ہیں۔ تم لاکھ میرے دوست ہو ... نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ ... میرے پاس آ ... رہا اور آخر مجھے پیر سالوس حیات کے پاس لے گیا۔

جس وقت میں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا وہ ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چند معصوم ... چہرے ... تھے۔ کچھ ... کمال ... تھا۔ ... کے بعد ایک معصوم چہرہ پیر صاحب کو ایک گلاس پیش کیا۔ میرے دوست ... کی طرف دیکھتے رہنا۔ یہ ابھی دودھ کا گلاس ہے گا۔ کچھ ... تاریکی سی تھی۔ معلوم نہیں ... نے دودھ بنایا نہیں۔ میں ... اور پھر پیر صاحب نے ... میری طرف ... کیا۔ میرے بدن میں ... ہو گئی۔ ... سرخ سرخ ... آنکھیں ... دیکھتیں۔ ... آخر ... "... " ... " میرے منہ سے نکلا "جی حضور" اور میں نے ... کر آج تک کبھی آپ سے بھی نہیں کہے۔ پیر صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور وہاں بیٹھے ہوئے سب مریدوں نے بھی زوردار قہقہہ لگایا۔ پیر صاحب نے حکم دیا " دودھ سے دو ... کو بھی دودھ دے دو !! " اور میں ... بعد بیٹھ گیا۔

آپ نے بھی پیر سالوس حیات کا نام سن رکھا ہوگا۔ یہ تیس چالیس سال ادھر ... یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ... کر کے آئے تھے۔ ایک انگریز بیوی اور ایک ... کار بھی ساتھ لائے تھے۔ انھوں نے امرتسر میں آکر اپنے وکیل باپ کی جگہ پریکٹس شروع کی۔ لیکن بیشتر وقت اپنی بیوی کے ساتھ اور موٹر کار میں سیر و تفریح میں گزارتے تھے۔ اس لیے باپ کی جگہ نہ لے سکے۔ بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ کی زندگی میں وقت اچھا کٹ گیا۔ وکالت سے طبعاً متنفر تھے۔ ... اور پھر بھی ... نہیں ملا۔ ... وفات کے بعد یہ نفرت اور زیادہ ہو گئی اور جب انھوں نے ... کو ترک کر کے ... کا ... اختیار کیا تو بیوی بچہ چھوڑ کر واپس ولایت چلی گئی۔ اس وقت سے انھوں نے عورت کی شکل دیکھی یہاں تک کہ سب معصوم چہرے ... رہتے ہیں یہ اپنے منہ پر ... ڈالے رہتے ہیں۔ ہر عورت کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اطلاع دینا پڑتی ہے تاکہ وہ منہ پر نقاب ڈال لیں۔ یا روشنی گل کر دیں۔ آپ نے ... ترک کرنے کے ... زہد و اتقا کی منازل کچھ اس سرعت سے طے کیں کہ ہر طرف سے لوگ آ آ کر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ... قسم کے سربراہوں سے لے کر مجھ جیسے حقیر آدمی بھی اس انقلاب سے متاثر ہوئے۔

ہر شخص [illegible] یہ کہہ احساس میں [illegible] کر دیا ہے تاکہ [illegible] نے یہ کہہ کر بٹھا دیا۔ اس سے ملو یہ ضمیر جان ہیں۔
[illegible] کے قدموں میں۔ میں آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے بالکل میرے جیسا انسان کھڑا تھا۔ وہی قد و قامت، وہی جثہ، وہی
[illegible] یہاں تک کہ جب بولتا تو مجھے اپنی آواز سنائی دیتی۔ وہ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا۔ منعم نے
ضمیر جان کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہیں سیر کرائیں گے۔ ضمیر جان آگے آگے چل رہا تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہم ایک لق و دق
[illegible] ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ اس جھیل کا پانی گہرے سیاہ رنگ کا تھا اور اس میں سے ہیبت ناک شور اٹھ رہا تھا۔ کی
[illegible] ضمیر جان میری طرف دیکھ کر ایک دفعہ پھر مسکرایا اور بولا "یہ دریائے ہمک ہے۔ ڈرو مت! میں تمہیں اس
[illegible] چھوڑ گا۔" اور پھر جیسے اس نے مجھے ایک ہاتھ پر اٹھایا اور نہایت اطمینان سے جھیل کے پانی میں سے گزرتا ہوا دوسرے
[illegible] پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے مجھے پھر خشکی پر رکھ دیا۔ لیکن یہ عجیب قسم کی وحشت ناک خشکی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ ہونے کا اس
[illegible] مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ اس خشکی (زمین) پر بہت سے سانپ رینگ رہے ہیں۔ میں گھبرا کر ضمیر جان سے چمٹ گیا۔ ضمیر
[illegible] نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں۔ میں بھی تمہارا انتظام کرتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر اس نے ٹکلی سے زمین میں شگاف کیا
[illegible] شگاف اتنا بڑا تھا کہ میں کھڑا کھڑا اس میں داخل ہو گیا۔ مجھے شگاف میں سے اوپر سب کچھ نظر آتا تھا لیکن میں رینگتے ہوئے
[illegible] سے باہر ہو گیا۔ وہ سب بھی اٹکھیلیاں کر رہے تھے بلکہ ان کے ساتھ بڑے بڑے اژدہے بھی شامل ہو گئے تھے اور پھر سب دیکھتے
[illegible] ان پر عجیب الخلقت جانور جمع ہونے شروع ہو گئے اور ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ہزاروں نہیں کروڑوں تک پہنچ گئی۔ یہ عجیب عجیب
[illegible] تھے۔ ایک دوسرے پر کھڑے ہو کر ناچتے اور جب ایک دوسرے سے ٹکراتے تو شہاب ثاقب کی طرح آگ کی لکیر دار چنگاریاں
[illegible] نکلتیں اور پھر یکایک گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی اور ساری فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔ جانوروں نے ناچ بند کر دیا اور ان کا سانس جہاں کا
[illegible] گیا۔ دفعتاً ایک کانپتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ زمین کے ماحول پر چیخیں کھینچتی ہوئی بلند ہوئی:

"کیوں تم نے انسان کو راہ ضلالت دکھانے کے لیے یہ کارنامے سر انجام دیے ہیں؟"
اور پھر جیسے ہوا بھی چلنے سے رک گئی تھی۔ کہیں سرسراہٹ کا بھی نشان نہ تھا۔ ایک دفعہ پھر وہی آواز گونجی۔
"ابلیس کے بچے ہو یہ کیوں نہیں؟ میں تم سے مخاطب ہوں۔"
ایک جانور [illegible] آگے بڑھا اور بولا۔ "حضور میں نے ابن آدم کو جوا کھیلنا سکھایا۔ یہ دیکھیے یہ میرا تازہ ترین شکار ہے۔
[illegible] سب سے بڑے قمار خانے میں کار و بار میں اپنی جائیداد ہار کر خودکشی کر لی تھی۔" جانور نے ایک
[illegible] آدمی کا سر اوپر کھینچا جس کی پیشانی سے گولی گزرنے سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا کہ ایک
[illegible] ہیبت ناک کے ساتھ اس طرح گولی کر مقتول کا سر جانور کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر سمندر میں جا گرا۔ جانور زور زور
[illegible] کر [illegible]

"تم جیسے ہلاک ہو گئے ہم تو اس کو اب تک پہنچ کر خودکشی کر سکتے ہیں اور کتنے آدمیوں کے پاس اتنا وافر روپیہ ہوتا
ہے۔ وہ جوا کھیل سکیں۔ بہت سے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہ طریقہ کافی نہیں۔" دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" جوا

جس سے ایک تیز دھار کی سیاہ تلوار بننے لگی کاشت چلی گئی اور اس کے اندر جلی ہوئی زمین پر بکھر کر لٹک گئے۔

سیاہ آواز پھر آئی۔ ”ہے کوئی میرا شاگرد جس نے علم ابن آدم کو دیکھا ہو جس کا مزہ قدرت نے دیا کیا؟“
ایک اور بڑا گروہ آ رہا تھا۔ ”حضور میں نے انسان کو شر کی بڑی سخت اور دو مسئلوں پر لکھا ہے کہ وہ سب سے کم انسان پرست ہو کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس سیاہ کاری کی تہ میں سے انسانی معاشرہ برباد ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ ان گھروں میں جہاں اس کی دولت ہے وہاں ایک مسئلہ کم کم اور ایسا ذہنی وصال کرنے کے بجائے ایک دوسرے انسانوں کو شراب کے نشے میں مستقل کئے دیتا ہے۔“

ہیبت ناک آواز پھر بلند ہوئی۔ ”تم کچھ ہو۔ تم سے نا بلد شاگردوں نے مجھے ابن آدم کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ شراب عام ہے لیکن انسان ابھی ہمت سے کام لے کر نفس کے چور کو پیچھے دھکیل رہا ہے۔ کلبوں کی بات چھوڑو۔ وہ ہر ملک میں عام ہیں جہاں پینے والوں کی کثرت دھوپ اور کرب میں پیتی ہے اور منہ چھپا کر پیتی ہے۔ اس سے دولت مند انسان بھی گھرو نہیں ہوتے اور بھی گمراہ کہاں ہوتے ہیں۔ وہ وقتی اور نسلی میں گرفتار ہو کر بہت جلد اپنے معاشرے سے رخصت ہو جاتے ہیں پھر اس سے انسانی معاشرہ کیسے بھاری و سیاہ ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسی بات اور ایسا کمال بتاؤ جس سے تمہارے شاگرد انسان مستقل حد پر فساد اور میں مبتلا ہو جائیں۔“

سب ہزاروں حیران اور چپ تھے۔ میں نے دیکھا ضمیر جان مسکرا رہا تھا اب اس نے بھی ایک لمبے کالے دھاریں وہ کہہ اٹھا اور بولا ”استاد! اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟“

”بولو“ فضا میں سیاہی بکھیرنے والی آواز سنائی دی۔

ضمیر جان نے کہا ”حضور میں نے پیر سالوس حیات کو تربیت دی ہے۔ جب وہ پیر شری اور علم و فضل کے فرائض اپنی زندگی میں ناکام رہا تو میں نے اسے شخصی راہ دکھائی اور اس پر یہ واضح کر دیا کہ وہ انسانوں کو اس امر کی تلقین کرے کہ دنیا کی کامیابی حیات ہے اور مرا… صرف ذہنی انسان کو کرتا ہے جسے ایسا عہدہ یا مرتبہ مل دیا جائے جس سے فرائض منصبی ادا کرنے کی وہ بالکل اہلیت نہ رکھتا ہو۔ مثلاً جیب کترے کو پولیس کا افسر بنا دیا جائے یا استاد کو گدھے ہانکنے پر لگا دیا جائے تو انسانی معاشرہ میں وہ ابتری پیدا ہوتی ہے کہ اسے دور کرنے کا حل مشکل سے بھی انسان کو نہیں سوجھتا۔ خود پیر سالوس حیات مرا… کرتا ہے اور اپنے مریدوں کو بھی یہی تلقین کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ کس قدر سے میں ہیں لیکن انھوں نے انسانی… میں وہ آگ لگا دی ہے کہ جلنے دیجئے۔ یہ دیکھئے پیر سالوس حیات کا گندہ…۔“

اور یہ کہہ کر ضمیر جان نے جیب سے… نکال کر اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر… سامنے پیش کر دیا۔

پھر ایک مہیب قہقہہ سنائی دیا۔ ”شاباش! شاباش!! میرے عزیز شاگرد تم نے نہایت صحیح راستہ دریافت کیا ہے۔ انسانی معاشرہ میں ابتری پھیلانے کے لیے اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں کہ عہدے اور منصب نا اہل لوگوں کے سپرد کیے جائیں۔ شاباش“ مہیب آواز نے ضمیر جان کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور ضمیر جان اس داد سے اس طرح اترا کر…

جیسے جتا کا لہو چینچ کر پیا۔

میں نے دیکھا کہ خواجہ غلام خان میرے سرہانے کھڑا مجھے جگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے: "اُٹھو تم تو دُودھ پی کر یوں پڑے ہو جیسے قیامت تک نہیں جاگو گے۔ پیر سالار حیات کی خدمت میں حاضر ہو، سنا ہے تو شب بیداری کی عادت ڈالو کیونکہ فیض کا وقت ہوتا ہے جب یہ خلوت سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔"

صندل میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اب میں نہ آپ کے گھر میں آؤں گا، نہ غلام خان یا پیر سالار حیات کے قریب جاؤں گا۔ یہ میرا آخری ڈرافٹ ہے جو تصویب کے لیے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں بازار سے چنے وکرہ ہوری کی صندوقوں میں بیچا کروں گا۔ آپ کی دُعا سے مال روڈ کے پیسے پیسے مل جایا کریں گے۔ اس آخری عمر میں مجھے اور کیا چاہیے۔

نیکا

جیلانی بانو

نیکا، تم اتنی اُداس کیسے ہو گئیں ۔۔۔؟

آہ تم سے بتانے کو جی چاہتا تھا ۔۔۔۔ پہلے کبھی میں [illegible] سوچ رہی ہوں کہ میں اتنی اداس کیسے ہو گئی ۔

میری جوانی، میرا پیار، کب کہاں گئی ۔۔۔ بڑھاپا کیسے قریب آیا ۔۔۔؟

مجھے کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

ابھی [illegible] کا مہینہ چل رہا ہے۔ میرے پڑوس میں رہنے والی لڑکی اپنی کھڑکی میں [illegible] رہی ہے ۔۔۔ میں نے

[illegible] کے ہاں سے منگوا لیا ہے :

[illegible]

[illegible] نہیں ہوتا۔

[illegible]

آج مجھے بہت سی پچھلی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

[illegible]

نی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی زندگی گاؤں میں گزاری ہے۔ سندھ کی کہانیوں اور نظموں میں یہی باتیں دوہرائی جاتی ہیں ——— لیکن
کی قدر شہر والوں سے زیادہ ہے ——— بارش تو جیسا بتاتے ہو ہوتے ہیں یاد کرتی کہ اس نے بلایا ہو۔ سندھ کی ہر چیز سے زیادہ مجھے
پپیہا کیا ——— گھر ہمارے گاؤں میں ہماری [illegible] یہ خوف تھا رہتا ہے کہ کہیں ماں کی بیٹی ماں باپ کے گھر جوان نہ ہو۔ پہلے
ہوتے وقت وہ ان کے ساتھ ہی کسی لڑکی کی قسمت نہ بیٹھ جائے۔ میرے ماں باپ نے بھی اسی لئے جلدی کر دی تھی۔ جبھی تو تیرہ برس کی ہو
میرے ساتھ بیاہ کی [illegible] تھی ——— میں پپیہا کو یاد کرنے لگتی ہوں۔ جب سے گاؤں چھوڑ کر میں ان کے ساتھ شہر آئی ہوں، مجھے
برسات میں پپیہا بہت یاد آتا ہے۔ شہر والوں کے لیے تو برسات ایک عذاب ہے۔ بارش کی قدر تو ان گاؤں والوں سے پوچھو جو زندگی
بھر دانے دانے کے لیے آسمان پر تکتے ہیں۔

میرے میکے کا گھر کتنا بڑا تھا۔ پورے گاؤں میں اس سے اونچا گھر اور کوئی نہ تھا۔ لیکن جب بیشتر چاچا گاؤں میں ایک کچی
[illegible] جا کر ہوئے تو انہوں نے ہمارے گھر کے سامنے ایک بہت اونچا مکان بنوایا۔ اتنا بڑا کہ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ ہمارے
چاچا بڑے پیسے والے تھے۔ ان کے پاس بہت سارے باغ تھے۔ کھیت تھے۔ بیل تھے۔ اس لیے گاؤں کے ہر جھگڑے میں ان
سے پوچھ کر [illegible] سے چار بچوں والی بیوی کو گھر میں چھوڑ کر وہاں جا بسے۔

میری ماں [illegible] ہوں گی۔ بس ایسی ہی تھی کہ کبھی کے نام پر سارے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی تھی اور اپنے دولہا کے
ذکر پر جانے کیوں سارے بدن کا خون سمٹ کر میرے چہرے پر آ جاتا تھا۔

بیٹی کی شادیوں میں کوئی اتنی سیانی بیٹی کو گھر میں نہیں بٹھاتا۔ مگر میرے ابا (اب بھی کیا کرتے) اس سے پہلے وہ بیس بیس ہزار کے
کرو بیٹیوں کے دولہوں کا سوال کر چکے تھے۔ میرے لیے ایک اچھا سا دولہا ڈھونڈنے کو پیسہ جمع ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں میری ماں اور
باپ دونوں روز دیول میں جا کر دعائیں مانگتے کہ شاید بیڑی کے پتوں کی تجارت میں خوب نفع ہو کر میرا بیاہ ہو سکے
——— میں ان سے شہر میں کتاب لے کر بیٹھی رہتی تھی۔ مگر میرا من بھگوان سے لگ جاتا ——— جانے کیوں مجھے اپنے
بیاہ کا بڑا ارمان تھا۔ بڑی جلدی تھی۔ شاید میں اتنی جلدی نہ چاہتی اگر مجھے پڑھنے کے بہانے ماں باپ کے گھر پر نہ بٹھا رکھتی۔ میں جب
باتیں بکنے پر بھی یہ بات بکنے کی کوشش نہ کرتی کہ جب اٹھاتے ہیں تو ماں یہ کیوں چاہتی ہے کہ میں اب ان کے گھر سے ہی نہ
آؤں!

اور کوئی کیا جانے کہ کوٹھے پر بیٹھے بیٹھے میں کیا دیکھتی تھی ———؟

بیشتر چاچا کا مکان بالکل سامنے تھا۔ ہمارے کوٹھے کے سامنے والے کمرے میں وہ دونوں رہتے تھے۔ وہاں سے چاچا کا
دیا کے [illegible] دیکھ کر میں اب کی طرح تپنے لگتی تھی۔ مجھے یوں لگتا کہ اگر ذرا سا دھکا بھی لگا تو میں چٹان سے پھٹ جاؤں گی۔

پھر کتاب ایک طرف [illegible] کر میں اپنے دولہا کے انتظار میں کھو جاتی تھی۔ ماں باپ کے دل میں [illegible] کی طرح بنے سنورنے کے
ہزار [illegible] میں سجا لیے تھے۔ میں نے تصویروں کے [illegible] ویسے ہی سوچ رکھے تھے جیسے [illegible] ماتا پہنتی تھی ———
لیکن [illegible] تھی۔ [illegible] ہو جاتی۔ میں نے اپنے گھر میں کسی عورت کو اتنا سجتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا

بہنیں بھی سسرال جاتی تھیں تو سسکیاں لیتی ہوئیں۔ رستے کاٹتی تھیں تو آنکھیں لال ہوتی تھیں ——— میاں اللہ [illegible]
پہلے قصے چھپتے ہیں گھر میں رہنے والی شریف عورتیں باہر نہیں ہنستیں۔ ایک بار میں نے ان سے یہ بات پوچھی [illegible]
میرے ایسے سوالوں پر وہ ہمیشہ غصّہ بھری نظروں سے مجھے دیکھتی تھیں جیسے کوئی بے ادبی ہو گئی ہو [illegible]
ابھی دماغ سے نکل گئی تھیں۔

میں چپکے سے پاس بیٹھ کر ان کے چہرے کو دیکھتی رہتی تھی جب ہیشم چاچا اپنے ہاتھ سے [illegible]
ایک بار انہوں نے رتنا کے جانے میں بیٹھ سہائی تھی ——— پھر میں جلدی کو منڈی ہو کر نیچے اترتی تھی تب سے سنتا چاچی کو [illegible]
بات یاد آجاتی ——— جوانی میں عیش کریں جوانی دیوانی۔ بڑھاپے میں کمبخت بھنک جاتی ہیں۔ مرتے وقت کوئی پاس [illegible]
نہیں ہوتا۔

سنتا چاچی چاچا کے جیتے جی اکیلے گھر میں پڑی رہتی تھیں۔ وہ بات چھپتے چھپاتے کہہ گئی ہیں۔ [illegible]
گئی ہے۔ مگر وہ ہر بات سے بے خبر بھینس کا دودھ دوہ رہی ہیں۔ آنکھیں بچھڑے کے چرنے سے نظریں بند کیے ہیں۔ [illegible]
دھو رہی ہیں۔

ان کہتی تھی کہ جب سنتا چاچی بیاہ کر آئی تھیں تو ان سے زیادہ سندر لڑکی پورے گاؤں میں اور کوئی نہ تھی۔ [illegible]
عورتیں ان کے شوہر کے جلنے پر سے کر دیکھ کر سوچتی تھیں کہ ہیشم چاچا نے سنتا چاچی جیسی بیوی کیا پتہ کیسے پا لی [illegible]
آ جاتا ہے جب کہ اچھی بھلی چاچی کو ایسا بدصورت بنا دیا اور اس طرح اپنی رتنا کو پسند کر دیا ہے۔ رتنا کو چاچا نے چاچی کب بنا لیں گے؟ [illegible]
پہلے پہلے اپسرا لگتی تھی۔ میں نے اتنی خوبصورت، ایسی ہنس مکھ عورت پھر کہیں نہیں دیکھی۔ ویسے ہنس مکھ عورت تو شاید [illegible]
ہی نہیں ہو!

مجھے اس دن کا انتظار رہتا جب میں ایک دن رتنا کو بیک کا ٹھیکرا ایسے ایک اندھی کھائی میں بتاؤں گی۔ وہ مجھے [illegible]
اسے کی تو میں نفرت سے منہ پھیر کے کہوں گی ——— کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ میری چاچی کو رولا کر ساری زندگی ہنستی رہو گی؟

ایک بار اس نے دور سے رتنا کو دیکھ کر کہا تھا۔

"تم بھلے اچھی خاصی صورت شکل کی ہے مگر کیسی اپنی مٹی پلید کر رہی ہے!

اس کی بات سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا تھا۔ اب میں اس سے کیا کہتی کہ ذرا کرشنے پر چل کر تو دیکھو۔ مگر جب رتنا کا [illegible]
رہی ہے تو سوکھ کس چیز کا نام ہے ——— ؟ پھر میں چاچی کی دہری میں لگ جاتی تھی جو اپنے دھان پان بدن کی [illegible]
نکال کر لیلے اوپلوں کو تھپ تھپتی تھیں۔

اس بات کے کئی مہینے بعد ایک دن میں نے سامنے دیکھا تو جیسے دھک سی لگ گئی۔ رتنا جیسی سندری ویسے پیاسے [illegible]
کھڑی تھی کہ دس گز دور سے ہی ایک دم اس پر نظر پڑی۔ میں نے اس کے لیے جتنی نفرت جمع کی تھی وہ جانے کہاں غائب [illegible]
اپنے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ ہمارے گاؤں کی لڑکیوں نے بھی زندگی کے اس کام کے لیے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے وہ [illegible]

پہنے ساتھ والی تھی۔ کوئی اس کے گھر دیتا تھا۔ مگر تب وہ اچانک اسے یوں تنہا دیکھ کر مجھے اُس پہ بے حد ترس آیا۔ پھر جب اُس نے سے بے کچھ پا کر میں اُس کے پاس تو اُس تب مجھے دُنیا کی بہت بڑی دولت مل گئی۔ اسے قریب سے دیکھنے اور چھونے کی تمنا بچپنے سے میں اپنے دل میں دبائے بیٹھی تھی۔

میں تیزی سے نیچے بھاگی، جہاں چولہے کے پاس اماں بیٹھی سنتا چاچی کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

"اماں ـــــ اماں وہ ماما ہے نا ـــــ وہ ـــــــ"

"چُپ ـــــ چُپ ـــــ" اماں نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"کیسی کنواریاں رنڈیوں کا نام لیتی ہیں! تیری آنکھیں پھوڑ دوں گی جو تُو نے پھر کبھی ماما کو دیکھا۔ چل جلدی سے چولہا سلگا"

میں سہم کر دوپٹے سے چپٹ گئی۔ اچانک مجھے احساس ہُوا کہ اماں نے مجھے پاپ کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا ہے۔ اگر میں ماما کے پاس چلی جاتی تو ـــــ! وہ مجھے چھو لیتی تو ـــــ میں جو بندگی کی طرح پاک ہوں۔ راجا سے بہت بلند ہوں۔ پہلے میں بھی ہوں گندگی ناقوں سے بھرا ہو۔ کسی کو کیا پتہ ـــــ!

"ارے سنتا! صبر کر بہو۔ بھگوان پاپ کی سزا یہیں نہ کچھ سنسار ہی میں بھی دیتے ہیں۔" اماں چاچی کو سمجھا رہی تھیں۔

"بھابی! یہ چڑیلیں کچھ دوا کھلا دیتی ہیں کہ آدمی اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھتا ہے۔ ان کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔" چاچی نے آنسو پونچھے

میں نے مہاشے کی بھابی پنچھے تیں سوچا کہ سنتا چاچی اپنے پتی کو قصور وار کیوں نہیں ٹھیراتیں۔ دیوانہ بنانے کی جو دوا ماما کے پاس ہے وہ دوا چاچی کو کیوں نہیں ملتی! میں یہ بات آگے بڑھ کر اماں سے پوچھنے والی تھی۔ مگر ان کا غصہ یاد کر کے پیچھے ہٹ گئی۔

"ابھی بھگوان کے باندھے ہوئے بندھن بھی کہیں ٹوٹتے ہیں۔ چار دن عیش کر کے گھر میرا پتی لوٹ آئے گا ہی تو یہ بات ہوگا" چاچی نے بس فخر سے کہا اور آنسو پونچھ کر بیٹھ گئیں۔

"کیوں ـــــ بھابی میں کیوں نہیں ـــــ؟" میں پھر چاچی سے پوچھنے لگی اور جلدی سے اپنا پانی دار تڑپ پکڑ کے بیٹھ گئی۔

بڑی بہو کی کتنی سیدھی ہیں۔ جانے کس نے ان کے دل میں یہ بہت سی باتیں بٹھا دی ہیں کہ میں ان چیزوں پر یقین جیسے بیٹھی ہیں۔ سُنا ہے جب مُنّہ چاچا اس کسبی کو لائے تو چاچی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ چاچا سے بھی نہیں۔ جنھوں نے ان کی شادی کے زیورات تک اس کسبی کو دے دیئے تھے۔ بڑی خاندانوں میں کسی مرد نے ایسی جرأت نہ کی ہو گی۔ کیونکہ رشتے کا پورا معاملہ اس کی داد دیتے ہیں مگر چاچا کو شاید بس یاد دوا ـــــ!

آج پچاس برس بعد بھی وہ دن میری آنکھوں میں روشن ہے ـــــ

کہتے ہیں مرنے سے پہلے سوئی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ شاید موت میرے پاس آ رہی ہے۔ آج ماما نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں وہی مُورکھ ہوں ـــــ یہ کہتے وقت وہ کیسی حقارت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آخر میں نے اپنی جوانی کیوں گنوا دی ـــــ بیوں سے ماما کر گیا ہے!

گاؤں ——— میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

——— [illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ؛

شاید سب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے ساتھ جاتی تھی تو میری ساس چلاتی ؛

[illegible] ہر وقت آئینہ میں [illegible] ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جاؤ [illegible] تھی۔ میں کتنی خوش قسمت تھی۔ [illegible] سب کچھ [illegible] ۔

پانچ برس بعد تینوں بچوں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اٹھانی پڑتی ہے۔"

بیگم صاحبہ معصوم بچہ کو چھوڑ کر [illegible] چلی گئی ہے۔ اس لیے دادا پاپا انہیں چھوڑ کر ایک دوسرے سیٹھ کے پاس چلی گئی ہے۔
[illegible] نے اسے طلاق دے دی تھی۔ پاپا پھر بہت [illegible] گئے تھے مگر اس سیٹھ کے ساتھ جیسے کوئی ملک فتح کر کے لوٹے ہوں، وہ رات چاچی [illegible] پھر آگئی تھی۔ وہ سدا کے کالے کے بر تو پھینک دیتے تھے۔ چاچی چاروں دم سادھے سر اٹھائے سارے گھر میں دوڑتی پھرتی [illegible] بجھی بجھی سی [illegible] کر دیکھ کر اپنی بیٹی کو میری پناہ میں لے آئیں۔

مجھے
بیگم چاچا کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ میں تو سمجھتی تھی وہ اب زندگی بھر چاچی کو صورت دکھائیں گے۔ اپنے کیے پر ہمیشہ پچھتائیں چاچی اپنے پتی کے واپس آنے کی خوشی میں دیوالی منا رہی تھیں [illegible] کے ساتھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے دیوار کے پاس کھڑی تھی۔ اتنی خوبصورت جیسے جگنو نے کوئی روپ دھار لیا ہو۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تو میں گھبرا کے پیچھے کو ہٹ گئی ـــ وہ سا جا رہی تھی ـــــــ ستی ساوتریوں کی طرح سر پہ پلو ڈالے نگاہیں جھکائے، جانے وہ جگنوؤں سے کیا مانگنے آئی تھی؟ شاید اب اپنے بڑھاپے کی فکر ہے۔ اولاد کی کمی محسوس کر رہی ہوگی۔ گزرے دنوں میں اس نے اپنی عمر کیا ادھوری [illegible] تھی۔ بکھلے مہینوں کی طرح شاداب تھی [illegible] ابھی [illegible] اس کا [illegible] کر دو دعا ابھی اپنے اصول بدل کر جیت اس کی تمنا پوری کر دیں۔ اسے دیکھ کر میرے من میں آگ سی [illegible] جگنو اپنے چیلے کی سرکاب دیں گے؟ یہ کب تک [illegible] ہونے کی۔
وہ پوجا ختم کر کے میرے پاس آئی، تو چاروں طرف پھول سے برسنے لگے۔ اپنا بچہ ـــــ جگنوؤں کے سامنے بیٹھا رہے [illegible] میں یہ کتنا سا خیال ابھرا کر رہا تھا ابھی ہے۔ بیکھے [illegible] ہی رہا ہے ـــــ ! ہاں، پھر سر جھٹک کر میں نے اس خیال کو دماغ سے دھیان میں دھکیل دیا۔

اس کے بعد جب میں سسرال گئی تو معلوم ہوا کہ چاچا پر ایک دن پھر [illegible]۔
انہیں مدراس کے ایک نواب کی [illegible] میں ملازمت مل گئی تھی۔ اب میں اپنی سسرال میں دو ایک چھوٹے سے گھر کی مالک تھی۔ بہت محنت کر کے چھوٹے اور [illegible] نکال دیا تھا۔ کیا بیٹیاں بھی بڑی ہو گئیں تھیں۔ اس اسکول کا امتحان دینے والی تھی جب میں [illegible] تھی پھر سالوں چاچی [illegible] کی ماں تھی تو [illegible] گئی تھی۔ شاید وہ جانتی بھی نہ ہوگی جب [illegible] کسی کام میں بچوں کو لگا دیتے ہیں۔ مگر انہیں اب کسی وقت فرصت ملتی تھی وہ گھر میں بیٹھے رہتے تھے [illegible] بہت [illegible] وہ شام میں بھی [illegible] بہت [illegible] کرتے تھے۔ پھر جب [illegible] نے میٹرک اسکول پاس کیا تو ہم نے [illegible] کے بیاہ کے لیے تقاضا کر دیا۔ اب تو وہ بھی اس بات سے مل گئی تھی کہ [illegible] اس وقت چاچی [illegible] پوچھا کرتی [illegible] تھا۔ [illegible] بہت [illegible] ہو گئے تھے وہ اپنی بیٹی [illegible]۔ مجھے [illegible] لیے۔ [illegible] کو بھی سمجھا کر دیا تھا۔ [illegible] کہتے تھے میری دل کی بات [illegible]۔ مجھے بھی [illegible] ہے۔ [illegible]
یہ [illegible] چیزیں کھا سکتی تھی۔
[illegible] کے دوسرے تیسرے دن سے آیا تو [illegible] تھا کہ [illegible] کے پاس سے گھر چلی گئی ہے۔ اس نے ایک [illegible] سے [illegible]

ہے۔ مجھے شک کہ [illegible] نہیں ہوتی تھی۔ سب [illegible] کو معصوم [illegible] پیش کرنے کی کوشش [illegible] ہے۔ [illegible]
ہے، مگر [illegible] [illegible] ہوتی ہیں [illegible] پیدا [illegible] ہیں [illegible] [illegible] تھا [illegible]
میں [illegible] تھی۔ میں [illegible] وہ [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible]
[illegible]۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible]
[illegible] کروں۔ [illegible] [illegible]
جس کو آج بھی اپنے طرف سے [illegible] سب میں بانٹ دیں گے۔

[illegible] آج [illegible] جب [illegible] ہے تو وہ [illegible] بیٹھے تھے۔ اس وقت میں نے [illegible]
[illegible] [illegible] اپنا گھر [illegible] گے۔ [illegible] بیٹے تو اپنے [illegible] ہیں۔ [illegible]
[illegible] بات [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] ہے [illegible]۔ وہ [illegible]
[illegible] [illegible] پر قدم رکھا۔

اب تو بیس برس گزر گئے اس بات کو ـــــــ جانے تو اس گھر کا بیٹا تھا بھی یا نہیں۔ میں کمرے میں [illegible] اس کی تصویر دیکھتی
ہوں تو تم کو پہچان نے سے رہے، [illegible] [illegible] [illegible] ایک دم [illegible] ہیں۔

تم نے پیار کر لیا تو مجھے [illegible] اور [illegible] سے کوئی امید نہ رہی۔ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] سے [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بیٹا ہو کے [illegible]
[illegible] [illegible]۔ [illegible] ہے۔ میں [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]۔ [illegible] [illegible] ہیں کہ [illegible]
[illegible] کوئی ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔

مجھے جانے کیوں اپنے گھر سے اتنی نفرت ہے؛ کوئی [illegible] تو [illegible] ہے۔ [illegible]
تو [illegible] ہیں۔ وہ کہتے ہیں تم اتنی [illegible] پر دل کیوں [illegible] ہو ـــ وہ کیا جانیں کہ یہ باتیں [illegible]
[illegible] ہیں۔ میں نے اس گھر کے [illegible] کتنی محنت سے [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible]
[illegible]؛ وہ کہتے ہیں کہ [illegible] [illegible] ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ [illegible] [illegible] ہے:
اب میں اکیلی اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔ شاید اب تو سب ہی اس بات کے منتظر ہوں کہ میں مرتے وقت اپنا خزانہ
کے حوالے کروں گی ـــ ؛ میرا سارا گھر اب اجنبی ہو گیا ہے۔ میں کس بات پر فخر کروں [illegible] شکایت کرنے [illegible]۔

"آپ ہر وقت سمجھانے کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہیں! آپ کہیں تو ہم آج ہی آپ کا گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔"
یہ سن کر میں سہم جاتی جیسے کہ کہیں یہ بات اس کے باپ تک نہ پہنچ جائے۔ وہ تو مجھ پر غصہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے
... وہ بھی کیا کریں ——— ایک بلا ہے جسے وہ اپنی کرخت آنکھ تو وہ نہ کماؤ بیٹوں کو ڈانٹ سکتا ہے نہ کمسن چڑھی بہوؤں کو
——— بس جیون اتنا لمبا کھینچ کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی مصرف کہیں نہ تھے۔

جب کوئی کام نہ ہو تو میرا دماغ ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ شاید ایسی بھی عورتیں دنیا
میں ہوں گی جو ہمیشہ سکھی رہیں۔ ہمیں تو کبھی چین سے سونا بھی نصیب نہ ہوا۔ میرے پوتے ہنس کر پوچھتے ہیں کہ پیاری دادی اماں (
اماں) خوش کہاں ہے۔ ہمیں کب ملو گی!
اور میں آنسو پونچھ کر سوچتی ہوں کہ میں کتنی منحوس ہوں۔ میں نے اپنا خزانہ کیسی لاپروائی سے لٹا دیا۔ کچھ بھی تو بچا کر
نہ رکھا۔

آج مجھے یہ سب باتیں کیوں یاد آ رہی ہیں ——— ؟ کل میں شام کو ایک فلم کی شوٹنگ دیکھنے بہو کے ساتھ
گئی تو مجھے کچھ بھی یاد نہ آتا۔ میں روز کی طرح کسی نہ کسی طرح سو ہی جاتی۔ آج بہو کی چھوٹی بچی کو سنبھالنے کے لیے میں اس
کے ساتھ ایک فلم اسٹوڈیو میں گئی تھی کیونکہ مجھے بچپن ہی سے سنیما دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ میرا بیٹا فلم بناتا ہے اس لیے ہم بڑے
ٹھاٹ سے وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں وہاں گھوم رہی تھیں۔ مگر ایک لڑکی کے پیچھے تو ساری خدائی لگی
ہوئی تھی۔

میری بہو نے چپکے سے مجھے بتایا کہ یہی وہ مشہور ہیروئن ہے جو دس ہزار روپیہ فی فلم سے کام کرنے آئی ہے۔
"مگر اس کی صورت میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ اتنا روپیہ کماتی ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
"وہ اداکاری کی دولت ہے ——— " میری بہو نے کان میں کہا۔
"اری ماں یہ بچاریاں کیا جانیں کہ ناز ——— ان کی اپنی ادائیں ہوتی ہیں چالاک۔ انھیں اداکاری سے کاری کا کر
دیکھانے کا شوق ہے۔"
آخر وہ ہیروئن شوٹنگ کی تیاری کے لیے ایک خوبصورت سی کار میں آ گئیں۔ سب کھڑے ہو گئے۔ پروڈیوسر نے خود بڑھ کر دروازہ
کھولا تو وہ اتریں۔ پھر سامنے کا نظارہ دیکھتے جواب دیا ——— یوں جیسے کوئی مہارانی چلی آ رہی ہو ——— بے حد قیمتی ساڑھی
پہنے۔ کپڑوں پر ہلکے ہلکے ——— لوگ جلوس سا بنا کر ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور وہ بی بی کسی ملکہ کی طرح آ رہی تھیں۔ جب وہ
میرے قریب سے گزریں تو میں چونک پڑی۔
"ماہا ——— ماہا ——— !"
ماجانے کس طرح آنکھ کے آگے مجھے نہ جانے کیا دکھا ——— جو بہو نے کچھ پکڑ کر مجھے سنبھالتی، مسکراتی ہوئی وہ
ہر طرف پھیل گئی ———

• تم ——— تم تھکا ہو ——— اتنی بڑی عمر کیسے ہو گئیں ——— ؟

(معصومہ کمرے میں بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی ہوں کہ اتنی بڑی عمر کیسے ہو گئی ——— یہاں تک کہ گیا بھی ——— ؟

بہادر

مسعود مفتی

فرخ بھیا ہندوستان سے بہت خفا تھے۔

وہ ہندوستانی وزیر اعظم شاستری اور وزیر دفاع چاون (جسے وہ "وزیر جنگ اور جھوٹ" کہتے ہیں) کو اپنا ذاتی دشمن سمجھتے تھے کیونکہ ہندوستان صرف پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ صرف فرخ بھیا کے خلاف تھا۔

وجہ یہ ہے کہ ان دنوں چاندنی بیگم سے بڑی سرعت سے کورٹ شپ فرمانے میں مصروف تھے۔ جہاں مشرق اور مغرب کی روایات کا امتزاج ہو وہاں ترتیب میں تھوڑا الجھاؤ آ جاتا ہے۔ زیر نظر فقرے میں خالص مغربی روایات کی مرید تھیں اس لیے کورٹ شپ کے دوران میں گھبرا کر رہی تھیں۔ بظاہر تو بھیا بھی مشرقی لحاظ سے شرماتے تھے اور مغربی بننے کا ارمان دل میں رکھتے تھے۔ مگر جب کورٹ شپ شروع ہوئی وہ خالص مشرقی انداز میں ظاہر ہوئے۔ منگنی کے قریب ہونے کا فخر میں پیدا ہو تو وہ بے ساختہ عاشق ہو گئے ——— اس کے دوران وہ کہتے تھے کہ میں کورٹ شپ کر رہا ہوں مگر دراصل ترتیب اُلٹی تھی اور کورٹ شپ اُن سے کھیلنے میں مصروف تھی اور وہ تو پہلے ہی عاشق ہو چکے تھے۔

بہرحال اس عمل کی ایک کڑی یہ تھی کہ بھیا نے ایک طرز سازش کی تھی کہ وہ چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شالامار باغ کے مہمد میں فرخ سے ملے ہوں گے۔ مگر بے تکلفی کے شاید پر [illegible] (وزیر خارجہ نشانے پر تھے (——— اور ——— اور خسارہ علی الترتیب) تو شاید کے دوبارہ دنوں میں فرخ سے وہ پہلے ملاقات دیکھنے تصور پائیں گے۔ اس کے بعد اس کے چچا خسر انہیں سیالکوٹ مزید دعوت کریں گے اور وہیں پر وہ شادی کی تجویز پیش کر دیں گے۔ اس لیے پانچ ستمبر کی رات کو وہ بہت خوش و خرم تصورات کے ساتھ سوئے تھے اور پہلی [illegible] سامنے صورت میں ان کو اچھی کل نظر رہی تھیں۔

مگر چھ ستمبر کی صبح کو نقشہ بدلا ہوا تھا۔

شالامار سے منسلک جو خیالی محل پر وہ بنا چکا تھا وہ [illegible] کے باغات گردباری۔ ہوائی جہاز اور بمباری کی زد میں تھے اور تین دن بعد سیالکوٹ والے چچا بموں کی بوچھاڑ سے گھر رہے تھے۔ ستمبر ختم ہونے تک یہ تھا کہ اس دن بھیا نے فرخ کے سامنے تجویز کی کہ وہ بہو ہم [illegible] راولپنڈی یا کراچی یا پشاور چلا جائے تو [illegible] شروع ہو گئے۔ تب مکھن نے ذرا اندرونی [illegible] جانے کی تجویز

٭ روزنامہ مشرق میں شائع ہونے سے قبل [illegible] ہے ——— [illegible] سرحد [illegible] پاکستانی فضائیہ کے حملوں سے دشمن کے جہاز اور ٹینک تباہ اور وہ بالکل [illegible] ہو گئے

٭ مصنف کے چچا زاد بھائی

کی کہانیوں اور سرگرمیوں پر تبصرہ کرنے لگے۔ ان سب باتوں سے بیتا کو یقین تھا کہ ہندوستانی عورتوں کا کتنا کمانے کا [illegible]
نسخہ غلطی کی طرح دوسری چیزوں کی طرح ہندوستانیوں کی فہرست میں بھی جگہ رکھتی۔ وہ سمجھتے کہ بیتا وہاں پہنچ گئے ہیں جو [illegible]
کا مگر وہ وہاں نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح بیتا ہندوستانیوں کے اندر رہتے ہوئے جو سبھی گئے۔ مگر انھوں نے کبھی [illegible]
ہے وہ بیتا کا تجربہ بجا رہے۔ تو کیا انھوں نے ہر ایک سے پاکستان سے دشمنی کی۔ اور مشرقی پاکستان کو بھی بھائی چارے کا رشتہ دیا
رہے۔

بیتا کا یہ استدلال آپ کے لیے نئی چیز ہو تو ہو۔ جانتے ہیں ہرگز نہیں کہ بیتا ہمیشہ سے پہلے ہر چیز کا علم رکھتے ہیں یہ سمجھتے ہیں ہر دوسرے عیسا سمجھتے ہیں۔ اور اگر نہیں سمجھتے تو انہیں سمجھنا چاہیے ——— شوکس وغیرہ ہیں۔ اشتہ جیسا کہ انداز کی دکان میں جب کبھی کسی عورت کو تصویر دیکھتے ہیں تو چل جاتے ہیں کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں ——— بیتا کو پڑھے لکھے اپنے آپ کو سب بڑا انجینئر لیں سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ کہا بھی

"بیتا آپ اتنے بڑے انجینئر ہیں۔ مگر کبھی سمجھتے کچھ نہیں۔"

بیٹھ کر سے ذرا اوپر اشارہ کرکے ہنستے ہوئے بیتا کہیں ——— پھر انھوں نے [illegible]
کے رساوں کا کوئی معیار بھی تو ہو۔ اپنا نام گھٹیا قسم کے پرچوں میں دیکھ کر کسے اچھی لگتی ہے۔ ——

پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولے

"وہ اصل میں کل وہ بڑی خاص محنت کر رہے۔ جب یہ ذرا ڈاکٹر کو کہیں گے۔"

اسی طرح دستاویز میں کہیں بیل ہونے کا کوئی اتفاق بتاتے ہیں۔ سال کے سال یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں

"پنجاب یونیورسٹی میں سب سے بڑا خرابی یہ ہے کہ یہاں کوئی قابل شخص نہیں ہے ——— جب تک وہ میری بات نہیں سنیں گے
تب کیا خاک دیں گے۔"

انہیں یہ بھی دعویٰ ہے کہ تنہا ہر کوئی۔ تبھی ان کے قدر ان جیسا کریں۔ مگر وہ ذرا سا اشارہ بھی کر دیں۔۔۔ سمجھ وہ خود کوئی ایسا نہیں کرتے کہ کبھی انہیں ایک آدھ اپنی فہرست کی جگہ نہیں نظر آئی۔

کسی بڑے دفتر سے بیتا کہتے ہیں۔ "میں بھی تعلیم کے دستاویز میں جیتا تو منظور ہوتا۔ مگر میں بیتا ہی نہیں۔"

اسی قسم کا نعرہ ہیں وہ اور ان کمیونسٹوں کے پیچھے لوگوں سے بھی کہہ چکے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اگر عورتوں کے مقابلے میں پہنچ جانے والا عیسیٰ عالم سے بھی ملیں تو اسی قسم کی بات کہیں گے۔

شاید بہت ہیں۔ مجھے نفرت نہ ہوں مگر اعتراض ہے کہ میں کہ وہ بالکل اس گھوڑے کی طرح ہیں جو بیل گاڑی کے پہیے پر بیٹھ بہت خوش ہوتی ہے کہ میں سارا دھار بہی ہوں

بیتا کہتے اب بیتا شاعری کے منتشر شعر ہیں۔ جس نے ان کی شاعری کا اعتراف تو قبضہ ضائع کر دیا۔ ابھی تک انھوں نے ہیں بیتا کی عمر بات ان کی باتیں سنائی دیتیں اور سب مگر میں بیتا کی وقت انھوں نے پچھلا کی شاعری آنکھوں کو اچھا لگتے ہیں دیکھتے ہیں! ۔ پہلے صحت ۔

تی ہے۔ تو یہ تھی شاستری کی پالیسی۔ صدر ایوب خاں سے جہاں تک کہ بھی غیرت تھی۔ مگر وہاں تو نیا ہی ڈوب گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ جنگ کے
بعد سے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک اور زور پکڑ گئی۔ اور لوگوں کے نظریات بالکل بدل گئے۔ چنانچہ جب فلم ایکٹریس شمیم آرا نے اعلان
کیا کہ اس حالت سے شادی کروں گی جو بھی اور کشمیر پر پاکستان کا جھنڈا لہرائے گا۔ تو بچیا کی قدر بھی مغربیت ترک کر کے مشرقی ہو گئیں اور
نرگس شپ کی طرح سو تمبر پہننے پر آ گئیں۔ انھوں نے بھی اسی قسم کی شرائط کا اعلان کر دیا۔ آپ چاہے اسے عورت کی نقالی کہیں یا
جذبہ حب الوطنی۔ مگر بچیا صفوں ماتھوں میں پیش گئے۔ چنانچہ شاستری کے پیلے دشمن ہو گئے۔

خدانخواستہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ بچیا اس جنگ کو ذوق الٰہیہ ہی سمجھتے تھے۔ یہ اُن کے ساتھ بے انصافی ہو گی۔ کیونکہ اُن کا جذبۂ حب الوطنی
اسی شدت سے بیدار ہوا تھا ——— سب جانتے ہیں کہ بچیا کو پاکستان سے کتنی محبت ہے۔ کیونکہ یہاں کے لوگ عرصے اُن
کی خوش فعلیاں برداشت کرتے رہے ہیں۔ کہیں ایسا پیسے چاہنے والے شاید نہ مل سکیں۔ اس لیے وہ بھی سب کی طرح اس ملک کی حفاظت
میں لگے اور ملک کا جذبۂ حب الوطنی جوش سے بیدار ہو گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بچیا فوج میں بھرتی کے دفتر پہنچ گئے۔

یہاں یہ عرض کر دینا غیر ضروری نہیں ہو گا کہ مطلب جنگ ہوتے ہی بچیا نے فرض کر لیا تھا کہ وہ بہادر ہیں۔ ممکن ہے اس وجہ سے
کہ وہ ایک بہادر قوم کے فرد تھے۔ مگر وہ تو اپنے آپ کو فاتح حد تک بہادر سمجھتے تھے۔ اور خدا بھی تھے کہ اُن کی سابق لغزشیں یہ تسلیم کبھی نہیں
کرتیں اور ہم لوگ کبھی نہیں مانتے۔ ہم تو غیر مقبول اُن کے حسد کی وجہ سے نہیں مانتے تھے۔ مگر جب جنگ کے دنوں میں بہادری کے
کارنامے وغیرہ کی فہرست میں اُن کا نام نہ آیا۔ تو انھیں بہت دھچکا پہنچا۔ ہم سے خوشی بھی نہ ہوئی کہ اُن کا نام حذف ہونے پر ہمدردی نہیں
کی۔ بالآخر جب جنگ کے بعد صدر ایوب نے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر فضائیہ کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان کو تمغے نہیں
دیے۔ وہ بھی بہادر ہیں۔ تو بچیا کی کچھ تسلی ہوئی اور پھر جب صدر نے اسی تقریر میں کہا کہ جنگ میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کی
بہادری کے کارنامے دیکھنے والا کوئی موقع پر موجود نہیں ہوتا اور اس کی بہادری کا لوگوں کو علم نہیں ہو سکتا۔ تو بچیا کی باچھیں کھل گئیں کہ ان
کی بہادری بھی بالآخر تسلیم کر لی گئی ہے۔ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ جس وقت وہ صدر کی تقریر ریڈیو سے سن رہے تھے اس
وقت ساتھ ساتھ شیو بھی کر رہے تھے۔ انھیں کھٹکنے سے چہرے کی کھال ذرا سی کٹ گئی۔ اس حالت سے اپنے آپ کو جنگ کے بیسے خون بہانے والوں
میں شمار کرتے ہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ نہ جنگ ہوتی۔ نہ صدر ایوب تقریر کرتے اور نہ خون نکلتا۔

یہ ذکر تو ضمناً ہو گیا۔ اصل قصہ تو اُن کے فوج میں بھرتی ہونے کا تھا۔ وہاں جانے سے پہلے انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ بھرتی ہونے
جا رہے ہیں۔ لیکن واپسی پر کوئی اعلان نہ کیا۔ ہمارے پوچھنے پر صرف اتنا بتایا

"ابھی حالات اتنے نازک نہیں ہوئے کہ انھیں میری ضرورت پڑے"

اور پھر اور سوالوں سے بچنے کے لیے اخبار لے کر بیٹھ گئے

مگر بعد میں ایک اور دوست بھی اسی گروپ میں گئے اور بھرتی کر لیے گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ بچیا طبی معائنے میں کامیاب
نہیں ہو سکے تھے کہ ان کا وزن کم نکلا تھا۔ اور پورے دو گھنٹے سے پریشانی پر بحث کر رہے تھے۔

"ہوا یوں کہ جب وہاں سے گئے تو کئی لوگ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ مگر بھیا بھی پریشان ہو کر ... ۱۹
پہلے جب اندر گئے تو گھنٹے چپ چاپ رہے تھے۔ بیٹا خود ہی جاگا تھا مگر ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر ... کی
بیٹھ گئے۔ ڈاکٹروں نے یہ چیز بھی جذبے کی شدت پر محمول کرتے ہوئے دوا دی یا اور دوسری ...۔"

"ان کا وزن کتنا تھا؟" میں نے اس کے دوست سے پوچھا۔

"یہ صرف اس وقت ڈاکٹر بتا سکتا ہے جب ... ہو۔ مگر وہاں تو ... نہیں۔ اس لیے مجھے نہیں معلوم۔"

"بھائی کی یا فقل کتنی تھی؟"

"بس یوں سمجھو کہ خیرہ کر سکے گی ... پچھلے دو چار دنوں میں کام چل گیا تھا۔"

"اور قد کتنا لمبا تھا؟"

"ہمشہ کا استعمال کرنے کو تو کافی تھی۔ مگر لوگوں کے لیے کافی نہ تھی۔"

مگر چند دن بعد بھیا کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انھیں انقلاب کے اس طریقے پر اعتراض ہے ـــــ

"بھئی دیکھو۔ تمہارا دیا جانا ... بہادرانہ اور جذباتی ہو سکتا ہے!!"

جلسے سے پہلے بھیا کے دوستوں کی مشاورت ... میں ہوا کرتی تھی۔ مگر جلسے کے دنوں میں یہ ایک مجرمانہ ... کرتی تھی۔ پہلے سب لوگ اندر جا کر نماز پڑھتے۔ ... پھر باہر لان میں بیٹھ کر ... تبصرہ کرتے
اور ٹرانسسٹر ریڈیو سے خبریں سنتے۔ چنانچہ اس دن جب اکٹھے ہوئے تو بھیا بہت ناراض تھے۔ کہ انھیں اپنی بہادری دکھانے کا موقع
نہیں دیا جا رہا۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ وہ ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی سو نمبر بھی جیتنا چاہتے ہیں۔ مگر حالات ان کے خلاف
ہو رہے ہیں۔

"ابا جان: وہ وقت سے پہلے ... آگے آ گیا۔ تو جتنے لوگ شہید ہوئے ہیں۔ ان سب سے زیادہ ... کا ... پر
زندہ کا زندہ واپس آئے۔"

"ایسی ہیں تو جلسے کے بعد بھی ہو سکیں گی۔ ... اب آپ کوشش کریں کہ وہاں ... ہاتھ لگ جائے۔"
صاحب بولے۔

اتنے میں کسی نے ٹرانسسٹر ریڈیو پر ہندوستان کی خبریں لگا دیں۔ وہاں سے اعلان ہو رہا تھا کہ پاکستان نے ... اور
قریب ہو کر شتا رہے ہیں۔

بھیا غصے سے اُچھل پڑے۔ "اب ... ہیں نہیں سے تھے۔ تو انھوں نے ... کے ساتھ ... ـــــ
کچھ تو کام ہے ... ہے ... بہادری ہے۔"

مجھے یاد دلایا "مگر بھیا ... ابھی تو ... نہیں ... بہادری ... ہوتی ہے۔"

"... ہاں ... یہ بھی ... بات ہے کہ ... کے ... ـــــ ... تھا"

پہنا کر سکتے تھے جب تک [illegible] چھوٹا پاپا پاس پہنچ جاتا۔ اور میں اور آپ کی کشیدگی پیدا ہو جاتی۔"

[illegible] قسم کی بہت سی گالیاں دے ڈالیں۔ "پھر بولے۔

"[illegible] عمل کرتا ——— باقی کا اب تک سول ڈیفنس کی جو ہدایات شائع ہوئی ہیں ان پر تو سب لوگ [illegible]"

[illegible] بہت [illegible] درست تھی۔ [illegible] خوب عمل کر رہے تھے۔ [illegible] ایک آؤٹ میں کپڑے بھی کالے پہن لیتے تھے۔ ہر [illegible] خضاب سے کالا کر لیتے تھے۔ چہرے پر کالک صرف اس ڈر سے نہیں لگاتے کہ نشانہ نہ بن جائیں۔ اس لیے [illegible] دنوں میں استعمال کرتے تھے۔ لوگوں نے اپنی کاروں پر [illegible] بالکل معطل کر کے کار کے نیچے [illegible] اس طرح [illegible] تھی [illegible] کرتے ہیں۔ [illegible] کبھی نہ آتے [illegible] "کالا ہے کیا [illegible] ہے۔" لیکن اگر کبھی سفید [illegible] تو [illegible] ——— جیب میں [illegible] (فرسٹ ایڈ کے لیے) اور بمباری کے وقت دانتوں کے درمیان [illegible] رکھنے کو [illegible] ——— ایک جیب ریت سے بھری ہوتی۔ دوسری میں پانی کی چار اونس والی شیشی ہوتی۔ اگر ان کے [illegible] ——— ہر چیز کا امکان ہو سکتا ہے ——— سر کے بال [illegible] رہے تھے [illegible] ——— [illegible] کے جوتے پہنتے تھے کہ بمباری سے گرتی ہوئی بلڈنگ کے نیچے سے بھاگنے میں [illegible] ——— [illegible] سے [illegible] کالا کر لیا تھا

[illegible] ہم بھیا کو سمجھا رہے تھے کہ فوج میں بھرتی ہوئے بغیر بھی آپ خدمت کر سکتے ہیں۔ مگر وہ بہادری کے کارنامے [illegible] موجودہ حالات میں ممکن نہ تھا۔ [illegible] تو بھیا سخت [illegible] ہوئے تھے اور ناراض بھی [illegible] جب باہر نکلے تو دیکھا سڑک پر بہت سے لوگ [illegible] کر رہے ہیں اور اس پر پھبتیاں کس رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ [illegible] ساتھ ہی ایک [illegible] کو لوگوں نے کندھوں پر اٹھایا تھا۔ اور [illegible] تھے۔ اس نے [illegible] کو [illegible] سیسہ [illegible] تھا۔ یہ سب [illegible] پولیس [illegible] رہے تھے۔

مسٹر [illegible] بولے "بھیا۔ یہ بھی تو بہادری ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں کرتے۔"

بھیا [illegible] بولے "بہادری [illegible] ہے۔ مگر یہ تو ہر کوئی کر لیتا ہے۔ میں تو کوئی بڑا [illegible] کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد بھیا دو چار دن غائب رہے۔ اندازہ یہ تھا کہ وہ ہم سب سے ناراض ہیں ——— مگر ایک دن دیکھا تو سڑک [illegible] رہے ہیں۔

[illegible] صاحب بولے "بھیا واقعی بہادر ہیں ——— یہ اتنے دن اس لیے غائب تھے کہ محاذ سے آئے ہوئے [illegible] نے [illegible] سے [illegible] کالا [illegible] رہے۔"

[illegible] ختم ہونے تک بھیا [illegible] میں نہ [illegible] تھے اور [illegible] ہو گئی تھی۔ مگر [illegible] تو [illegible] بھیا نے [illegible] کی

"[illegible] جب وہاں سے [illegible] بیٹھے تھے۔ [illegible] بیٹا [illegible] ہو
[illegible] بیٹا [illegible] گیا تاکہ [illegible]
[illegible]"

"[illegible] کتنا [illegible] بہت سا [illegible] دوست سے [illegible]۔"

"[illegible] اس وقت [illegible] جب [illegible]۔"

"چاول کی پیالی [illegible]"

"[illegible] پہلے [illegible] کام [illegible] تھا۔"

"[illegible] چاول لگی تھی؟"

"[illegible] تھی۔ مگر [illegible] کے [illegible] تھی۔"

مگر [illegible] بیٹا [illegible] ہے ـــــ

"[illegible] بات [illegible] جا سکتا ہے!!"

[illegible] بیٹے [illegible] کی [illegible] تھی [illegible]
[illegible] سب [illegible] بات [illegible] سب [illegible]
[illegible] جب [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] ہیں۔ [illegible]
[illegible]

"[illegible] ۵۰۰۰ [illegible] ہے۔ [illegible] سب [illegible]
[illegible]۔"

"[illegible] بھی [illegible] گی۔ [illegible] بات [illegible]
[illegible]"

[illegible] نے [illegible]۔ [illegible] پاکستان [illegible] ہے
[illegible] ہیں۔

بیٹا [illegible] ہے۔ [illegible] تھے [illegible] ـــــ [illegible]
[illegible] ہے۔"

[illegible] ہے۔"

[illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] ـــــ [illegible]

[illegible] پہنچ جاتا۔ اور یہیں [illegible] کشیدگی پیدا ہو جاتی۔"
[illegible] بہت سی کہانیاں [illegible]۔ پھر بولے۔
[illegible] ——— [illegible] اب تک سول ڈیفنس کی ہدایات شائع ہوتی
[illegible]
[illegible]۔ [illegible] ایک وقت میں کپڑے کالے پہن لیتے تھے۔ سر
[illegible] تھے۔ [illegible] اس ڈر سے [illegible] نہ کیے جائیں۔ اس لیے
[illegible] کے دنوں میں استعمال کرتے تھے۔ لوگوں نے اپنی کاروں پر [illegible]
[illegible] تھے۔ اور بتیاں بالکل [illegible] کر کے [illegible] اس طرح [illegible] دی تھی
[illegible] ہیں۔ [illegible] کیا [illegible] ہے۔ لیکن اگر کبھی [illegible] بیٹھا تو
[illegible] ——— [illegible] تھے۔ (فرسٹ ایڈ کے لیے) اور بمباری کے وقت دانتوں کے درمیان [illegible] رکھنے کو
[illegible] تھے ——— ایک [illegible] سے [illegible] ہوتی۔ دوسرے میں پانی کی [illegible] شیشی ہوتی۔ اگر ان کے
[illegible] ——— [illegible] تھے
[illegible] ——— [illegible] تھے کہ بمباری سے [illegible] کے نیچے سے بھاگنے میں
[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ہم [illegible] آپ [illegible] سکتے ہیں۔ مگر وہ بہادری کے [illegible]
[illegible] تھے [illegible] تو بہت سخت [illegible] ہوئے تھے اور [illegible] بھی
جب [illegible] کر رہے ہیں اور [illegible] پریشانیاں کر رہے ہیں۔ معلوم [illegible]
[illegible] تھا۔ اور اپنا [illegible] تھے۔ اس نے [illegible]
[illegible] تھا۔ [illegible] پولیس [illegible] رہے تھے۔

[illegible] تو بہادری [illegible] آپ یہ کیوں نہیں کہتے۔"
[illegible] ہے۔ میں تو [illegible] کرتا ہوں۔"
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ہیں۔

[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ہے۔"
[illegible] تھی۔ [illegible]

جو ہمارا قوم دوست ہو سکتا ہے وہ [illegible] ایک ہندوستانی جاسوس لگتا ہے۔

"کچھ سمجھ نہیں۔ جواب دو تم ہی نے کہا"

"ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے لالہ۔ وہ مشکوک ہے۔ ضروری ہے کہ اس کو پکڑنے سے پہلے [illegible] ثبوت

کرو کہ وہ کس سے ملتا ہے۔ تاکہ اس کا گروہ پکڑا جا سکے۔"

وہ ان کے متعلق جو بتا کر پوچھ رہے۔

"مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ جاسوس ہے؟"

"بہت سی چیزوں سے ———— نمبر ۱

نمبر ایک ———— وہ شکل سے ہی جاسوس لگتا ہے

نمبر دو ———— ہمیشہ اکیلا رہتا ہے۔

نمبر تین ———— جہاں دو چار آدمی اکٹھے ہوں۔ وہ اُن کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے۔

نمبر چار ———— نام آدمیوں سے مختلف لگتا ہے۔ منا جاسوس ہے۔

نمبر پانچ ———— مگر وہ پہرا [illegible] کھیتوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ وہاں سے یقیناً [illegible] سے خبریں [illegible] ہو گا

نمبر چھ ———— سب میں [illegible] دماغ [illegible] ہوتا ہے وقت کبھی نہیں ہوتا۔ مگر [illegible] کام کرتا ہے

نمبر سات ———— مگر یہ شکل سے [illegible] تو یہ یقیناً جاسوس ہوتا۔

نمبر آٹھ ———— وہ بھینگا بھی ہے۔ اس لیے اس کی آسانی سے ایک طرف نظریں دوڑا کے جیسے دوسری طرف بھی

دیکھ سکتا ہے۔

نمبر نو ———— میں نے اسے بس سے اترتے ہوئے [illegible] دیکھا۔ [illegible]

گیا۔ سوال یہ ہے کہ [illegible] تو بس پر کیسے آ گیا۔

نمبر دس ———— اپنے گھر کو ہمیشہ تالا لگا کر رکھتا ہے ———— یقیناً اندر کچھ ہو گا۔

نمبر گیارہ ———— اگر وہ جاسوس نہیں تو [illegible] کیا ہے؟"

نمبر بارہ ———— اس کی . . . . .

"بکواس بند کرو۔" ماسٹر صاحب چلائے۔ "تمہیں یہ کہنے کا حق کس نے دیا؟"

اب ہم سب [illegible] ہو گئے تھے۔ وہ یقیناً جاسوس لگتا اور اگر جاسوس نہیں تو جاسوس کا [illegible] تھا۔

"میں پچھلے چار روز سے اس کا تعاقب کر رہا ہوں:"

ہم سب [illegible] کے قائل ہو گئے اور [illegible] پیش کش کی کہ سب کی ڈیوٹی مقرر ہو جائے۔ ہم چاروں [illegible] کے تعاقب میں [illegible]

ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی گروہ [illegible] ہو جائے۔ [illegible] کو [illegible] لگایا جائے۔

مگر جیا نے "تم سب بچے ہو۔ خواہ مخواہ کام بگاڑو گے۔ میں مناسب وقت پر تم کو ساتھ ملاؤں گا۔"

جیا نے جیمز بانڈ کی چند کتابیں پڑھی تھیں۔ اور شرلاک ہومز اور سیکسٹن بلیک کا نام بھی سن رکھا تھا ——— بس اسی وجہ سے [illegible] کرتے تھے۔ ہم نے بہت کہا کہ ہم بھی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ اور یہ کارنامہ اکیلے کرنے چلے گئے۔

جیا چلے گئے تو ہم لوگوں نے بڑی بے چینی سے انتظار کیا۔ جیا کی ضد پر افسوس بھی کیا۔ یہ بھی سوچا کہ چپکے چپکے پولیس کو اطلاع دے دیں۔ مگر آخر فیصلہ یہی ہوا کہ اگلی رپورٹ کا انتظار کر لیا جائے۔

مگر کافی دن تک جیا کی اگلی رپورٹ نہ ملی۔ البتہ اِدھر اُدھر سے جو حالات پتہ چلے وہ آپ کی خدمت میں عرض کر رہے ہیں۔

پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ اگلے دن وہ جاسوس کا تعاقب کر رہے تھے کہ اس نے ٹیکسی پکڑی اور ایک طرف نکل گیا۔ جیا بھی پیچھے جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ مگر وہاں کوئی دوسری ٹیکسی نہ تھی۔ یہ چوک کی طرف بھاگے کہ شاید وہاں سے کوئی مل جائے۔ مگر عین اسی وقت ہوائی حملے کا سائرن بج گیا۔ چشم زدن میں ٹریفک رک گئی۔ جیا کو بھی ایک خندق میں پناہ لینا پڑی۔

اب اس جگہ میں [illegible] کے وقت فضا میں ہوائی جہازوں کی لڑائی کو شوق اور [illegible] کیا کرتے تھے اور خندقیں خالی پڑی رہتی تھیں۔ اس لیے [illegible] خندق انہیں خاص مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگی۔ چنانچہ جیسے ہی جیا [illegible] ہوا کہ وہ ایک کتیا اور چار پلوں کے آرام میں حارج ہوئے ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جیا کتوں سے بہت ڈرتے ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ کتوں کا سرگرم ہونے کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں۔ اس ڈر کی بڑی پیچیدہ ہسٹری ہے۔ جب انہیں کسی ہندوستانی مصنف کے کتے نے بغیر اشتعال کے کاٹ لیا تھا۔ اور [illegible] جیا کی حفاظت بارہ چودہ انجکشنوں کے کورس سے کی۔ اس کے بعد سے جیا اس جنس سے اتنے ڈرتے ہیں کہ اگر کہیں نظر آ جائے تو [illegible] عجیب و غریب شکلیں بناتے ہیں کہ [illegible] ڈر لگتا ہے۔ ان کا فلسفہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ پورے کتے سے ڈرو ——— کیونکہ وہ نظر آئے بغیر کاٹ سکتا ہے۔ اور بھونکنے میں بالکل اچھا نہیں ہوتا۔

۲۔ [illegible] سے بہت ڈرو ——— کیونکہ اس کی موجودگی [illegible] نظر نہیں آئے گا۔

۳۔ کتیا سے اس سے بھی زیادہ ڈرو ——— کیونکہ ہر عورت کی طرح [illegible] سے ڈرتی ہے۔ چاہے وہ کتیا ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ بچے والی کتیا سے سب سے زیادہ ڈرو ——— کیونکہ اسے کتیا کی حمایت حاصل ہے۔ یعنی نمبر ایک اور نمبر تین مل جاتے ہیں۔

بہرحال اس دن جیا کو ایک طرف دشمن کے ہوائی جہازوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف بیک وقت ایک کتیا اور کئی پلوں کا۔

[illegible] کرنے میں خاص مدد ملی۔

اگلے دن جب ہم جیا کی عیادت کے لیے گئے تو [illegible] کی بجائے کتیا سے مقابلہ [illegible] جاسوس کیا شے ہے۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ خندق [illegible]

[illegible] سے بچنے [illegible] نہیں [illegible] کے لیے اتر آئے۔ [illegible]

دوسرے دن [illegible] ایک [illegible] جلسہ تھا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] بیا [illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہے کوئی ہندوستانی [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] ہندوستانی [illegible]؟ [illegible] بولی۔
بیا کو ابھی [illegible] قریب [illegible] رہے
[illegible] میں [illegible] ہوں۔
[illegible] ایک [illegible] صاحب [illegible] [illegible]
[illegible]

تب بیا [illegible] لگے۔ [illegible] مسرت سے [illegible] لگے۔ [illegible] کی
آنکھوں میں [illegible] تھا۔

[illegible] ایک [illegible] بولی

میاں جی۔ [illegible] ہے۔ آپ [illegible] میں تشریف رکھیں۔ میں [illegible] ہوں۔
بیا نے مڑ کر دیکھا تو ایک خوبصورت سی [illegible] کھڑی تھی۔ وہ ایک دم [illegible] گئے اور اپنے [illegible] کے
[illegible] لگے۔ وہ بڑی خوشی سے [illegible] رہے

نہیں آپ مجھے بتا دیجیے کہاں گیا ہے۔ میں ابھی [illegible] کر آتا ہوں۔
عورت بولی۔ نہیں آپ بیٹھیں۔ [illegible] گھر میں گیا ہے۔ وہ [illegible] والے ہیں۔
بیا خوشی خوشی اس کمرے میں بیٹھ گئے اور وہ [illegible] کا پتہ لینے باہر چلی گئی۔ ساتھ ہی [illegible]
[illegible] گئی۔

کوئی بات نہیں۔ بیا [illegible] رہے
[illegible] ۵۰۰۰ [illegible] چند منٹ میں [illegible] بیا کے
سر [illegible] ہو چکے۔

"مم... مم... میں تو جاسوس نہیں۔ میں تو کتے پکڑنے نکلا تھا۔"

سپاہی نے سب سے پہلے ان کی بانہہ یا رسی سے باندھا۔

"اجی صاحب۔ تم بھاگ نکلنے تک۔"

"مگر کیوں؟" بھیا بولے

"وہ سالا جوا" سپاہی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور بھیا بے بس ہو کر ساتھ چل پڑے۔

رستے میں لوگ کو شک ان کے کہ بہت سی عورتیں اور بچے اکٹھے ہو گئے تھے۔ جب وہ چلے تو بچوں نے نعرہ لگایا۔

ہندوستانی جاسوس ـــــ مردہ باد!

کالی کی دادی کالی نے ایک ادھ ہوا میں اچھالا۔ جو جٹ ہوائی جہاز کی رفتار سے سفر کرتا ہوا ان کے رخسار پر آن اترا۔ کچ کچ سے جسم میں ابھی پیاس بجھ رہی تھی۔ آدھے چہرے کی شرمندگی تو انڈے کے لیس دار لعاب سے چھپ گئی اور باقی آدھے کی شرمندگی جوتی معہ چپ سے آ کر گئی

تھانے جا کر معلوم نہیں کیا ہوا۔ مگر بھیا کا بیان ہے کہ انہوں نے جب اپنے کالی کا شناختی کارڈ دکھایا تو پولیس والوں نے ان کی ادھر ادھر خوب ذلت ڈپٹ کر واپس آ گئے۔ پولیس والوں سے ابھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں ان کا بیان کیا ہے۔

اب بھیا جرم دشمنی کے دوستی در کچھ کر سیدھے انداز میں بدمعاش پکڑنے پر تل گئے۔ خدا نے یہ موقع بھی جلد ہی دے دیا۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے نیچے سے جاسوس کو گزرتے دیکھا۔ بھیا نے آنکھ دکھا کر آؤ۔ فوراً اٹھ کر دو دو چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے اترے۔ باہر پہنچے تو انہوں نے دور سے دیکھا کہ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا ہے۔ بھاگ کر گلی تک پہنچے۔ گلی میں مڑے تو اس کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔ مگر بھیا جوش کے عالم میں یہ بھی کہ شاید گلی آگے سے بند ہے۔ حالانکہ وہ بند تھی اور آخر میں بہت سے تار سے ملتی والی گلی سے ملتا تھا۔

"بس تیر ہے کی" بھیا بولے "اب کہاں جائے گا۔ انہی مکانوں میں ہوگا کہیں ـــــ ابھی نکلے گا بچو!"

چنانچہ وہ لپکے ایسے ہوئے گلی کے منہ پر کھڑے ہو گئے۔ دوسری طرف سے تو بقول ان کے گلی بند تھی۔

اتنے میں ایک گھر سے ایک مولوی وضع کی صورت نکلی ـــــ

بھیا کو شک ہوا ـــــ یہ صورت تو اسی کیریکٹر کی ہے ـــــ اور حلیہ بھی ویسا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے دیکھا اور لپکے۔

"مولوی صاحب ـــــ تم اس طرح ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم جیسے تو میں نے کئی دیکھے ہیں۔"

اور جھپٹ کے اس کی داڑھی کھینچ کر پرے پھینک دیا۔

مولوی صاحب کی ایک گرم گرم صورت بلند ہوئی۔ بھیا تو بچیں ہوا ہو نہ سکے۔ مگر وہ خالص اصلی چہرہ لیا "مولوی جی"۔

مسلسل واہ واہ کر رہے تھے اور زور زور سے تالیاں بجانے لگے
ادھر ہم سب مطلب سے لطف اٹھا رہے تھے......
.... "اسے یہاں اتنی جلدی کیوں چھوڑ دیا ہے تم نے ... یہاں تک کہ انگلستان کے پاس آ گئے۔ یہاں کیا تھا جس کا دعویٰ کرتے
ہو...... " جیسی نے کہا۔

"یہاں تو ایک چند دن ہی تھے۔ مگر تم شکل کو کوشش نہ دیں۔ میں نے کہا تو سوچا چلا آیا۔"
"ہم.... ہم.... ہم نے کہا کہ تم کو اس کی ضرورت ہے۔" بینی نے اتنا کہا اور بیچ میں رک گیا۔
"ضرور ہے۔ اگر کوئی وقت پر کہتا۔" ضرور ہے آپ کا پہچانا تھا۔ علاوہ چار لوگ جو سب تھے اس کے پاس گئے۔
پہلے ہم سب کچھ کر چکے تھے ہمیں اس کی ضرورت نہ تھی۔
"پیارے جی... میں کچھ دیر سے کہہ رہا تھا" بینی بولا۔
"جیسی کی تاب سے دوڑا..." وقت ہوا "ہم ذرا کچھ دور سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھو میرا پیارا کہہ رہا تھا۔"
"وہیں ولایت سے ملا کرو گی" اور ساتھ کہا "کوئی وقت پر کہہ چکا ہوں۔ اور......"
معلوم ہے جب ہم لوگ بھیا کی عیادت کرنے گئے تو وہ چوکی کے دروازے سے باہر نکل کر باہر بیٹھے ہوئے تھے۔
"بھائی صاحب ہم سب آپ کے آنے سے خوش ہو گئے۔ دیکھیے تو وہ کیسے وہ بہت بے چارہ لگ رہا ہے۔"
ہم سب خاموش ہو گئے۔
اس کا سر بھی جھک گیا۔
ہم پہلے باہر کی طرف چلے کر بیٹھا جاتے ہوئے تھے۔ اور ہمیں سلام کرنے کا اشارہ کرکے آگے چلے گئے۔ ہم
سب کچھ چاہ کر بھی کچھ نہ کہہ سکے
"جیسی!" بینی نے اٹھ کر کہا۔
"ہ --- و --- ں --- ہاں --- سنتے ہی کہ ملنے سے جیسی رک گئی۔
بینی نے اس کی طرف اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے کچھ کہا۔ ہم بھی چشم زدن میں واپس تھے۔
"وہ وہ وہ مزدور بس جا رہا ہے۔" بینی نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کے پیچھے چلو ——— ا
جیسی وہ دیکھو کر دیکھے گا۔"
"اسے بھائی!" اتنی صاحب کے دھیرے آواز دی۔ "جلدی چلو۔ اس میں بندوق والا ضرور ہے۔"
جیسی دوسرے طرف بھی باہر نکل گئی۔
"ٹھہرو ——— جیسی شرارت ہو گئی۔" فکر نہ کرو ——— ایک پکڑتے ہیں۔"
بہادر جان بچانے بس کر جا رہا۔

ہنا ۔ بچنا چھٹے۔
ے پاگل ساتھ سمجھتا یا۔ ادھر سے ہم نے ہاتھ نکال نکال کر شور کیا۔
ی مدد کو ——— اندر جاسوس ہے ؟
جا کو ڈرکیٹ ویسے بہت زیادہ تھی۔ ساری قوم اُن کی جوانی کی پاسبان کھتی تھی اور اُن کے جذبے اور جوش
راستے نے فضا میں روک لی۔
س کا راستہ روک دیا۔ بچنا چھلانگ مار کر باہر نکلے ——— ٹیک کر سب کے پیچھے گئے۔ دروازے میں
کو گریبان سے پکڑا۔ اور گھسیٹ کر نیچے لانے لگے وہ ذرا بھاری تھا۔ اور مقابلہ بھی کرنے لگا مگر
ہ اٹھا کر نیچے اُتار دیا۔
ت سے منہ کھول کر یہ ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔ ایک آدھ آواز اعتراض کی بھی آئی۔ " کیا کرتے ہو

ہا " جاسوس " ——— اور بس کی فضا ہی بدل گئی۔
ہ کو ۔

ری گھر نہ آنے لگا جس نے ویسے ہی گالیاں دیں
نے اسے گریبان سے پکڑا اور اچھل کر زور سے ٹکر ماری
— اب بھاگ کر کہاں جاتا ہے " وہ دانت پیس کر چلائے
سے خون نکلنے لگا۔
ت ہاتھ اور نے ویسے تھے کہ اس نے شاید ہی کوئی چوٹ کھائی تھا بلکہ ایک ادھر ادھر سے ہاتھ

پیچھے کر دیا
— کیا ہوا " ایک دوسری اوپر والی منزل سے چلتا آتا نیچے بھاگ آیا
شانی جاسوس ہے " بچنا جی کی لفتیں ہی سے چاہئے۔
ہ پتہ ہے ؟
دیکھو امجن کر یہ ہر جگہ گشت کرتا ہے اور جہاں چار آدمی جمع ہوں تو ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے۔

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آج کل [illegible]

[illegible] ہے۔

نیم کے پتّے

آغا بابر

یہ بات تو اُس پر واضح تھی کہ عورت کی ذات اور پیار بھری گھڑیوں سے نا آشنا ہے مگر کرامت [illegible] پرانے [illegible] نے پہچان کر [illegible] تبدیلی کر لی [illegible] پاس [illegible] پہلے کہ اُس کی زندگی کے [illegible] حال اور مستقبل کی [illegible] [illegible] قطرہ قطرہ ہو کر [illegible] تو [illegible] [illegible] شروع سے [illegible] [illegible] اس طرح [illegible] ہو جائے جیسے [illegible] اُس کا اُسے علم نہ تھا۔

[illegible] جب [illegible] کہ [illegible] سیلاب اور آندھیاں [illegible] کر دیا۔ [illegible] پاؤں [illegible] دیا ہے۔ [illegible] سے [illegible] کے [illegible] تھی جنہیں [illegible] [illegible] تھا۔ [illegible] کے اندر [illegible] کی چارپائیاں [illegible] [illegible] بند رہتا۔

[illegible] سے [illegible] کی [illegible] اگر [illegible] پہنچتے پہنچتے [illegible] ہو جاتی۔ [illegible] [illegible] کے [illegible] ہو کر [illegible] کے [illegible] کر دیتیں۔ وہ [illegible] سے [illegible] کے [illegible] کوشش کرتا [illegible] اُسے [illegible] کر دیتے [illegible] [illegible] ہو جاتی۔

[illegible] سے تعلق ہے۔ میں نے اس کی شہرت بھی سنی اور آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ [illegible] کی بیوی [illegible] ساتھ [illegible] ہے؟ تم کسی [illegible] چھوڑ دو۔ [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] احساسات [illegible] [illegible] زندگی کے [illegible] [illegible] وہ [illegible] [illegible] [illegible] جاتی۔ اس [illegible] جاتا۔ [illegible] سال [illegible] بے بس ہو کر [illegible] پر گر پڑتا۔ [illegible] [illegible] کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ [illegible] سے [illegible] رات کے [illegible] سنتا۔ اُس کے اندر زخم کھائے ہوئے سانپ [illegible] [illegible] [illegible] جب [illegible] اُس پر [illegible] جاتی۔

[illegible] کی [illegible] [illegible] ہو کر [illegible]

[illegible]۔

[illegible] [illegible] جاتا۔ [illegible] [illegible] [illegible] تھی۔

[illegible] [illegible] [illegible] ہو سکتے ہوتے۔

[illegible] ہوگی۔

جب سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اشارہ کر دیا۔

[illegible] کہاں ہیں؟

[illegible]

[illegible]

[illegible] سنبھال کر بیٹھ گئے جیسے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بیٹھے ہوئے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ممکن ہو گا

"میں کتابیں نہیں صاحب کا وعدہ ہے۔ پڑھ لو اور ان کو چھوڑ کر ان کا شکریہ ادا کر دو۔ سات سلام ہوں ایسی نوکری کو۔"
...نے روز کی تنگی دیکھ کر نوکری چھوڑ کر چل دیا۔

ایک روز شکیل باغیچے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایک لڑکے کے پیٹ [illegible] خوش ہو کر زندگی کتنی اچھی ہے۔ جمیلہ نے نظر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا اور بولی:
"اچھا! [illegible] دیکھتے ہو؟"
"کیا؟" شکیل پھر پکار گیا۔
"وہ سامنے بیٹھی بچے کو چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہے [illegible] جیسے ابھی بلبلا اٹھی تھی۔"
شکیل نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ادھر دور [illegible] بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ مگر اسے بیزار معلوم ہوتا تھا۔
جمیلہ اٹھ کر کرسی کے کنارے کی طرف چلی گئی۔ شکیل نے دل میں کہا جمیلہ کی چال کتنی اچھی ہے۔ پھر قدموں کی چاپ سن [illegible] اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو جمیلہ اور ماں اس کی طرف چلی آ رہی تھیں۔ ماں کی قمیص پر جہاں اس کی دودھ سے بھیگی [illegible] ایک داغ ہو رہا تھا جیسے دودھ کے دھبے تھے جیسے وہ بچے کے منہ سے دودھ کھینچ کر چلی آئی ہو۔
"میرے میاں تم سے [illegible] کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے پاس بیٹھ جاؤ کرسی پر بیٹھو۔"
جمیلہ کی زبان میں شفقت [illegible] تھا۔

[illegible] جمیلہ کی طرف [illegible] دیکھ رہی تھی۔ [illegible] سامنے جمیلہ کے منہ پر [illegible] بیٹھ گئی [illegible]
[illegible] جانے کا [illegible] گیا۔
اگلے روز صبح [illegible] اور اس کی بیوی نے کمرہ خالی کر دیا۔ ان کے چلے جانے سے جمیلہ کو کوئی تکلیف نہ ہوئی مگر [illegible] کے جانے سے [illegible] شکیل [illegible] نے کہا: "بیگم صاحب [illegible]
[illegible] ہوں گی۔"
جمیلہ نے [illegible] دیکھی پھر [illegible] ہو گئی۔ [illegible] نے کہا: "[illegible] بچے [illegible]
[illegible] ہیں۔ [illegible] ہو جائے گی۔"
"[illegible] نہیں؟"

[illegible] کمرہ میں بیٹھے تھے [illegible]
[illegible] بیٹھے [illegible] کرتے۔ [illegible] کر دی۔ [illegible] سے [illegible] کے

[illegible]

کملیں چاشکا کو پہ وہاں کی دہشت سے باہر نکل آنا آرزو نے اشارے کہ جب چاچی تو اُس باہر کی بیوی کو جلک مکانظر آتی۔ ایک
دن نے دیکھا۔ کہ وہ بیٹھے وقت شیشوں کی طرح کی کھڑکی طرف اٹھی تھیں۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ گلی وقت جانے کے لیے پڑے ہوئے سا
مہر کرکی کا پردہ اٹھا ہے تھا تو وہ ستار سا کھڑکی کے پٹ کھلے تھے

• نیچے پردہ وہ کاڈ آتی ہے کمال باہر آتی ہیں۔
• بس کہ گلی نے شیشے میں عکس دیکھے ہوں گے۔
• میں کہیں سب میں نے کھڑکی کھول دی ہے۔

جو ہیکے ہم سے باہر چلی گئی اس نے کہا کہ اماں دن۔ "تم نا ہیں ہو آؤ۔"
وہ ستار پر گلی کو صاف کر رہا تھا۔ "میں کہہ رہا" جو وہ نے اُس سے کہا "میں نے پہلے ذکر دیا تھا کہ یہ کھڑکی صاحب کے
سامنے سب کھلی رہتی تھی۔ ابھی صاحب دفتر نہیں گئے۔ تمہاری بیوی نے یہ کھڑکی کیوں کھولی ہے۔"
اُس نے باہر کہا۔ کھڑکی کھٹ سے بند ہو گئی۔
گلی کر سب کو وہی پھر آئی تو بیوی اندر چلی گئی۔ جب آئی تو سکول کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے اندر کر کے بچوں کو بھیجنے سکول
دیا۔ خود کہ وہ ستار کی بیوی کو جنے بھیجا اور خود برآمدے میں بیٹھ گئی۔ لڑکے نے کہا۔ وہ کہتی ہے کہ گھر سے باہر قدم رکھنے کی
ضرورت نہیں۔

"اچھی بات ہے" جو وہ نے غصے میں آ کر اور وہ برآمدے میں بیٹھ کر اُس کی راہ دیکھتی رہی۔ وہ ستار کی بیوی بہر حال تھی
"میں نے تمہیں کہا تھا تم نے کیا گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اتنی بڑی ہو کر تم مجھے پتہ نہیں کہ کیا وقت
وقت کھڑکی کھول کر یہ ہم ہو بیٹھے میاں کو دکھاتی رہتی ہو۔ میں نے سوچا تھا صاحب آ گئے تو ان کی شکایت کروں۔ دونوں کو پتہ
ہو جائے۔"
وہ ستار کی بیوی کا رنگ غصے کے مارے پیلا پڑ گیا۔ وہ ہاتھ سر پر رکھ کر بیٹھی اور بولی "میں نے اس کو دکھایا کہ تو بہ کرو دکھاتی پھرتی ہے
سب چپ رہو جب کمرے سے نکل جا کر بیٹے نادم کے ساتھ بیٹھتی ہے تو کیا ہی بدلہ مگر تم پچھتی ہے کیں۔"
جو وہ کو اس پر غصہ چڑھا اس نے غصہ سے ہاتھ نکال دیا۔ "زیادہ بات کی تو زبان کھینچ دوں گی۔"
"چپ چاپ مت رہو" وہ وہ کی بیوی نے جا کر ہاتھ نکالے۔
"ہٹو۔ سالے خاموش ہو۔ کمینی میں نے کہا کہ تیرے پاس آ کر کہے" جو وہ نرم ہو کر بیٹھ گئی
"میرے بچوں کو اپنے بدکردار خاوند کے نام سے جوڑ کے۔ پر نہیں بتا دوں تیرے اُوپر تھوکنے کا کوئی نہیں میرا ساتھ
ہے۔ دیکھ کہ وہ تمہارا گھر چل رہا ہے۔ دیکھو دو دن کا کام۔"
"اس نے بیٹے بھیجا تھا۔ جب بار بار بیٹا پکارا۔ جو وہ کی حالت قابل رحم ہو گئی ہے ٹوٹ گئے کہ سکی۔" جب میاں
نے جا کر تم تو پچ بھی ہو گی کہ نیند دیکھو۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"[illegible] کیوں بیٹھی ہو؟"

[illegible]

"[illegible] کچھ نہیں تھا۔"

حمیرا [illegible] کچھ نہیں۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

...ی خدا

...ندیہ

... شدت سے بیمار تھی۔

[illegible] اس نے [illegible] اس وقت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کا اندر [illegible]

[illegible] تو کیسے؟

[illegible]

[illegible] نہایت

[illegible] اس نے [illegible]

[illegible]

[illegible] تو کیسے؟

[illegible]

[illegible] وقت [illegible]

[illegible]

[illegible] بہت پیار تھا [illegible]

[illegible]

[illegible] وقت سب [illegible]

[illegible]

[illegible] تھا۔ [illegible]

[illegible] اس وقت [illegible] کے ساتھ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

• [illegible] ——— [illegible] ۔"

• [illegible]

[illegible]

• بات کیا ہے؟ ——" [illegible]

• کوئی بات نہیں ہے [illegible] ———"

• [illegible] ———"

• [illegible] ہے ... تو با؟"

• [illegible]

• [illegible] ———"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] —— [illegible]

[illegible] اور بھی بھر گئی۔ [illegible]

[illegible] بہار [illegible]

[illegible] کے آنے [illegible]

[illegible] راستے سے آ کر [illegible] ایسے پڑھتے

[illegible] بیٹ [illegible]

[illegible] ——

[illegible] —— [illegible] :

پنکھے کی تیز ہوا میں بال [illegible] کی طرح لہرا رہا تھا۔

حمیدہ کے گریبان میں منہ دیے [illegible] جا رہا تھا۔ حمیدہ کی گردن پر پسینے کے قطرے سوئی کے [illegible] ابھر آئے تھے۔ اس نے [illegible] کو [illegible] کر کے پرے کیا اور شیخ جی کے ہاتھ پر انگلی پھیر کر بولی۔ "

—— اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ڈاکٹر سے مزید کوئی دوا لے کر آئیں گی —— "

"اتنے سے بچے کے پیٹ میں کیڑے؟ [illegible] کے پیٹ میں ہوں تو ہوں —— "

[illegible] میری بات نہیں سمجھتا۔ [illegible] اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں ورنہ رات کو سو رہا تا ! "

[illegible] بڑی ڈھٹائی سے حمیدہ کی پشت سے [illegible] ہاتھوں سے اس کی چوٹی کو چھو رہا تھا۔

"میں تو جب تک اس کے ساتھ بیٹھی رہوں گی [illegible] —— "

"ادھر آ جاؤ میرے پلنگ پر —— " شیخ جی نے [illegible] سے [illegible]۔

لیکن حمیدہ [illegible] کے ساتھ لیٹ گئی۔ [illegible] شیخ جی کے [illegible] سے گھن آتی تھی۔ [illegible] نیند میں جب [illegible] تو حمیدہ کو ان سے بڑی نفرت پیدا ہو جاتی۔ وہ [illegible] سے وہ حمیدہ کے [illegible] —— اللہ میاں آپ نے [illegible] کیا دیکھ کر بیاہ دیا۔

جب حمیدہ [illegible] پلنگ پر [illegible] کا ہاتھ [illegible] پشت پر [illegible] جب [illegible] تو [illegible] ہو گیا۔

"[illegible] حمیدہ بولی —— " [illegible] —— ہاں!"

"[illegible]"

"[illegible] سکتے ہیں۔"

[illegible] کیا [illegible] ہے؟ —

[illegible] ۱۰ [illegible]

[illegible] ہے —

[illegible] بے حیائی [illegible] ؟
[illegible]

[illegible] بے حیائی نہیں ——— استغفراللہ!

[illegible]

[illegible] تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] —— [illegible] زندگی کا [illegible] شروع ہوا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ———

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شیخ جی چالیس کے پیٹے میں تھے اور تائی کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ایک طرح بیس برس کا فرق تھا۔ دوسرے شیخ جی
ست یا لاابالی تھے تو [illegible] چھینک کیا آتی سارا جسم
[illegible] ہو جاتا۔ [illegible] کبھی سانس اکھڑ جاتا ہے کبھی نبض ڈوبنے لگتی ہے۔ تائی کا [illegible]
[illegible] شکل و صورت [illegible] نے چاٹ لیا تھا۔ [illegible] رنگت اور شباب کے
[illegible] تائی [illegible] تھی۔

عجیب سی بات تھی [illegible] شیخ جی کی صحت [illegible] اسے تو [illegible] کی خوبیاں گنتی تھیں۔ ایسے
[illegible] ساتھی کی ضرورت تھی [illegible] شیخ جی [illegible] کی بات دو سال سے [illegible] میں پڑی تھی
[illegible] شیخ صاحب [illegible] دو سال بیت گئے۔ [illegible] نکاح کا نام [illegible]
[illegible] گئے۔ [illegible] باقی [illegible]

شیخ جی کچھ ایسے [illegible] تھے۔ [illegible] اپنے آپ کو [illegible] سے تائی کا خیال رکھتے تھے
[illegible] واجبات کے [illegible] بھی [illegible] ہوں پائے [illegible]
[illegible] زندگی [illegible] ہے۔ [illegible] شیخ جی
[illegible] تھا [illegible] شکل و صورت
[illegible] —— [illegible] ہو جاتا۔ [illegible]

[illegible] باتیں ہیں ویسے ہی [illegible]۔

[illegible] شیخ جی [illegible]
[illegible] شیخ جی [illegible] کے
[illegible]
[illegible] لیا۔

[illegible] بھگا کر [illegible]۔

[illegible] کبھی [illegible]
[illegible] —— [illegible] شیخ صاحب [illegible]
[illegible] —— [illegible] شیخ جی [illegible]
[illegible]:

[illegible] شیخ جی [illegible] جب [illegible]
[illegible] شیخ جی [illegible]

بلانے جاتے ہیں جیسے کہ ان سے ملنے نہیں آئیں گے مگر یہاں انہیں کچھ مقصد تمام ہو جاتا ہے اور جانے کو جی نہیں چاہتا [illegible]
چہرے سے تاثر ظاہر ہو رہا تھا۔ ہم خاموش ہیں، بہت پریشانی۔ اب سب ہی پریشان ہوں گے۔

اگر یہ چیز کوئی اشکال نہ بنتی تو ... یہ بات بہت آپ کے لئے ہے [illegible] ؟ —

پھر شیخ صاحب نے [illegible] لڑکی کی طرف چلنے لگے۔

"آپ یہیں [illegible] شیخ صاحب [illegible] ہوگا۔"

شیخ صاحب کچھ دیر خاموش رہے [illegible] حقیقت یہ ہے میں جانتا ہوں [illegible]
[illegible] باتیں ہوں گی —

اب [illegible] شیخ جی کے ساتھ [illegible] جواب سنتے [illegible]
[illegible] نکل گئی۔

شیخ جی اس [illegible] گئے اور [illegible] کا انتظار جلد ہی ہونے لگے۔ [illegible]
[illegible] پہنچ جانے کا [illegible] تھا۔

"کیا [illegible] شیخ جی؟ —"

شیخ جی نے [illegible] انہیں لے۔

"میری طرف دیکھئے شیخ صاحب میری طرف —"

"تم [illegible] بستر سے نکل آئی ہو —"

"آپ [illegible] بہت [illegible] میری طرف دیکھئے —"

[illegible] شیخ جی [illegible] ہو گئیں۔

"آپ [illegible] کیا ہے؟ —" [illegible] کر رہی تھی۔

"[illegible] — کمال ہے، یہی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟"

"[illegible] میں [illegible] سکتی ہوں۔" "اور آپ کا رشتہ کیا ہے شیخ صاحب؟"

"میری [illegible] کیوں [illegible] ہے —؟" شیخ صاحب [illegible] چاہتے تھے۔

"میرا آپ کا رشتہ کیا ہے؟ —" [illegible] کر رہی تھی۔

"یہ کیا کوئی پوچھنے کی بات ہے —"

"آپ [illegible] میری [illegible] ہے۔" [illegible]

"میں ... تم ... میری [illegible] تمہیں [illegible] ہے۔ [illegible] ہو جائے گا۔"

[illegible] — میں [illegible] شیخ صاحب [illegible] — میں نے [illegible] دیکھا۔

[illegible] کہ تم [illegible] آپ [illegible] اور [illegible] ہیں۔

[illegible] کے پاس [illegible] کہاں [illegible]
[illegible] پر [illegible] کر [illegible]
[illegible] سے [illegible] کا۔

شیخ جی کیا بات ہے [illegible] دیجیے۔

شیخ جی نے [illegible] سے [illegible] کر [illegible] گئے۔ [illegible]
[illegible] ہیں۔ [illegible] شیخ جی [illegible] لگے تھے
[illegible] بات [illegible] شیخ جی [illegible] رہے تھے۔ [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible] میں [illegible] ہو —
[illegible] ہے۔ اگر [illegible] تو [illegible] کروں۔

[illegible] —

[illegible] شیخ جی آپ نے [illegible]
[illegible] آپ کے [illegible] ہوں گے آپ [illegible] ہیں
[illegible] دیجیے [illegible] ہو گئی۔

[illegible] کے [illegible] میں
[illegible] کا [illegible] ایک [illegible]
[illegible] تھا [illegible] تھے۔ [illegible] میں ایک
[illegible] تھی۔ [illegible] تھے [illegible] بہت [illegible]
[illegible] تھی۔ [illegible] تھا۔ [illegible] تھی۔ [illegible]
[illegible] کر [illegible] کی [illegible]
[illegible] بات [illegible] ہو [illegible] —

[illegible] بات [illegible] شیخ جی [illegible] تھا۔ اس خیال سے [illegible]
[illegible] تھی۔

[illegible] تھی۔ [illegible] شیخ جی [illegible] کی [illegible]
[illegible] گئے۔ [illegible] کا [illegible] کی [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

نہ ڈریں کہ ... [illegible] ... سے نکل گئی ہو جائے۔

قدسیہ کی ... [illegible] ... میں جب بولا کرتے تھے ... [illegible]

[illegible] ———

دیکھا ... [illegible] ... ؟ —

تم کیا معلوم ؟ ... [illegible] ... ہیں۔

انشاء اللہ ... [illegible] ——— ہم کو ... شیخ ... [illegible] جاتے ہیں۔

... [illegible] ... کا شربت ... [illegible] ... ۔ ... [illegible] ... کے دو ... [illegible] ... ——— ... [illegible] ... نکال ... [illegible] ... [illegible] ... جب وہ ... [illegible] ...

... [illegible] ... سوچی کہ ... اس ... [illegible] ... بند کر ... گا ؟ ... [illegible] ... کانوں کے دونوں ... [illegible] ... شدہ قدیم مصری ... [illegible] ...

آہستہ آہستہ کانوں کی طرف بڑھنے لگے ———

ٹپ ٹپ ...... بوند بوند

... [illegible] ——— ... [illegible] ... سارے ... میں ... شیخ جی کو یاد ... [illegible] ... اپنے مستقبل کے ... [illegible] ...

بارش آہستہ آہستہ برس رہی تھی

... [illegible] ... جیسے وہ صندوق ... [illegible] ... سارے گھر میں ... [illegible] ... برس رہی تھیں ... [illegible] ... کا سا سماں تھا ... [illegible] ...

آج ... [illegible] ... ہو رہی تھیں۔

... [illegible] ... شیخ صاحب ... [illegible] ... تھی لیکن ... [illegible] ... آج کے ... [illegible] ... اپنی ... [illegible] ... کرتے تھے ... [illegible] ... پہلے ... شیخ صاحب کے لیے ... [illegible] ... گھر میں ... [illegible] ... سارے گھر میں ... [illegible] ... شیخ جی کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی گئی تھی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس روز سے [illegible]

[illegible]

زمانہ میں چھپا بیٹھا تھا —— جو قیمتی ہو ——
پھر اتفاق سے ایک پرکشش [illegible] سے ملاقات ہوئی ... شیخ جی کے [illegible] سے [illegible] زندگی
اس سے ملنے کے [illegible] شیخ جی کی [illegible] باتیں [illegible] شیخ جی کی [illegible] سے کوئی [illegible]
[illegible] کو تو ... [illegible] سارے [illegible] ... [illegible] کا تو پھر کیسی [illegible] کر
شیخ جی جیسا [illegible] اتنا سب آیا۔

جب اس نے [illegible] کا فیصلہ کیا تو [illegible] نے [illegible] کے [illegible] سارے [illegible] پیدا کرکے
ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر وہ [illegible] ساتھ [illegible] ... جب [illegible] چلتے چلتے [illegible] دیکھ
وحیدہ اور [illegible] ... [illegible] سے [illegible] ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ
[illegible] ... [illegible] تم ساتھ چلیں اور کسی طرح شیخ جی کو [illegible]
تم کیا [illegible] ... [illegible] ——

حمیدہ خوفزدہ ہو کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔
وہ [illegible] ——— اے حمیدہ! جب اس [illegible] تو پھر [illegible] کام لینا کہیں
پہنا [illegible] ... تم کو [illegible] کو اپنا کر [illegible] —— وہ [illegible]
شیخ صاحب کو پھر [illegible] ——

کینال پارک کی جانب سے [illegible] ... ٹیکسی کی پچھلی [illegible] جیسی [illegible]
کرایہ [illegible] اور [illegible] تھا۔
[illegible] ... [illegible] میں [illegible] بیٹھی تھی۔
پچھلے دن نے [illegible] اس کے [illegible] زندگی کی [illegible] سے [illegible] کی۔
[illegible] ... [illegible] جب اپنے [illegible]
سے [illegible] ... شیخ جی سے بولے ——— تم جانتے ہو [illegible] مجھ سے [illegible]
[illegible] ... [illegible] شیخ [illegible] میں [illegible] ... [illegible]
ہیں۔ اس [illegible] بند کر [illegible]۔

شیخ جی [illegible] سے ... [illegible] تھے۔ [illegible] تو سامنے [illegible]
[illegible] ... [illegible] بیٹھ گئے۔
[illegible] ... [illegible] بے [illegible] کر کہا ——— [illegible]
تم [illegible] نہیں ——— [illegible]

[illegible]:

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

—

[illegible]

[illegible]

سری موت

لام علی چودھری

فضا بند دالان پر مرگ ہے۔ چہرے بند سے میں گھٹن اس کے پاس گم سم بیٹھی ہے۔ سمندر مُنڈیر کی چادر اوڑھے اور حزن ایک رقص
مرن سو رہی ہے۔

بند کا نظروں کی حد تک بنا ہوا ہے اُنے پر جم گیا ہو پسینہ؟ آنکھوں کی دھندلی سیاہی سینے میں اور سانس کا لمبا گھونٹ اندر چڑھاؤ . . . .
مگر یہ سب کچھ اُن کی سطح اوپر سے دیکھ رہی ہے یہاں تک کہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے پسینہ خشک ہو گیا ہے سیاہی سینے میں اتر گئی ہے اور سانس
اُکھڑ گیا ہے۔

شہر سے تیز چلتی ہوئی دیوں کی چیخیں اور کر بلا کی طرف سے دریا پہنچے سے کارخانے کے آسیب کا سائے کی چادر اوڑھے اور بچہ
کی چھت کے سامنے بیٹھی ہے بند کر کے ایک اور مرتبہ دیکھا ہے کہ اس نے میاں دوازاد کو بے زبان کو ملا ہے۔

ادھر ریل ویگن میں مسافر اور مال گاڑیاں شور شرابہ بھک بھک کرتی ہوئی چلی آ رہی ہیں اور کمانیں کھنچی جا رہی ہیں اور کارسے
کی دیواروں اور بچوں کی پشت پر اپنا لپکا رہا ہے۔ مزدور کاروں، ٹرکوں، بسوں، ٹرین، چھکڑوں، تانگوں اور ریڑھیوں کا اُبل جانا
۔۔ ہے جو اثر گرد کے گوشے تک آتا ہے اور کبھی کبھی زرد پتوں میں اور ان کے شور۔ وہ کچھ نہیں دے اور سو رہے والوں کی آوازوں کو
بھی سو دیتا ہے۔

شام کی اس دھند میں دھواں اور دھوپ میں کارخانے کی چمنیاں باہر کالے دھوئیں کے جالے اڑا رہے ہیں اور رہی ہیں جو پھیل پھیل کر
سے ہیں اور پھیلا پھیلا کر فضا کی اور بھی آتشیں بنا رہے ہیں۔ کارخانے کی بڑی بڑی بھٹیوں کے دہانوں سے نکلنے والے اور بہتے
سرخ اور گلابی کے چھینٹے گرنے سے پسینے کے بل پہ چلنے والے سینکڑوں انسانوں سے زبان ٹھنڈا کرنے کی دیواروں اور بچوں کی چھت کے
سامنے میں ایک مانند کو سانس کی لوری تپ کے تنور میں جل کر راکھ ہو گئی ہے اور بند وہ پھر مرگیا ہے۔

بند پہلی بار مرا تھا تو بچوں نے سر کے بال نوچ لیے تھے اور حزن بے حس بیٹھی چلائی تھی اور پلنگ کے پیچھے صمد کی بیوی گھٹی
بند ہو گئی تھی۔

بند دوسری بار مرا تھا تو بچوں رونے اور چیخ کر قہر کیا تھا اور حزن نے سیکھا بہر قدم پر تھی اور صمد کی بیوی آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی
بند تیسری بار مرا ہے تو بچہ گم سم بیٹھی ہے۔ صمد نے گاڑ کو اوڑھ لیا ہے اور حزن ملک کی سو رہی ہے
بچے ... ... کیا کے سبب کیا بتانے۔ صمد نے قد ... بند کا تپ ... ... تھا
بند پھر جانے کا ... ... کے بیچ ... ... گیا تھا ... ... پر ... ...

[illegible]

[illegible] ..... [illegible]

[illegible] چکا ہے۔

[illegible]

[illegible] ..... [illegible]

دیتا ہے۔ [illegible]

[illegible]

پاس بیٹھ جاتی ہے۔

[illegible] کی طرف چل

دیتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

نے گھر تک اس کا پیچھا کیا ہے

بچن میں بندے کے منبر پر [illegible] ہے اور عزیزہ پاس کھڑی ہو کے اس سے پانی کی دھار ڈال رہی ہے۔ اس کے نتھنوں [illegible] اس کے لیے [illegible] کیونکہ [illegible] پہلے جب وہ گھڑا اٹھانے کنوئیں کو جا رہا راستے میں [illegible] ہوتے ہوئے گھر [illegible] ہنستے ہوئے [illegible] کے وہاں سے نے جب بچا [illegible] نے [illegible] ایسے [illegible] کہ اس کے [illegible] پر ہنستے تھے۔ [illegible] دیکھا اور [illegible] گھڑا اٹھانے کے لیے بھیج دیا۔ اور پھر خود [illegible] کے پوچھتا [illegible] کیا حال ہے۔ عزیزہ بہت دنوں سے [illegible] استعمال کر رہی تھی مگر اسے اب معلوم ہوا ہے کہ یہ رشتہ دار ہے۔

[illegible] پانی کا دوسرا گھڑا بھر کے لایا ہے اور [illegible] کے کنارے پر اس میں بیری کے پتے بھی ڈال دیا ہے۔ وہ [illegible] کے قریب [illegible] ہو رہا ہے کہ [illegible] آگیا ہے۔ اس کے ساتھ تین اور آدمی ہیں جن میں [illegible] ہے۔ [illegible] پیال کی ایک چٹائی اٹھا لایا ہے اور وہ چار [illegible] میں باہر ڈال دیا [illegible] سامنے میں بیٹھ گئے [illegible] واپس اپنے [illegible] کی طرف چلا گیا ہے۔

[illegible] ہے اور عزیزہ [illegible] کفن کے لیے کپڑا ڈھونڈنے گئی ہے [illegible] ان [illegible] کے نیچے [illegible] اور [illegible] کی [illegible] میں بیٹھنے کی استطاعت [illegible] اس کے [illegible] وہ [illegible] نہیں۔ وہ [illegible] کہیں [illegible] جب [illegible] آتا ہے [illegible] اپنے [illegible] کے [illegible] بہت [illegible] کیا [illegible] کے ہاتھ میں [illegible] چلے گئے ہیں۔ [illegible] تیسری بار [illegible] کی طرف [illegible] گیا ہے۔ [illegible] پیال کی چٹائی پر بیٹھی [illegible] ہے اور عزیزہ اس کے پاس [illegible] ہے۔

[illegible] دیکھ کے [illegible] کنوئیں سے بہت [illegible] کے [illegible] گاؤں [illegible] بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ [illegible] ہے [illegible] بیٹھ [illegible] بات [illegible] ہے۔ [illegible] بیٹھک [illegible] سے [illegible] نہیں [illegible] ہے اور [illegible] ہے۔ [illegible] وہ [illegible] سے [illegible] ہیں [illegible]

[illegible]

سعد کا جھگڑا اور غیصہ برداشت کر رہا ہے۔ بندو نہ کیا کا پہلے یونہی ردّ کرنے کو اکیس برس ادھم سادہ شخشا تھر سا

ہے۔ وہ اس کے ذریعے لوٹ آئے گا۔

جمن کی جیب والا سونے کا تعویذ اور اس کی تیز کمانے والی چندیا اور پاؤں دابنے والے ہاتھ کہاں ہیں۔ بندو بالکے جی! کیا تھا تو تیسری بار بات کیوں نہیں مانے گا۔ بندو آنے جنیر رہے گا۔

ہورین کا ریشم اور خوشبو اور زلفوں والا شوٹ کیسں کر رہا ہے۔ بندو پرانا ہو گیا ہے میں اس کے جھوٹے غم جہد کیوں نہ جاؤں؟

وہ گلی سے گھر سے کارخانے کی بجلی کی تیز روشنیوں کے دہانے اور کالے اژدہے کا گھنے والی چمنیاں معلوق ہوئی روشنیاں اور کٹری والے رہتے ہیں گنت شبانہ روز گھومتے ہوئے پہیے اور دن رات چیخنے چلانے والی مشینیں اور اپنا رہے ہیں تالی بجا رہے ہیں، بچ کا رہے ہیں کہ سعد اور جمن اور ہورین نے دکا بھید پا لیا ہے۔

[illegible] ہو گئی۔

ایک دفعہ [illegible] کے ساتھ [illegible] بیگم صاحب سے [illegible] بات کرو۔ چنانچہ بیگم صاحب نے [illegible]

[illegible]

[illegible] کی زندگی [illegible] اس کے [illegible] کے خلاف [illegible] مرتبہ [illegible] اپنی [illegible] جانیں [illegible] ہتھیار [illegible] اس نے [illegible] تمام [illegible] ——— [illegible] قرآن [illegible]

[illegible] قرآن [illegible] اس کی [illegible] اس نے قرآن [illegible] دیکھتے ہی [illegible] اس کی [illegible]!

اس نے [illegible] قرآن [illegible] اپنے ساتھ لے جانے کے لیے [illegible] اپنے [illegible] کے [illegible] جب [illegible] کا دل [illegible]

[illegible] تھی۔

[illegible] چنانچہ اب [illegible] کوشش [illegible] ان کے [illegible] اور اس نے [illegible] کر دیا [illegible] اس وقت [illegible] شخص [illegible] کے سامنے [illegible]

[illegible] کی وہ [illegible]!

[illegible] اس نے [illegible] اپنے [illegible] چنانچہ [illegible] اس نے [illegible] ایک [illegible] تھا [illegible] تھی!

مجھے نے صبح شمیم کو یہ تمام واقعات سنایا لیکن شمیم صرف مسکرا دی شمیم کی مسکراہٹ میں ایک راز چھپا ہوا تھا۔

ہفتے میں دو چار بار دوسری ملازم لڑکی بلقیس آتی تھی اور مجھے نے شمیم کے کمرے سے اپنے کمرے میں چلے جانا مناسب سمجھا کیونکہ بلقیس اشارہ کنایہ میں کچھ ایسی باتیں کہہ کر سنایا کرتی کہ میں پریشان ہو جاتی۔

بلقیس نے مجھ کو جاتے دیکھ کر شمیم سے کہا "ہفتہ بھر تو اچھی طرح یہاں آنے نہیں دیتیں ہر ایک کے پہننے میں اٹک گئی ہے صاحب کا قاعدہ اترانے کا"

شمیم نے ترس کھاتے ہنس کر کہا "بیچاری کا تو یہ معاملہ ہے" بلقیس نے جھنجھلا کر کہا "ایسی سیدھی سادی خوب مزے کرتی ہیں ہم تو مفت میں بدنام ہو جاتی ہیں"

شمیم نے کہا "نہیں نہیں ابھی اس کی ایسی کوئی بات نہیں" بلقیس نے طنز سے کہا "تو بیگ اینڈ کمپنی میں یونہی نہیں نوکری مل گئی شمیم کو سو روپے بیس میں پہلے سے ادا لیتی ہے"

شمیم نے دور سے اس کی سپرنٹنڈنٹ کو آتے دیکھا تو بلقیس کو مشورہ کر کے چپ ہونے کو کہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے دور ہی سے پوچھا "شمیم بات بیگ صاحب تمہارے ہاں آئے تھے؟" "نہیں تو کیوں؟" شمیم نے ذرا گھبرا کر کہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اوپر سے کہا "کچھ نہیں، اماں رہی تھی کہ وہ کچھ پہلے سے پارک میں رات بیگ صاحب کی کار کھڑی تھی" شمیم نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا "یہ خواہ مخواہ خبریں اڑاتی رہتی ہے سارا وقت یہاں سے وہاں سو رہتی ہیں" سپرنٹنڈنٹ نے دور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "خیر اپنا تو ایک اڑاتی ہے کوئی مینہ ویسا نہیں گرتا جس میں کوئی نہ کوئی شگوفہ نہ کھلتا ہو" وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔ وہ کر کے شاکی جا رہی تھی کہ شمیم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "بدمعاش کہیں کی"

مجھ کو بیگ اینڈ کمپنی میں کام کرتے تین چار ہفتے گزر چکے تھے شمیم صاحب کے دفتر میں نہ تھی وہ اماں وہ دفتر میں اپنے افسر کے سامنے بیٹھی رہتی اور اس کا تمام وقت بیکار ہی بیٹھے گزرتا۔ حالانکہ ہمارے ساتھ کام کرنے والے مرد اپنے دفتر کو گھنٹوں والے مزدوروں کی طرح سارا دن کام کرتے رہتے اور مجھ کو دفتر میں بیٹھے بیٹھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک اشتہار کی مانند دفتر میں آراستہ دیکھنے کے لیے رکھی گئی ہے اور اس کا کام دفتر کی زینت بڑھانا ہے!!

مجھ نے ایک دن شمیم سے پریشان ہو کر پوچھا "زمین والے پریشان ہو جاتے ہیں ان کے ہاں میں کسی لڑکی کی ملازمت کیسے ہوتی ہے ... بہت زیادہ صحت مند اور نیک ہوتی ہیں" شمیم نے مسکراتے ہوئے کہا "کمپنیوں کے مالک سمجھتے ہیں لڑکیاں لڑکوں کی نسبت کاروبار زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں" مجھ نے اپنے متعلق سوچا اور اس نے اپنے دل میں جانچ لیا کہ اس مالت میں تو کوئی دوسری بات نظر آتی ہے کہ جانے والے ان کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا راز ہو!

ایک دن شمیم کچھ دنوں کے لیے پنڈی دوستوں کے ساتھ گھومنے جا چکی تھی۔ ادھر صاحب نے شمیم کی غیر حاضری میں تنہا پا کر مجھ کو اپنے پاس بلایا۔ شمیم نے جاتے جاتے پوچھا تھا "میری ابھی تک نوکری پکی نہیں ہوئی" مجھ نے خوشامد سے مسکراہٹ چہرے پر لا کر شمیم سے کہا "بیگ صاحب کی کمپنی میں بہت بڑا کام ہے جس میں پیار دار کام آتا ہوں" شمیم نے

[illegible] بیگم بیٹھے بیٹھے [illegible]
[illegible] نہیں [illegible]
[illegible] کمرے سے باہر [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

بیگم

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] صاحب [illegible]
[illegible]

[illegible]

بیگم نے جواب دے دیا کیا وہ شامل ہو گئی ہیں، وہ کانپ گئی، اس کا حلق خشک ہو گیا اور وہ گھبرا کر کار میں یوں بیٹھ گئی جیسے صاحب نے اس کا کوئی جرم پکڑ لیا ہو!

کار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور بیگم خاموش بیٹھی [illegible] دیکھ رہی تھی جیسے وہ [illegible] اس کی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہو۔ اس کے [illegible] وقت جو کچھ وہ جانتی ہو کر اسے مفت کی تنخواہ ملتی ہے، اور اب بیگم صاحب کی کار میں کیوں ہے، بیگم صاحب کی نیت کیا ہے، بیگم صاحب اس سے کیا چاہتے ہیں!

کار ایک [illegible] کوٹھی پر آ گئی تھی، بیگم صاحب نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا: "اچھا سنو [illegible] اپنے متعلق کہو تو [illegible] ٹیچر تو آپ کی بہت تعریف کیا کرتی ہے"۔ [illegible] نے جواب دیا "بیگم صاحب دراصل معاف کیجیے [illegible] گھر [illegible] اپنے گھر والوں کی [illegible] نہیں کرتی"

[illegible] شاید آپ کی [illegible] خیالات کی ہو۔ بیگم صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] بات مختصر کر کے جواب دیا "بیگم صاحب دراصل [illegible] کام کرنا نہیں چاہتی" اور اپنے بٹوے سے اپنا [illegible] نکال [illegible] صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔

کار جا رہی تھی، بیگم صاحب [illegible] دیکھ کر [illegible] کہا "چلو اب تم [illegible] تمہیں [illegible] اب [illegible] افسوس [illegible] ہوں"۔ [illegible] نے جواب دیا اور [illegible] پیچھے خاموش ہو رہی۔

بیگم صاحب نے [illegible] کوشش کی [illegible] بات [illegible] نہیں [illegible] میں [illegible] دروازہ [illegible] بیگم صاحب نے [illegible] کہا "[illegible] زندگی [illegible] اب [illegible] کی [illegible] ہوں [illegible] بچے [illegible] میں [illegible] ہوں [illegible] ایک ایسی [illegible] ہے جو [illegible] نہیں [illegible] کے [illegible] میں [illegible] اس کی [illegible] کا [illegible] قائل ہو گا"

[illegible] خاموش ہو گئی۔ بیگم صاحب [illegible] پیچھے [illegible] دیکھنے [illegible] تھا [illegible] زندگی [illegible] دولت [illegible] ہو [illegible] گئی [illegible]

[illegible] بیگم صاحب کے [illegible] اب [illegible] تھے [illegible] کر کے [illegible] کی [illegible] شعر [illegible] کرتے [illegible] تھی۔

کر لڑکی کے شوہر سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھ پہ بستر سے اٹھی اور کمرے کی بتی گل کر دی۔ اس نے سامنے [illegible] [illegible] بیگم صاحب [illegible] مجھے [illegible] بیگم صاحب کے [illegible] لاش [illegible] کے سامنے [illegible] بیگم صاحب [illegible] زندگی [illegible] خیال آتے ہی بیگم صاحب کے [illegible]

مجھے اس وقت [illegible] [illegible] بیگم صاحب [illegible] [illegible] بیگم صاحب [illegible]

مجھے [illegible] بیگم صاحب [illegible]

مجھے اس وقت [illegible] بیگم صاحب [illegible]

اور [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

ماں

محمد شریف

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خالہ نے بے تابی سے اماں کی طرف دیکھا۔ کہنے لگی

[illegible]

[illegible] پیار سے کہنے لگے

[illegible]

اس گھر میں سب ایک دوسرے سے ڈرتے تھے۔ [illegible]

[illegible]

پھر بھی اس گھر میں سب ایک سے ڈرتے تھے۔

اُس نے ٹارچ کے لیٹ سے ملا کر روک دیا۔

میں کاٹھ کباڑ کے ڈھیر میں الماری کے نیچے پڑا تھا۔ تابان جس طرح جھک کر ٹینک سے اُٹھی تھی اس طرح [illegible]
اس کی آنکھوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

[illegible] جیسے میں بنگلے میں سو رہا تھا [illegible] اس طرف نظر آ رہے تھے
قبرستان میں [illegible] ——— [illegible]۔ میں نے [illegible] کے ساتھ [illegible] تک پہنچ کر
دروازہ کھولا اور ڈیوڑھی میں آ گیا

ایک دنیا میرے پیچھے تھی اور ایک دنیا میرے آگے۔ بیچ کے [illegible] ان کا درمیانی خلا لمحہ لمحہ تنگ ہو رہا تھا۔
میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دروازے کے پیچھے چھپ گیا

میں اندھیرے کالے دالان سے بھاگنا چاہتا تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے"

اس کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور اسے دیکھ کر میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے گرد ڈال کر مجھے
اوپر سے اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔

"تیرے گھر جانا ہے گا۔"

میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی

"تیرے ابا کا بیاہ ہے۔ ابے۔ تابان کے ساتھ۔"

اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی۔ اس وقت میرے سارے وجود میں آگ لگی ہوئی تھی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت
کے نرم ٹیلوں کے درمیان [illegible] زندگی
[illegible] کر لی۔

"ڈر۔ کمینہ۔"

وہ اس دالان کی طرح [illegible] اندھا تھا [illegible]
اور [illegible] تھا ——— میں وہاں سے بھاگ کر آ گیا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible] ساتھ ساتھ [illegible] تھے

[illegible]
[illegible]

[illegible] پاؤں کو دیکھتے کیوں؟

[illegible]

[illegible]

نہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہو کی حالت بارش سے شدید کر شاخوں میں چھپے اس پرندے کی سی ہوگئی جس کے سر پر اچانک اولے آ گرے۔ پر آپا کا دل چاہا کہ اس کے بیٹے کے سر پر سونے کی بارش ہونے لگے اور وہ کسی چاند ماری کے تختے کی طرح نظروں سے ہٹ جائے اور جب وہ سر پر کس کے ساتھ بیٹھے تو وہ اس کی مٹھی میں آ کر ذرات شمسی کی طرح بکھرنے لگیں۔

دروازے کے اس طرف وہ کر بجلیاں کرنے لگیں اور آپ نے خوش سے اپنے گرد سنہری تاروں کا جال بننے لگے۔ برکت بیٹی تو وہ خود بھی بیٹی کی موم کی طرح پگھلنے لگے۔

ایک شام برکت بی بیٹھ کا دروازہ نیم وا کیے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر کالا سا چولا بنا ہوا تھا۔ چنبیلی کی شاخوں پر ڈھلکی ہوئی دوائی کے سرے کی سول بجلیوں میں بیٹھے چھپے ہوئے تھے۔ اتنے میں برکت بی کی نظر ماسی رحمت علی پر پڑی اور وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر دری میں بھاگ گئی۔ آپا کو دیکھ کر ماسی رحمت علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ آپا اس خوابے کی طرح جہاں ہوا کیا۔ آگ نکل جانے پر سے اٹھے ہوئے قلمی بیلیوں کا جیسے تاش اندھیرے کی طرح کونوں میں صندوق کے پیچھے چھپے۔

اب پتہ نہیں وہ ماسی رحمت علی کی دور اندیشی کا نتیجہ تھا یا برکت بی کے منہ زور عشق کی تاثیر کہ اس روز ہوشیاری کر کے کنواری کو اکیلا چھوڑ کے سامنے برکت بی کو دلہن بنا کر گھر لے آئی۔ ماسی رحمت نے اپنے دادا کے ہاں بازار میں سہاگ کی اس کے تمام جوڑوں کو سمیٹ لیا۔ موسیوں میں رہنے والی مندر اندیش برکت بی ان سے وقت کے ساتھ ساتھ بیٹی میں سہاگ چھپا لی۔ شادی کے ہنگامے ذرا دب گئے تو سے وہاں سے گزرتے ہوئے کوٹھے کے اندر کھڑی بیٹی کا جائزہ لیا اور بھی بیٹ کو آپ کے شیشے کے اندر کھڑی ہو کر آئینہ میں طور پر جا کر بھر لیا۔ دادی نے سر کر جوتی طرف دیکھا۔ دبے پاؤں اس کے قریب آئی۔ اس کے سر پر دونوں ہاتھ گھما کر اس کی ساری بلائیں اپنے سر کا صندوق کی چابی اس کے سپرد کرتے ہوئے بولی

" بیٹی اب تک تم بیر دو دھوں نہاؤ پوتوں پھلو "

صدیقی انتظار اندھیرے کو اٹھا کر خاموشی میں چل گئی۔ آپا اس وقت صحن میں تھے۔ انہوں نے سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ سنا اور مرتا ہوں کر بنا کچھ کہے وہاں سے چلے گئے۔

سہاگ کی دو دو ہو گئے اور اس کے ذہن میں سہاگ کا جاب رہتا گیا۔ ان کا سر جھکتا گیا اور وہ ان کی مسکراہٹ جس پر آکھیں ملا تے ہیں وہ زہر بن گئی۔

وہی دوپہر کے ہاتھ کے رشتے سب کے درمیان جو ہر دم ہیں نے جی بھر کے آنکھیں کھول کر بار رکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار ستارے جل رہے تھے۔ اس روز یہ دم بھی ڈوب کر مسکرا رہے۔

دادی خوشی سے پاگل ہو گئی۔ وہ بیلی ہوتی آتی۔ ٹھٹھک کر بیٹھ کے دیکھتی رہی اور جب کے انتظار کے میں بیٹی کی تمنا لے لے جوان ہوا۔ آپا کی آنکھوں میں جگنو چمکتے اور بھی بولا کرتے تھے۔

وہ وہ بیٹی کو دادی نے اک ایک کی دعوت دے گئی۔

وقت گزرنے اس کی طرح دادی کی حالت ایسی ہو گئی جس کو پڑھ کر آپ اس طرف ڈال دیا گیا تھا اور بیٹھے ایک کو لا دیا اور اس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک منزل اور تھا۔

انھوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگے۔

[illegible]

جیسا میں نے پہلے عرض کیا [illegible]

[illegible]

"نوری، تم" [illegible]

[illegible]

[illegible]

بابا نے بیٹے کی بات سنی اور کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ مجھے بابا کے چہرے پر پہلے کبھی ایسی بےبسی نظر نہ آئی تھی۔ دل میں [illegible] ہوں

اس بات پر تعجب ہوا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں کہ وہ کس قدر دکھی ہیں۔ جیسے میں وہ زندگی بھر چھپاتے رہے تھے۔ وہ میرے

بچپن سے چاہا کرتے تھے کہ [illegible] دل میں [illegible] رہتی تھی۔

میرے بابا بہت دکھی تھے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ میں نے سوچا اٹھ کر ان سے بات کروں میں [illegible] جائے۔

پھر خیال آیا ——— کیوں نہ میں ہی رہ جاؤں۔ میرا [illegible] سارے [illegible] ہوئے تھے۔ [illegible]

[illegible] ——— میں [illegible] میں [illegible]۔ چاند نے میرے گرد سنہری تاروں کا جال سا بن

دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ قدم قدم ہی گلی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ [illegible] ایک قدم پر [illegible]

[illegible]۔ [illegible] وہ چاند [illegible] پکار رہی تھی۔

"بابا ——— بابا"

میں نے [illegible] قدم پیچھے ہٹ گیا۔ [illegible] گھر کی طرف جا رہا۔ [illegible] کے قریب [illegible]

ایک [illegible] میں [illegible] سے [illegible]۔

"اماں"

[illegible] ہاں تھی۔ وہ [illegible]

"تم نے بابا کو دیکھا ہے کہیں؟"

وہ [illegible] میں تو صرف [illegible]

——— گھر میں [illegible] کی طرف [illegible]۔

زرد پھول

وقار بن الٰہی

[illegible] اپنے دوستوں [illegible] جھٹکے [illegible]

[illegible] کبھی [illegible] شیشے

[illegible] ترتیب [illegible]

[illegible] چپ چاپ بیٹھا [illegible] فضا [illegible] اپنے آپ [illegible] نیم وا آنکھوں سے [illegible]

[illegible] بہت [illegible] نہیں چاہتا [illegible]

[illegible] پھول [illegible] بیٹھا ہوں [illegible] ہاتھ بھی [illegible]

[illegible] ایسے [illegible] مل گئے [illegible]

[illegible] آنکھوں [illegible] بہت [illegible]

[illegible] —— [illegible] محسوس ہوتا [illegible]

[illegible] سے [illegible] چلنے لگ گیا

ہے [illegible] درخت [illegible] چپ چاپ [illegible]

[illegible] —— [illegible] ہاتھ میں [illegible]

[illegible] تھا۔

[illegible] —— [illegible] پھول [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] یادوں [illegible]

[illegible] —— [illegible] نہیں [illegible] وقت نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] میں یوں محسوس کرتا ہوں [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] بیٹھا ہوں [illegible] پھول [illegible]

[illegible] چپ چاپ [illegible] —

[illegible] زندگی [illegible] بیزار [illegible] دنیا میں [illegible]

[illegible] کوئی بھی ڈاکٹر نہیں ہے۔ جیسے یہاں کیا آیا ہوں، وہ سلسلہ درد جاگ اٹھا ہے۔ درد پیٹ میں ہو تو اس کی تکلیف اتنی نہیں ہوتی لیکن اگر
[illegible] بھوڑے پھنسے میں یا پھیپھڑے بیٹھ جائے تو پھر وہ نہ جینے دیتا ہے اور نہ ہلاکت کو گلے لگاتا ہے۔

بہت کچھ تو سے پیتے ہیں لیکن پیٹ بھر نہیں ہوتا۔ متوسط میرے جیسے سیکڑوں تصویریں بنا ڈالتے ہیں لیکن کام کی [illegible] ایک بھی نہیں ہوتی۔ اسلم بھی انہی میں سے ایک تھا۔ سارے شہر کی برف میں [illegible] کر اس نے اپنی بلیک اینڈ وائٹ کو نکال [illegible] تھا اور تنگ [illegible] کرکے کہا: اس شام سے بار بار ڈرتا اور [illegible] پہنچنے لگتا جیسے کوئی بہت بڑا سرمایہ اٹھائے ہوئے ہو۔ سارے [illegible] چاک لاشے کے جسم پر سرخی کا رنگ کی سنسان راہوں پر جا پہنچے تو [illegible] نے ایک۔ [illegible] کے پاس جس ایک سنگار میں پکڑا گیا اور خود کچھ [illegible] سے پیچھے بیٹھے ۵ [illegible] ہماری تصویر بنا رہا ہو۔ میں تمہارا بیٹے بغیر نہ رہ سکا۔

[illegible] ہے۔ اگر اس نے تمہیں [illegible] دیے ہیں تو ـــــ میں نے بڑھ کر کہا وہ اس سے چھین لیا۔ [illegible] کر ڈھونڈ [illegible] [illegible] اس کے [illegible] میں اچھی تصویر دیں گے۔ پھر ـــــ اور میں اسے [illegible] ہوا پھر [illegible] کی لال [illegible] پیٹے تو ہم [illegible] تک [illegible] ہے۔ اول تو کوئی [illegible] چہرہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ [illegible] تو اس کے [illegible] اور [illegible] کے [illegible] بند تھی۔ ایک بلند [illegible] کی چار [illegible] ہو گئی تھی اور دکانوں کے [illegible] ستاروں سے باتیں کر رہا تھا اور بند دکانوں [illegible] کے سامنے [illegible] تھے۔ ایک نیلا [illegible] کی [illegible] نظروں سے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی دو تین [illegible] کھڑی تھیں۔ ایک کا [illegible] تھا اور باقی دو [illegible] سادہ کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ وہ سب لڑکی کی طرف [illegible] [illegible] بند دکانوں کی طرف [illegible] سے مجھے دیکھا

[illegible] میں اس کی [illegible] سے [illegible] ـــــ مجھے [illegible] ضرورت نہیں۔ میں نے [illegible] [illegible] بالکل پاس جا بیٹھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں [illegible] میں نے [illegible] [illegible] نہیں۔ میں نے [illegible] تصویر بنائی جب کہ وہ [illegible] پیچھے ہی [illegible] [illegible] بڑی [illegible] اور [illegible] کی [illegible] ہے۔

[illegible] جیسے ہی [illegible] اور ـــــ وضاحت کے دوران میرے [illegible] دیکھ رہا تھا [illegible] [illegible] بالکل [illegible] کی طرف دیکھا۔ [illegible] میں [illegible] اور وہ [illegible] [illegible] اچھا کرتی ہیں۔ مجھے لگتا تھا کہ جیسے [illegible] میں بیٹھے ہیں [illegible] [illegible] کو قتل کر دیا ہے [illegible] بھی [illegible] [illegible] پانی میں [illegible] گئی ہیں [illegible] خوشی [illegible] [illegible] تھا۔

[illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] چھوڑ [illegible] [illegible] کس وقت وہ مجھے [illegible] ـــــ [illegible] لگتا ہے [illegible] [illegible]

تو ہوتا ہے جیسے ابابیل اڑ رہی ہوں آپ بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ مجھے کتاب کا
مطالعہ کرتے ہوئے بہت اچھا لگا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ ایک دن میں نے سوچا۔ یہ کتاب ایک بار کھولی
تو اس میں بیٹھ کر پڑھتی رہی۔ پڑھتے پڑھتے میں نے سوچا کہ اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں ہماری دنیا
کے دن رات کی باتیں ہیں۔ کیا کسی اور کتاب ۔۔۔۔۔۔ تو بہت بڑا کام ہوتا۔ پہلی بار میں نے
اس کو پڑھنے کے بعد بہت کچھ نکال سکا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ میرا کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ کتاب کی کچھ باتیں اور اس کے خیال کے بارے میں ایک مضمون لکھوں گا:
پہلے میں نے سوچا کہ کوئی اور کتاب پڑھوں جس سے مجھے کچھ مدد ملے۔ میں نے کئی کتابیں دیکھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی
کہ وہ کتاب اس کے پاس تھی۔ کتاب اس نے میرے سامنے رکھ دی اور پہلے صفحے سے پڑھنے لگی۔ ایک ایک لفظ
اس نے پڑھا۔ وہ کتاب کے کئی صفحے پڑھ گئی اور پھر اس نے مجھے دیکھ کر کہا
کہ یہ جو آپ نے لکھا ہے یہ بہت اچھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا آپ نے یہ کتاب پوری پڑھی ہے۔ اس نے کہا
نہیں، ابھی تو آدھی پڑھی ہے۔ وہ بولی کہ اس کتاب کے بعد میں نے اور بھی کتابیں پڑھی ہیں۔ کتاب کے
متعلق میں نے بہت کچھ سنا ہے۔ وہ کتابیں تو میں نے بہت پہلے پڑھی تھیں۔ کچھ برس پہلے میں نے
یہ بات بھی سنی تھی کہ آپ نے اور بھی کتابیں لکھی ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ ان میں کیا لکھا ہے۔
پہلے میں نے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھنا چاہتی ہوں۔ وہ میں اسے پڑھ کر آپ سے بات کروں گی۔ اس کی باتیں سن کر
مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے کتاب بند کر کے اس سے کہا۔

۔آپ مصروف ہیں تو میں آپ کو یاد دلا دوں ۔۔۔۔: وہ کچھ کہہ کر بولی کہ میں نے اس کی پریشانی کو شاید بھانپ لیا۔
پھر وہ مسکرا دی۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے بھی کتاب بند کر دی۔ سارے صفحے پلٹ کر درست کیا اور
کھڑی ہو گئی۔

۔سب کچھ غلط ہو رہا ہے۔ آپ کو یاد دلا دیجیے ۔۔۔
۔میری بھی ایک عادت ہے کہ ساتھ ایک کتاب کی تصویر ۔۔۔ : باقی فقرہ اُس کی ہنسی میں ڈوب گیا۔ وہ ہنستی رہی
کے بعد اس نے کتاب اٹھا لی۔ پھر اس نے میرے سامنے کتاب رکھ دی اور چلی گئی۔
۔میں بھی کہوں۔ یاد کیجیے کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے۔ سچ کہوں تو آپ نے بہت عمدہ بات کی ہے
میری بات۔ جب میں بھی زیادہ نہیں پڑھ سکی۔ صرف اتنا کہ میں نے کتاب کی تعریف میں دو چار جملے کہے اور
ہو گیا

۔اس وقت آپ کہیں تو میں بتا دوں گا۔ بس ۔۔۔۔۔ اُس نے یہ بات کہہ کر اپنا بیگ اٹھایا اور جب
چپ چاپ باہر نکل گئی ۔۔۔۔ اس نے کچھ کہا۔ وہ چپکے سے میرے پاس بات کرنے لگی

در اصل شہناز کا لمس میں نے بالکل بے باک خوشبو تھی جو بنی ہے۔ تبھی وہ میرے اندر گھس گئی میرا ارادہ خوشبو سے دور اس طرف بکھر گیا ہے۔

میں یہیں بیٹھا تھا صبح سے یہیں بیٹھے ہوئے تھے جو ٹھیک اسی طرح جیسے میں جب میں نے پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھ کر اپنا ہاتھ
اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ کتنا مشکل ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ لیکن اب سے دور کر دینا تو پہلے ہی سے طے تھا۔ تم ان کا منہ بند کر دیتے ہو۔
شہناز کے ہیں میرے چہرے پر لکھا سب کچھ ہے۔ آخر کیوں میں نے قسمت سے ایک عام سی لڑکی کے لیے میں نے چاہا تھا اور
اگر میں جب وہ پاس بیٹھی گئی تو میں نے خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ وہ بھی نہیں دیکھ سکتی اور یہ بات کہ لیکن نہیں
اس نے بھی دیکھا نہیں دیا۔ بچے کی طرح کی ساری باتیں بہت کچھ کہتی تھیں اور بس ——— اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں

شام ہوئی میں نے تھوڑی دیر پہلے جب میں گھر سے نکلا ہوں تو میں نے کرتا شاپنگ سنٹر کا چکر لگا کر اپنی دونوں ایک
جیب سے نکال کے دوسری جیب میں رکھ لیے تھے۔ نہیں یاد آیا باہر نکلتے ہوئے دروازے کی آواز میں بیٹھتے ہی میں نے اپنا دیکھا تھا
کے آخر میں بھی وہی سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش ہو گئی۔ زینے کے نیچے بیٹھے ہوئے جب پہنچا ہوں اور گیٹ کھولنے لگا میں نے ہاتھ
اٹھایا تو دیکھا تمہارے ہاتھ کے پاس سے گزرتے ہوئے لڑکی دو بیٹیوں نے مجھے پکارا۔ میں نے سوچا جانے کون ہیں
یہ لوگ ——— اور پھر پتہ نہیں انہیں میرا یہاں آ کر رہنا کیسا لگا۔ میں گیٹ کھولنے کی جگہ ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ دونوں میرے
سامنے تھے۔ ایک جو چھوٹا تھا اس نے پوچھا کیا ہے، پھر کچھ باتیں کرتے ہوئے ان کے اوپر آنکھوں کے نیچے کا گوشت ڈھلک
رہا تھا۔ دوسری عورت تھی جس نے اپنے سامنے میرے کو کسی طرح پکڑ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو کچھ تھا اس کا ایک حصہ اس نے
رنگ کر کے دکھایا جیسے میرے چہرے کے نیچے جو آدھا بازو میں اپنا ہاتھ ڈال کے سڑک پر اتر گئی۔ میں نے ان دونوں کو نہیں
کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مرتا کیا میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے لوگ نہیں دیکھے جیسے لوگوں کو دیکھنے کی تمنا نہیں کی جو زندگی کو بس پیش
کا مرحلہ سمجھتے ہیں اور جو گناہ سے کر کے طے ہوئے ہوں۔ یہ دونوں کے طرح ہوں۔ وہیں تک کے سوچا بھی کہ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں مجھے
چاہے نہیں ہو تو میں کچھ کیسے میرے ساتھ آیا۔ مجھے کچھ نہیں دیے تو ہر وقت ہو میں نے بہت زیادہ تھی۔ پھر جب میں پہنچا
تو گیا۔ سامنے والا قریب بیٹھا میں تھوڑا سا کمرے میں اندھیرا ہے بہت سارے چہروں کی دو پلکیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے گھر کے پیچھے
کے کسی کمرے میں ہاتھ رکھا تھا۔ اندر کمرے کے کسی کونے میں گھنٹی بجی اور دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا وہ اندر آئی۔ میں نے
اندر روشنی میں اسے دیکھا۔ وہ کچھ سہمی سہمی سی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جو کچھ تھا اس کا نام میں نہیں جانتا۔ وہ جیسے چپ چاپ آنسو کہہ رہی تھی اور
کمرے میں کسی کو جو کچھ پڑھ کر سنانے کو گھر کا سارا حصہ الٹ دیا ہو۔ اس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں میری طرف تاکتے ہوئے بولی:

"آپ نے بہت دیر کر دی۔ میرا خیال تھا آپ آ رہے ہیں۔ مجھے پتہ تھا۔" "چلیے، اچھا ہی کیا آپ نے۔" میں نے اپنے
پاؤں کے نیچے زمین سے ہٹ کر دیکھا۔ وہ کیسا ہے کہ میرے ہی کمرے میں کھڑی ہے کہ جیسے وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہو! "بیٹھیے" میں نے جیب پر ہاتھ رکھا
میرے پاس ہے جو پیسے کمانے کے بعد ختم ہو گئے تھے کیا۔ لیکن دل نہیں مانا۔ یہ وقت ملنے کا نہیں ہے۔ یہاں تو تم
دونوں بیٹھ کے لیے لیکن یہیں کچھ دیر بیٹھنا ہے۔ زندگی بھر کے لیے ایک کونے میں بیٹھ جائیں تو زندگی کا سوال ہی نہیں
کہ ہم نے ان کا بازو دیا اس میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کسی قیمت سے قیمتی ہو سکتا ہے اور ہمارے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ میں

[illegible]

[illegible]

میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

— آپ یہیں [illegible]

— [illegible]

— آپ یہیں [illegible]

— نہیں تو ——— [illegible]

[illegible] ———

میں نے نہیں [illegible]

[illegible]

— [illegible] ——— [illegible]

کمرہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

• کب تک چلو گی ——— وہ دور کہیں خلاؤں میں دیکھنے لگی۔

• ابھی چند برس پہلے ——— تم بے حد مصروف تھے۔ میں نے سوچا تمہیں [illegible] ——— میں نے [illegible] کرنے کے بجائے اس کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں بھی بڑی ہو گئی تو [illegible] کی باتیں کرنے لگے۔ [illegible] میں نے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔ معلوم ہوتا ہے [illegible] [illegible] چلتے چلتے اکیس برس کی عمر ہو گئی۔

• شعر بہت اچھا ہے ہم لوگ [illegible] کر لیتے ہیں۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی بات ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔

• بہت سنجیدہ قسم کی باتیں پسند ہیں نا ——— ؟

• میں نے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تو بہت دور کی بات ہے۔ جس کی کتاب سامنے آ جائے۔ اس کو پڑھ لیتی ہوں ——— پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

• مجھے فاصلہ ہو گیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔ زندہ رہنا مشکل ہو گیا ——— میں نے [illegible] کے دروازے تک چھوڑنے واپس آیا

اس روز میں گیلری میں سے اُٹھنے لگی تو پتا ہی نہیں تھا پھر بہت دیر ہو گئی [illegible] [illegible] بولنے کی بات یہ سوال پھر اٹھا ہوا میرے سامنے آیا کہ میں کیوں زینت سے بات نہیں کر سکا [illegible] نہیں بلکہ اس سے [illegible] اس کی شخصیت [illegible] شاید اس لیے کہ [illegible] [illegible] وہ [illegible] نہیں تھی۔

زینت سے اس کے بعد [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

وہ کسے یاد ہو گیا تھا، بہ عذر کسے دیکھا تھا۔ جا بجا بہت سے ٹشو پیپر کا گچھا بھیگا تھا ہیں وہاں تین ٹیکو دو پڑا تھا کہ اس پر کوئی سبز شاخ
ہو جس پر کوئی پتا پھوٹتا ہو نہ تھا کہ کوئی پتہ ہو نہ تھی کوئی پھول کھلتا ہی تھا۔ میری ریاضت کے باوجود وہ ہمیشہ ہی خشک رہا پھر
ہو جاتا ہے نہ تھا کہ کسے شک بھر ہیپیک تھی۔ زین کو ہر مرتبہ ہی کے بیج کے کی پودا لا دیا۔ آہستہ آہستہ یقین سا ہو گیا کہ زین کی
سے کبھی کوئی کلی نہیں چٹکے گی۔ اس کے گالوں پر کبھی گلاب نہیں کھلیں گے۔ اس زردی کی جائے اس کے چہرے پر کبھی سرخی نہیں آئے
گی نہیں ـــــ اس عذر کے بعد میں پہلی مرتبہ تو اس سے پروفیسر حامد کے ہاں ملا تھا۔ حامد کی بیوی بڑی عجیب عورت تھی۔ میں نے
لکھی کی تصویر یہ بنائی تھی اور ایسی خالی انتہا کے ال لگا تھا جیسے اس نے مستقبل کچھ یوں دیا تھا جیسے میں اس کا ہیچ کرتے ہوں۔
کے کھلے سے وہ سال سے وہ شیطان کا کٹ ہم میں ہم اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ سورج کی اودی کرنیں سامنے دیوار
تک پھیلی غائب نہ ہو گئیں۔ مجھے یاد ہے زین نے ہنستے ہنستے اپنی آنکھوں سے دیکھتے، اپنی آنکھوں کو گرا کے نیم گرم نیم سرد
زمین کو کہا تھا۔

"یہی تو بات ہے کہ انسان ہمیشہ ہمیشہ محروم رہا ہے۔ وہ بنیادی حقیقت کو اتنا جو نہیں کر وہ تو ایک کلو نے سے زیادہ کچھ بھی
نہیں ہے کہ کوئی خوشی اپنی کو تو بس یہ ہے، نہیں تو دکھ غموں کی دلدل اور دکھ اس میں دھنس کے نیچے جاتا ہوا انسان ـــــ" پھر اس
نے پھولوں کو اٹھایا۔ میں گھبرا کے پروفیسر کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن مزہ تو جب ہے کہ یہ خوشی وہ خود چھین لے ـــــ" پروفیسر نے گراں پیپر کے عنصری حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"وہ گڑیا ـــــ تو تو بڑی گہری باتیں کرنے لگی ہے۔ یونیورسٹی تو تمہیں فلسفے کے چکا دے کے پاس چھوڑ آؤں لیکن یہ ہمیشہ یاد
رکھنا چھین کے جو خوشیاں حاصل کی جاتی ہے۔ کوئی پتا بھی اس کو گرد میں نہیں آ کرتی ـــــ" زین نے کہا "کچھ بھی نہیں، صرف پروفیسر کو
یا لیکن چہرہ یہ جیسے وہ کر گئی ہو۔ حسن سنبل کی سنے والے پروفیسر تم کیا جانو ـــــ"

وہاں سے نکلے ہم باہر سے پیٹ کر پیچھے پھر لوٹ کے ہاتھ پہنچنے لگا تو جانے کیوں میں ایک کے پیچھے پہلے اور بس میں نے
اچھے میں ـــــ میں نہیں ہوں۔ اپنی کوٹھی کے سامنے رک کے زین نے مجھے دعا دے کی دوات دی لیکن میں نے کلاس کر جانے کے
بہانے ٹال دیا۔

دوسری اور تیسری مرتبہ بھی وہ مجھے ملنے آئی۔ وہ شاید حامد کا ہی ساتھ لائی تھی۔ وہ میں لیڈی آف شنگ سے فارغ ہو کر بیٹھی تو اس نے جب
سب میں کافی مصالحہ لیموں قوت سے نکیل کے سامنے رکھے تو میں نے اس سے کہا۔ "تم نہیں بولی گیا ـــــ؟"
"میں گھبرا گئی ہوں اور پھر ـــــ تم سادہ والے تم کتابوں سے الجھتے رہتے ہو، تھکتے بھی تو نہیں۔ پتہ نہیں تم نے تاریخ
کی کتنی گرد دی ـــــ" پھر شرماتی ہوئی کے اس نے کہا۔ "کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے ان کتابوں کو جلا دوں، تمہاری آنکھوں
میں اپنے زندگی ہمیشہ کا جاتے ہیں لیکن ـــــ تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔"
"اتنی نفرت اپنے ذوق ہو ـــــ"
"میں اتنا چاہتی نہیں ہوں کہ میں وہ کتابیں کہ جن کی دو انسانوں کو کچھ بھی نہ دے سکیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات سن لے میں کہ بارہ

ہاتھوں پر جو ملکہ کا پیلا [illegible] چمکتا ہوا ہوئے ہم ——— تم آپ کو ان باتوں سے کیا دلچسپی ہے ——— اس نے یہ بات کچھ اس طرح کہی جیسے وہ زندگی کی جنس کے لئے ہو۔

"قسمیں ہیں۔ ایک عمر تو اب یہ کرتے گزر گئی ہے وقت ہوں۔ جیسے کہ آپ تھک گیا۔"

"نہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے۔" وہ ہنسا جیسے ہم جیسے ہیں اس بات کرنا کہ تو کچھ ہو۔ "اور جیسے تم۔ یہ زندگی بھی سب کچھ ایک تماشا ہی تو ہے ہی ——— "

"کیا تم ہوا یہ مطلب ہے۔ یہ سب اس حال سے تنگ آ گئی ہو۔"

"ہاں تعداد زیادہ نہیں۔ تقریباً ختم کر چکا ہوں۔ اب تو شاید کھانے کا بھی وقت آ گیا ہے۔"

پھر وقت کے ساتھ ہم دونوں کی شام کے وقت آتے رہے اور ایک ایسا تعلق قائم ہو چکا کہ اس کے بغیر [illegible] جیسے بہت ادھوری ہو۔ پھر ایک دن کسی وجہ سے وہ نہیں آ سکا اور میں اکیلا بیٹھا رہا۔ زندگی کی تنہائی کا احساس ایک بار پھر جاگ اٹھا۔ وہ ایک عجیب کیفیت تھی ——— جیسے ہم سب کچھ کھو دیں۔ وہ تو بچے کی طرح اداس ہو گئی تھی۔ خوش کیوں تھی۔ مرنا ہے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ جب آپ بھی چلے جائیں تو ہم خوش ہو گئے ———

پھر زندگی دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر چلنے لگی۔ اس روز بھی ہم حسبِ معمول باتیں کر رہے تھے، جب وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ اس کے کانوں میں شاید کوئی آواز آئی جیسے کچھ نہیں ہے تو پھر سے کیوں نہیں بیٹھا۔ اچانک وہ کھڑی ہو گئی اور جیسے بہت دور کہیں دیکھنے لگی۔ اور پھر اس طرف چل پڑی۔ جیسے کہ چہروں کا حسن اس کی طرف کھینچ رہا تھا۔ جیسے زندگی کبھی ختم نہ ہو۔ اس کے چہرے کی سرخی جیسے میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ جیسے ہم دونوں نے بہت سی باتیں کی ہوں اور وہ پھر سے چپکے سے آنکھیں بند کر لینا چاہتی ہو کہ یہ سب کچھ پھر سے ہو جائے گا۔ وہ جانے کے بعد بھی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

میں وہاں بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ سڑک سے اترتے ہوئے پھر اس کی یاد آئی۔ وہاں پر ہمیشہ ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ ایک عجیب سا سکون میرے سارے وجود میں پھیل گیا تھا۔ جانے کیوں میں نے اس کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ میں اسے کبھی بھی نہیں بھلا سکا۔ وہ نہیں۔ یہ غلط ہے۔ میں اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اس کے بارے میں سوچ کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے زندگی کے چہرے کا عکس وہاں موجود ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں بیٹھ کر دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کچھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ چاند کی چاندنی پر اداس آنکھیں اٹھا کر مجھے بہت دور تک دیکھتی رہتی۔

وہ دوبارہ نظر نہیں آئی۔ میں تیسرے روز جاتے ہوئے اس کے گھر کے سامنے سے گزرا کہ شاید نظر آ جائے ——— لیکن دروازہ بند تھا۔ میں نے کئی بار اس کی آنکھیں دیکھنے کی کوشش کی جیسے آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ جیسے زندگی میں اپنی تھی۔ اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش بڑھتی گئی۔ کئی مرتبہ میں نے کوشش کی کہ اس کے دروازے پر دستک دوں ——— چند سطریں پڑھ کر میں نے کتاب بند کر دی ——— پھر وہ زندگی میں دوبارہ کبھی نظر نہیں آئی۔

سے گھر جا رہا تھا [illegible] گیا اور کسی نے مجھ کو جواب دیا تو جیسے میری نیند ٹوٹ گئی۔ جیسے میرا خمار اُترنے لگا۔ ایسا خمار جس نے میرے ذہن کو پاگل سا کر دیا تھا۔ میں نے دو موٹی کتابیں زینت پر رکھیں۔ ایک کتاب لے کے بیٹھ گیا۔ نظریں کتاب پر تھیں مگر میں سوچ رہا تھا۔ میں یونہی بھٹک گیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ زینت مجھے دوست سمجھتی ہے اور اسی طرح ہم کئی دوست بن سکتے ہیں۔ زینت نہیں تو کیا ہوا۔ مجھے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے [illegible] کہہ رہی ہے۔ میں بھی کتاب [illegible] اور کتاب زیادہ مشکل سے پڑھنے لگا لیکن ـــــ صرف ایک پیرا گراف پڑھ سکا تھا کہ میں نے پھر کتاب پٹخ دی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔

”کہیں زینت تو نہیں آگئی ـــــ؟“

لیکن وہ ایک چپراسی تھا جو لائبریری سے کتاب لینے آیا تھا۔

پھر بہت دیر کی بات ہے۔ یونیورسٹی بند ہونے والی تھی اور میں اپنے تھیسس پر کام کر رہا تھا کہ ایک روز زینت اچانک ملی۔ اس کے بالوں میں سفید سفید تازہ مہکتے پھول تھے۔ کپڑے سادہ تھے لیکن ان میں سے دیسی دیسی خوشبو آ رہی تھی۔ اہتمام زیادہ تھا لیکن پتا چل رہا تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بہک نہ سکے لیکن میں اس اہتمام سے زیادہ اس کے مزاج کی نفاست کو سراہتا رہا۔ جیسے ہی ہم ملے میں نے اس سے کہا

”میرا خیال تھا تم مجھے یہاں نہیں ملو گی تمہارے تھیسس تو کب کے مکمل ہو چکے تھے۔“ میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا کہیں وہ میری کمزوری کو تو نہیں بھانپ گئی۔ کہیں وہ [illegible] تو نہیں کر رہی پر اس کا چہرہ تو اس کا ساتھ دے رہا تھا [illegible] ہو۔ میں نے چاہا اس سے [illegible] کا شکوہ کروں۔ میں نہیں کر سکا۔ میں نے چاہا اس سے پوچھوں [illegible] نہیں۔ میں نہیں پوچھ سکا۔ میں نے چاہا اس سے اپنی ساری بے تابی کہہ دوں میں نہیں کہہ سکا صرف اتنا پوچھا۔

”تمہارے والدین کیسے ہیں زینی ـــــ“ اس کے چہرے کا رنگ تھوڑا سا بدل گیا لیکن تبدیلی [illegible] اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے ہاتھوں سے جیکٹ کے بٹن کو [illegible] کی ناکام کوشش کر رہی تھی

”ٹھیک ٹھاک ہیں ـــــ“ میرے سوال پر مجھے خیال آیا۔ میں کیوں اس کے ڈیڈی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ میں نے آج تک انہیں جاننے کی کوشش نہ کی تھی ورنہ اس نے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ کیسے ہیں۔ پھر میں نے سوچا اگر میں اس سے یہ سوال [illegible] کیا ہے“ مجھے معلوم [illegible] ہے اس کے ڈیڈی ہیں تو نہیں۔

مجھے اس روز [illegible] جو [illegible] ہوں وہ مناسب نہیں ہے۔ اب زینی [illegible] ہے تو میں خوش ہوں۔ میں پہلے [illegible] بھول گیا ہوں۔ بس [illegible] اس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ [illegible] باتیں کر رہا ہوں۔ زینی نے [illegible] پوچھا۔ [illegible] ـــــ اس کے چہرے کو دیکھا اور اس کے [illegible] جیسے اس کے چہرے پر [illegible] چاہت تھی لیکن [illegible] اہمیت دینے لگ گیا تھا۔

: یہ حقیقت تو [illegible] نہیں۔ [illegible] تھا [illegible] ہو جاتا۔ وہ [illegible]

[illegible] ہے ——:

: دوسرے [illegible] مستقبل ہے جو چلا ہے ——

: یہ کہہ کر [illegible] بہت [illegible] نہیں [illegible] لیکن [illegible] سے [illegible]

[illegible] اس کی آنکھیں [illegible] مسکراہٹ [illegible]

نہیں گیا۔

: بہت اچھا ہے۔ [illegible] بڑی خوشی ہے۔ [illegible] مستقبل [illegible]

[illegible] زندگی [illegible] نہیں [illegible] ان کے ساتھ [illegible]

[illegible] تم [illegible] زندگی [illegible]

بہت اچھا ہے

: [illegible]

[illegible]

[illegible]

: [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بستر مشکل ہی سے نکلا تھا۔ میرا موضوع ٹائپ ہو رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے اُس کی جلدی فکر کرنی تھی۔ اور پھر تبسم جی کے ایک دور دراز گاؤں میں پہنچ جاتا تھا۔ بہار کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ یونیورسٹی کھل گئی تھی۔ تبسم اب نرسری کی ڈگری پڑھنے لگی تھی۔ وہ نرسری سکول اب بھی تھے ٹیلیفون پر وہ لوگ پوچھتے رہتے تھے۔ بھئی! کمال ہو رہی ہے۔ لیکن وقت نہیں نکلتا۔ گزرتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے وہ لوگ میں ذہنی کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ بڑی محبت سے کھانے پر بلاتے تھے۔ کبھی کبھار ٹیلی فون بھی کر لیتا تھا لیکن پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ صرف ایک روز جب میں نے ٹیلی فون کیا تو کسی نے بتایا کہ تبسم رخصت پر ہے۔ میں بہت گھبرا گیا تھا اور پھر میری بہت ہمت نہ ہوئی کہ پوچھوں۔ جو ہے پوچھا۔ کہہ دیا اچھا ٹھیک۔

پھر اس روز جب میں تبسم جی کے یہاں دوبارہ گیا تو میز پر بیٹھا اور اس میز پر بیٹھے۔ سال کے صرف سرد رُت شروع ہونے والی تھی پہلے کی طرح چہرہ چمک رہا تھا زینی آ گئی۔ اس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بالوں میں سفید پھول اور ہونٹوں پر اداسی کی مسکراہٹ تھی۔ میرے سامنے بیٹھ کے اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"میرا تو خیال تھا تم اطلاع دیے بغیر ہی چلے گئے ہو گے۔ تبسم صاحب کو فون کیا تو پتہ چلا کہ تم ابھی تک یہیں ہو۔ اور ستم ظریف ہو کر بیٹھے ہو۔" دراصل جذبات نے ایک ساتھ مجھ پر یورش کر دی تھی اور میں مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گھما کر غور سے مجھے دیکھا۔ پھر چپ چاپ سر جھکا کے ایک پرچہ اٹھایا اور ورق الٹنے لگی لیکن اس کی مسکراہٹ جا چکی تھی۔ اس کے چہرے پر چھپی ہوئی تھی۔ میں جو اُجڑا ہوا تھا پھر جیسے خود کو سمیٹ کر کہا

"تم تو ایسی دیر تک خاموش رہے۔ زینی، تم کچھ کہتی کیوں نہیں۔ تمہیں بتاؤں تمہارے دل میں کیا ہے لیکن ٹھہرو پہلے تمہیں یہ بتا دوں کہ میرے اندر کیا ہے؟" میں اس سے سب کچھ کہہ گیا سب کچھ —— زینی پہلے پہل دیکھتی رہی اور چپ اٹھتی رہی پھر اس نے پرچہ رکھ دیا۔ اور اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔ وہ پھر اس نے تھرا رہی ہے ہاتھ کی انگلیوں میں لیکن وہ دیر میں اس کے ہاتھ کا رنگ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی طرح جو اس کے بالوں میں رات ہے تھے کانپتے ہونٹوں سے اس نے جیسے بہت دور سے بولی۔ جو اپنی آنکھیں جھکائیں اور جیسے دور نہ جانے کہاں کیسی سی تھی اس کی ...

"تم نے غلط کیا۔ اب میں نہ کسی منت سے جانتی ہوں۔ میرا خیال تھا تم کوئی بات کہو گے لیکن —— تم نے اگر میری صحت میں کچھ پایا ہے —— مجھے تمہاری صحت میں سب کچھ مل گیا ہے۔ لیکن میں نے تم سے کہا ناں یہ میرے اندر جو تمہیں محسوس ہو رہا ہے وقت نے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ اس کے نیچے تمہیں زینی کچھ کرنے کی کوشش کرے تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ وہ کہنا چاہتی تھی لیکن نہیں۔ مجھے تمہیں بتا دینا چاہیے تھا کہ اب جیسے وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت درست ہو گئی۔

"تم میرے قریب سے واقف نہیں ہو۔ تمہیں ابھی کچھ نہیں پتا ہے۔ تم ... مجھے تمہارا تھا کہ تم سنا نہیں تم خود ہی سمجھ گئے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا وقت جو گزر رہا ہے وہ خوشی کسی کی تقدیر میں نہیں۔ ہاں جو کچھ نہیں۔ کہ وہ جانے اتفاقات سوچتے تو سوچتے وہ بھی ختم ہو جائے۔ ہم دونوں نے چند لمحے ایک ساتھ گزارے ہیں۔ جن میں خوشی سے

[illegible] ہیں [illegible] کی [illegible] کرتی ہے۔ [illegible]
[illegible] نہیں مل سکتی —

میں نے [illegible] ——— تم زندہ ہو؟

[illegible] ڈیڈی [illegible] تم نے [illegible] ایک [illegible] ۔ پھر [illegible]
[illegible] ۔ وہ میرے ڈیڈی ہوتے [illegible] تھی [illegible] شعر [illegible]
[illegible] بہت [illegible] ——— میرے ڈیڈی [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ہے [illegible]
[illegible] تم [illegible] ہے۔

[illegible] میرے ڈیڈی [illegible] نہیں [illegible] تھے [illegible]
[illegible] تھے [illegible] تھے [illegible] ایک [illegible]
[illegible] میرے ڈیڈی [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] تھے [illegible] ایک [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] میری [illegible] ڈیڈی [illegible] نہیں [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] تھا [illegible] میں نے [illegible]
[illegible] میرے [illegible] ہے [illegible]
[illegible] میں [illegible] میری [illegible]
میرے ڈیڈی [illegible] تھا۔ [illegible] میرے ڈیڈی بہت [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] ——— [illegible] ہوتی ——— ۔

[illegible] ہے [illegible]
[illegible] میرے ڈیڈی نے [illegible] نہیں [illegible] ہے [illegible]
[illegible] میں نے [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] ہے [illegible]
[illegible] میرے ڈیڈی [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ڈیڈی [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ہو جاؤں بلکہ سب سے اچھا ہے کہ کام ہی نہیں ملتی۔ انھوں نے مجھے سرسری سی تسلی دی۔ کوٹھی کے اچھے کمروں میں کبھی نہیں گئے
[illegible] تو چند دنوں کا بیشتر حصہ ان کی یادوں میں ان کے زمانے میں گزرتا ہے۔ پر اب ——"

میں وقت نہیں ہے شوق تو میں کچھ کر نہیں سکتا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے لگتا تھا بالکل نہیں، احساس گیا تھا اور
[illegible] جاگ رہا ہوں اور —— یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی سینما ہال میں بیٹھا ہوں اور ایک بڑی فلم کی تصویر دیکھ رہا ہوں کہ میں کے
ایک ایک کر کے نہ جانے کیسے نکلتے جا رہے ہیں۔ میں نے بے بسی سے اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کی۔ دو چار مرتبہ کرسی پر پہلو
[illegible] زینی کی طرف دیکھا۔ جس میں اب شاید نگاہیں اٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ پھر میں نے اس کے سامنے سے کپ اٹھایا۔ تھوڑی سی کافی
اور جب سے پیتے پیتے سوچا کر بڑی پریشانی سے پوچھا

"دیکھو زینی، میں نے تم سے کہا تھا۔ اس کا تعلق تمہارے ڈیڈی سے تو نہیں۔ پھر ——" زینی نے اتنی سی دیر میں پہلی مرتبہ
اٹھایا میری طرف دیکھا اور کسی قدر بے بسی سے بولی۔

"تمہارا قصور نہیں۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ تم سچ کے ساتھ چھوڑ جاتے ہو۔ میں تمہیں سمجھا سکوں گی یا نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس
[illegible] میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔" اس کی نگاہیں جھک گئیں اور میں سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ صرف اتنا کہ آپ کیا اس لیے کر
دینا چاہتی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں

"نہیں ڈیڈی کا میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی۔ کچھ بھی ہو۔ آج سے چار پانچ برس پہلے انھوں نے سروس چھوڑ دی تھی کہ ایک [illegible]
[illegible] تھے نہ بچے۔ ان کے پاس جائداد کافی تھی لیکن سب کچھ شراب، کلب اور ان چیزوں کی نذر ہو گیا۔ دوست ہوتے ہیں تو یہ تینوں دوست ہیں
[illegible] دوست۔ دولت، ہم لوگوں کی عزت بھی دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں آ کر کے یہ کوٹھی ہی ہم رہتے ہیں۔ وہ بھی چند [illegible] ہوئے ایک
ہے۔ ان کے پاس اب اتنا ہی ہے۔ [illegible] دو چار ماہ اور گزر جائیں۔ پھر —— اس کے بعد ——" اس نے سر نہیں اٹھایا۔
مجھے محسوس ہوا جیسے وہ بات کہنا تو چاہتی تھی لیکن اس کا حوصلہ جواب دے گیا ہے۔ اور زینی نے اس کی آواز کو دبا دیا ہے۔ میں نے سوچا
[illegible] کی بات ہو سکتی ہے جس نے اسے یوں [illegible] پوچھا۔

"پھر —— اس کے بعد کیا ہو گا زینی۔ تم خاموش کیوں ہو گئی ہو ——"

زینی نے ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا پھر دونوں کہنیاں میز پر ٹیک دیں اور گردن جھکا کے دونوں ہتھیلیاں گردن پر رکھ لیں
[illegible] کی طرح ہو گئی تھی۔

"میرا خیال تھا تم سمجھ گئے ہو گے۔ ڈیڈی کو روپے کی اشد ضرورت ہے [illegible]
[illegible] جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ میرا زیادہ ہی خیال رکھنے لگے ہیں۔ [illegible]
[illegible] بیٹھ [illegible] ہوں۔ [illegible]
[illegible] مجھے میں تو سب [illegible] بھی بات نہ رہی تھی۔ [illegible]

"تو میں نے [illegible] اپنے ڈیڈی کا اچھا [illegible] ——؟"

[illegible]

اس نے جانے کے لیے قدم اٹھایا تو میں نے جلدی سے کہا

"سنو زینی سنو تو ـــــ ہم ـــــ" وہ فوراً رک کے پلٹی اور میری بات کاٹ دی

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی۔ تمہیں اگر پہلے سے تو تم جو باقی ہو۔ ہے ہو وہ کرتا ہی رہے، پھر میرا باپ ہے اور اُسے تم نے بغیر میرے تمہارے ساتھ چلی گئی تو وہ میری لے کا کیا ـــــ آخر کس ماں کی اولاد ہے ـــــ اور میں کسی صورت نہیں سن سکتی تھی۔"

پھر اس نے تیز تیز قدم اٹھائے اور باہر نکل گئی۔

میں نے اس پر بندش کی کوئی نہیں کی۔ پیچھے سے باہر چلا گیا۔ میں کہاں کہاں نہیں پھرا۔ سالوں تک کے ملک سے اس کا ذہن نہ جا سکا ہوں۔ مجھے کہیں بھی زینی جیسی لڑکی نہیں ملی۔ مجھے کہیں بھی وہ ٹھنڈا سا پسینہ نہیں آیا جو ان دنوں میں مجھے حاصل تھا جب زینی میرے ساتھ تھی۔ کبھی میرے کانوں میں تو آواز کے رس سے آشنا نہیں ہوئے۔ اس کے بعد زینی نے کبھی مجھے ٹیلی فون نہیں کیا، کبھی خط نہیں لکھا اور نہ ہی کبھی ملنے کی کوشش کی۔ ایک بار سڑک پر جا رہی تھی تو مجھے دیکھتے ہی ایک دکان میں چلی گئی اور میں اُسے جگہ جگہ تلاش کرتا پھرا۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ جانے کے باوجود کہ وہ کہاں ہے، میں نے دوسرے شہروں، دوسرے سالوں اور دوسرے گھروں میں تلاش کرتا رہا ہوں۔

ایک مدت کے بعد ... کے آیا ہوں تو معلوم ہوا ہے کہ زینی کی شادی ہو گئی ہے۔ ... [illegible] ... کے لڑکی نے اسے بتایا ... [illegible] ...

سچ پوچھو تو ... [illegible] ... خوش ہو ... [illegible] ...

تم ... [illegible] ... مجھے کبھی ... [illegible] ... نہیں لیکن کبھی بات ضرور ہے کبھی کبھی کی ... [illegible] ... کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا تھا ... [illegible] ... تھا ہوں کہ پیار دیا ہے ... [illegible] ...

... [illegible] ... ہوتا ہے۔

زمین کا درد

اقبال متین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پا جاتا ہوں کہ مجھے اتنے شور میں کہ میں یقیناً فارغ دلی سے جا سکوں — لیکن اتنے شور میں کہاں سے لاؤں — چاند تک پہنچنے والا دور بھی اتنا شور مچا رہا ہے کہ اس کے پاس بھی شور کا علاج نہیں رہا ہے — اور میں اپنے اس دور میں پیدا ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر شخص جیسا ہوتا ہے

کہانی شاید اسی طرح شروع ہوتی ہے جیسے میں تمہیں سنانا چاہتا ہوں — کہانی تو رواں دواں ہوتی ہے۔ جیسے چلتے ہوئے کوئی سانس کی طرح مسلسل — میں یوں کہ کہانی شروع ہو اور آپ اس کے ہو رہیں — میں یہ سارے ٹرخا دیتا ہوں لیکن اگر میں آپ کو ٹکڑے ٹکڑے سانسوں کی کہانی سنا پاتا سکوں تو کہانی کے تسلسل کا کیا ہوگا — پھر بھی میں ٹکڑوں ٹکڑوں سانسوں کو جوڑ کر انہیں مسلسل اور مربوط کر کے آپ کو کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

جب رات نے چند سیاہ زلفیں زمین پر پھیلا دیں تو زمین کی ساری ہنگامہ آرائیاں چین کی نیند سو گئیں — اور یہ تو قبرستان تھا جہاں میں تھا — یہاں تو زمین سانس بھی نہیں لیتی [illegible] والا مالک [illegible] گا اور [illegible] زخم ہرے ہوں گے۔

میں سگریٹ جلا کر اس کی قبر کے پائینتی بیٹھ گیا ہوں۔ جس جگہ [illegible] اس رات نے نور [illegible] کے نیچے چھپا کر پاش پاش کیے ہوئے چہرے سے دھتکار دیا ہے اور اب [illegible] — [illegible] اگر یہاں جا کر سامنے رکھ دی ہیں اور بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا ہوں

آبادی بڑھنے لگی تو قبرستان [illegible] ہو گئے — شہر خموشاں [illegible] کا [illegible] اگر آپ کو [illegible] شہر کا ایک باسی بھی پیارا [illegible] کی قبر کے پائینتی بیٹھا ہوں وہ تو مجھے بہت پیارا تھا — میں نے موم بتیاں جلا کر [illegible] رکھ دی ہیں — میرے اطراف اندھیرے پھیل گئے ہیں اور میرے بیٹے کی قبر کی سیدھی جانب دوسری قبروں کے کتبوں کے سائے لمبے ہو گئے ہیں — اندھیرے کے ساتھ یہ سارے کتبوں سے [illegible] آ رہے ہیں [illegible] نہیں رہتے۔

یہ قبرستان بہت عجیب ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں اس کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوں — [illegible] ہوتی ہیں۔ چھوٹی بڑی [illegible] بہت پرانی — میری پشت پر چبوترے کے احاطے کی دیوار — [illegible] بہت منہدم ہو رہا ہے اور ایک بہت بڑی قبر کے [illegible] — [illegible] چبوترے کے درمیان [illegible] آنے جانے کے لیے — [illegible] ہے وہ مرنے والوں کا [illegible] ہے۔

دشمن کے اس [illegible] نے جو ابھی ابھی موم بتیاں جلانے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے [illegible] چونکہ [illegible] موم بتیاں جلا دیا ہوں۔ سچ پوچھیے تو جب میں یہاں ہوتا ہوں تو مجھے ان اندھیروں [illegible] مجھے اپنے اطراف بکھرے ہوئے [illegible] سے نہیں [illegible] اس زندگی سے [illegible] ہوئے [illegible] سے مجھے [illegible] ہے —

[illegible] ——— پھر اس گھر میں سے ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔

پھر تم سے کہو ہے

انشا ——— میری داستانِ [illegible] ہے۔

[illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں ہے۔

[illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible] ———
[illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible]

تمہارے سینوں میں جو ایسی زندگی ہو رہی ہو ۔

میں اس کی کہانی سے تنگ آ گیا ہوں ——— ٹوٹ پھوٹ بہت سی باتیں سوچ رہا ہوں ۔ مجھے اپنی تنہائی کے قصے کا غم ہے اور عالم اسلام کا ان جو قبروں پر پڑے ہوئے کر رہے سب میرے پیچھے چلا آ رہا ہے اپنے سینے پر سے جو پہاڑوں کا بوجھ تھا اور اس کے بعد سے اگر دینے کی سوچ رہا ہے ۔

اور پھر جل مرنا بھی تو آسان نہیں ——— وہ پھر شروع ہو گئی ہے ——— مٹی کا تیل جو الیس پیسے شیشہ ہو گیا ہے ۔ اس طرح مرنا تو بہت مہنگا پڑے گا ۔

میں ڈرتا ہوں اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے نکل جاتا ہوں ۔ تو اب سلام کے بعد میں اس کو اتنا وقت بھی نہیں دیتا کہ وہ پھر کچھ مجھ سے کہہ سکے ۔

اس وقت تو وہ میرے پاس نہیں ہے ۔ اس وقت تو میں اکیلا ہوں لیکن میں ڈر رہا ہوں کہ وہ آ نہ جائے ——— روشنی کے اس دھبے نے جو ابھی ابھی موم بتیاں جلنے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے ۔ میرا سکون چھین لیا ہے ۔ میں پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیتا ہوں ۔

روشنی کے یکایک غائب ہو جانے سے اندھیرے زیادہ گہرے ہو گئے ہیں لیکن آنکھیں دیکھتے دیکھتے اندھیروں سے مانوس ہو گئی ہیں اور اب میں اپنے سامنے گنبد کا ہرا دروازہ ہمیشہ کی طرح دیکھ سکتا ہوں جو بند ہے ۔ اس گنبد میں میرے جد امجد یا پھر شاید میرے کسی جد امجد سوئے ہیں —— میں نے صحیح رشتہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔ یہ لگ وہ دین جنہوں نے علم کے دریا بہائے ہیں اور انسانوں کے ابھرنے ہونے کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اس سے کوئی دلچسپی حاصل کی ہے ۔ بہر حال میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایسی ہستیاں ہیں جن کے اعلیٰ حالات پر جا جا کر بھی غور کر سکتا ہوں جس طرح ان کی وہ پیاس بجھ رہی ہے جو گنبد جاتے ہوئے جنگل سے نکل بھاگا اور ایسے پیچھے موم بتی کی روشنی کا دھبہ دیکھ کر چلا آتا ہے ۔ یہ صورت میری رشتہ داری ہے اور گنبد میں سونے والی ان برگزیدہ ہستیوں سے اس کا رشتہ زیادہ قریبی ہے ۔

مجھے اندھیرے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی اس گنبد کو دیکھ رہا یا یاد آیا ۔ میری نانی امی یہاں گنبد کے باہر بیٹھی رہا کرتی تھیں اور کبھی اپنا سر کو اندر کی طرف پھیلا کر پڑھنے لگتی تھیں جیسے وہاں کی آواز ہو گئے ہوں ——— عید بقرعید پر جب ہم سب پہنچا کرتے تو خاندان کے اکثر بچوں کے ساتھ مل جل کر ایک اچھی خاصی فوج تیار ہو جاتی ۔ فوج گنبد کے دروازے پر بیٹھا کرتی تو گنبد کے دروازے کھول دیے جاتے اور ہم سب سے ادب سے اندر داخل ہوتے ——— بند کمرے میں ہوا کا خاص ساتھ ہوتی وہ دھیمے انداز میں کھلی ہوئی کھڑکی کی بتیاں جلا دیتیں ——— پھر فاتحہ کا سلسلہ شروع ہوتا اور وہ کہہ کر سب سے ایک مل کے بیٹھتے کہ ان سے زیادہ تر جاتا ۔ جیسے کوئی منظر ختم ہو رہا ہے سلسلہ جاری رہتا تاآنکہ پیٹ بھر جائے ۔

یہ چار فاتحہ تو ہمیں اسی طرح کھینچ کر لے جاتے ۔

[illegible] وابستہ ہو گئی ہے۔ [illegible] تھا۔
[illegible]
[illegible] آ گیا۔

[illegible] ہے۔ اس [illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible] سکتی ہیں۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] ہے

[illegible]
[illegible] ہے ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible] تھا
[illegible] تھا

"[illegible] تھا"
[illegible] ——— [illegible] تھا۔
"[illegible] ——— [illegible]"

[illegible] ——— [illegible] تھا۔ [illegible]
[illegible] تھا ——— [illegible] تھی

[illegible]
[illegible] تھے [illegible]
[illegible] ——— [illegible] تھا۔ [illegible] ——— [illegible]

ہیں۔ جیسے جب میری آنکھیں اندھیروں سے مانوس ہو گئیں اور جب میں نے گنبد کے بیرونی دروازے کو بند دیکھا تو اس دروازے کے دوسری طرف مجھے پیاسا کرشن چیمپو ہوتا ہوا دکھائی دیا جو کہ اکثر حضرت سے پیسے مانگنے کی عادت کو زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا تھا ——— اور جب میں یادوں کو گنبد کی تاریکیوں میں پھینک کر سیدھا اپنے بیٹے کی قبر پر واپس آیا تو میں نے سگریٹ جلانے کے لیے کچھ لمحات میں چپ چاپ کسی احتیاط سے تیلی جلائی کر کے ابھر کر پھیلنے والی زرد روشنی بھی کمزور ہوتے ہوتے معدوم میں بدلنے والی نظروں سے چھپ سب ——— لیکن میری آنکھوں نے ایک عجیب چیز دیکھ لی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ تھا ——— میں نے جھک کر دیکھا ——— میں جو کچھ دیکھ رہا تھا، سچ تھا ——— وہ کون ہے، وہ کون ہے جو میرے غم میں شریک ہو گیا ہے ——— وہ پھول جو میں نے قبر پر چڑھانے کے لیے لیے تھے وہ تو دھوپ کے سینکے ہوئے ہوئے پتوں میں بدل گئے تھے۔ ان پر پیاسا ہوا کا دھاگا ہمک ہوا کا قوس تھا — پھر یہ تازہ پھول کس نے میرے بیٹے کی قبر پر چڑھا دیے تھے — میں نے پھول اٹھا کر اپنی آنکھوں سے بالکل قریب کیے ——— میری آنکھوں کی پوروں نے پھولوں کی نمی اور ٹھنڈک محسوس کی۔

ہیں سورج کی کرنوں نے نہیں پھینکا ہے ——— نرم پھول میری بھیگی ہوئی پلکوں سے لگے رہے تھے ——— میں نے انہیں قبر پر اسی احتیاط سے رکھ دیا جیسے پلکوں میں آنسو پرو رہا ہوں

کچھ موم بتیاں جلا کر اس بچی ان کا انتظار کروں جو روح کی طرح قدموں کی کسی چاپ کے بغیر سبز بچے جلاتی ہے ——— میں نے مزید کچھ سوچے بغیر موم بتیاں جلا دیں ——— تازہ پھولوں نے میرے بیٹے کی قبر کے پاس بچے ہوئے پتھروں پر اپنی نمی کے نقش چھوڑے ہیں۔ میں نے انہیں چومنا چاہا تو پیاسا بیٹھ قبر پر ڈول گیا ——— پھر میں نے خود کو سنبھالا ——— وہسکی کی بوتل سے کشیدہ گھونٹ پیے۔ پھر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر اس طرح چھپا سا بیٹھ گیا جیسے قریب سے سانسوں کی آواز سن رہا ہوں

اس کے اجالے نے قبر کے اندھیروں کو اور گہرا کر دیا تھا۔ نیم کے بوڑھے درخت کی ٹہنیوں کو اب تک نہیں کئی جگنو پھر رہے تھے۔ یہاں اگر جگنوؤں کا کھیت بھی بچھا دیا جائے تو بے فائدہ ہے ——— یہاں جگنوؤں کی چمک موم بتی کے اجالے، نظروں کی بجلی کچھ بھی تو وہ ہمارے اندھیروں کو دور کرنے کی اہمیت نہیں رکھتے۔

مجھے محسوس ہوا کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کوئی نہیں ہے ——— لیکن وہ کون ہے ——— وہ ——— جو شاید میرے گھنے اندھیرے میں ——— میں کھڑا ہوا ہوں ——— میں نے مڑ کر دیکھا ہے۔ شاید کوئی ہے۔

میں آہستہ آہستہ اس سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی قبر پر نظر ڈالی ——— موم بتیوں کی روشنی میں بھی میں وہ کتبے پر لکھا ہوا نام، اس کی تاریخ پیدائش، اس کی تاریخ وفات کچھ بھی نہیں پڑھ سکا تھا۔ جوں ہی یہ عبارت کو سب ہی کو لڑکی تھی ——— میں پھر اور دکھی ہو گیا ہوں۔ میں کتبے کے حروف مٹ رہے ہوں تو مجھ کو اس نے

[illegible]

[illegible] —— [illegible] سے
[illegible] —— [illegible]
[illegible]
[illegible] —— [illegible]
[illegible] —— نہیں —— کیا نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں
ہوگا —— [illegible] —— تمہارے بیٹے کی [illegible]
ہے —— [illegible] —— تمہارے [illegible] —— آؤ ہم دونوں پھر سے [illegible]
[illegible]

[illegible] جیسے [illegible] ہوں —— [illegible]
[illegible] —— [illegible] نے میری [illegible]
[illegible] —— [illegible]
[illegible] —— [illegible]
[illegible] اپنے بیٹے کی قبر [illegible] ہے۔
[illegible]

[illegible]
میں نے اس سوال سے پہلے کسی اور سوال کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
[illegible]
[illegible]
[illegible] —— [illegible] —— [illegible]
[illegible] —— میں نے [illegible]
[illegible] —— [illegible] —— [illegible] ——

[illegible] ——

[illegible] —— [illegible] —— [illegible]

[illegible]
اس نے اثبات میں صرف گردن ہلائی۔

میں سب کچھ بھول گیا اور اس کا منہ تکتا رہا ——— بعد میں اس سے یہ پوچھ کر بھی کیا کرتا کہ یہ جہان کا حصہ اس سے کتنی دور ہے
جس کا یہ حصہ ہے.

اور پھر اس نے مجھے بات کرنے کی مہلت بھی تو نہیں دی تھی.

ٹوٹی ہوئی قبروں پر پیر رکھتی ہوئی وہ اپنے کھنڈر ہوتے ہوئے مکان کی طرف تیز تیز چلی جا رہی تھی اور کھنڈر سے کسی زور زور سے بلک بلک کر رونے کی آواز میں صاف سن رہا تھا.

اپنے بیٹے کی قبر پر واپسی کے وقت میں نے اس قبر کو نہ ڈھونڈنے کے خیال سے جس کی شکستگی نے میرا دل ہلا دیا تھا کتنی قبروں پر نظر ڈالیں جو سرے سے مٹ چکی تھیں.

ہوا کے کسی زور کے جھونکے نے میرے بیٹے کی قبر کا دیا بجھا دیا ہے لیکن جب میں اس کی تربت کے پائنتی پہنچا ہوں تو بادلوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا چاند اب اتنا ابھر گیا ہے کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں اور ہلکی مدھم چاندنی سارے میں بکھر کر ٹوٹ گئی ہے

——— میں نے قبر کی تہہ سے نکال کر وہ گھونسلہ چھت سے بچے اتار لیے ہیں.

——— میں نے کھنڈر سے آتی ہوئی زور زور سے بچے کے رونے کی آواز پھر سنی ہے.

——— میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھولوں کو پھر دیکھا اور یہ سوچا بھی نہیں کہ یہ کس نے چڑھائے ہیں.

——— میں نے تھیلی کا دہانہ کھول کر وہ پھول بھی قبر پر چڑھا دیے جو میں اس کے لیے لایا ہوں.

——— میں نے سگریٹ جلا کر چاند کو دیکھا ——— وہ اب درختوں سے بلند ہو کر بادل کی اوٹ میں چھپ رہا ہے مجھے افسوس ہوا جیسے چاند مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم لوگ مجھ تک پہنچ بھی جاؤ تو اس زمین کے دکھ کو زمین ہی پر چھوڑ آؤ گے تا میرے سینے میں اتنی وسعت کہاں ہے جو زمین کا سارا دکھ درد سمیٹ سکوں

اور چاند نے بادل کی چادر تان لی.

میں ہر چاند کو کفن تو نہیں دے سکتا

سیکنڈ راؤنڈ

انتظار حسین

چچا جان صدر دروازے سے ہٹ کر چلتے رہے۔ دونوں طرف قطار قطار کوٹھیوں کے بیچ کے آگے گھوڑوں سے
بھری ہوئی کوٹھی دیکھ کر بیچ میں کہ انہیں کوٹھیاں انسانی صورتوں سے بھری ہوئی لگیں۔ اور پھر وہ اس کوٹھی کے سامنے سے
گذرا جس کے صدر دروازے پر ایک سرخ تختی پر WELCOME لکھا ہوا تھا۔ اس سے آگے کوٹھی ہی ایک دوسرے میں قلعی منقش کھڑی
ہوئی تھی۔ اور شاہجہان آباد کا دروازہ ، گھڑ بیک قلعوں سے لیس ہو گئے۔ وہ ابھی بیچ ہی میں تھے کہ اپنے گھر سے پہلا آدمی تھا جس نے پیچھے
کی طرف مڑ کر دیکھا تھا کہ جنگ ہو رہی ہے۔ ابھی ابھی بڑے ابا نے دیوان حافظ سے فال نکالی تھی اور دیوان کہتا تھا کہ جنگ ہو گی
آگے کیا ہوگا۔ یہ شعر بتا رہا ہے۔"

"وہ میں بتاتا ہوں۔" چچا میاں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"سنو چچا!" بڑے ابا نے دیوان حافظ بند کر کے ایک طرف رکھا اور عینک اتار کر کیس میں رکھنے لگے۔

"بس شمالی ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔"

"کیسے؟" بڑے ابا عینک کیس میں رکھتے رکھتے رک گئے۔

"کیسے کیا؟ بس ہو جائے گا۔ مگر صرف شمالی ہند پر۔ جنوبی ہند کی میں گارنٹی نہیں دیتا۔"

"کیسے ہو جائے گا؟ کوئی ثبوت؟"

"ثبوت؟" چچا میاں نے بڑے ابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی۔"

بڑے ابا سوچ میں پڑ گئے۔ تامل کیا۔ پھر بولے۔ "انہوں نے یہ لکھا ہے؟"

"صاف لکھا ہے جی۔"

بڑے ابا پھر سوچ میں پڑ گئے۔ آخر انہوں نے بند کئے ہوئے کیس کو پھر کھولا، عینک نکالی اور دیوان حافظ اٹھا
"فال دیکھتا ہوں۔"

اور اس کو لگا کہ یہ تھا کہ دیوان حافظ کی فال اور اس کا یہ شعر سچا ہے مگر اس لمبی اور کشادہ سڑک پر آ
دو رویہ قطار قطار کوٹھیوں کے بیچ سڑک سے ہٹ کر چلتا رہا۔ اسے یوں ہی خیال آیا کہ ابھی ابھی سے وہ اس سڑک کی سمت کیسی
ہو گئی تھی اور یہ ادھر کیسی تھی۔ [illegible]

سائرن بجاتا ساتھ ٹریفک کے سپاہی تیزی سے سیٹیاں بجاتے ادھر ادھر بھاگتے۔ جن سے بچی ہوئی موٹر کاریں رستوں سے اتر کر تھم جاتیں۔ قطار در قطار کھڑی نظر آتیں اور سڑک خالی اور خاموش ہو جاتی۔ وہ خالی اور خاموش سڑک کتنی عجیب لگتی تھی۔ ساری فضا پر چھائی ہوئی نظر آتی تھی جیسے اسے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آج وہ ظاہر ہوئی ہے۔ آج ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ اور اب پھر سڑک پھر سے کتنی مصروف ہو گئی ہے۔ اب پھر سے کاریں کتنی ابلی ہو گئی ہیں۔ چلتی دوڑتی کاریں میک کے بغل میں دوسری اسمارٹ پڑا اور سنہری دیکھو۔ ایک لمبی کار سے اترتی ہوئی بچے زیور اور بھاری جوڑوں میں ملبوس خواتین۔ "ظاہر!" پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ مسعود اور رضا بس سٹاپ کے قریب کھڑے تھے۔ وہ رک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں قدم مارتے ہوئے آ گئے۔ "تو خالی سب نا اس وقت؟"

"اور کیا؟"

"بس پھر چلو۔ گرینڈ سے بس پکڑ کر چلتے ہیں۔ گر سالی ٹیکسی مل جاتی تو اچھا ہوتا۔"

"اس وقت یہاں ٹیکسی ملے گی۔ توبہ کرو۔"

"چلو پھر پیدل چلتے ہیں۔ کون سی بہت لانبی مسافت ہے۔"

"یار" وہ چلتے چلتے بولا۔ "آج شادیاں بہت ہو رہی ہیں۔"

"ہاں بہت بیڑیں ذبح ہوئی ہیں آج۔" مسعود نے یہ فقرہ بہت گمبھیر لہجہ میں کہا تھا۔ مگر وہ اور رضا دونوں ہنس پڑے۔

پھر رضا کہنے لگا۔ "اصل میں موسم کے انتظار میں شادیاں رکی ہوئی تھیں۔ موسم اس برس بدلنے ہی کو نہیں کہتا تھا۔ بہرحال اب موسم بدل گیا۔"

اس نے رضا کی طرف دیکھا اور کسی قدر الجھے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "ہاں موسم بدل ہی گیا۔" چپ ہوا۔ پھر بولا "کیا خیال ہے یار، سیکنڈ راؤنڈ ہوگا؟"

"سیکنڈ راؤنڈ؟" مسعود نے بے فکری سے کہا۔ "ممکن تو نہیں۔"

"ہاں یار ممکن تو کچھ ایسا ہی ہے۔" اس کا لہجہ ... ہو گیا۔

"کیسے لگتا ہے؟" رضا نے گرم لہجہ میں سوال کیا۔

مسعود نے لہجہ میں تھوڑی طنز پیدا کرتے ہوئے کہا "شاید تم نے ظاہر کی پہلی بات نہیں سنی۔"

"کون سی پہلی بات؟"

"یہی کہ شادیوں کا موسم شروع ہو گیا۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ ... کی گشت زدگی بھی واپس آ گئی ہے اور رشتوں کا میٹر بھی پھر سے تیز چلنے لگا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وقت واپس آ چلا ہے۔"

"مگر وقت ضائع ہی ہو رہا ہے"

"یعنی بزدلی کی تین نشانیاں ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی دلیل دے، مسعود کا تیز چلتا ہوا ذہن جھک گیا"

اس جواب پر رضا چپ ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکالا۔ مسعود اس کی طرف بڑھا، پھر ایک سگریٹ منہ میں لگا کر سلگایا۔ سگریٹ کا کش لیا۔ پھر بولا "کہتے ہیں جنگ ہو گی"

مسعود ہنس پڑا۔ پھر کہنے لگا "یہ لوگ خواہ مخواہ ڈر رہے ہیں۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ جنگ ہو گی"

"معاف کرنا، تم نے پہلے کہا تھا تمہیں بھی نہیں لگتا کہ جنگ ہو گی۔ جنگ اور عشق دونوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ شروع کرنے سے شروع ہوتے ہیں، ختم کرنے سے ختم ہوتے ہیں"

"خوب!" مسعود نے مخصوص انداز میں داد دی۔

"مسعود" وہ بولا "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ معاف کرنا، شک کرنے کا مرض ہے، جو عشق میں کم نہیں ہوتا"

"جنگ میں بھی نہیں ہوتا" رضا نے لقمہ دیا اور ہنس پڑا۔

مسعود نے رضا کی بات کو نظر انداز کیا اور اس سے مخاطب ہوا "یہ دلیل ہے۔ تو ابھی تک ڈرا ہوا ہے؟ عشق ختم نہیں ہوا ابھی؟"

"ابھی کیا ہے، نہیں بھی ہوا"

"پیار سے تو بہت کر رہا ہے، لیکن غصہ کر رہا ہے۔ کہیں تو وہ ادھر کا پانی پانی ہو"

اس نے بات کو ہنسی ہنسی میں اڑا دیا، وہ چپ رہا۔

رضا ایک وقت کے لیے بولا "یار یہ جو لوگ CYNIC ہوتے ہیں، یہ بڑی گہری سوچ کے ہوتے ہیں، پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں"

وہ چپ ہوا۔ پھر براہ راست مسعود سے مخاطب ہوا "تم محاذ پر گئے ہو؟"

"نہیں گیا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے" رضا کے لہجے میں ایک برتری کا احساس پیدا ہو گیا "میں محاذ پر گیا ہوں۔ تم نے سپاہیوں کو نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے"

مسعود جواب میں چپ رہا۔ پھر وہ چلتے چلتے بولا "یار موڑ سے سگریٹ تو لے لیں"

اصل میں وہ باتیں کرتے کرتے منزل کے قریب آ گئے تھے۔ موڑ کی دکان تو وہ ستارہ تھی جہاں سے وہ گزرتے ہوئے ہمیشہ سگریٹ لیا کرتے تھے۔ وہ باتوں میں ایسے الجھے ہوئے چل رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ پہنچے اور موڑ کی دکان پر رک گئے۔

"موڑ والا" مسعود نے دکان سے آج بھی بولا "کہ سگریٹ چلے گا، کیوں؟"

"چلے گا جی" موڑ والے نے خندہ پیشانی سے جواب دیا

کہ رضا اس موڑ پر ... میں نے شفقت محسوس کر لی۔ جب آدمی ...

"شفقت جوج گرد" مولوی چونکا۔ "شفقت جوئی کو آپ نے دیکھا ہے رضا صاحب؟"

"ہاں ...... ہاں" اس نے برتری کی شان کے ساتھ کہا۔

اس موٹے آدمی نے جس نے شلوار کے ساتھ کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر جناح کیپ منڈھی ہوئی تھی۔ رضا کو غور سے اور احترام کی نظروں سے دیکھا۔ "اچھا جی! تو آپ کی شفقت جوئی سے باتیں بھی ہوئیں؟"

مولوی بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولا۔ "خواجہ صاحب جی۔ آپ ہمارے رضا صاحب کو نہیں جانتے۔ یہ بہت بڑے سیر سپاٹا دیکھ کے آئے ہیں۔ اچھا جی رضا صاحب بتاؤ شفقت جوئی کیسا لگتا ہے۔ کیا سوچتا ہے؟"

"بہت عجب آدمی ہے" رضا کہنے لگا۔ "ہم میں اس مقام پر گئے جہاں عزیز بھٹی کی شہادت ہوئی تھی۔ اس جگہ پر جا کے دیکھا۔ [illegible] میں ایک جوان آیا اور بولا کہ جانے نہ دیتے۔ آپ لوگ اب واپس چلیں۔ ہم واپس چلنے لگے۔ مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ ہم ٹھٹکے۔ ہم نے کہا کہ صاحب آپ نہیں چلیں گے۔ شفقت جوج نے ہمیں غور سے دیکھا۔ اور کہا کہ یہاں سے واپس جاؤں۔ اس مقام سے جہاں عزیز بھٹی کا خون بہا ہے۔ آپ لوگوں کو واپس جانا ہے۔ آپ واپس جائیں میں تو یہیں کھڑا ہوں [illegible] ہم اس شخص کی صورت دیکھنے لگے۔"

"سبحان اللہ" خواجہ صاحب نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گئے۔

"میں چھمب جوڑیاں بھی گیا تھا" اور رضا نے سوچتے انداز میں کہا۔ "معلوم ہے چھمب میں داخل ہوتے ہی پہلے [illegible] آتا ہے؟"

"کیا؟" خواجہ صاحب اور مولوی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"قبریں؟"

"قبریں۔"

"ہاں قبریں۔ بہت لمبی قطار چلی گئی تھی۔ برابر برابر ایسی قبریں تھیں۔ یہ جو ان رجمنٹ کے سپاہی تھے۔ مگر یار عجب بات ہے۔ قبریں تھیں۔ اور وہ جگہ قبرستان سی نہیں لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اس جنگ میں لڑ رہے ہیں۔ ہم نے فاتحہ پڑھی۔ جب [illegible] تو ایک سپاہی ہمارے قریب آیا۔ کہنے لگا کیا خیال ہے آپ شہری جائیں گے۔ ان قبروں کو چھوڑ کر واپس [illegible] ...... میرا بھی جی چاہتا ہے میں کہ لوں۔ مگر کچھ نہیں کہا۔ بس [illegible] ...... بس کچھ دل بھر آیا۔"

[illegible] ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

تھوڑی دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ پھر خواجہ صاحب کسی قدر آہستہ لہجے میں بولے۔ "[illegible] ہے جی۔ کیسے چھوڑ دیں؟"

مولوی نے جھرجھری لی اور کہا۔ "خواجہ صاحب جی۔ مذاق نہیں [illegible] ہے جی۔"

"یا تحفہ کچھ پتہ نہیں؟"

"یہ پہلے نہیں تھی" مولوی تڑپتا ہوا بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر ہمارا قسمت سے۔ میں کہوں ہوں کہ دو تین ہفتے کی بات لگتی ہے۔ پھر بھی ایسے کہ ...   سب گئے ہوئے" اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا۔ "اللہ تعالیٰ نصیب کرے ... مولانا صاحب کا منہ چڑا، اب میں پوچھوں کیوں کہ کشمیر میں ان بزرگوں کا قصہ ختم کرنی۔ یا ختم شدہ ہے۔"

خواجہ صاحب نے مولوی کی بات سنی اور چہرہ اس سوٹ بوٹ والے شخص سے پھیر لیا جو نئے ماڈل کی کار سے نیچے اتر کر کھڑا تھا اور فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوئی عورتوں کے لیے ابھی ابھی کار کو روکا تھا۔ "کیوں جناب خیریت کیا کشمیر میں جنگ چھڑ گئی؟"

سوٹ بوٹ والے شخص نے تامل کیا پھر بڑی متانت سے بولا "بات یہ ہے کہ......"

"ہاں کہیے!" مولوی نے پان لگاتے پوچھا۔

سوٹ بوٹ والے شخص نے کہا "سادہ خوشبو والا دینا"

خواجہ صاحب نے بے چینی سے کہا "ہاں جی"

سوٹ بوٹ والے شخص نے اسی متانت سے بات پھر شروع کی "بات یہ ہے کہ پاکستان بھی جنگ ایفورڈ نہیں کر سکتا"

"جی کیا فرمایا" مولوی کا ہاتھ پان لگاتے لگاتے رک گیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ" سوٹ بوٹ والے شخص نے پھر اسی متین انداز میں بات کی "ایک چھوٹے ملک کے لیے جس کے وسائل محدود ہوں کسی بڑے ملک سے ٹکر لینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے"

"اس ملک کے یار بڑے ملک نے تو بڑی چوٹ کا اندازہ لگایا۔ مگر ہوا کیا" مولوی کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"ہوا کیا" سوٹ بوٹ والا شخص نہایت متانت سے مسکرایا "مجھے کہنا تو نہیں چاہیے۔ مگر بہرحال اتنا واضح ہے کہ اس جنگ کا اثر ترقیاتی منصوبوں پر بہت پڑے گا"

مولوی نے پان لگاتے لگاتے ہاتھ روکا۔ غصے کے پان کو الگ رکھ دیا ... ہوئے ... "۔ مولوی بیگم صاحبہ سے بوتل لے کے آ" اور دونی نکال کر سوٹ بوٹ والے شخص کے سامنے رکھ دی۔

"میں نے پان ہی لگانا تھا"

مولوی نے انگلی سے سامنے دو سوٹ فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے نمازی کی طرف اشارہ کیا "پان وہاں سے"

سوٹ بوٹ والے شخص نے کسی قدر بے دلی سے دونی اٹھا کر جیب میں رکھی اور واپس اپنی کار کی طرف چل دیا۔

شارٹ ہوتی ہوئی کار کو مولوی دیکھتا رہا۔ جب وہ روانہ ہو گئی تو اس نے بہت غصے سے کہا "امریکہ کا چمچہ"

"یہ شریف آدمی تھا" خواجہ صاحب نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"شریف آدمی؟" مولوی نے تیزی سے کہا "خواجہ صاحب آپ جانتے ہیں اسے؟"

"نہیں یار۔ میں تو نہیں جانتا کون صاحب ہیں"

"خیر چھوڑو جی" خواجہ صاحب بولے "مولوی تو یہ بتا کہ لڑائی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی؟"

"بتا دوں؟"

"بتا دے"

"خواجہ صاحب جی، رات کو اٹھ کر بارہ بجے کے بعد میں آسمان کو دیکھو۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا کہ لڑائی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی"

"ان پلاّ میری نانی کہہ رہی تھی۔ ...... پر مولوی" خواجہ صاحب رکے اور بولے "میری نانی تو بہت ڈری ہوئی ہے"

مولوی نے سیدھا سوال کیا "خواجہ صاحب جی، ایک بات بتاؤ۔ پاکستان میں کبھی ایسا ہوا؟"

"نہیں"

"پر بھارت میں ہوا۔ یا کبھی وہاں نہیں ہوا؟"

"ہوا"

"ہوا کیا جی۔ وہاں پر قوال پڑ رہا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ ادھر لگ گئی"

خواجہ صاحب نے اس بات کو یہیں چھوڑا اور کہا "خیر یہ تو دمدار ستارہ ہے۔ مگر وہ کیا تھا یار میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا"

"کیا؟" مولوی نے سوال کیا۔

"ابھی کل کی تیسری رات تھی۔ کوئی آدھی رات کا وقت۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ قوس قزح کی طرح جیسے آسمان تک [illegible] لگی ہوئی ہو۔ کوئی منٹ تک لگی رہی پھر غائب۔ میں اب تک سوچ رہا ہوں کہ کیا چیز تھی۔ ...... پر اس رات" خواجہ صاحب رک کر بولے "تو پتہ نہیں چلا۔ چھت ایسے ہل رہی تھی جیسے بھونچال آتا ہے"

مولوی نے بہت غور سے یہ واقعہ سنا۔ پھر بولا "یہ تو جنگ سے تین دن بعد کی بات ہے۔ مگر مجھے تین دن پہلے پتہ چل گیا تھا۔ پتہ مجھے۔ وہ ایسے کہ خواجہ صاحب جی میں نے خواب دیکھا کہ جیسے شالامار باغ میں آگ لگ گئی ہے۔ جیسے سارا باغ جل گیا ہو۔ میں بھی وہ آگ [illegible] سے بجھا رہا ہوں۔ وہ سارے درخت ویسے کے ویسے ہی۔ [illegible] جتنی وہ آگ خود ہی بجھ گئی۔ وہ درخت سب ویسے ہی ہرے ہیں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ بس تیسرے دن جنگ ہو گیا"

خواجہ صاحب حیرت سے مولوی کو تکتے رہے۔ پھر بولے "ان صاحب بعض بعض خواب بڑا سچا ہوتا ہے"

مولوی پھر شروع ہو گیا۔ "یہ تو خوشی کی بات تھی۔ سب اور سنو" بات کرتے کرتے اس نے اسے مسعود اصغر کو
دیکھا۔ "بابو جنتی میتوں تم بھی سنو۔ خواجہ صاحب جی بھی بڑی کمال کے تھے۔ ایک دفعہ پڑھ رہے تھے، مرگ گئی ہوئی بیٹھ جاتے ہوئے
پھروں تسبیح پھیر رہے تھے، بولے "آؤں! ایسا لگا جیسے کوئی میرے پیچھے کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے نظام الدین اولیا کے پاس جا۔" میں نے
مڑ کر آنکھیں کھولیں۔ پیچھے مڑ کے دیکھا ...... کوئی بھی نہیں تھا .... اور آج بھی ایسا ہی ہوا۔ بس
جھپکی آئی تھی۔ لگا ... کوئی کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے نظام الدین اولیا کے پاس جا .... میں حیران ہوں خواجہ
صاحب جی کہ اس بات کے ماننے کیا ہوتے"

خواجہ صاحب کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد آنکھیں کھولیں۔ بولے "آج کل کے
دو منوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔"

مولوی بولا "میں کہتا ہوں کہ بھتو اب تو تم نے آنکھ سے سب کچھ دیکھ لیا۔ اب تو سمجھ لو۔ اب بھی نہیں سمجھتے؟" یہ
کہتے کہتے مولوی ان کی خاموش کھڑی ہوئی ٹولی کی طرف متوجہ ہوا۔ "کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو۔ اب دیکھ لو، میری باتوں پر ہنستے ہیں۔"

مسعود ہنس دیا۔ "مولوی کو کیا ہے۔ کیپشن کا ایک پیکٹ دے دے۔"

کیپشن کا پیکٹ آیا۔ تینوں نے سگریٹ سلگائی۔ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رضا نے اچانک بے چینی کا اظہار کیا۔ "یار چلو۔"

"کرینہ سے نہیں چلو"۔ مسعود نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"یار اب دیر ہو گئی۔ اور مجھے یاد آیا مجھے تو اس وقت گھر پہنچنا تھا۔ کچھ مہمان آنے والے تھے۔" رضا نے سگریٹ کا ایک کش

لیا۔ "اب اچھا ہے چلو۔ اب تو دیر ہو گئی۔"

"ہم بہت خیال میں کہ نشست ختم ہو گئی۔ آج مشورہ کریں۔" اس نے بیدلی سے کہا۔

"کیوں! تم بھی تو نشست سے ہو؟"

"تو نشست کی بات نہیں۔ ایک طرف چلو۔ یہ پوری کیفیت نہیں رہی۔ ہم آتا وقت یہاں ہم نے گزار دیا۔ اتنی تو دیر

ہو رہی ہے کہ آج کچھ موڈ نہیں بن رہا۔"

مسعود کچھ الجھ سا ہو گیا۔ بیدلی سے بولا "بس ...... اس میں بیٹھے رہے، یہاں تک نہیں چاہیے تھا۔"

"ہاں ... یہ دیکھے بیٹھے بولا "بیٹھے رہے، یہ کرنا نہیں چاہیے تھا۔"

ٹیکسی چلی نہیں ملی تھی۔ اور ٹیکسی کے لیے انہوں نے ایسی خواہش بھی نہیں کی۔ یوں بھی سب سڑک نسبتاً خاموش

اور سنسان پڑی تھی۔ بس اکا دکا ...

"چلو پھر!" مسعود چلتے چلتے بولا "تم اس بات کو یاد رکھو، سب سمجھو۔ کیا پھر کہو......"

"نہیں یار" وہ بات کاٹتے ہوئے بولا "وہ تو میں کو بس کہہ رہا تھا۔ اب کوئی قصہ نہیں ہے۔"

"پھر اس ... کیا وہ کیا تھا؟" مسعود کہنے لگا "ایک شخص تمہارے بھی کوئی ہے؟"

"کیا؟"

"نہیں رستے میں رکنا نہیں چاہیے تھا۔"

وہ نہایت بے حوصلہ سی ہنسی ہنسا۔ "پھر کیا ہو جاتا؟"

"پھر بھی ہوتا۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آدمی اس رستے پر پڑے ہی نہیں جیسے میں نہیں پڑا۔ سمجھتا ہوں کہ یہ قصہ ہی بڑا اس ہے۔ لیکن اگر اس رستے پہ پڑے تو پھر انتہا تک جانا چاہیے۔ چاہے انجام کچھ ہو۔ بیچ میں رک جانے کے تو کوئی معنی نہیں ہیں۔ آخر عشق اور مال پسندی میں کیا رشتہ ہے۔"

"عشق اور جنگ" اس نے مسعود کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اپنے ہی طور پر کچھ کہنے لگا۔ یا شاید وہ بات بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "بات بہت اچھی کہی گئی۔ عشق اور جنگ۔"

"دونوں اصل خانہ خرابی۔" مسعود نے ٹکڑا لگایا۔

"ہے تو یہی مگر ...."

"مگر کیا ...."

"اور پتہ ہے ڈکر کی بات کیا ہے؟"

"کیا؟"

"ڈکر کی اصل بات یہ ہے کہ جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے اور عشق بھی ختم ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر یہی کہ جنگ شروع نہ کرو مگر شروع ہو جاتی ہے یعنی اگر ختم ہی پہ ہو تو ختم ہو جاتی ہے۔"

"اور عشق؟"

"وہ بھی۔"

"واقعی؟" مسعود نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

وہ کچھ اکھڑ سا گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "یہ کچھ پتہ نہیں۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ پھر چپکے چپکے مسعود نے کہا "تمہیں ایک خبر سناؤں۔ وہ لندن جا رہی ہے۔"

"مجھے خبر ہے۔"

"تمہیں افسوس تو ہوگا۔"

"کس بات کا؟"

"اس کے چلے جانے کا۔"

"وہ تو پہلے ہی جا چکی تھی۔"

مسعود نے چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو"

"کیا واقعی اب کوئی قصہ نہیں ہے؟"

وہ پھر ٹھٹکا، چپ ہوا، پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا "یار پتہ نہیں۔"

دونوں چپ ہو گئے۔ چپ چاپ۔ چھت سے چپ چاپ [illegible] "بات یہ ہے کہ عشق ختم کرنے کا ترکہ [illegible] مگر اس بہت سی ہیں۔ یار یہ حافظ جی تو ہونے تو بہت سی ہم الجنس مصروف رکھنے کے لئے پیدا ہو جاتی ہیں لیکن فیصلہ اور جنگ بھی ختم ہو جا...... بہت بے عقلی کی بات ہے۔ تو تم نے سنا ہے کہ تاسے دیوان حافظ سے فال نکالی ہے جنگ ہوگی؟"

مسعود زور سے ہنسا اور خاموش ہو گیا۔

دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ وہ بس اور کار، وہ سڑک جس پر چلتے ہوئے آئے تھے اور وہ سڑک سے ادھر پڑا تھا اس وقت خالی اور پرسکون تھی۔ اس کوٹھی کے سامنے کوئی بس اسٹاپ نہیں تھا۔ دو تین کاریں کوٹھی کے احاطے کے اندر کھڑی تھیں اور درختوں کی سبز پتیوں سے ہلکے ہلکے قمقمے جھلک رہے تھے۔ کوٹھی کے سامنے سڑک بہت دور تک خالی نظر آ رہی تھی۔

اس نے چلتے چلتے پوچھا "تو سنو کہ اب" یار شک سی ہے۔"

"کیا؟" مسعود نے سوال کیا۔

"یہی کہ جنگ ہوگی یا نہیں ہوگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"حافظ شیرازی کی فال لے لو یار"

"حافظ شیرازی کی فال۔" مسعود بولا

مسعود پھر ہنس دیا اور چپ ہو گیا۔

"یار مسعود تم کچھ ۔۔۔ نہیں کر رہے"

"کیا کروں کیا کریں یار؟" وہ کسی قدر بیزاری سے بولا اور پھر چپ ہو گیا۔

پھر وہی چپ چاپ۔ خاموش سڑک اور قدموں کی چاپ۔ بلکہ ہلکے قمقموں سے جھلک رہی ہوئی کو کے سامنے کی منور سڑک پیچھے رہ گئی تھی۔ آگے سڑک خالی اور خاموش تھی اور اندھیرے میں تھی۔ اور اسے پہ دنوں کی خالی اور خاموش سڑک کا دھیان آگیا۔ مگر اس وقت وہ خالی اور خاموش سڑک کتنی پررونق نظر آتی تھی اور اس میں کتنا شور تھا۔ اور اب .... بلکہ خالی اور سڑک بس شور کرتی ہوئی قریب سے گزر گئی چلی گئی

"کدھر چلو گے اب کیسے چلا جائے گی؟"

آں یہ بات کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ گئے بھی تو بیل ہی تھے۔"

مسعود: اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس مرتبہ اس نے بہت سنجیدگی سے مسعود کو مخاطب کیا ہے۔

"ہاں؟"

"کیا خیال ہے تمہارا جلد ہو گی؟"

مسعود اسے سمجھنے لگا، پھر بولا "بتاؤں اپنا خیال۔"

"ہاں؟"

مسعود کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ سوچ میں پڑ گیا پھر بڑی بے چارگی کے لہجے میں بولا "یار کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

کوڑیوں کے مول

(چوتھی قسط)

شاہد — مسٹر اے۔ ایس۔ احمد سعدی

کمال نے اس بار کرسی سے [illegible] اٹھ کر [illegible] وکی کی کرسی کے قریب گیا۔

مختار دیا: ایک روپیہ یا آٹھ آنے ——"

وکی نے [illegible] کی طرح کمال کی طرف دیکھا اور اس کا [illegible] بات تو وہ بھول ہی گیا تھا

کمال نے کہا۔ — تم کیوں ایسا سوچ رہے ہو؟ سیدھی بات کیوں [illegible] سے پہلے [illegible] ہو کر [illegible] کر رہا

تھا، سوچا تھا کہ تم اپنا [illegible] دوسروں کے [illegible] کہ [illegible] ہے اور دوکان پر [illegible] کریں گی۔"

وکی نے کہا —— میں نے تو نہیں کہا ——"

"نہیں کہا؟ تو پھر کتنا چندہ دیا؟ سیدھا سیدھا کہو؟"

تھوڑی دیر کے بعد وکی نے [illegible] ہاتھ ڈال جیب سے نکالا اور [illegible] ورق الٹ کر دیکھنے لگا آخری ورق

دیکھ کر بولا۔

"کیا؟ کچھ بھی نہیں دیا؟"

وکی نے کہا —— "میں نے کہا تو نہیں [illegible] چندہ کے پاس [illegible] بھول گیا۔"

"پچھلے سال چندہ کے لیے [illegible] کے گھر پیچھے گئے اور وہاں جا کر چندہ کی بات ہی بھول گئے، پھر تم دو گھنٹے وہاں بیٹھے کیا کرتے تھے؟ بولو؟ بولو نا؟"

کمال نے وکی کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، دیکھا [illegible] تم [illegible] نہیں [illegible] اب کے [illegible] کرکے [illegible]

[illegible] ایک [illegible] اسلام [illegible] نہیں [illegible] راستے [illegible] چندہ [illegible]

[illegible] یہ نہیں ہوگا ——:

[illegible] گیا، پھر [illegible]

"پھر [illegible] کیا [illegible] بتاؤ ——"

"وہ سب [illegible] تھیں؟"

"[illegible] باتوں سے [illegible] کیا [illegible] ہے؟ [illegible] کیا [illegible] سکتی ہیں [illegible]

ملوں کے ساتھ میرے علاوہ دوسروں کی کیا باتیں ہو سکتی ہیں، میں بھی تو سنوں؟"
" ڈریشر نے کہا ـــ "ممی دیدی بہت اچھی لڑکی ہے، وہ ان سے لڑکیوں جیسی نہیں ہے۔"
ے لڑکوں جیسی نہیں، کیا معنی؟ سب جانتے ہیں کہ نیک فطرت کے ہوتے ہیں، وہ میرا دیکھا بھالا ہے، بھوجوا
بالے لڑکی بھی ویسے ہی ہیں، مگر جب سے یہاں آئے ہیں تب سے لڑکوں کی برائی کرتے ہیں کے
ہیں، بھوجوا تو جھوٹ نہیں بولتے، بھوجوا بیمار تھے، وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا، انہیں سب کچھ اندر
پا، خیال ہے کہ تمام دنیا میں بھوجوا، ممی انکار کر چکے ہیں ـــــ۔"
کی باتوں پر کان ہی نہیں دھرا۔
نہیں معلوم، ممی دیدی بہت مصیبت میں ہے۔"
یہ مصیبت؟ وہ تو روپے پیسے ہوتے ہوئے کیسی مصیبت؟"
ت اسی مصیبت میں ہے، ممی دیدی کی تکلیف دیکھ کر مجھے اس پر رحم آتا ہے۔"
ـــــ تمہاری مصیبت میں ہے، مجھے ہی دیکھو، مجھ سے زیادہ مصیبت اور تکلیف بھی کسی کو ہو سکتی ہے؟"
ت ہوتا بھائی، لیکن ممی دیدی کی زندگی ہم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ باہر سے دیکھنے میں کچھ پتہ نہیں چلتا
چپ رہتی ہے، بس میں بیٹھ کر کھا جاتی ہے، سہتی ہے، بات کرتی ہے، بہت بھلے آدمی کی بیٹی ہے لیکن
سکتی ہے جیسی اندر سے ہے، وہ بہت زیادہ دکھی ہے، جانتے ہو۔"
معلوم ہوا؟"
نے بتایا ہے۔"
ے سنوں تو سہی؟"
کی نہیں ہے بھائی؟"
کیا معنی؟ تکلیف کا کوئی سبب تو ہوگا؟ جیسے کھانے کو نہیں ملتا یا تمہارے لیے روپیہ نہیں ہے یا
ہو سکتے ـــــ۔"
ہے ـــــ دیپا نے کہا۔
تکلیف کیوں نہیں بتاتے ہیں؟ تمہاری ممی دیدی نے کیا قصور کیا ہے؟"
قصور نہیں کیا، تم سے تقدیر کا گلہ کر سکتے ہو، اپنی قسمت کے ہاتھوں وہ تکلیف اٹھا رہی ہے، اس کے
ہ نہیں ـــــ۔"
کی ہمیشہ سے نہیں رہتی، لیکن ایک نہ ایک دن تو اس پر بھی جائے گی، دراصل اس نے بھیس بدل کر تمہیں بھی
ہ کہنا بہت مشکل ہے سمجھ سکتے ہیں، جانے دو، تم سے یہ سب کہہ کر کیا فائدہ ہوگا، اولاد کی

[illegible] ـــــ [illegible]

[illegible] ـــــ

"دیکھیے کیا ـــ [illegible]؟"

"نہیں نہیں، [illegible] ایک [illegible] ریسرچ پیپر [illegible]

[illegible] نہیں ہے [illegible] ـ"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"ویکیپیڈیا پر"

"اب تو کہاں جاؤ گے!"

[illegible]

[illegible] ـــ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کو J. T. Sunderland [illegible] India in World Politics

catalogue [illegible] India in Bondage.

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھتا۔

"کیا بات ہے، بہت خوش نظر آ رہے ہو، کیا سبب ہے تمہیں؟"

کرن نے بابا کی جیت ابھی ہو گئی کیا؟ کرن کا بابا۔ ہاں ہو گیا؟ کرن کو ملازمت مل گئی؟ نہیں، یہ سب کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

"پیچ کتابوں میں سے ایک ایسی کتاب پڑھنا شروع کی ہے کہ تم پڑھو گے تو چونک اٹھو گے..."

"کون سی کتاب ہے؟"

کرن کتاب دکھاتا۔

"ہیرو جو ملے مجھے پڑھنے کے پیسے دیتا ہے، یہ [illegible]"

وہ کون سی کتاب تھی، کیا نام تھا، کس کی لکھی ہوئی تھی، اب یاد نہیں [illegible] مصنف تھا [illegible] سوانح [illegible] کی تھی جہاں [illegible] کے سوانح [illegible] ہیرو [illegible] پتہ نہیں کہاں کہاں سے ایسی انوکھی کتابیں لا کر اسے پڑھنے کے پیسے دیتے تھے، وہ سب کتابیں تو اب دکھائی ہی نہیں دیتیں۔

کرن نے کہا ——— "یہاں سے پڑھ کر دیکھو، کیا خوب لکھا ہے ———"

وہ زمانے کب کسی صدی کی بات تھی۔ [illegible] ایک وقت ایسا تھا جب [illegible] ان کی حالت بھی [illegible] تھی [illegible] دنیا میں [illegible] تہذیب کے [illegible] کے ساتھ [illegible] تہذیب نے جنم لیا تھا، ان دونوں [illegible] کی حالت بھی [illegible] تھی۔ ان کے [illegible] جانوروں کو [illegible] دیتے تھے۔ وہاں کی [illegible] بھی [illegible] حاصل نہ [illegible] کی وجہ سے [illegible] ان کا [illegible] زندگی گزارتی تھیں، ان [illegible] کی طرح [illegible] تھا۔ [illegible] نہیں ہو [illegible] تھی [illegible] جانے پر [illegible] لوگ [illegible] وہاں کے لوگوں [illegible] کی طرح [illegible] زندگی بسر کرتے تھے۔ [illegible] کے بعد [illegible] بیٹے، وہاں بھی [illegible] جیسی [illegible] چھپا کر [illegible] تھیں، وہاں بھی [illegible] میں [illegible] اور [illegible] جانے کے خواب [illegible] تھی اور وہاں بھی [illegible] لوگ تھے [illegible] جانوروں کی طرح [illegible] کیا [illegible] کے محل [illegible] تو اب [illegible] تھے [illegible] کے ساتھ [illegible] قوت اور بقا کے [illegible] رہتے:

[illegible] نے کہا ——— "ہو بہو ہم لوگوں کے ساتھ مل جاتے ہیں [illegible]؟"

واقعی بڑی [illegible] تھی [illegible] میں [illegible] تھے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] —

[illegible] ———۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"When I see the poor without the clothing and without the shoes which they themselves are engaged in making, and contemplate the small minority who do not work and yet want for nothing, I am convinced that Government is still the old conspiracy of the few against the many, only it takes a new form — —"

[illegible]

[illegible]

"conspiracy کے معنی کیا ہیں۔"

[illegible] ——

مسٹر شاہ

کہنے لگے ——— وکیل بھی عجب ہے، یہاں تو اکبر میں سب تقریریں کیا کرتے ہیں محلے کے لیے، ورنہ یہ سرمایہ دار سب
منافق ہیں، یہ سب ——— لیڈروں کی جماعت کے ہیں ———

دیکھا کیا ——— یہ بھی کچھ دیر کی بات نہیں ہے۔

کہنے لگا ——— دادا، یہ سب لالہ کی سازش ہے، جو کہ شادی کا چندہ دینا ہے، وہی بات بھی ہے، تم خوبصورت چہرہ دیکھ کر
دل ہار جاتے ہو، دیکھ رہے ہو تمہارے لالہ جی چندہ نہیں دیں گے، وہ ہرگز چندہ نہیں دیں گے ———

لیکن نہیں، اس روز ہی ایک ملنے والا میرا لالہ جی سے ملاقات ہو گئی، شام کے وقت وہ دفتر سے لوٹ رہے تھے، اور اس روز ان
کے کپڑے بھی صاف ستھرے تھے، اکشیتوں پہنے ہوئے تھے اور سر پر ہیٹ تھا۔

انھوں نے کہا ——— ارے دیر ہو ———

دیکھو پیدل کے زور پہ جا رہا ہو ———

"آج آپ بہت سویرے واپس آ گئے؟"

"آدھا دن کا نیم، کام نہیں ہے کا تو گھر نہیں جاؤں گا۔"

ایک بار میرے جی میں آیا کہ وہ پوچھے لالہ جی کیا کام کرتے ہیں، کس دفتر میں ملازم ہیں، لیکن اس [illegible]
بات یاد آ گئی۔

"لالہ جی، ہم چاہتے ہیں کہ آپ چندہ دیں گے؟"

"چندہ؟ کیسا چندہ؟"

"ہماری لائبریری کا ———"

"تم لوگوں نے کیا لائبریری قائم کی ہے؟ خوب، خوب، اچھی بات ہے۔"

لالہ جی نے دوسری فرمائش کی۔ دیکھا ان سے باتیں کرنے کا اتفاق [illegible] چپ چاپ کھڑا تھا، لالہ جی [illegible]
[illegible] خاموش نہ رہ سکا۔

"لالہ جی، اس لائبریری کا سیکرٹری ہوں، اور دو پیسے ———"

"یہ بات ہے؟ واہ، بہت اچھی بات ہے، تم لوگوں نے کہاں لائبریری کھولی ہے؟"

لالہ جی نے بہت ساری باتیں دریافت کیں، کتابیں پڑھنا تو اچھی عادت ہے، [illegible]
[illegible] کتابوں کا [illegible] کیا ہے۔

لالہ جی نے کہا ———

"میں تمہاری لائبریری ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں، جلد دیر ہو ———"

کرپوسے کہا —

"ابھی پیجئے ؟ —"

وہ پھر سے کہا —

"ہم لوگوں نے پانسو تک ہی بیچا کرلیا ہیں۔ مزید تائید و مدد کے ٹیبل پر کچھ دینا ہوگا [illegible] —"

"یہ چندہ دس کا اکٹھا کیا ہوگا ؟"

وہ پھر اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ بتلا نہ پائے کہ [illegible] ایک روپیہ جب کرکے یا دس روپیہ [illegible]

چونکہ وہ نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"آپ دو روپیہ دیجئے گا [illegible] ۔ ۔ ۔"

[illegible] اُس نے کہا —

"اچھا، دو روپیہ دے دوں گا ۔ ۔ ۔"

کرپو نے کہا —

"آپ اس وقت دو روپیہ ہی دے دیجئے، انشاءاللہ [illegible] آپ نے دو سو روپے [illegible] آپ کو

وہ کیسے کہ ہمارے مستقبل کا [illegible] آپ چپ ہے، دیکھ لیجئے گا —"

[illegible] اس بات پر [illegible] چلے گئے۔

[illegible] [illegible] کی گلی کے اندر بستی کے [illegible] قریب [illegible] تھی۔ [illegible]

[illegible] یا [illegible] دیتا تھا۔ [illegible] [illegible] کہیں کہیں [illegible] تھی۔ ان

[illegible] [illegible] کے [illegible] ہوئے

وہ پھر کر [illegible] تھی۔

کرپو نے کہا —

"[illegible] روپیہ [illegible] پر کہاں سے ملے گے۔ ابھی [illegible] شروع کیا جا رہا ہے ۔ ۔ ۔"

[illegible] اُس نے کہا —

"اس سے کیا ہوگا ؟ [illegible] ہوگئے ہیں —"

اس کے [illegible] —

"شاید [illegible] ۔ ۔"

[illegible] [illegible] تھا۔ [illegible] ہوا تھا

[illegible] —

"میں اندر جا نہیں سکتا؟"

کرن نے کہا ——

"پہلے میں واش بیسن، آپ ذرا سا ٹھیک کر دیجئے گا۔"

متعدد دنوں کے بعد بھی اس وقت کی یاد تازہ ہو آتی کہ اسے شرم بھی آتی اور جھنجھلاہٹ اور دکھ بھی ہوتا! لیکن اس وقت تو بیچاری کو معلوم نہیں تھا کہ ۲۲ ابا اتنی دلچسپی سے اس کی لائبریری دیکھنے کیوں جا رہے تھے؟ آفس سے تھکے ماندے واپس آنے کے بعد بھی بستی میں پیدل چل کر گندگی کو پھلانگتے ہوئے وہ وہاں کیوں چلے گئے تھے؟ بہت دن پہلے کی بات ہے اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہی لائبریری دکھانا کرن کے لیے مصیبت کا سبب بن جائے گا اور وہ لائبریری کرن کی زندگی میں تباہی لے آئے گی۔

۲۲ ابا نے کہا —— "یہ بہت اچھی لائبریری ہے، یہ لائبریری تم کو چلا رہی ہو شاید؟"

کرن نے جلدی سے کہا —— "اس میں کا سیکرٹری بھی ہوں اور یہ پریسیڈنٹ ہے ——"

دیئے کی روشنی میں ۲۲ ابا ایک ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کر رہے تھے، فرش پر بوسیدہ چٹائی بچھی ہوئی تھی مٹی کی دیوار اور پھٹے ہوئے بوسیدہ چھپر کی اندر سب تھے اور اس روز اس شخص آپ ہی اور لالی ہر لالٹین کی دھندلی روشنی میں ۲۲ ابا جوش آن کی طرح دلچسپی اور شوق تجسس دیکھ کر دیپکا اور کرن کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ چندہ تو بہتوں نے دیا تھا۔ زبانی ہمدردی بھی بہتوں نے جتائی تھی اور راستے گھاٹ میں بہتوں نے حوصلہ افزائی بھی کی تھی لیکن ۲۲ ابا کی طرح کسی نے بھی جوش، دلچسپی اور شوق تجسس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے لائبریری میں قدم رکھ کر اس کی عزت بڑھا دی تھی گویا اسے ایک شرف دے دیا تھا۔

کرن نے کہا —— "۲۲ ابا! آپ ہم لوگوں کے پریسیڈنٹ بن جائیے، آپ پریسیڈنٹ ہو جائیں گے تو ہم لوگوں کو بڑی آسانی ہو جائے گی ——"

۲۲ ابا نے پوچھا —— "کون کون ممبر ہیں؟"

"سبھوں کو ممبر بنایا ہے ۲۲ ابا" کرن نے جواب دیا —— "ڈولی، لالی، چاند، چھوٹے دا، ہمارے جتنے کلاس فرینڈ ہیں، پریشر، پرت، کملا، زلی، بلست، دیپکا، اجیت، کمال سب لوگ۔"

۲۲ ابا نے پوچھا —— "اور محمود ہیں؟"

دیپکا نے کہا —— "ان لوگوں کو محمود سے ملوایا ہی نہیں دیا۔"

کرن نے کہا —— "میں محمود کے پاس بھی گیا تھا، محمود آئی کے ساتھ کرو دیں ——"

"تمام ممبر یہاں آتے ہیں؟" ۲۲ ابا نے پوچھا۔

"کوئی نہیں آتا ۲۲ ابا۔ میں اکیلے ہی یہ شیشہ لگا کر یہاں بیٹھا رہتا ہوں، کوئی نہیں آتا، اس لئے میں نہیں آتا ——"

۲۲ ابا نے کہا —— "ٹھیک ہے، اب میں آیا کروں گا۔"

آپ پہچانتے نہیں ہیں کیے؟
۷۷ بابا نے کہا ——— [illegible]

میں ۔۔۔
آپ نے [illegible] ——— [illegible]
[illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible]
۷۷ بابا [illegible]
[illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
۷۷ بابا [illegible]
تم [illegible] ہو؟
[illegible] نے کہا [illegible] ———
۷۷ بابا نے کہا ——— صاحب!
[illegible] نے کہا ——— [illegible]
[illegible]
۷۷ بابا نے گھبرا کے کہا ——— نہیں، میں [illegible]
[illegible] نے کہا ——— [illegible]
[illegible]
[illegible] ——— [illegible]

استعمال ہونا بند نہیں ہوتے اسی لیے بہت سے ایسے لفظ ہیں جن کا کچھ مطلب بدل گیا ہے اسی لیے ہم لوگوں نے یہ بنایا

ملا ہے۔

کالا بابو نے پوچھا کیسے بدلا ——

"یہ سب باتیں تمہیں کس نے سکھائی ہیں؟"

کرن نے جواب دیا —— "ہمارے ماسٹر کالا بابو، بھی تو جانتے ہیں اور وہ نہ جانے کتنے ہی لفظ ہیں انگریزی میں بھی ایسے

شبد ہیں اور ہندی اور اردو میں بھی کتنے ہی لفظ ایسے ملتے ہیں۔ اب وہ صرف کتابوں میں ہی ملتے ہیں۔ بہت سے لفظ بیکار

ہو گئے سب لوگ بھول گئے ہیں۔ یہ لفظ تو [illegible] ہو گئے ہیں۔ اب ان کے ذریعہ تمام لوگوں کو یہی بات کہی جاتی ہے"

وکیل نے کہا "ہاں! تم باتیں بہت اچھی بناتے ہو۔"

"بہت ہوشیار ہے!"

کالا بابو اشتیاق سے کرن کو دیکھ رہے تھے۔

"کرن بہت سمجھدار ہے، بہت لائق آدمی معلوم ہوتا ہے!"

وکیل نے کہا —— "ہاں، بہت عقلمند ہے۔ میرے ساتھ ابھی تک باتیں نہیں ہوئی ہیں۔" "کرن چاہتا ہے کہ

کے ساتھ اس کی باتیں ہوئی ہیں۔"

کالا بابو سوچ میں پڑ گئے۔

"بہت اچھا، بہت اچھی بات ہے۔ تمہاری یہ باتیں سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

اسے کچھ کہنا ہے۔ کالا بابو کی آنکھیں دیکھ کر وکیل [illegible] خوش ہوئی تھی۔ اس کا وعدہ کالی [illegible] کیا تھا جس کو وہ کبھی

پورا نہ کر سکے تھے۔ جیسا کہ وہ [illegible] کر رہے تھے۔ کالا بابو نے پہچان لیا تھا کہ یہ بھی ایک بچہ ہی تو ہے جو

[illegible] اس وقت [illegible] کا کام کرتا تھا اور [illegible] جانتا تھا

میں اور پیسے [illegible] [illegible] کا کام [illegible]

وہ چاہتا تھا۔ اسی [illegible] کالا بابو [illegible] ایک بار [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] کالی گھاٹ کا نام [illegible] حرف [illegible] نہ [illegible] اشرف کا نام [illegible]

[illegible] اور [illegible] لوگ [illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible] [illegible]

حرف [illegible] نہیں [illegible] کالی گھاٹ کا [illegible] نہیں [illegible] [illegible]

مشکل [illegible] [illegible] [illegible]!

کالا بابو کو کافی دیر ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا ——

"اچھا اب میں چلتا ہوں، کرن!"

کرن نے کہا —— "پھر آئیے گا کالا بابو!"

"خدا کی قسم"

اس کے بعد جب سے وہ دو مہینے کلکتہ سے واپس آیا تھا اسے یہ بیٹے کر کے گھر پہنچا
آیا تھا، وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ۲۲ اگست کے پہلے روز ہی اس کی یہ حالت ہو گی جو صورت اس کی ہو گئی تھی
دیکھنے والوں نے چہرے کی طرف دیکھا، بیٹے کو اس کی کسی بات کی خوشی نہ ہوئی، تیز تیز چند
سوچیں بیٹا رہا تھا کہ وہ کیا کرے، وہ خوشی کے مارے جیسے تھک سا گیا تھا اور اس کی دونوں آنکھیں خوشی

جاتے جب ٹاٹا بابو نے کہا۔

"تم مجھے ایک بار اس کو دیکھ لینے دو۔"

"کب، ٹاٹا بابو؟"

"آج شام کو، دیکھو"، ٹاٹا بابو نے کہا۔

ٹاٹا بابو چلے گئے اور وہ ... سے اٹھ کر ... کے ... اس کے بعد ... ایک
بیٹے کے سامنے ... بیٹھ گیا ... پر ... سے ... تماشہ ... چند
... کے ... ساتھ ... کے وقت ... اسی طرح وہ ... دیکھ
... سے ... میں ... سے ... جب ... اس ... سے
اچھل کر چہرے پر خوشی کے ساتھ ... آیا ... دیکھتے دیکھتے ... بعد اس کی حالت

"کرو"، اس نے اسے ... چاہا۔

... کرو کا ... تھا، وہ ... جا رہا تھا، ... جیسے ...
... پر ... کے ... گر پڑے گا

وہ اسے سنبھالنے کے لیے ... لے گیا۔

"مڑ کر جاؤ، رک جاؤ کرو!"

اس نے جلدی سے جیب سے ... کر کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کرو کی حالت ... تھی کہ وہ ...
رہا تھا۔

"مڑ کر جاؤ کرو!"

"چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو!"

دیکھنے والے پھر کہا ... رک ... کے ... رک جاؤ۔"

کرو رک گیا ... "میں کیا کروں بتاؤ تو ... دل چاہتا ہے کسی کو کچا کھا جاؤں۔"

"کیوں؟"

گرو کی حالت واقعی پاگلوں جیسی تھی۔

تبھی گرو خوشی سے اس سے بہت بہت بھائی، میں کیا کروں بتاؤ تو؟

دیکھرے نے کہا ——— تم یہ پانچ ہزار روپے، تمہاری ماں دیکھے گی تو یہی کہے گی کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔

مجھے وہ آج ہی کہاں کا بھی نہیں، سوال کا بھی نہیں، میں تمام رات جاگتا ہوں گا، تمہارے کام آ جائے تو اچھے آدمی ہیں

، تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا تھا؟ میں نے جھوٹ موٹ نہیں بتایا، آدمی کہہ کر گیا ہو گا ہے:

گرو نے چہرے کی طرف دیکھ کر دیکھرے کو سخت حیرت ہوئی، افسانوی کہانی میں ایک لاکھ روپیہ انعام پا کر بھی اس طرح دیا نہ

ہوگا۔ دیکھرے نے گرو کو زبردستی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا

ارے جاؤ، بک جاؤ، چپ رہو۔

اسے ایسے جا اس رنگ کر دیکھ کر رہ رہ کر گرو دیکھرے بھی خود کو سنبھال نہ سکا تھا لیکن اس دن دیکھرے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اتنی اچھی سی سی کے اسے میں کوئی رابطہ قائم کرنا درست نہیں۔ آج جلد ہی سے سامنے آ جائے کہ اس آدمی کے ساتھ انسان کی جان، کیسی ہی آدمیوں نے فقط چندہ دیا ہے، وہ شخص وہ آر، جس کے ساتھ نفر کے راستے میں ملاقات ہوئی تھی، ایک بات پر اس پانچ سو روپیہ چندہ دے رہا تھا۔ دکان میں سے بال سنبھالیں، اس کا اور رات بھر کو کھلوایا تھا۔ لیکن اس روز گرو اس طرح خوش ہے کا کوئی نہیں ہوا تھا اور جنہوں نے کچھ بھی نہیں دیا تھا اور جو بہت پڑا دینے کی دھمکی دی تھی ——— وہ سب کیا خواب ہی تھے؟ اس کا فیصلہ کیسے ہو گا کہ کون اچھا ہے اور کون خراب؟ روپے کے پیمانے سے؟ روپے سے انسان کی اچھائی ناپی جا سکتی ہے؟ مگر وہ اگر پانچ سو روپیہ چندہ نہ دیتے تو وہ بھی بیکار ہے، ایک ہی طرح گرو کی نگاہوں میں اچھے آدمی ہو جاتے یا؟ دیکھرے نے بعد میں بہت بار بہت سی باتیں سوچا تھا، لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ کوئی مستقل جواب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا، وہ کچھ سا پانے ہیں سے مختلف کر سکتا ہے:

گرو نے کہا ——— بھائی، یہ تمہارا فیصلہ وہی کا جانیں

، مگر پیسہ کہاں ہے؟

مجھے پتہ چلے گا، میں بستر کے نیچے چھپا کر رکھوں گا اور صبح اٹھ کر پڑھنے کے لیے دوں گا۔

دیکھرے نے کہا ——— اب تم جا کر کھانا کھاؤ، میں گھر جاتا ہوں:

اس وقت بہت دیر ایک چپ چاپ سی ہوئی تھی کہ لائبریری میں تنہا بیٹھا اس شاید اسے خوشی سے وہاں کھانا نہیں کھایا گیا شاید ہی کبھی نہیں واقعی تو یہ کس نے سوچا تھا کہ کام بار بار اس طرح اس کی لائبریری کی مدد پہنچے، اس طرح لائبریری میں آ کر اس کی بہت افزائی کر جائیں گے، اور چندہ کا کام اور ہر ہفتے میں نہ کسی دن چندہ وصولی بھی ہو جانے کی امید ہو سکے تو کیا اب اسے کوئی فکر نہیں [illegible]
[illegible]

[illegible] —— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ———— [illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ——

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

پھر چہرے سے مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔
"تم بہت کچھ جانتے ہو ڈیکر۔"
وہ ڈمی پہلے ڈیکر ہوا کے بارے میں جانتا ہی کیا تھا۔ صرف اس کی شکل دیکھ کر سمجھا تھا۔ خوبصورت سہ ہامت مند جسم تھا اس کا۔ دستی کے قریب سنا تھا۔ اس کو دیکھ کر یہ عجیب خوشی ہوئی تھی۔ خوشی بھی بڑی تھی۔ دکھ بھی ہوا تھا۔ یہی تو ہے وہ انسان! ایک کی تعریف آئیڈیل انسان! اس میں تھے ساتھ ساتھ بار بار دیکھ کر اسے دنیا کے تمام انسان حقیر معلوم ہوئے تھے
انھوں نے کہا تھا —— "اس سے خوبصورتی جھلکتی ہے ڈیکر، خوبصورتی تو انسان کو کبھی نہیں ملتی۔"
جیسے اس روز نوجوان شہزادہ سیٹھ کی اس لائبریری سے باہر آنے کے بعد ڈیکر کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے دنیا میں اگر کوئی آئیڈیل انسان ہو سکتا ہے تو وہ صرف ۷۷ اگر ہیں اور صرف ڈیکر ہی نہیں بلکہ دیگر نے بھی یہی سوچا تھا اور اب میری کلی سے نہیں ایک بار پھر ڈیکر نے دیکھا ۔۔۔۔ دروازہ ابھی کھلا ہوا تھا۔ ڈیکر اندر داخل ہو گیا۔ اگر وہ دونوں کمرے بار بار نانے کے سامنے جانے کیا کرتا تھا۔

"کون؟"
"میں ہوں ڈاکٹر ڈمی، میری بات سنو۔"
"اس وقت اچانک؟"
"۲۲۰ بار سے مجھے ہو جاتا ہے۔" ڈیکر نے کہا۔
"ہاں ۔۔۔ وہ بھی ڈمی اور ستی بھی انھوں نے کہا ہے۔"
ڈاکٹر اتنا کہہ کر اپنے کام میں لگ گئیں۔ مگر ڈاکٹر کے اس نے فرمانے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ پھر بھی وہ کہتی جیسے کام کرنے میں انھیں راحت ملتی ہو۔ چپ چاپ سنتا رہا جیسے بہت کچھ انھیں بتانا ہو۔
ڈیکر نے کہا —— "ہاں تم ہو ڈاکٹر ڈمی ۱۲۲ بہتر نمبر والا تمہارا بہت خوش ہے۔"
"وہ ڈمی، اچھا تو ہے۔"
"وہ نمبر والے سب بھی ہو گئے ہیں۔"
ڈاکٹر کے نمبر والی بات نے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اس کو بھی پتا تھا ڈمی دیدی ستی بھی کمرے کے تمام لوگوں سمیت اس وقت روز کی بات کر رہے تھے۔
دوسری منزل پر ڈمی دیدی کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ شاید ستی بھی وہیں موجود تھی۔ اب ستی کی ضرورت بھی ختم ہو چکی ہو گی۔ وہ سب بیٹھی ہوئی ہوں گی۔ تھوڑی دیر پہلے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ڈمی دیدی نے اس سے پوچھا تھا۔ ڈیکر کیا ہو گیا؟ واقعی ڈمی دیدی بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہے۔ اب سے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ جیسے ڈیکر تو جانتا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہیں۔ جس وقت ڈمی دیدی کو ضرورت ہوتی ہیں شاید ستی بھی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ستی اس سے کچھ

"وہ سب کے لئے ابو چھ[illegible] بعد ممی دیدی کے پاس کیسے آیا ہے؟"

ویکر سیدھے [illegible] چلا گیا۔

ممی دیدی اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جیسے [illegible] وہاں موجود نہیں تھی۔ آج کیا [illegible] واپس جاتی تھی

ویکر نے آواز دی ۔۔۔ "ممی دیدی!"

ممی دیدی نے کتاب سے نظریں ہٹا کر حیرت سے ویکر کی طرف دیکھا۔

بولی ۔۔۔ "کیا ہے تو پھر کیوں آ گیا؟"

"تمہیں معلوم ہے ممی دیدی ٹاٹا جی [illegible] کے ممبر ہو گئے ہیں۔" ویکر نے کہا ۔۔۔ "انھوں نے ابھی مجھے بتایا ہے۔"

ممی دیدی چونک گئی جیسے وہ کسی انجانے خوف سے سہم گئی ہو۔

"بتایا ہے؟ کیوں ہے؟"

"معلوم نہیں۔" ویکر نے جواب دیا

ممی دیدی نے پوچھا ۔۔۔ "تم سے ملنے کا وقت نہیں ہوئی؟ تو تیرے ہی یہاں گئی ہے!"

"میرے یہاں؟ ابھی؟ کیا کرنے؟"

"کہتی تھی تیری ماں کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔"

ویکر حیرت سے ممی دیدی کا منہ تکنے لگا ۔۔۔ "تو اس کے یہاں گئی ہے، اس کی ماں سے باتیں کرنا چا[illegible]

ویکر نے کہا ۔۔۔ "میں ٹاٹا جی سے مل کر ابھی آیا ہوں۔"

"میں نے ان کو کیا بے تکا یاد ہے!" ممی دیدی نے پوچھا۔

"ہاں بے ممی دیدی!"

ممی دیدی نے پھر یاد دہانی کرا دی، بولی ۔۔۔ "مگر پہلے کہ تم ہمارے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں، تو کہ[illegible]

میں کچھ نہیں جانتا، سمجھ گئی نا؟"

"دیکھو بہت مت جانا!"

"نہیں جاؤں گا۔"

"شاباش، بہت اچھے!"

اتنی دیر میں ویکر زینے سے اتر کے تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ تیسری منزل پر اس وقت ٹاٹا جی کپڑے تبدیل کر کے [illegible] سامنے بیٹھے [illegible] رہے تھے۔ ویکر کے قدموں کی آواز سن کر انھوں نے [illegible] طرف سر اٹھا کر [illegible] دیکھ کر کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"بیٹھو"
وہ پیٹر کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیمز ٹالبرٹ کا چہرہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس کا چہرہ اور دنوں کی طرح نہیں تھا۔ قدرے سنجیدہ تھا۔

ٹالبرٹ نے کہا۔۔۔ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔"

ویٹر نے کہا۔۔۔ "آپ کے چلے جانے کے بعد کمرہ اچھا لگتا تھا۔"

"کیوں؟"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے ٹالبرٹ، ہم کالج کی شکل سے لائبریری چلا رہے ہیں خاص سے کرنے کی محنت کر رہا ہے، وہ بہت اچھا لڑکا ہے ٹالبرٹ، خود دیکھا کر وہ لائبریری کا چندہ ہے، لائبریری کے پیچھے وہ دن رات محنت کرتا ہے، رات سوتے میں بھی وہ لائبریری کے خواب دیکھتا ہے۔"

ٹالبرٹ نے تمام باتیں غور سے سنیں اس کے بعد بولے

"میں نے تمہیں کیا کہنے کے لیے بلایا ہے، جانتے ہو؟"

وہ قدرے رک کر بولے ——

"تم کروتھ کے ساتھ رہا کرو۔"

[illegible] کے سامنے جیسے بجلی گر پڑی، اسے ٹالبرٹ کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔

"کیوں ٹالبرٹ؟" اس نے پوچھا

ٹالبرٹ نے کہا۔۔۔ "ہاں، میں کہتا ہوں تم اس کے ساتھ رہا کرو۔"

"جی وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے ٹالبرٹ!"

ٹالبرٹ کا چہرہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا، اتنا سنجیدہ کہ [illegible] دیکھ کر اس کا چہرہ دیکھ کر [illegible] ہوتے ہوئے اس نے ٹالبرٹ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میں کہہ نے تو کوئی قصور نہیں کیا ہے ٹالبرٹ، آپ کو معلوم ہے کتنی تکلیف سے [illegible] کے سامنے [illegible] سال سے اب اس کی زندگی کی حالت کتنی خراب ہے، کتنی کمائی ہے [illegible] کے گھر میں کھانا [illegible] اس کے [illegible] بیمار ہیں، اس کی ماں جیسے تیار کرتی ہے [illegible] اس کی [illegible] پھر [illegible] ایک پیسہ بھی گھر میں [illegible] کے لیے نہیں ہوتا، اس جیسا نیک لڑکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"چپ رہو۔"

ٹالبرٹ کی آواز [illegible]

"ہے ۔۔۔ تمہاری عمر کتنی ہے [illegible] ابھی [illegible] دنیا کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ تم نے ابھی دیکھا"

سوال پوچھا ... بعد ممی ڈیڈی کے پاس کیوں آیا ہے؟

ویچر سے پالا پڑ گیا۔

ممی ڈیڈی اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی، تیمی تو وہاں موجود نہیں تھی، تو کیا تیمی ابھی تک گھر واپس نہیں آئی؟

ویچر نے آواز دی —"ممی ڈیڈی!"

ممی ڈیڈی نے کتاب سے نظریں ہٹا کر حیرت سے ویچر کی طرف دیکھا۔

"ہاں —کیا ہے تو پھر کیوں آ گیا؟"

"تمہیں معلوم ہے ممی ڈیڈی کا ۲۷۲ آج ہم لوگوں کی لائبریری کے ممبر ہو گئے ہیں۔" ویچر نے کہا —"انہوں نے بلایا ہے۔"

ممی ڈیڈی چونک اٹھیں جیسے وہ کسی انجانے خوف سے سہم گئی ہو۔

"بلایا ہے؟ کیوں سے؟"

"معلوم نہیں۔" ویچر نے جواب دیا۔

ممی ڈیڈی نے پوچھا —"تیمی سے تیری ملاقات نہیں ہوئی؟ تیمی تو تیرے ہی یہاں گئی ہے!"

"میرے یہاں! اچھا! کیا کرنے؟"

"کہتی تھی تیری ماں کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔"

ویچر حیرت سے ممی ڈیڈی کا منہ تکنے لگا —"تیمی اس کے یہاں گئی ہے، اس کی ماں سے باتیں کرنا چاہتی ہے؟"

ویچر نے کہا —"میں ۲۷۲ اور سے مل کر ابھی آتا ہوں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے تجھے یاد ہے نا؟" ممی ڈیڈی نے پوچھا۔

"یاد ہے ممی ڈیڈی۔"

ممی ڈیڈی نے پھر یاد دہانی کرا دی، بولی —"مگر پوچھے کہ تم ہمارے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں، تو کہہ دینا بس جانتا، سمجھ گئے نا؟"

"زیادہ بولنا ہے ہے نا؟"

"نہیں بولوں گا۔"

"شاباش بول دو ہے بیٹے!"

اتنی دیر میں ویچر زینے طے کر کے تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ تیسری منزل پر اس وقت ۲۷۲ اور کپڑے تبدیل کر کے اپنے بیٹے شاید فجر کا کام کر رہے تھے۔ ویچر کے قدموں کی آواز سن کر انہوں نے فائل ایک طرف سرکا دی، اس کے بعد سامنے کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"بیٹھو۔"

وشپر کرسی پر بیٹھ گیا۔ شیمو کاکا بابو کا چہرہ دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی۔ ان کا چہرہ اور دنوں کی طرح نہیں تھا۔ قدرے سرد تھا

انھوں نے کہا —— "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، اسی لیے تمھیں بلایا ہے۔"

وشپر نے کہا —— "آپ کے بلانے کے بعد میں آنے والا تھا۔"

"کیوں؟"

"اُسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے بھی بڑی خوشی ہوتی ہے کاکا بابو۔ ہم کالج کی شکل سے لائبریری چلا رہے ہیں۔ خاص کر کرشن بڑی محنت کر رہا ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے کاکا بابو، خود نہ کما کر وہ لائبریری چلا رہا ہے۔ لائبریری کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ رات سوتے میں بھی وہ لائبریری کا ہی خواب دیکھتا ہے۔"

کاکا بابو نے تمام باتیں غور سے سنیں۔ اس کے بعد بولے

"میں نے تمھیں کیا کہنے کے لیے بلایا ہے، جانتے ہو؟"

وہ قدرے رُک کر بولے ——

"تم کرشن کے ساتھ مت رہا کرو۔"

یکایک وشپر کے سامنے جیسے بجلی گر پڑی۔ اسے کاکا بابو کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔

"کیوں کاکا بابو؟" اس نے پوچھا۔

کاکا بابو نے کہا —— "ہاں، میں کہتا ہوں تم اس کے ساتھ مت رہا کرو۔"

"لیکن وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے کاکا بابو!"

کاکا بابو کا چہرہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ آج پہلی بار شیمو نے کاکا بابو کا یہ چہرہ دیکھا۔ اتنا سنجیدہ ہوتے ہوئے تو اس نے کاکا بابو کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"لیکن کرشن نے تو کوئی قصور نہیں کیا ہے کاکا بابو! آپ کو معلوم ہے کتنی تکلیف سے وہ پڑھتا ہے۔ اس کے سامنے ... ہے۔ اس کی زندگی میں کتنی مصیبتیں ہیں، کتنی تکلیفیں ہیں۔ اس کے گھر میں کھانا کبھی نہیں پکتا۔ اس کے ابا ... بیمار ہیں۔ اس کی ماں جینو تیار کرتی ہے اور وہی جینو بیچ کر اس کی ماں گھر داری چلاتی ہے۔ پھر بھی وہ چندہ والا ایک پیسہ بھی گھر میں خرچ کرنے کے لیے نہیں دیتا۔ اس جیسا نیک لڑکا......"

"چپ رہو۔"

کاکا بابو کی آواز بڑی سخت سنائی دی۔

بولے —— "تمھاری عمر کتنی ہے وشپر؟ تم ابھی بچے ہو۔ نیک ... تم نے ابھی دیکھا

[illegible] ۷۷ بابا [illegible]

۷۷ بابا نے کہا ـــــ انسان کا سب کچھ دیکھا نہیں جا سکتا۔ ایسے جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ معلوم نہیں ہوتا۔ تم میری فکر زیادہ [illegible] میں نے بہت کچھ تم کو دیکھا ہے اور [illegible] کی ہے [illegible] کے لیے ہی [illegible] کے ساتھ [illegible] کرو۔

یہ بات ختم کر کے ۷۷ بابا خاموش ہو گئے۔ [illegible] ۷۷ بابا کی باتوں کی تردید کر کے ۷۷ بابا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ خاموش بیٹھا رہا۔

۷۷ بابا نے کہا ـــــ شاید یہ ماں ہے [illegible] کہ تم دیکھ کر [illegible] دوسروں سے [illegible] کام کر کے [illegible] کیا اس لیے کہ تم کرنے کے ساتھ [illegible] کیا تمہیں ایک [illegible] ہے [illegible] دوسروں کا [illegible] زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا؟

اب تو [illegible] کچھ دیر کر رہا۔

۷۷ بابا کہنے لگے۔ [illegible] کرنے کا ساتھ چھوڑنے جیسے تمہیں [illegible] ہے۔ ایک [illegible] سے بھی زیادہ پیاری [illegible] چھوڑا ہوگا۔ [illegible] دنیا کی [illegible] جیسی دنیا نہیں ہے [illegible] کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے [illegible] ٹھیک ہی کہا ہے [illegible] کچھ کر [illegible] نہیں ہے۔

اس کے بعد [illegible] کی طرف [illegible] پھیر لیا۔

اب تم جا سکتے ہو۔

[illegible] بیٹھے [illegible] اس نے سوچا۔ کیا [illegible] کرنے نے کیا قصور کیا ہے؟ [illegible] دوست ہو سکتا ہے۔ [illegible] دوست ہے؟ [illegible] ایک [illegible] نہیں [illegible] اچھا نہیں تھا۔ [illegible] ساتھ [illegible] کیا ہے۔ ساتھ ساتھ [illegible] جا سکتے ہیں [illegible] کا ساتھی ہے [illegible] اس کا ساتھ چھوڑنے [illegible] کرنے نے کیا قصور کیا ہے؟ [illegible] کیا گناہ ہے [illegible] کہتے تھے کہ انسان کو [illegible] انسان [illegible] ۷۷ بابا کا ساتھ چھوڑنے [illegible] سکتے ہیں؟ [illegible] نہیں سکے گا تو پھر کس کے ساتھ [illegible] کے ساتھ [illegible] نہیں کہیں گے؟ [illegible] کیا اس ساتھ [illegible] ۷۷ بابا [illegible] کیا [illegible] کے ساتھ [illegible] دیں گے؟ [illegible] ہوتا [illegible]

وکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہو۔ تمام کشش اچانک جیسے ختم ہو گئی ہو۔ اس پاؤں کے نیچے کی زمین، سر کے اوپر کا آسمان اور دوسری چیزیں جیسے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہوں اور وہ کسی خلا میں معلق ہو۔ اس کا کوئی وجود نہیں، اس کا کوئی بھی نہیں ہے، حالانکہ وہ ہر لمحہ پہلے تک وہ انہیں اپنا سمجھ رہا تھا۔ یہ کالا ہاؤس، یہ ٹمی ڈیوی، یہ کالی شے ... یہ دھرم ہوا، یہ فرسٹ اے ایل سکول، یہ کالی گھاٹ کے راستے، گلیاں سب کچھ جیسے اس کے اپنے تھے، آسمان پر چھائے بادل بھی اس کے اپنے تھے۔ سمندر بھی اپنا تھا، اور اس کے پیڑ کی شاخ پر بیٹھا پرندہ بھی اپنا تھا، اور راستے اور گلیوں میں گھومتے پھرتے لوگ بھی اپنے تھے۔ کسی سے نفرت یا محبت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہاں جو کچھ اچھا تھا، یہاں جو کچھ برا تھا، اس دنیا میں جو کچھ چھوٹا تھا اور جو کچھ بڑا تھا، جو کچھ ادنیٰ تھا اور جو کچھ اعلیٰ تھا، وکٹر تو ان سب سے وابستہ تھا۔ وکٹر کی وابستگی تو ان سب سے تھی۔ وہ کالا بابو کی باتوں سے جیسے اس شعور سے دور ہٹتے ہٹتے جیسے کسی خلا میں پہنچ گیا تھا۔ وکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گم ہو گیا ہو، سب کچھ کھو گیا ہو، سمندر اور ٹمی ڈیوی، کالی ماتا ... جیسے یہ سب بھی اس سے کھو گئے ہوں، صرف وہ کم ہو گیا ہو، نہیں کھو گیا ہو، جیسے اسے وہ روشنی ہی نہ ملی ہو اور اب اسے ذہن سے بھی وہ نہیں ملے گا۔ کالا ہاؤس کے باہر وہ باہر کر اس کا سراغ نہیں ملتا تھا۔

"اچھا!"

دوسری منزل کے برآمدے میں پہنچنے پر ٹمی ڈیوی نے دیکھا تھا، وہ کمرے کے دروازے سے لگی کھڑی تھی، لگتی تھی جیسے بہت دیر سے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ قریب آکر اس نے وکٹر سے پوچھا ... "اتنی دیر تک کالا بابو کے ساتھ کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

وکٹر کی آنکھوں میں کرب سا تھا۔ ٹمی ڈیوی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی ... "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"ٹمی ڈیوی! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر میں کون ہوں؟"

"کیوں، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کالا بابو نے کیا بہت کچھ الٹا سیدھا کہا؟"

"میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا ٹمی ڈیوی، ابھی میں کچھ جا رہا ہوں۔"

ٹمی ڈیوی حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی، اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

وکٹر نے کہا ... "تم کچھ خیال مت کرنا ٹمی ڈیوی، ابھی مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، میں ابھی گھر جا رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر ٹمی ڈیوی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور زینے سے نیچے اتر کر سڑک پر آ گیا۔ وکٹر کی کانوں میں جیسے ابھی سائیں سائیں ہو رہا تھا، اسے دور تک راستے کے ساتھ ساتھ جو دھند سی چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی، اس کا بھی اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے تمام دنیا میں وہ تنہا ہو، کبھی کوئی مرتے تڑپتے ہوئے، یہ سب اس کی پہنچ سے دور ہو گیا ہو، پھر اس سمندر میں بھی اس کا کوئی حق نہ رہا ہو۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وکٹر سیدھا اندر چلا گیا۔ کمرہ اسی طرح بکھرا پڑا تھا، جیسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میز پر ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ مدھم روشنی میں وکٹر نے چاروں طرف ہر چیز کو صاف صاف دیکھا۔ اس نے دروازہ بند کیا، کرسی پر بیٹھ گیا، اتنی دیر تک کالا بابو کے

پھر مجھے صدیوں پہلے سب کچھ اس کا جواب سے معلوم ہو گیا تھا۔
میں بے حجاب آنکھیں ہوں، تم تو ساری دنیا کو دیکھ رہی ہو؟"
سامنے ستی کھڑی تھی۔
ستی واپس جا چکی تھی اور ویکرم کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں وہ ویکرم کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے پہچان نہیں رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ان سانپوں کی طرف دیکھا جو ویکرم کے قدموں میں پڑے تھے اور ویکرم نے جھک کر اندھیرے میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ یکایک اُسے ہوش آ گیا۔

"ستی۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا کوئی وجود نہیں ہو جیسے اس کا وجود ختم ہو گیا ہو، وہ کہیں کھو گیا ہو۔ اس دنیا میں نہ ہو جیسے اس دنیا میں سب کچھ اس کا مٹ نہیں پا سکا۔
"ستی ٹھہرو۔"
ویکرم کسی شیطان کی طرح ستی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔
"تم نے مجھے بلایا؟"
"ہاں، اتنی دیر تک تم کہاں تھے؟ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"
ویکرم کچھ بھی نہیں سمجھ پایا۔ جیسے ستی اس سے کیا کہنا چاہ رہی ہو۔
اس نے کہا ..... "میں؟ مجھ سے پوچھ رہی ہو؟"
"ہاں تم سے نہیں تو پھر کس سے پوچھ رہی ہوں؟ یہاں پر تمہارے سوا اور کون ہے؟"
اتنا کہہ کر ستی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی ——
"میں تم سے پوچھ رہی ہوں، اتنی دیر تک میرے یہاں کیا کرتے تھے؟"
"میں؟ تمہارے یہاں جا کر بیٹھا تھا؟"
ویکرم عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ لالا جی کے یہاں اس کی دوستی پہلے دن سے تھی۔ کسی نے بھی تو اس طرح اس سے سوال نہیں کیا تھا۔ اس نے ابھی تک یہ سوال نہیں کیا تھا۔ لالا جی کیا اس سے پوچھنے ہیں؟
اس نے کہا "میں؟ تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟"
ستی نے کہا "بتاؤ، اتنی دیر تک میرے یہاں کیا کرتے تھے؟ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"
ویکرم خاموش رہا۔ پھر یکایک اسے کسی پرانی بات کی یاد آ گئی۔ کسی دیوتا کی کہانی۔ کسی دیوی کی زندگی کی بات یاد آ گئی۔
"بتاؤ کس سے باتیں کر رہے تھے؟ میں بھی تو تمہارے ساتھ تھی؟"
ویکرم نے ستی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل کی بات معلوم کرنی چاہی۔ ستی کیا اس پر شبہ کر رہی ہے؟ اندھیرے

سیتا کی آنکھوں کی تحریر پڑھنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا پھر بھی وہ ایک ٹک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ تاریکی اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ شیشم کے پیڑوں کا سایہ اور بڑھ گیا تھا۔ سیتا دروازہ کی طرف پشت کیے ہوئے کھڑی تھی اور دینکر سامنے میں کھڑا ہوا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اندر برآمدے کی روشنی سیتا کی پشت پر پڑ رہی تھی اور اس کے سر کے بالوں اور ساڑی کے آنچل پر بکھر رہی تھی۔

"بابا! اب چپ کیوں ہو؟ کس دوست سے باتیں کر رہے تھے؟"

دینکر نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔"

"پھر کس کے ساتھ؟"

"بابا کے ساتھ۔" دینکر نے جواب دیا۔

اس کی باتیں سن کر ایسا معلوم ہوا جیسے سیتا مطمئن ہو گئی ہو

بولی ——" تم ابھی ابھی گھر سے باہر تھے اور ادھر تمہاری ماں تمہاری بیٹی تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہے۔ جلدی گھر جاؤ۔"

"تاکہ تم شاید سیتا بھی جاتی۔" دینکر نے جواب کے بجائے سوال کر دیا۔ "کبھی اگر میں نے کسی دوسرے سے باتیں کی ہوں تو ان کا کیا مطلب ہے؟"

سیتا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ سن لو کہ یہ کہتی ہے بلکہ دیدی نے ساتھ تمہاری چاہت باتیں کرنا چھپایا۔ لیکن اس کو کبھی پڑھنا لکھنا ہے اور نہیں بھی پڑھنا لکھنا ہے تو باتیں کرنا کیا اچھا ہے؟ تمہاری ماں کہہ رہی تھی کہ تم پڑھنے لکھنے پر بالکل دھیان نہیں دیتے۔"

یکایک سیتا بالکل بدل سی گئی جیسے یہ وہ سیتا نہیں ہو۔

دینکر نے کہا —— "میں تو لکھتا پڑھتا ہی ہوں۔"

"لکھتے پڑھتے ہو۔ میں تمہاری ماں سے سب کچھ سن چکی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم ایک سال تک فیل ہو گیا ہے۔ اور بات اسی کے ساتھ گھومتے رہتے ہو۔ میں سب کچھ سن چکی ہوں۔"

یکایک دینکر نے خود سوال کر دیا۔

"تم پہلے جیسی کیوں نہیں رہیں؟"

"کیوں نہیں جانا چاہیے؟"

دینکر نے کہا ——" میں یہ نہیں جانتا۔ لیکن تم پہلے جیسے یہاں ہوا کرتی تھیں ویسا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

[illegible] سے جو کا مطلب سن کر تھا:

وہ بچا دو بہت دیکھنے میں جیسا تھا آپ ویسا نہیں ہے، مجھے مطلب ہے: کہ یہ تم سے دوستی [illegible] نفرت سے یہاں آئی تھی۔

ویشنے کہا —— "تم بہت ساتھ دوستی کرنے کے لیے تم تو بے چین ہو رہے ہو؟"

ستی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جب —— "میں نے اس روز بات تمہاری ماں کو بتا دی ہے، تمہارے گھر پر سارا دو کے [illegible] تھی، یہ سب کرتا ہوں اس بہت جلدی ہو میں —— اس لڑکے نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے، تم شاید خود ہی اس کی باتیں کرتے ہو؟"

یہ بات ختم کر کے وہ بیٹھنے لگی اور ویشنے کر وہ جا رہی یاد آ گئیں جو [illegible] سے پہلے کبھی بیدی نے کسے بتلائی تھیں۔

اس نے پھر پوچھا —— "اچھا ستی، سچ سچ بتاؤ، تم میرے یہاں کیوں آئی تھیں؟"

"یہ تو مجھے کہنا نہیں چاہیے تھا۔"

"نہیں، تم سچ سچ بتاؤ، تمہیں یہاں نے [illegible] سے [illegible] گئے۔ کبھی نہیں [illegible] پھر [illegible] دونوں سب ایک جا گئیں؟"

ستی نے کہا —— "کیوں، تم پوچھتے ہو، میں نہ بولوں؟"

"نہیں، میں یہ نہیں کہتا، میں [illegible] تمہارا کوئی مقصد تھا [illegible] تو تمہیں نہیں جانتی، کا کوئی نہیں جانتا کا بابا بھی نہیں جانتے —— پھر تم یہاں کیوں آئی تھیں؟"

"وہاں کوئی نہیں جانتا اور یہاں کے بھی نہیں جانا چاہیے، میں اور لوگوں سے مختلف ہوں، شاید اس لیے کہ میں اُن سے مختلف ہوں۔"

ویشنے سر ہلایا

"نہیں، مجھے یقین نہیں آتا، تم اُن سے مختلف نہیں ہو۔"

ستی اس کی باتیں سن کر [illegible] وہ خاموش کھڑی رہی، اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ویشنے کہا —— "اصل بات یہ نہیں ہے، اصل بات میں جانتا ہوں۔"

"کیا ہے اصل بات؟"

ویشنے کہا —— "تم میرے یہاں کس لیے آئی تھیں، میں جانتا ہوں۔ تم نہیں بتاؤ گی تو میں ہی سمجھتا ہوں۔"

ستی [illegible] دیکھا رہ گئی

"کیا جانتے ہو تم، بولو تو سنوں، میں تمہارے یہاں کس لیے آئی تھی، بتاؤ تو دیکھوں؟"

"میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" ویشنے جواب دیا۔

تب وہ زینے سے اتر آئی۔

"نہیں، یہ میں کبھی تم سے، تمہیں نہیں بتاؤں گا۔"

ویلکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے ستی اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھ رہی ہو، جیسے وہ اس کے دل کی تہہ میں چھپی ہوئی باتوں کا پتا چلا رہی ہو۔ ستی اس کے بالکل قریب آگئی تھی۔ ویلکر پیچھے ہٹ گیا۔

بولا ـــــ "تم سمجھتی ہو، میں کچھ بھی نہیں سمجھتا، کیوں؟"

ستی نے کہا ـــــ "بہت خوب، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایسا سمجھتی ہوں؟"

"تم سب کچھ سمجھتے ہو۔" ویلکر نے کہا ـــــ "تم سمجھتی ہو، تمہارے کالا بابو سمجھتے ہیں اور کالی ماں بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں کہ مجھ سے کوئی بات معلوم کر سکو گی۔ تم میرے یہاں آکر رہی، اس سے پہلے مجھ سے ملا، تم کتنا ہی پیار کرو، جتنی دلداری کرو، میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

پہلی بار ویلکر کی زبان سے کالی ماں کی باتیں سن کر ستی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے

بولی ـــــ "اس کا مطلب؟"

"نہیں، اس کا مطلب بھی نہیں بتاؤں گا۔" ویلکر نے جواب دیا ـــــ "تم دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہو، بس کو دھوکا دیتی ہو، حالانکہ دھوکا دینے سے آدمی کو کتنی تکلیف ہوتی ہے، یہ تو نہیں جانتی؟"

ستی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

اس نے پوچھا ـــــ "کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میں جس کی بات کر رہا ہوں، یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔" ویلکر نے جواب دیا ـــــ "میں تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم کیا سمجھتی ہو؟ تم تو صرف شک کرتی ہو۔"

"شک کرتی ہوں؟ کس پر؟ کس پر شک کرتی ہوں؟"

"یہ بھی تم نہیں جانتیں کہ کس پر شک کرتی ہو؟ یہ بھی تمہیں بتانے کی ضرورت ہے کیا؟"

ستی نے ایک لمحے کچھ سوچا، پھر بولی

"تم کس کی بات کر رہے ہو، بتاؤ تو؟ تم سے یہ سب کس نے کہا ہے؟ کسی نے کہا؟"

ویلکر نے کہا ـــــ "میں تمہیں بتا دوں اور تم سبھوں کو بتا دو ـــــ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

ستی نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ـــــ

"لیکن میں کس پر شک کرتی ہوں، تم نے یہ تو نہیں بتایا؟"

"وہ کس پر؟ مجھ پر؟ تم مجھ پر شک کرتی ہو؟ تم سمجھتی ہو میں کچھ بھی نہیں جانتا؟"

"تم پر شک کرتی ہوں؟ تم پر شک کیوں کروں گی؟ کس لیے تم پر شک کروں گی؟ تم نے کیا کیا ہے؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔"

یہ کہہ کر ویلکر سیدھا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اور [illegible] ستی وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی، ویلکر کی باتوں پر [illegible] سے کھڑی رہ گئی۔

دنیائے عرب

بصیر عالم

دنیائے عرب کی سیاست ـــــــ دوسری جنگ عظیم کے بعد

دوسری جنگ عظیم کے بعد تیسری دنیا کے مسائل [illegible]

[illegible] دوسری جنگ عظیم کے بعد [illegible] کسی نے نہیں دیا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد فاتح طاقتوں نے [illegible]
کے [illegible] کر دیا تھا لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد اکثر اہم مسائل پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔

جنگ کے نتیجہ میں امریکہ اور سوویت روس کو بڑی طاقتوں کی حیثیت حاصل ہو گئی اور یہ دونوں ملک جو اصل میں [illegible]
[illegible] دونوں ملکوں کے نظریات میں [illegible] تضاد تھا [illegible] اشتراکیت [illegible]
[illegible] طاقتوں کی شکست کے ساتھ ہی [illegible] ختم ہو گیا اور اشتراکیت و سرمایہ پرستی کے [illegible]
ہو گیا۔ روس نے جنگ کے بعد [illegible] سے فائدہ اٹھایا اور امریکہ نے اپنی دولت کے ذریعے اشتراکیت کے سیلاب کو
روکنے کے لیے [illegible] اس طرح [illegible] نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء سے طاقتوں کے [illegible] کمیونزم اور سرمایہ دار
[illegible] کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی۔ دنیائے عرب بھی سرد جنگ سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہ علاقہ جغرافیائی [illegible] کی وجہ سے
پہلے ہی [illegible] اہمیت کا حامل تھا اور تیل کی دریافت نے اس کی اہمیت کو دو چند کر دیا تھا۔ مغربی طاقتیں پہلے ہی اس علاقہ میں [illegible]
[illegible] غلبہ رکھتی تھیں اب روس بھی یہاں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا۔ جبکہ عرب عوام ہر قسم کے سامراج سے اپنی سرزمین کو پاک کرنا
چاہتے تھے۔ چنانچہ دنیائے عرب کی سیاست [illegible] مغربی سامراج، کمیونزم اور عرب قومیت کے درمیان کشمکش کی آئینہ دار ہے۔

مئی ۱۹۴۵ء میں عرب لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۵۰ء میں عرب لیگ کے رکن ممالک نے باہمی تحفظ کے معاہدہ پر دستخط کیے
جس پر ۲۲ اگست ۱۹۵۲ء سے عمل درآمد کیا گیا۔ یہ معاہدہ [illegible] امریکہ کے مفاد پر براہ راست [illegible] تھا۔ مغربی طاقتیں
چاہتی تھیں کہ عرب اقوام ان کی سرپرستی میں دفاعی معاہدے کریں۔ چنانچہ برطانیہ، ترکی اور عراق کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ کیا
اور ۱۹۵۵ء میں [illegible] معاہدہ [illegible] جس میں برطانیہ، ایران اور پاکستان بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں معاہدہ بغداد پیکٹ
کی [illegible]
[illegible] ۱۹۵۸ء میں [illegible] مصر نے شام اور [illegible]
[illegible]
[illegible] ہو گئی۔

جس کے نتیجہ میں عربوں کو جو شکست اس وقت تسلیم ہوئی وہ کبھی نہیں ہوئی تھی جب ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا تھا۔ مصر کو اسرائیل کی بڑھتی ہوئی عسکری طاقت سے خطرہ تھا اور مغربی طاقتوں سے مایوس ہو کر وہ روس کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اس لیے صدر ناصر نے اکتوبر ۱۹۵۵ء میں کمیونسٹ ملکوں سے ہتھیار خریدے۔ مغربی طاقتوں کو مصر کی یہ روش سخت ناگوار گزری۔ برطانوی وزیر اعظم سر انتھونی ایڈن نے امریکی صدر آئزن ہاور سے ملاقات کی جس کے نتیجہ میں دونوں نے جنوری ۱۹۵۶ء میں یہ اعلان کیا کہ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے اسرائیل اور عرب ریاستوں کی موجودہ سرحدیں قائم رکھنے کا جو عہد کیا تھا وہ اس پر قائم رہیں گے۔ اس ملاقات میں مسٹر ایڈن نے دیکھا کہ صدر آئزن ہاور عرب ملکوں کے ساتھ معتدل رویہ اختیار کرنے کا اعلان کر دیں جس سے واضح ہو گیا کہ تیل سے متعلق اپنے معاشی مفاد کے پیش نظر امریکہ عرب ملکوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔ مسٹر ایڈن کی مصر دشمنی آخر کار جنگ سویز کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کے نتیجہ میں انگریزوں کو نہر سویز سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونے پڑے۔ سویز کی شکست نے جہاں ایک طرف دنیائے عرب میں آزادی کی تحریکات کو تقویت بخشی وہاں دوسری طرف سامراجی طاقتوں کو اپنے مفاد کے اجتماعی تحفظ پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور نے امریکی کانگریس سے یہ اختیار حاصل کیا کہ وہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کو جو اشتراکی جارحیت کا شکار ہوں امداد دے سکتے ہیں اور بوقت ضرورت کسی بھی ملک میں فوجی مداخلت کر سکتے ہیں۔ جب ۱۹۵۸ء میں لبنان میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی تو امریکہ نے وہاں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ عراق میں شاہ فیصل کا تختہ الٹنے کے بعد برطانیہ نے بھی اردن میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ان دونوں ملکوں سے بیرونی فوجوں کو رخصت ہونا پڑا۔

شمالی افریقہ میں بھی تیونس اور مراکش نے ۱۹۵۶ء میں آزادی حاصل کر لی۔ الجزائر میں بھی قوم پرستوں نے ۱۹۵۴ء میں فرانسیسی سامراج کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور ایک طویل اور خونریز جنگ کے بعد ۱۹۶۲ء میں آزادی حاصل کر لی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے دنیائے عرب میں آزادی کی جو جدوجہد شروع ہوئی تھی اس کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب اور خلیج فارس کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سوا آج تمام عرب ملک کم از کم سیاسی اعتبار سے آزاد ہیں۔ اس آزاد دنیائے عرب کی سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند اہم ملکوں کی جدوجہد آزادی اور سیاست کی روشنی میں ان کے حالات کا اجمالی جائزہ یا تجزیہ کیا جائے۔

مصر

اس وقت جبکہ دوسری عالمی جنگ قریب الختم تھی مصری قوم پرستوں نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ اس معاہدہ کی رو سے برطانیہ کو مصر کے مواصلات اور دفاع پر اختیار حاصل تھا۔ سوڈان کا مستقبل بھی مصر کی مرضی کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ نہر سویز کا دفاع بھی برطانیہ کی ذمہ داری تھی اور اسے نہر کے علاقہ میں فوجیں رکھنے کا اختیار حاصل تھا۔

مصری قوم پرستوں کے مطالبات یہ تھے کہ وادی نیل کے تحت مصر اور سوڈان کو متحد کر دیا جائے اور نہر سویز کے علاقہ سے برطانوی فوجیں ہٹا لی جائیں۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ پر نظرثانی کے سلسلے میں حکومت برطانیہ سے بات چیت جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۵۱ء میں مصطفیٰ نحاس پاشا کی حکومت نے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۳۶ء کے معاہدوں کو یکطرفہ طور پر منسوخ کر کے شاہ فاروق کو مصر و سوڈان کا بادشاہ قرار دیا۔ اس اعلان کے بعد برطانوی فوجوں سے مصری فدائین کی جھڑپیں شروع ہو گئیں جو انہیں نہر کے علاقہ سے نکالنے کے لیے سرگرم عمل تھیں۔ مصری حکومت کے اس اقدام کے بعد برطانیہ نے یہ تجویز پیش کی کہ مصر کو مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم

پہلے یہ اجلاس کبھی ایک وقت مشرق وسطیٰ کی دفاعی کانفرنس کے وقت [illegible] میں [illegible] مطالبہ یہ تھا کہ مصر [illegible] [illegible] ۱۸ جون ۱۹۵۳ء کو جمہوریت کی شکل اختیار کر گئی۔ ان حضرات نے ہدایت کی کہ وقت کے [illegible] شاہ فاروق [illegible] بادشاہ [illegible] چاہتے تھے [illegible] خاص پاشا کا [illegible] اور شاہ [illegible] [illegible] شاہ فاروق کی [illegible] ہے۔

۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء کو فوجی افسروں کے ایک گروہ نے جنرل نجیب کی قیادت میں شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا۔ ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کو شاہ فاروق معزول ہو کر ملک سے چلے گئے اور ۱۸ جون ۱۹۵۳ء کو مصر کو جمہوریہ قرار دیا گیا جس کے پہلے صدر جنرل نجیب مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد جنرل نجیب اور کرنل ناصر کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ [illegible] ۱۹۵۴ء کو جنرل نجیب جمہوریہ مصر کے صدر اور کرنل ناصر وزیر اعظم نیز انقلابی کونسل کے صدر مقرر کیے گئے۔ اب حقیقی اختیارات انقلاب کونسل کے صدر کرنل ناصر کے ہاتھ میں تھے۔

معاہدۂ سوڈان

جنرل نجیب کے دور میں سوڈان کا مسئلہ حل ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ مسئلہ مذاکرات کے ذریعے حل ہو جائے لیکن برطانوی حکومت انقلابی حکومت سے مذاکرات کے لیے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ جنرل نجیب نے برطانوی حکومت کو نظر انداز کر کے سوڈان کی سیاسی پارٹیوں سے براہ راست مذاکرات شروع کر دیے۔ انقلابی حکومت کی یہ چال کامیاب ثابت ہوئی۔ برطانوی حکومت جانتی تھی کہ اگر مصر و سوڈان [illegible] اس لیے انہوں نے [illegible] مذاکرات کیے جائیں۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں [illegible] ۱۹۵۳ء کو ایک معاہدہ پر دستخط کیے گئے جس کی رو سے سوڈان پر [illegible] مشترکہ دور حکومت ختم ہو گیا اور سوڈان کو خود مختاری دے دی گئی۔ معاہدہ میں طے پایا کہ سوڈان پارلیمنٹ کے لیے فوری انتخابات کیے جائیں اور [illegible] کمیشن مقرر کیے جائیں۔ [illegible] نومبر اور دسمبر ۱۹۵۳ء میں انتخابات ہوئے اور [illegible] مصر سے اتحاد کے حق میں [illegible] مصر و برطانیہ کے درمیان معاہدہ کے مطابق [illegible] انتخابات ہونے والے تھے لیکن ان انتخابات سے قبل ہی سوڈانی پارلیمنٹ نے سوڈان کی آزادی کا اعلان کر دیا اور مصر و برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ سوڈان کو آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کریں۔ مصر و برطانیہ نے سوڈان کی آزادی تسلیم کر لی اور اس طرح [illegible] کا معاہدہ جس کی رو سے سوڈان [illegible] یکم جنوری ۱۹۵۶ء میں سوڈان کی آزادی کے ساتھ ختم ہو گیا [illegible]

پسندوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ انھوں نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ سوڈان عرب لیگ کا رکن ہوگا اور اس کی خارجہ حکمت عملی غیر جانبدارانہ ہوگی۔ نومبر ۱۹۵۸ء میں فوج نے جنرل عبود کی قیادت میں جمہوری حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں فوجی حکومت نے دریائے نیل کے پانی کی تقسیم کے متعلق مصر سے ایک سمجھوتہ کر لیا اور اس طرح ایک سیاسی مسئلہ حل ہو گیا جو مستقبل میں مصر و سوڈان کے درمیان نزاع کا باعث ہو سکتا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں اسلامی پارٹیوں کی رہنمائی میں جنرل عبود کی حکومت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ حکومت نے تشدد کا راستہ اختیار کیا تو مظاہروں نے عام بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ آخرکار جنرل عبود کو ملک چھوڑنا پڑا اور سوڈان میں دوبارہ جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔

مصر کی داخلی سیاست

۱۹۵۲ء کے انقلاب کے وقت مصر میں دو منظم سیاسی پارٹیاں یعنی وفد پارٹی اور اخوان المسلمون موجود تھیں۔ انقلاب کے ساتھ ہی ایک تیسری سیاسی پارٹی منظر عام پر آئی اور وہ تھی فوج کے آزاد افسروں کی تحریک۔

وفد پارٹی میں مختلف جمہوریت پسند عناصر شامل تھے۔ ان میں سرمایہ دار، شاہ پرست جاگیردار اور آزاد خیال نوجوان غرض ہر قسم کے لوگ تھے لیکن پارٹی کی قیادت سرمایہ دار اور جاگیردار عناصر کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ لوگ صرف اپنے طبقے کے لیے آزادی اور جمہوریت چاہتے تھے۔ شاہ فاروق ان کے طبقاتی مفاد کی علامت تھے اور شاہ کے توسط سے ان لوگوں کے [illegible] معاملات حل ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طویل جدوجہد کے باوجود وفد پارٹی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اخوان المسلمون ایک اسلامی جماعت تھی۔ یہ جماعت فوج اور نچلے متوسط طبقے تک محدود رہی۔ مصر کی نئی نسلیں مغربی خیالات و نظریات سے متاثر ہو چکی تھیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں قومیت، جمہوریت اور اشتراکیت کے نظریات سرایت کر چکے تھے۔

۱۹۳۶ء میں فوج میں شاہی خاندان اور طبقہ امراء کے نوجوان ہی افسر ہوتے تھے لیکن اس کے بعد سے [illegible] افسری کے دروازے عوام کے لیے بھی کھول دیے گئے اور افسروں کے طبقہ میں ترقی پسند نوجوان بھی شامل ہو گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے جمال عبدالناصر کی قیادت میں آزاد افسروں کی تحریک شروع کی اور آخرکار انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔

اپریل ۱۹۵۴ء میں کرنل ناصر مصر کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ ان کی اقتصادی، معاشی اور سیاسی اصلاحات سے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے، شاہی کے کارندے اور سیاسی پارٹیوں کے لیڈر ناخوش تھے۔ نجیب اور ناصر کے درمیان اقتدار کی کشمکش میں ناصر کا ہی ہاتھ تھا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کی شام [illegible] جب وہ ایک جلسہ میں خطاب کر رہے تھے ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جس سے وہ بچ گئے۔ حملہ آور اخوان المسلمون کا ایک رکن تھا۔ اس واقعہ نے کرنل ناصر کے ہاتھ مضبوط کر دیے۔ انھوں نے نہ صرف اخوان المسلمون اور دیگر سیاسی پارٹیوں کو ختم کر دیا بلکہ جنرل نجیب کو بھی اس بنا پر صدارت سے معزول اور اپنے مکان میں نظر بند کر دیا کہ حملہ آور کو ان کی تائید حاصل تھی۔ اس واقعہ کے بعد کرنل ناصر نے [illegible] سیاست کے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

"جب تک [illegible] قانون ساز مجلس [illegible] جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا اثر ختم نہیں ہو جائے گا۔"

متحدہ ہے کہ تقریباً تیس سال بعد ۱۸ جون ۱۹۵۶ء کو برطانیہ نے اپنے آخری فوجی دستوں کا انخلا کیا [illegible] کو
فوجی نظام کی ایک نئی جماعت وجود میں آگئی جس کے تحت [illegible]
[illegible] جس میں سوائے جمہوریت [illegible]
[illegible] شامل ہیں۔

معاہدۂ سوئز

۱۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مصر اور برطانیہ کے درمیان سوئز کے بحری اڈوں کے انخلا کے متعلق ایک معاہدہ پر دستخط کیے گئے۔ اس معاہدہ کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

- برطانوی فوجیں بیس مہینے کے اندر اندر سوئز کا علاقہ خالی کر دیں گی۔
- سوئز کے علاقے میں تمام فوجی اڈے اور سامان جو برطانیہ کی ملکیت ہیں گے، [illegible] کی تعداد میں بہتر بنانا پڑے گا۔
- اگر کسی بیرونی طاقت نے عرب لیگ کے کسی ممبر ملک یا ترکی پر حملہ کیا تو برطانوی فوجیں سوئز کے فوجی اڈوں پر دوبارہ قابض ہو جائیں گی اور مصر انہیں تمام سہولتیں دے گا۔
- نہر سوئز میں تمام ملکوں کے جہازوں کو آزادی سے گزرنے کی اجازت ہوگی۔
- ۱۹۳۶ء میں مصر و برطانیہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔
- یہ معاہدہ سات سال تک نافذ رہے گا۔

جنگ سوئز

۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو صدر ناصر نے [illegible] کیا۔ اس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ [illegible] جو کہ [illegible] نہ [illegible] کو [illegible] جب [illegible] کیا جا رہا تھا [illegible]
[illegible] نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ روس اور دیگر کمیونسٹ ملکوں سے [illegible] ہوا [illegible] مصر کے [illegible]
[illegible] اور [illegible] چکے تھے [illegible] جواب [illegible]
[illegible] نہر سوئز کمپنی کے قومیانے کا اعلان کر دیا۔ یہ اقدام سوئز کمپنی کے حصہ داروں [illegible] برطانیہ اور
فرانس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ [illegible] کی تجویز [illegible]
[illegible] سیکرٹری جنرل [illegible] کی قیادت میں پانچ قوموں کا
ایک وفد مصر بھیجا [illegible] کی بنیاد پر [illegible] کانفرنس کر [illegible]
پیش [illegible] تجویز ناقابل قبول [illegible] برطانیہ اور فرانس [illegible]
[illegible] دوسری آزادی [illegible]
[illegible] کانفرنس منعقد [illegible] ایک جماعت کا قیام [illegible]

رہ گیا لیکن اس جارحیت نے مصر کے معاملات میں دخل اندازی کی تھی اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

برطانیہ اور فرانس کا اقرار تھا مشترکہ طور پر دنیا پر یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ نہر کا مسئلہ پُرامن طور پر حل کرنا چاہتے ہیں لیکن اندر خانہ انہوں نے اسرائیل کو مصر پر حملہ کرنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اسرائیل نے مصر کی توجہ ہٹانے کے لیے پہلے اردن کی سرحدوں پر متعدد حملے کیے اور پھر ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اچانک مصر پر حملہ کر دیا۔ چشم زدن میں غازہ اور جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ ہو گیا۔ برطانیہ اور فرانس نے مصر اور اسرائیل کو متنبہ کیا کہ وہ نہر سویز کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور اپنی فوجوں کو نہر سے دس میل دور رکھیں اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو برطانیہ اور فرانس نے بندرگاہ سعید اور بندرگاہ فواد پر بمباری کر کے وہاں اپنی فوجیں اتار دیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مصر کی مذمت سے متعلق قرارداد برطانوی حق تنسیخ کی وجہ سے منظور نہ ہو سکی۔ چنانچہ یہ معاملہ اسمبلی میں پیش کیا گیا اور جنرل اسمبلی نے جنگ بندی اور غیر ملکی افواج کے انخلا کی قراردادیں بھاری اکثریت سے منظور کر لیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر روس نے برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کو مداخلت کی دھمکی دے دی اور اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ روس کی یہ دھمکی کام کر گئی۔ برطانیہ اور فرانس نے جنرل اسمبلی کی قراردادیں قبول کر لیں۔ جنگ بندی پر فوراً عمل کیا گیا مصر کی سرزمین سے برطانوی اور فرانسیسی فوجیں واپس چلی گئیں۔ اسرائیل نے بہت تاخیر اور ٹال مٹول سے کام لیا لیکن غزہ کا علاقہ خالی کر دیا۔ مصر اور اسرائیل کی سرحدوں پر بین الاقوامی فوج تعینات کی گئی اور اقوام متحدہ نے اپنے خرچ سے نہر سویز کو ڈوبے ہوئے جہازوں سے صاف کرایا۔

برطانوی وزیراعظم انتھونی ایڈن کا خیال تھا کہ وہ تین چار روز میں نہر سویز کے تمام علاقے پر قبضہ کر کے اقوام متحدہ سے محض ایک فاتح کی حیثیت سے بات کریں گے اور نہر سویز سے متعلق اپنی شرطیں منوا لیں گے لیکن یہ جنگ تقریباً دس دن تک جاری رہی اور برطانیہ و فرانس نہر سویز کے تمام علاقے پر قابض نہ ہو سکے۔ اس عرصہ میں دنیا کی رائے عامہ حملہ آوروں کے خلاف شدید طور پر ہو گئی اور روس نے اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ مسٹر ایڈن کو امید تھی کہ امریکہ ان کا ساتھ دے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت امریکہ دنیائے عرب میں غیر مقبول ہو رہا تھا اور اس کے اپنے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا چنانچہ امریکہ نے بھی برطانیہ اور فرانس کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اقوام متحدہ کی قراردادیں مان لیں۔

اس جنگ کے نتیجہ میں برطانیہ اور فرانس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہر سویز سے دستبردار ہونا پڑا۔ صدر ناصر دنیائے عرب کے قائد بن گئے۔ روس ایشیائی ممالک اور خصوصاً دنیائے عرب میں مقبول ہو گیا اور برطانیہ اور فرانس کے دوست کی حیثیت سے امریکہ کی غیر مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔

اقوام متحدہ کے دباؤ اور روس کی دھمکی نے حملہ آور طاقتوں کی فوجی فتح کو سیاسی شکست میں تبدیل کر دیا۔ مگر مصر کو دنیا کے سامنے [illegible] حاصل ہوئی تھی روس کی دھمکی بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ سو جنگ سویز [illegible] اور [illegible] کی سب سے بڑی شکست کی علامت ہے۔

سویز کا واقعہ برطانیہ کے لیے ہر لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوا۔ اسے نہر سویز سے ہاتھ دھونے پڑے: [illegible]

جن شہروں اور علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ تھا ان کو جنگ کے بعد خالی کرانے کی کوشش کی گئی
جنگ ختم ہوئی تو مصر نے نہر سوئز کی صفائی کا کام شروع کر دیا اور ۱۹۷۵ء میں نہر سوئز کو دوبارہ کھول دیا گیا
تاکہ بین الاقوامی تجارت کا راستہ کھل جائے۔ اس جنگ سے مصر کی معیشت کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ جزیرہ نمائے سینا کا
بیشتر حصہ بھی اسرائیل کے قبضہ میں تھا۔ اس کے علاوہ شہروں کو بھی نقصان پہنچا تھا اور عام شہریوں نے ہجرت کر کے
دوسرے علاقوں میں پناہ لی تھی۔ اسرائیل کا رویہ ایسا تھا کہ وہ ان علاقوں کو خالی کرنے پر تیار نہیں تھا
اس لیے مصر نے سیاسی طور پر امریکہ سے مذاکرات کیے اور اس کی ثالثی میں معاہدہ کیا
امریکہ کی ثالثی میں سینا کا کچھ حصہ مصر کو واپس مل گیا اور مصر نے امریکہ سے قریبی تعلقات
قائم کر لیے۔ ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ بات طے کی گئی کہ ان علاقوں کو خالی کیا جائے گا۔

انور السادات کی کامیابی کو ایک اہم حیثیت ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے اب تک عرب ممالک
اسرائیل کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اکتوبر کی جنگ میں مصر کی فوجوں نے پہلی مرتبہ
اسرائیل کو شکست دی اور اس کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا کہ اس کی فوج ناقابل شکست ہے۔ ۱۹۷۷ء میں
سادات نے یروشلم کا دورہ کیا اور ۱۹۷۸ء میں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں مصر اور اسرائیل کے
درمیان امن قائم ہوا۔ عرب ممالک نے اس معاہدے کی مخالفت کی اور مصر کو عرب لیگ سے الگ کر دیا گیا
سادات کی حکومت کا یہ قدم ایسا تھا جس نے عرب دنیا میں اختلافات پیدا کر دیے اور ۱۹۸۱ء میں ان کو قتل کر دیا گیا
لیکن مصر اپنی کامیابی سے آگے بڑھتا رہا اور اس نے اپنے تمام علاقوں کو واپس حاصل کر لیا
اور امن قائم کر دیا۔

عرب اتحاد کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ متحدہ عرب جمہوریہ کی بنیاد پر قائم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد
۱۹۵۸ء میں مصر اور شام نے مل کر متحدہ عرب جمہوریہ بنائی لیکن ۱۹۶۱ء میں شام الگ ہو گیا
اور یہ اتحاد دیر پا ثابت نہ ہوا۔ شام نے محسوس کیا کہ یہ دونوں ملکوں کا اتحاد نہیں ہے بلکہ
مصر کی بالادستی ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں شام نے علیحدگی اختیار کر لی
اس کے بعد عرب اتحاد کی کوششیں جاری رہیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں مصر، شام اور لیبیا نے
مل کر اتحاد قائم کرنے کا اعلان کیا لیکن یہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔
بعد میں سوڈان بھی شامل ہوا مگر کچھ عرصہ بعد یہ اتحاد بھی ختم ہو گیا۔
یہ عرب ممالک کے درمیان اختلافات کی وجہ سے ہوا۔ مصر اور سعودی عرب کے تعلقات بھی
مختلف ادوار میں کبھی اچھے اور کبھی خراب رہے۔ یمن کی جنگ میں مصر اور سعودی عرب
۱۹۶۷ء میں شاہ فیصل اور صدر ناصر کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے یمن کی جنگ ختم ہوئی

کے زیر نظم ہوں یعنی اس امر پر استصواب صدر نے بھاگ کر پایا کہ یا لوگ موجودہ جمہوری نظام کو پسند کرتے ہیں یا امام سیف البدر کے خاندان کی حکومت چاہتے ہیں۔

اب تک ایسی کئی مثالیں سامنے آئی ہیں کہ صدر ناصر پہلے عرب ملکوں کی حکومتوں سے دوستی کرتے ہیں اور پھر ان ملکوں کے عوام اور فوج میں اپنے حامی پیدا کرکے ان حکومتوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب دیگر عرب ریاستوں کے حکمران صدر ناصر سے تعلقات پیدا کرنے میں بہت محتاط ہو گئے ہیں اور اپنے عوام کو مصر کے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ اگر صدر ناصر مصری غلبہ کی بجائے واقعی عرب اتحاد چاہتے ہیں تو وہ سازشوں اور فوجی انقلابوں سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے صحیح مقاصد کا تعین کرکے ایک بین الاقوامی عرب تحریک کی ضرورت ہے ـــــ جب یہ تحریک عوام میں مقبول ہو جائے گی تو ایک ایسی متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئے گی جس پر کسی ایک ملک کا غلبہ نہیں ہوگا۔

عراق

پہلی عالمی جنگ کے بعد عراق پر برطانوی تولیت قائم ہو گئی تھی۔ برطانیہ نے شریف مکہ کے سب سے بڑے لڑکے فیصل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ ۱۹۳۲ء میں عراق آزاد ہو گیا لیکن حبانیہ اور بصرہ کے اڈوں پر برطانیہ کا قبضہ قائم رہا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران رشید علی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کے حق میں بغاوت کی جس کے نتیجہ میں سارے عراق پر برطانیہ کی فوجیں قابض ہو گئیں۔ جنگ کے اختتام پر عراق کی قسمت برطانیہ کے سب سے بڑے حامی جنرل نوری السعید کے ہاتھوں میں تھی۔ جنگ کے بعد سے ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب تک عراقی حکومت برطانیہ کے اشاروں پر چلتی رہی۔ اس عرصہ میں مغربی طاقتوں کی کوشش یہ رہی کہ عراق کو دنیائے عرب کا لیڈر بنا دیا جائے اور اس کی مدد سے دنیائے عرب کی دفاعی تنظیم بنائی جائے جس کی سرپرستی مغرب کو حاصل ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر سب سے پہلے عراق اور ترکی کے درمیان معاہدہ پر دستخط ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں بغداد پیکٹ وجود میں آیا۔ جب ۱۹۵۸ء میں متحدہ عرب جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا تو عراق میں عرب قومیت کے حامیوں نے [illegible] کے لیے عراقی حکومت نے اردن کے ساتھ مل کر وفاقی عرب مملکت بنائی لیکن جولائی ۱۹۵۸ء میں بریگیڈیئر جنرل کریم قاسم نے شاہی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور شاہ فیصل، شہزادہ عبدالالٰہ اور وزیر اعظم نوری السعید قتل کر دیے گئے۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی وفاقی عرب مملکت ختم ہو گئی اور چند ماہ بعد عراق معاہدہ بغداد سے بھی علیحدہ ہو گیا۔

توقع تھی کہ معاہدہ بغداد سے علیحدہ ہونے کے بعد عراق متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ جنرل قاسم متحدہ عرب جمہوریہ کے حق میں نہ تھے [illegible] عراق [illegible] عرب ممالک کی قیادت حاصل ہو جائے۔ [illegible] کرنل عارف [illegible] حکومت سے علیحدہ کر دیا [illegible] صدر ناصر کے حامی ہو گئے۔ انھوں نے کرنل عارف [illegible] اور دوسری بار کرنل شواف [illegible] حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں بار ناکامی ہوئی۔ صدر ناصر کے حامیوں کی مخالفت نے [illegible] قاسم کو اشتراکی [illegible] کر دیا۔ اس کا اثر خارجہ پالیسی پر یہ ہوا کہ عراق نے روس سے فوجی اور اقتصادی امداد حاصل کی [illegible] قاسم کے اقتدار کا خاتمہ صدر ناصر کے حامیوں نے اس طرح کیا کہ بعث پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ اس اتحاد کے نتیجہ میں [illegible] میں

شام کی حکومت اور پھر دوبارہ ۱۹۶۳ء میں جنرل حافظ کی قیادت میں بعث پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔ انقلاب کے بعد صدر ناصر اور شام کے ساتھ اتحاد کے لیے جنرل حافظ عراق کے ساتھ سب سے پہلے۔ عراق اور شام میں بعث پارٹی کی وجہ سے تیسری بار اتحاد کی کوشش ہوئی اور یہ ترقی ہو گئی کہ عراق اور شام متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل ہو جائیں لیکن صدر ناصر اور بعث پارٹی میں بعد میں اختلافات ہو گئے اور یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ صدر ناصر اور بعث پارٹی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

۱۹۶۱ء میں جنرل قاسم نے دعویٰ کیا کہ کویت عراق کا حصہ ہے۔ دعویٰ یہ کیا تھا کہ عراقی عوام میں کویت کو بھی شامل کیا گیا کیونکہ کویت میں برطانیہ اور امریکہ کی تیل کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ برطانیہ نے کہا کہ ہم اپنے ساتھی ملک کے تحفظ کے لیے فوجی کارروائی سے گریز نہیں کریں گے اور کویت میں اپنی فوج اتار دی۔ لیکن عرب لیگ نے بھی کویت کی حمایت حاصل کی جو جنرل قاسم کی کمیونسٹ نوازی کے خلاف تھیں۔ جنرل قاسم نے داخلی سیاست کے میدان میں اپنی اتحادی پارٹی کو مضبوط بنانے کے لیے کویت کا مطالبہ کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ برطانیہ بھی کوئی اس کی آنکھوں کے سامنے کویت کو ختم کرا ہو جانے گا۔ کویت کا مطالبہ عراق نے سنجیدگی سے نہیں کیا تھا۔

۱۹۶۳ء میں صدر عارف اس مطالبے سے دستبردار ہو گئے اور برطانیہ نے کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ عراق اور برطانیہ کے درمیان اس معاہدے سے کویت کو مزید فائدہ پہنچ گیا۔ برطانیہ نے اسے مکمل آزادی دے دی اور وہ اقوام متحدہ کا ممبر ہو گیا۔

شمالی افریقہ

شمالی افریقہ میں لیبیا، مصر، تیونس، الجزائر اور مراکش عرب ریاستیں شامل ہیں۔ مصر کا ذکر عرب لیگ کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

لیبیا

دوسری عالمی جنگ سے قبل لیبیا پر اٹلی کا قبضہ تھا۔ جنگ کے بعد اقوام متحدہ کی نگرانی میں آیا اور ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو لیبیا آزاد ہو گیا۔

جولائی ۱۹۵۳ء میں برطانیہ اور لیبیا کے درمیان ایک دوستی اور دفاع کا ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے برطانیہ کو لیبیا میں اپنے اڈے قائم کرنے کا اختیار مل گیا۔ بعد میں امریکہ نے بھی معاشی امداد کے عوض ایک ہوائی اڈہ قائم کر لیا۔

تیونس

تیونس کو فرانس نے ۱۸۸۱ء میں زیر حفاظت لیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مکمل آزادی کے لیے تحریک شروع ہوئی اور مارچ ۱۹۵۶ء میں تیونس آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مسٹر حبیب بورقیبہ تیونس کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انہوں نے تیونس کے بے کو معزول کر دیا اور ملک کو جمہوریہ قرار دے کر خود اس کے صدر بن گئے۔ مگر فرانس نے تیونس کی آزادی تسلیم کرنے کے باوجود بنزرت پر اس کا فوجی اڈہ قائم تھا۔ اس بحری اڈے کو فرانس سے خالی کرانے کی جدوجہد جاری رہی۔ آخر ۱۹۶۳ء میں فرانس نے یہ اڈہ بھی تیونس کے حوالے کر دیا اور تیونس سے فرانس کے تعلقات بہتر ہو گئے۔

تیونس کے صدر حبیب بورقیبہ اعتدال پسند لیڈر ہیں۔ وہ مغرب کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ مگر وہ بھی عرب اتحاد کے قائل

لیکن اس حد تک نہیں کہ ان کا کنٹرول کسی عرب مملکت میں ختم ہو جائے۔ صدر ناصر سے حبیب بورقیبہ کی نہیں بنتی۔ وہ سمجھتے ہیں صدر ناصر عرب اتحاد کی آڑ میں مصر کے اقتدار اور اپنی شخصی حکومت کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اسرائیل کے مسئلہ پر بھی ان میں دیگر عرب ممالک سے اختلاف ہے۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ عرب ریاستیں اسرائیل کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے انہوں نے تجویز پیش کی کہ عرب ریاستیں اسرائیل کو اس شرط پر تسلیم کر لیں کہ وہ اقوام متحدہ کی ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے مطابق فلسطین کی سرحدوں کا تعین کرنے پر راضی ہو جائے اور عرب مہاجرین کو دوبارہ اسرائیل میں بسائے۔

حبیب بورقیبہ کے اس بیان پر تمام عرب میں بہت لے دے ہوئی اور متحدہ عرب جمہوریہ، شام اور عراق نے تیونس سے اپنے سفیر واپس بلا لیے۔ حبیب بورقیبہ کی تجویز سے اسرائیل نے بھی اتفاق نہیں کیا۔ اسرائیلی وزیر اعظم نے گو اس بات کو سراہا (پہلی بار ایک عرب ملک نے مذاکرات کی تجویز پیش کی ہے) تاہم انہوں نے اس امر کا اعادہ کیا کہ اسرائیل عرب مہاجرین کو واپس لینے پر تیار نہیں ہے اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر عرب ملکوں نے دریائے اردن کے پانی کا رخ موڑنے کی کوشش کی تو اسرائیل طاقت کا استعمال کرے گا۔

عرب ریاستوں اور اسرائیل کے اس جواب نے آخر صدر بورقیبہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تجاویز پر نظر ثانی کریں۔ چنانچہ انہوں نے صدر ناصر کو ایک خط لکھا جس میں وضاحت کی کہ میں نے ایک طریق کار پیش کیا تھا ورنہ میرا نصب العین بھی یہی ہے کہ فلسطین سے یہودیوں کا غاصبانہ قبضہ ختم کیا جائے۔

مراقش

۱۹۱۲ء میں فرانس نے ایک معاہدہ کے ذریعہ مراقش کا دفاع اور امور خارجہ اپنے اختیار میں لے لیے اور بعد میں [illegible] قبضہ کر لیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد قوم پرستوں کی جدوجہد آزادی نے زور پکڑا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۵۲ء میں فرانسیسی فوج اور قوم پرستوں کے درمیان پہلا تصادم ہوا۔ فرانسیسی حکام نے مراقش کے سلطان سید محمد بن یوسف کو معزول کر دیا کیونکہ انہیں قوم پرستوں کی [illegible] محمد کی جگہ انہوں نے سلطان کے چچا زاد بھائی محمد بن عرفہ کو مراقش کے تخت پر بٹھا دیا۔ [illegible] شدت اختیار کر گئی [illegible] سلطان کی بحالی پر زور دیا [illegible] ۱۹۵۵ء [illegible] ۱۹۵۶ء [illegible] گئے [illegible] مراقش کے اس [illegible] کے [illegible] ۱۹۶۱ء [illegible] اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

الجیریا

فرانس نے ۱۸۳۰ء میں الجیریا پر قبضہ کیا [illegible] ملک یہودی باشندوں کو [illegible] [illegible] مسلمانوں کے [illegible]

کہ فرانس کے جمہوریہ کی حیثیت دلائی اور فرانسیسی حکومت نے کہا کہ الجزائر مستقل طور پر فرانس میں ضم کرنے کا فیصلہ نہ کرنے کے معاشی اور سیاسی اسباب تھے۔ معاشی سبب یہ تھا کہ الجزائر فرانس کو ۰۰ فیصد شراب، تیل، تمباکو اور پھلوں اور سبزیوں کا ... دوسری معدنیات اور تیل کے ذخیرے ہیں۔ سیاسی سبب یہ تھا کہ فرانسیسی نو آبادکار اپنے غلبہ کو مستقبل میں ختم نہیں کرنا چاہتے تھے اور صرف سیاسی تبدیلیوں کی بجائے فوجی طریقوں پر یقین رکھتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الجزائر کی آزادی کے لیے ایک طویل اور خونریز جدوجہد کرنی پڑی۔ یہ جدوجہد یوں تو ۱۹۳۰ء سے ہی شروع ہو گئی تھی لیکن ۱۹۵۴ء میں اس نے جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ ۱۹۵۶ء میں تیونس اور مراکش کی آزادی نے الجزائر کی جدوجہد کی حوصلہ افزائی کی اور اس میں اضافہ کر دیا۔ فرانس نے الجزائری عوام کو شکست دینے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ۵ لاکھ فوج میدان میں لگا دی ... الجزائر ... افریشیائی اقوام نے اقوام متحدہ کے ... اجلاس کے ایجنڈے میں الجزائر کا مسئلہ ... فرانس ... ستمبر ۱۹۵۸ء میں جلاوطن حکومت ... الجزائر کی آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ یہ وقت وہ تھا کہ فرانس کی حکومت الجزائر کی بغاوت سے تنگ آ چکی تھی۔ اسے چند فرانسیسی نو آبادکاروں کے لیے کروڑوں روپیہ روزانہ خرچ کرنا پڑ رہا تھا اور اس کی اقتصادی حالت بہت بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن فرانسیسی نو آبادکار اور فوجی افسر ... الجزائر کی بغاوت کو دبانا چاہتے تھے اور یہ کام کمزور اور غیر مستقل جمہوری حکومت سے ممکن نہ تھا۔ انہیں ایک سخت مزاج ڈکٹیٹر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے بغاوت کر دی اور مطالبہ کیا کہ جنرل ڈیگال کو فرانس کا حاکم بنایا جائے۔ اس بغاوت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ فرانس کے وزیر اعظم مستعفی ہو گئے اور جنرل ڈیگال ان کی جگہ وزیر اعظم بنائے گئے۔ فرانس کو ایک نیا دستور دیا جس کے تحت پارلیمانی نظام کی جگہ صدارتی نظام نے لے لی اور جنرل ڈیگال فرانس کے با اختیار صدر ہو گئے۔ ابتدا میں جنرل ڈیگال نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوجی طاقت سے الجزائر کی بغاوت کا مسئلہ حل کر دیں گے۔ لیکن جب ان پر واضح ہو گیا کہ الجزائری عوام ارادے کے پکے ہیں۔ ادھر فرانس کی اقتصادی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور وہ اپنے یورپی ساتھیوں کے مقابلے میں کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کمزوری کے باعث معاہدہ اٹلانٹک میں فرانس کے رتبہ پر خراب اثر پڑ رہا تھا اور اس کی امید جاتی رہی تھی۔ فرانس ایک بار پھر بڑی طاقت بننا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اقتصادی اعتبار سے مضبوط ہو اور بڑی طاقتوں کے زمرے میں شامل ہو جائے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب الجزائری عوام کے خلاف جنگ کا فضول خرچ ختم ہو جائے۔

صدر ڈیگال اس طرح سوچ رہے تھے۔ فرانسیسی نو آبادکار اور فوجی افسر صدر ڈیگال کے خیالات میں اس تبدیلی سے برہم ہو گئے اور انہوں نے ایک بار پھر بغاوت کر دی۔ لیکن ان باغیوں کے خلاف صدر ڈیگال ایک سخت مزاج ڈکٹیٹر ثابت ہوئے۔ انہوں نے باغی جرنیلوں کو گرفتار کر لیا اور ان میں سے بعض کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا۔ باغی فوجیوں سے نمٹنے کے بعد صدر ڈیگال نے الجزائری عوام کے نمائندوں سے مذاکرات کی پیش کش کی اور یہ مذاکرات ایویان میں شروع ہو گئے۔

مارچ ۱۹۶۲ء کے پہلے ہفتہ میں فرانسیسی حکومت اور الجزائر کی عارضی حکومت کے نمائندوں نے ایویان میں ایک معاہدہ

دستخط کیے جس کی رو سے فرانس نے محاذ قومی آزادی کو الجزائری مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کرلیا اور یہ بھی مان لیا کہ محاذ کو شمالی صحارا تک تمام پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا۔ فرانس نے یہ مطالبہ بھی مان لیا کہ گرفتار شدہ الجزائری گوریلوں کو جنگی قیدی سمجھا جائے گا اور ان سے ساتھ سلوک کیا جائے گا جو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ فریقین اس امر پر متفق ہوگئے کہ الجزائر فرانس کے تعاون سے آزادی حاصل کرے گا اور آزادی کے سوال پر فرانس اور الجزائر میں استصواب رائے کیا جائے گا۔ تین سال کے عرصہ میں فرانسیسی فوجیں الجزائر خالی کردیں گی مرسی الکبیر کا فوجی اڈہ فرانس کو دے دیا جائے گا اور ان یورپینوں کو الجزائر میں رہنے دیا جائے گا جو الجزائر کا شہری بننا پسند کریں گے۔

فرانس اور قومی محاذ کے درمیان مندرجہ بالا معاہدہ کا خیر مقدم تمام دنیا میں کیا گیا لیکن فرانسیسی نو آبادکاروں اور چند رجعت پسند (جرنیلوں) نے اسے منسوخ کرانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انھوں نے ایک خفیہ تنظیم بنائی جس نے دہشت پسندانہ کارروائیاں شروع کردیں۔ انھوں نے قتل و غارت اور لوٹ مار کو اپنا شعار بنالیا۔ ان کا خیال تھا کہ عوام اس خطر ناک دہشت سے پسپا ہو کر فرانسیسی فوجوں سے مل جائیں گے اور دوبارہ جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے ایویان کا معاہدہ اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔ لیکن یہ امر حیرت انگیز ہے کہ الجزائری مسلمانوں نے جس نظم و ضبط اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آخر کار دہشت پسند ایس جو تنظیم نے الجزائری حکومت سے اس یقین دہانی پر ہتھیار ڈال دیے کہ انہیں عام معافی دے دی جائے گی

فرانس اور الجزائر میں استصواب رائے کے ذریعہ دونوں ملکوں کے عوام نے ایویان کے معاہدہ کی توثیق کردی اور الجزائر آزاد ملک کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

آزادی کے وقت بن خدا الجزائر کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے فرانس سے جو معاہدہ کیا تھا اس سے الجزائر کے ... بن باللہ مکمل طور پر متفق نہیں تھے۔ وہ فرانس کو کوئی رعایت دینے کے خلاف تھے۔ وہ سوشلزم کے قائل تھے جبکہ بن خدا اور فرحت عباس مغربی طرز کی جمہوریت چاہتے تھے۔ بن باللہ فرانسیسی دہشت پسندوں کو عام معافی دیے جانے کے بھی خلاف تھے۔ ان اختلافات کے باعث بن خدا اور بن باللہ میں کشمکش شروع ہوگئی۔ آخر کار بن باللہ کامیاب ہوئے اور انہیں الجزائر کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ ان کی اس کامیابی میں فوج کے سربراہ کرنل بومدین کا بڑا ہاتھ تھا۔ بن باللہ یقیناً ایک مخلص شخص تھے لیکن ان میں آمرانہ ذہنیت بھی تھی اور وہ خود رائی تھی کہ وہ اپنے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام رفقاء سے ان کے اختلافات بڑھتے گئے اور وہ انہیں اپنے سے ہٹاتے گئے۔ کریم بالقاسم، فرحت عباس اور بن خدا نے الجزائر چھوڑ دیا اور آیت احمد نے قبائلیوں میں علم بغاوت بلند کردیا۔ ابھی یہ بغاوت پوری طرح فرو نہ ہونے پائی تھی کہ مغربی صحرا میں مراکش نے سرحدی چوکیوں پر حملہ کردیا۔ الجزائر میں شامل صحارا کے ایک بڑے حصہ پر مراکش کا دعویٰ ہے۔ یہ حملہ اسی دعوے کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کوشش تھی۔ الجزائر نے اپنی فوجیں مراکش کا حملہ ناکام کردیا اور چند دنوں تک سرحدوں پر لڑائی جاری رہی۔ ایتھوپیا کے شاہ ہیل سلاسی نے مراکش اور الجزائر کی لڑائی ختم کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے ان کے سربراہوں کو مالی میں تنظیم وحدت افریقہ کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس نے فریقین کے درمیان جنگ بندی کرادی اور سرحدی تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کردیا۔ اس معاہدہ کے بعد الجزائر نے بن باللہ

میں کمزوریاں ہیں اور ابھی اتحاد کی قدر معلوم ہوئی ہے۔ چنانچہ پاکستان نے اپنے پالیسی بیان میں کوشش کی ہے چناں
پایہ تکمیل نہ ہو سکی۔

بین الاقوامی سیاست میں یہ بات مسلمہ کی حقیقت ہے کہ چین اور کمیونسٹ ممالک کی طرف زیادہ ہے۔ الجزائر میں ایفرو ایشیائی کانفرنس کا انعقاد کیا جا سکتا ہے۔ یہ کانفرنس ۲۹ جون ۱۹۶۵ء کو ہونے والی تھی لیکن اس سے پہلے ۱۹ جون ۱۹۶۵ء کو الجزائر میں کرنل بومدین نے وزیر اعظم بن بیلا کی حکومت ختم کر دی اور انہیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ کیونکہ الجزائر کا نام ہی کا خطرہ تھا۔ اس لیے افریشیائی وزرائے خارجہ نے کانفرنس کو ۵ نومبر ۱۹۶۵ء تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ چین کے باعث یہ کانفرنس ۵ نومبر کو بھی نہ ہو سکی۔ اور غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے الجزائر میں بومدین کی حکومت بن بیلا کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ البتہ داخلی معاملات میں ان کی پالیسی ابھی تک واضح نہیں ہوئی ہے۔

دنیائے عرب کا مستقبل

عرب ممالک کی سربراہی کانفرنس ستمبر ۱۹۶۵ء کے تیسرے ہفتہ میں بمقام کاسا بلانکا منعقد ہوئی جس میں اکثر عرب ریاستوں نے حصہ لیا۔ تیونس نے متحدہ عرب جمہوریہ سے اختلافات کے باعث شرکت نہیں کی۔ اس کانفرنس کے فیصلوں سے عرب ملکوں کی موجودہ حکمت عملی پر روشنی پڑتی ہے۔ کانفرنس میں عرب ریاستوں نے باہمی معاہدہ پر دستخط کیے اور ایک اعلامیہ شائع کیا۔

معاہدہ کی خاص خاص باتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ عرب اقوام اپنے اتحاد و یکجہتی کا اعادہ کرتی ہیں۔ وہ خصوصاً فلسطین کے مسئلہ پر متحد و متفق ہیں۔

۲۔ عرب اقوام عہد کرتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں دخل نہیں دیں گی اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ نہیں کریں گی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ایک اعلامیہ کے ذریعے بتایا گیا کہ عرب رہنماؤں نے متحدہ کمانڈ کو مضبوط بنانے، فلسطینیوں کے قیام اور اسرائیل کے معاونین کا اخراج کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔ اس اعلامیہ میں عرب ریاستوں نے سفارش کی کہ ویٹ نام کا مسئلہ ۱۹۵۴ء کے جنیوا معاہدہ کے مطابق حل کیا جائے۔ انھوں نے جنوبی عرب اور عمان کے عوام کی آزادی کی حمایت کی اور مطالبہ کیا کہ ان تمام غیر ملکی اڈوں کو ختم کر دیا جائے جو دنیائے عرب کی سلامتی اور امن عالم کے لیے خطرہ ہیں۔ انھوں نے حق خود ارادیت کی حمایت کا اعادہ کیا کہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی تجاویز کے مطابق حل کیا جائے۔ آخر میں عرب رہنماؤں نے اعلان کیا کہ آزادی کا نصب العین واحد اور ہمہ گیر ہے اس لیے اگر کسی ایک قوم کی آزادی خطرے میں پڑتی ہے تو باقی تمام قوموں کی آزادی کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

کیسا بلانکا کانفرنس کا معاہدہ اور اعلامیہ عرب ریاستوں کی موجودہ حکمت عملی اور نظریات کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر باتیں نئی نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ اس سے قبل بھی بار بار کہے جا چکے ہیں لیکن جب عہد ناموں پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو یہی معاہدے ناکام ہو جاتے ہیں اور وعدوں کی شکست ہوتی ہے۔ کا سبب

ہیں۔ جب تک یہ اسباب موجود رہیں گے عرب کے اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ ان اسباب کو موٹے طور پر داخلی اور خارجی اسباب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

داخلی اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عرب اقوام معاشی، تعلیمی اور سیاسی اعتبارات سے پس ماندہ ہیں

۲۔ اس پس ماندگی کے باعث کسی بھی ریاست میں عوامی راج نہیں ہے۔ بعض ریاستوں میں ہنوز بادشاہوں کی حکومت ہے اور بعض میں خالص فوجی آمریت یا جمہوریت نما آمریت ہے۔ جہاں شاہی نظام ہے وہاں جاگیردارانہ معیشت ہے۔ ان ملکوں کا تیل غیر ملکی کمپنیوں کے انتظام میں ہے۔ تیل کی آمدنی کا نصف بادشاہ اور رؤسا کے خاندان کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ یہ آمدنی ملک کی ترقی اور عوام کی بہبود کے لیے خرچ نہیں ہوتی۔ جہاں آمریت یا نام نہاد جمہوریت ہے وہاں ضرور غیر ملکی امداد اور منصوبہ بندی کے ذریعہ ترقی کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اس ترقی سے اب تک اونچے طبقے کے لوگوں کو ہی فائدہ پہنچا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ریاستوں کا نصب العین اشتراکیت ہے۔ جب تک عوام منصوبہ بندی کے فائدے اور اشتراکیت کے مقاصد سے آگاہ نہ ہوں گے وہ حکومت سے شعوری اور عملی تعاون نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا حکمران طبقے واقعی عوام کا تعاون چاہتے ہیں؟ شاید نہیں۔

۳۔ عرب اتحاد، مشترکہ فوج، مشترکہ دشمن کے خلاف متحدہ اقدام ------ یہ سب عوام کو خوش کرنے کے لیے [illegible] میں کہنے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اتحاد کے لیے نظریاتی ہم آہنگی اور معاشی و سیاسی نظام کی مماثلت ضروری ہیں۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ عرب رہنماؤں میں نظریاتی اختلاف ہے۔ عرب ریاستوں میں مختلف معاشی و سیاسی نظام رائج ہیں اور محدود وطنیت وسیع تر عرب قومیت پر غالب ہے۔

۴۔ موجودہ حالات میں مشترکہ دشمن کے خلاف اور چند مشترکہ مقاصد کے لیے اتحاد ہو سکتا ہے جو کبھی کبھی ایک حد تک دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن صرف ایک حد تک کیونکہ جب بھی اس حد کو پار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اختلافات کی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔

خارجی اسباب :

۱۔ اکثر عرب ریاستوں کے وسائل خصوصاً تیل سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ یہ سامراجی طاقتیں اپنے معاشی تسلط کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں اور ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ عربوں کو [illegible] متحد نہ ہونے دیا جائے۔

۲۔ عرب ریاستیں سامراجی طاقتوں کے معاشی تسلط سے [illegible] کمیونسٹ ملک سے امداد لیتی ہیں [illegible] عرب ممالک مغربی طاقتوں کی رسہ کشی کے میدان بن گئے ہیں۔

۔ دُنیائے عرب کا جغرافیائی محلِ وقوع جنگی حیثیت کا حامل ہے۔ اس لیے آج بھی بیشتر عرب ملکوں میں غیر ملکی فوجیں متعین
طاقتوں کے فوجی، بحری اور ہوائی اڈے موجود ہیں۔ تیل اور مشرقی دُنیا سے تجارت کی حفاظت کے پیشِ نظر بیرونی طاقتوں کی
طاقتوں کو بہت عزیز ہیں۔ یہ اڈے علاقائی سالمیت کا ... اور عرب ملکوں کی سلامتی کے لیے مستقل خطرہ ہیں۔ ان خطروں نے
جہاں ایک طرف عوام میں اتحادِ اسلامی کی ضرورت کا احساس پیدا کیا ہے وہاں دوسری طرف ان حکمران طبقوں کو اتحاد و ترقی
کا دشمن بنا دیا ہے جن کے مفاد سامراجی طاقتوں سے وابستہ ہیں۔ یہ طبقے بظاہر تو عوام کے ساتھ ہیں لیکن درحقیقت عوامی مقاصد
کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

مندرجہ بالا اسباب کی روشنی میں دُنیائے عرب کی سیاست کا ایک مایوس کن نقشہ اُبھرتا ہے لیکن جہاں عوام میں اپنے حقوق
اور مفاد کا شعور بیدار ہو رہا ہے، وہ ان مستقبل سے مایوس نہیں ہیں، آج نہیں تو کل اتحاد کی صداقت سے ہمکنار ہونے کے مترادف ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دُنیائے عرب کے عوام کو صحیح نصب العین دیا جائے اور انہیں حقیقت پسندانہ طرزِ عمل سے
آگاہ کیا جائے۔

عرب عوام کے اتحاد کی چند منفی اور مثبت بنیادیں ہیں۔ منفی بنیادوں میں سامراج دشمنی، اسرائیل دشمنی اور دیگر تمام خطرے
شامل ہیں جن سے آج کل دُنیائے عرب دوچار ہے۔ منفی بنیادوں سے عارضی اتحاد حاصل ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن مستقل اتحاد
کے لیے مثبت بنیادوں پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ مثبت بنیادوں میں اسلام اور عربی زبان شامل ہیں۔ بدقسمتی سے عرب
رہنماؤں نے منفی بنیادوں اور عربی زبان پر زیادہ زور دیا ہے اور اسلام کو فراموش کر دیا ہے۔ کیونکہ عربوں نے اپنے روایتی نظریۂ
حیات کو تقریباً ترک کر دیا ہے اس لیے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اسے مغرب کے نظریات سے پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا
نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اشتراکیت، قومیت، جمہوریت وغیرہ نے ان میں نااتفاقی پیدا کر دی ہے۔ اسلام میں بدلتے تقاضوں کے جدید تقاضوں کو
سمانے اور قبول کرنے کی صلاحیت اور لچک پائی جاتی ہے۔ اگر اسلام میں جدید نظریات کی اچھی باتوں کو سمو لیا جائے تو یہ جمہوریت
اور کمیونزم کے سیاسی و معاشی نظریات کا کامیاب جواب ثابت ہوگا اور اس کے احیاء سے نہ صرف دُنیائے عرب بلکہ دُنیائے
اسلام کے اتحاد کی راہیں کھل جائیں گی۔


صابنوں میں ایک سے ایک بہتر سلسلہ
Lily
SOAP
FLAKES
ZULFEQAR
SWAN
سوان
جراثیم کش
ہر مقصد کیلئے
موزوں ترین
صابن
عمدہ۔ بہتر اور بہترین
ہم آپ کی خدمت میں دھونے اور نہانے کے بیسیوں صابن کا سیٹ پیش
کرتے ہیں جنہیں حفظانِ صحت کے صحیح ترین اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے۔
ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ۔ کراچی



قومی دفاعی فنڈ میں دل کھول کر حصہ لیجئے

اور

ے عطیات مندرجہ ذیل بنکوں میں سے
سی ایک میں جمع کرائیے ۔

سٹیٹ بنک آف پاکستان
نیشنل بنک آف پاکستان
حبیب بنک لمیٹڈ
کامرس بنک لمیٹڈ
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ
مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ
سٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ
آسٹریلیشیا بنک لمیٹڈ
ایسٹرن مرکنٹائل بنک لمیٹڈ
بنک آف بہاولپور لمیٹڈ

عطیات مندرجہ ذیل صورتوں میں دیئے جا سکتے ہیں نقدی ۔ چیک ۔ بنک ڈرافٹ انعامی بانڈ سیونگ سرٹیفکیٹ ۔ گورنمنٹ سیکورٹیز ۔ سونا یا زیورات ۔

جاری کردہ

قومی دفاعی فنڈ کمیشن

[illegible]